زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خان

صدر اسلامی مرکز

اپنے حق سے زیادہ چاہنا ——————

اپنے آپ کو اپنے واقعی حق سے بھی محروم کرلینا ہے

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراطِ مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو ، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۳ فروری ۱۹۸۷

فہرست

دنیا کا قانون

گائے دودھ دیتی ہے۔ یہ ہر آدمی جانتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو یہ سوچتے ہوں کہ گائے کیسے دودھ دیتی ہے۔ گائے دودھ جیسی چیز دینے کے قابل صرف اس وقت بنتی ہے جب کہ وہ گھاس کو دودھ میں کنورٹ (تبدیل) کر سکے۔ گائے جب اس انوکھی صلاحیت کا ثبوت دیتی ہے کہ وہ کم تر چیز کو اعلیٰ چیز میں تبدیل کر سکتی ہے، اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں دودھ جیسی قیمتی چیز فراہم کرنے والی بنے۔

یہی حال درخت کا ہے۔ درخت سے آدمی کو دانہ اور سبزی اور پھل ملتا ہے۔ مگر ایسا کب ہوتا ہے ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کہ درخت اس صلاحیت کا ثبوت دے کہ اس کے اندر مٹی اور پانی ڈالا جائے اور اس کو وہ تبدیل کر کے دانہ اور سبزی اور پھل کی صورت میں ظاہر کرے درخت کے اندر ایک کم تر چیز داخل ہوتی ہے اور اس کو وہ اپنے اندرونی میکانزم کے ذریعہ تبدیل کر دیتا ہے اور اس کو برتر چیز کی صورت میں باہر لاتا ہے۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ زندگی بھی اسی قسم کا امتحان ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے کہ اس کو محرومیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس کو ناخوش گوار حالات پیش آتے ہیں۔ یہاں دوبارہ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے ناموافق حالات کو موافق حالات میں تبدیل کر سکے۔ وہ اپنی ناکامیوں کے اندر سے کامیابی کا راستہ نکال لے۔

یہی دنیا کا قانون ہے، انسان کے لیے بھی اور غیر انسان کے لیے بھی۔ جو کوئی اس خاص صلاحیت کا ثبوت دے، وہی اس دنیا میں کامیاب ہے۔ اور جو اس صلاحیت کا ثبوت دینے میں ناکام رہے وہ خدا کی اس دنیا میں اپنے آپ کو ناکامی سے بھی نہیں بچا سکتا۔

خدا کی گائے گویا خدا کی مرضی کا اعلان ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں خدا کو ہم سے کیا مطلوب ہے۔ خدا کو ہم سے یہ مطلوب ہے کہ ہمارے اندر "گھاس" داخل ہو اور وہ "دودھ" بن کر باہر نکلے۔ لوگ ہمارے ساتھ برائی کریں تب بھی ہم ان کے ساتھ بھلائی کریں۔ ہمارے ساتھ ناموافق حالات پیش آئیں تب بھی ہم ان کو موافق حالات میں تبدیل کر سکیں۔

تخلیقی اقلیت

آرنلڈ ٹائن بی (۱۸۵۲ - ۱۹۸۳) ایک انگریز مورخ ہے۔ ۱۹۵۴ میں اس نے اپنی مشہور کتاب تاریخ کا مطالعہ (A Study of History) چھاپی۔ یہ کتاب بارہ جلدوں میں ہے۔ اور اس میں ۲۱ تہذیبوں کا فلسفیانہ مطالعہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں ٹائن بی نے دکھایا ہے کہ کسی قوم کا ابھرنا اس پر منحصر نہیں ہوتا کہ وہ کسی اعلیٰ نسل سے ہے یا زیادہ بہتر جغرافی حالات اسے حاصل ہو گئے ہیں۔ بلکہ اس کا انحصار کسی قوم کی اس صلاحیت پر ہے کہ پیش آمدہ چیلنج کا جواب وہ کس طرح دیتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ وہ قومیں ابھرتی ہیں جو خصوصی مشکلات پیدا ہونے کے وقت خصوصی جدوجہد کر سکیں۔ تہذیبوں کے ابھرنے کے بارے میں ٹائن بی کی توجیہات اس نظریہ پر قائم ہیں کہ جو چیز لوگوں کو تہذیبی کامیابی حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے وہ مشکل حالات ہیں نہ کہ آسان حالات:

> The rise of a civilization was not the result of such factors as superior racial qualities or geographical environment but rather as a people's response to a challenge in a situation of special difficulty that rouses them to make an unprecedented effort. Difficult rather than easy conditions prompted men to cultural achievement (4/659)

ٹائن بی کا کہنا ہے کہ تہذیب ہمیشہ کوئی تخلیقی اقلیت (Creative Minority) پیدا کرتی ہے۔ یہ دراصل چیلنج کا جواب دینے کا عمل (Challenge-response mechanism) ہے جو کسی قوم کو ابھارتا ہے اور اس کو دنیا کا امام بناتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس دنیا میں محروم ہونا کوئی ناپسندیدہ بات نہیں۔ کیوں کہ محرومی آدمی کے اندر پانے کا جذبہ ابھارتی ہے۔ اور اس طرح اُس کو زیادہ باعمل بنا کر اس کے لیے زیادہ بڑی کامیابی کا امکان پیدا کر دیتی ہے۔ مشکل حالات میں گھری ہوئی ایک قوم اگر ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہو تو وہ اپنے حالات سے صرف فریاد و احتجاج کی غذا لے گی۔ اور اگر وہ حالات سے اوپر اٹھ کر مثبت طور پر سوچے تو اس کو نظر آئے گا کہ اس کے مشکل حالات اس کو نئی شاندار تر کامیابی کا زینہ فراہم کر رہے ہیں۔

اس کے باوجود

۱۱ نومبر ۱۹۸۶ کی صبح کو میرے ساتھ ایک "حادثہ" پیش آیا۔ میری عینک ایک بھول کی وجہ سے پتھر کے فرش پر گر پڑی۔ اس کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے جھٹکا لگا۔ پھر میں نے سوچا کہ اس دنیا میں تو ہمیشہ یہی ہوگا کہ یہاں پتھر کا فرش بھی رہے گا اور نازک شیشہ بھی اس لیے اس دنیا میں حفاظت اس کا نام نہیں ہے کہ چیزیں کبھی نہ ٹوٹیں۔ اس دنیا میں حفاظت یہ ہے کہ ٹوٹنے کے باوجود ہم چیزوں کو محفوظ رکھ سکیں۔ محرومی کے درمیانی واقعات پیش آنے کے باوجود ہم اپنے آپ کو آخری محرومی سے بچائیں۔

گلاب کا پھول کتنا خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کو پھولوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ مگر جس ڈالی میں گلاب کا نازک پھول کھلتا ہے، اسی ڈالی میں سخت کانٹے بھی لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ ہمارے لیے ناممکن ہے کہ ہم پھول کو کانٹے سے جدا کر سکیں۔ ہمیں کانٹے کے باوجود پھول کو لینا ہوگا۔ ہم اس دنیا میں کانٹے کے بغیر پھول کو نہیں پا سکتے۔

یہ زندگی کا ایک سبق ہے جو فطرت کی خاموش زبان میں ہمیں دیا جا رہا ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں "باوجود" کا اصول کارفرما ہے۔ یہاں ناخوش گواریوں کے باوجود خوش گواری کو قبول کرنا پڑتا ہے، یہاں "نہیں" کے باوجود اس کو "ہے" میں تبدیل کرنا ہوتا ہے۔

یہی اس دنیا کا عام اصول ہے۔ یہاں کامیابی اس کا نام ہے کہ آدمی ناکامیوں کے باوجود کامیابی تک پہونچنے کا راستہ نکالے۔ یہاں تجارت یہ ہے کہ گھاٹے کے باوجود نفع حاصل کیا جائے۔ یہاں آگے بڑھنا یہ ہے کہ پیچھے ہٹنے کے واقعات پیش آنے کے باوجود آگے کا سفر جاری رکھا جائے۔ اس دنیا میں کھونے کے باوجود پانے کا نام پانا ہے۔ یہاں اتحاد صرف ان لوگوں کے درمیان قائم ہوتا ہے جو اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا فن جانتے ہوں۔

چوٹی کے لوگ

امریکہ سے ۱۹۸۶ میں ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کتاب کا نام چوٹی کے عمل کرنے والے (Peak Performers) ہے۔ اس کتاب میں جدید امریکہ کے ان لوگوں کا مطالعہ کیا گیا ہے جنھوں نے زندگی کے میدان میں ہیروانہ کردار ادا کیا۔ اس سلسلہ میں مصنف نے جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ طاقتور مشن (Powerful mission) وہ چیز ہے جو آدمی کے اندر کوشش (Superior effort) کا جذبہ ابھارتا ہے اور اس کو خصوصی کامیابی (Exceptional achievement) کے درجہ تک پہونچاتا ہے۔

۱۹۶۷ میں امریکہ نے پہلا انسان بردار راکٹ چاند پر بھیجا تھا۔ راکٹ کی روانگی سے پہلے جو ماہرین اس منصوبہ کی تکمیل میں مشغول تھے، ان میں سے ایک شخص کا بیان ہے جو اس ٹیم میں کمپیوٹر پروگرامر کے طور پر شامل تھا۔ اس نے دیکھا کہ عمل کے دوران کچھ غیر معمولی بات پیدا ہو گئی۔ ہزاروں عورتیں اور مرد جو اس منصوبہ میں کام کر رہے تھے، وہ سب کے سب اچانک اعلیٰ انجام دینے والے (Super-achievers) بن گیے۔ وہ اتنا عمدہ کام کرنے لگے جو اس سے پہلے انھوں نے ساری عمر میں نہیں کیا تھا۔

۱۸ مہینے میں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ کام مکمل ہو گیا۔ میں نے جاننا چاہا کہ ہم سب لوگ اتنا عمدہ کام کیوں کر رہے ہیں۔ میں نے منیجر کے سامنے یہ سوال رکھا تو اس نے مشرقی جانب چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ لوگ ہزاروں سال سے وہاں جانے کا خواب دیکھتے رہے ہیں۔ اور اب ہم اس کو واقعہ بنانے جا رہے ہیں :

People have been dreaming about going there for thousands of years. And we're going to do it.

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ جو چیز متحرک کرتی ہے وہ یہ کہ اس کے سامنے کوئی بڑا مقصد آجائے۔ بڑا مقصد آدمی کی اندرونی صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ وہ آدمی کو ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ ایک عام آدمی کو چوٹی کا آدمی بنا دیتا ہے۔

دینے کے بعد پانا

انگریزی کا مقولہ ہے کہ ہم دیتے ہیں تبھی ہم پاتے ہیں (In giving that we receive)
س کی ایک مثال اکتوبر ۱۹۸۶ میں برطانیہ کی ملکہ کا چین کا دورہ ہے۔ یہ چین کے لیے برطانیہ کے
ی شاہی فرد کا پہلا تاریخی دورہ تھا۔ چین اور برطانیہ ایک سو سال سے ایک دوسرے کے روایتی
یب بنے ہوئے تھے۔ اس دورہ سے برطانیہ کو یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ چین کے ساتھ اس کا
ـ بلین ڈالر سے زیادہ ($ 1.5 billion) سالانہ تجارت کا معاہدہ یقینی ہو گیا۔

پانے کا یہ معاملہ دینے کے بعد ہوا ہے۔ ٹائم میگزین (۲۷ اکتوبر ۱۹۸۶) نے اس دورہ کی
رٹ دیتے ہوئے یہ بامعنی الفاظ لکھے ہیں:

> Her Majesty Queen Elizabeth II had long voiced a desire to visit the People's Republic of China. But as long as Britain ruled a piece of Chinese territory, the crown colony of Hong Kong, such a journey was impossible. The 1984 Sino-British agreement returning Hong Kong to China in 1997 provided the price of admission (p. 22).

۔ الزبتھ بہت عرصہ سے اس خواہش کا اظہار کر رہی تھیں کہ وہ چین جانا چاہتی ہیں۔ مگر جب تک
طانیہ چین کے ایک حصہ (ہانگ کانگ) کا حکمراں تھا اس قسم کا سفر ناممکن بنا رہا۔ ۱۹۸۴ میں
ن۔برطانیہ معاہدہ ہوا جس کے مطابق برطانیہ ۱۹۹۷ میں ہانگ کانگ کو واپس کر دے گا۔
س معاہدہ نے ملکہ برطانیہ کے چین میں داخلہ کی قیمت ادا کر دی۔

برطانیہ نے ہانگ کانگ کے معاملہ میں چین کے مطالبہ کو مان لیا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن
اکہ اس کے لیے چین میں تجارت کا وسیع دروازہ کھلے۔ اگرچہ ہانگ کانگ کو دوبارہ چین کے حوالے کرنا
ـ بے حد سخت معاملہ تھا۔ ٹائم کے الفاظ میں، اس کا مطلب یہ تھا کہ برطانیہ کا ایک ہیرا اس کے تاج
ے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے ——— یہی موجودہ دنیا کا قانون ہے۔ یہاں دوسروں سے لینے
ـلیے دوسروں کو دینا پڑتا ہے۔ جو لوگ دیئے بغیر یکطرفہ طور پر دوسروں سے لینا چاہتے
ں، ان کے لیے موجودہ دنیا میں کچھ بھی پانا مقدر نہیں۔

برتر کامیابی

موجودہ دنیا میں اعلیٰ درجہ کا کام انجام دینے والا (Super achiever) بننے کے لیے کسی طلسماتی صلاحیت کی ضرورت نہیں۔ ایک اوسط درجہ کا آدمی بھی انتہائی اعلیٰ درجہ کی کارکردگی کا ثبوت دے سکتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ آدمی زندگی کی سادہ حقیقتوں کو جانے اور ان کو استعمال کرے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ، اکتوبر ۱۹۸۶)

ایک امریکی مصنف نے باقاعدہ طور پر اس کی تحقیق کی۔ اس کا کہنا ہے کہ تجارت، سیاست اسپورٹ اور آرٹ کے میدان میں اس نے ۹۰ ممتاز افراد سے رابطہ قائم کیا۔ ان کی اکثریت نے ناکامی کو "غلط آغاز" کا نتیجہ قرار دیا۔ مایوسیاں ان کے لیے زیادہ طاقتور ارادہ کا سبب بن گئیں۔ حالات خواہ کتنے ہی خراب ہوں، اعلیٰ درجے کا کام انجام دینے والے ہمیشہ محسوس کرتے ہیں کہ یہاں کچھ نئے گوشے ہیں جن کو وہ دریافت کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس ہمیشہ کوئی نیا تصور ہوتا ہے جس کا وہ دوبارہ تجربہ کریں:

In a study of 90 leaders in business, politics, sports and the arts, many spoke of "false starts" but never of "failure". Disappointment spur greater resolve. No matter how rough things get, super-achievers always feel there are other avenues they can explore. They always have another idea to test.

اگر آپ ناکامی سے دوچار ہوں اور اس ناکامی کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دیں تو آپ کے اندر عمل کا جذبہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ آپ صرف دوسروں کے خلاف احتجاج اور شکایت میں مشغول رہیں گے اور خود کچھ نہ کر سکیں گے۔ لیکن اگر آپ اپنی ناکامی کو خود اپنی غلط کارکردگی کا نتیجہ سمجھیں تو آپ کا ذہن نئی زیادہ بہتر تدبیر سوچنے میں لگ جائے گا۔ آپ سُست پڑنے کے بجائے مزید پہلے سے زیادہ متحرک ہو جائیں گے۔ آپ از سرِ نو جدوجہد کرکے ہاری ہوئی بازی کو دوبارہ شاندار تر شکل میں جیتنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ناکامی کی ذمہ داری خود قبول کیجیے۔ ایک تدبیر کارگر نہ ہو رہی ہو تو دوسری تدبیر کا تجربہ کیجیے۔ آپ یقیناً اعلیٰ کامیابی تک پہونچ جائیں گے۔

مقبول دین

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس
قبول نہیں کیا جائے گا اور قیامت میں وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا (ومن یبتغ
یر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین)
عام طور پر اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ اسلام آخرت میں نجات کا ذریعہ اس
بنے گا کہ وہ سب سے کامل دین ہے۔ اس کا رسول سب سے افضل رسول ہے۔ اس کی
اب سب سے زیادہ بابرکت کتاب ہے۔ آیت کی یہ تفسیر قرآنی تفسیر نہیں۔ یہ ایک مضبوط
ت کو کمزور دلیل سے ثابت کرنا ہے۔

قرآن میں دوسرے مقام پر ہے کہ خدا اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں
ن اللہ لیس بظلاّم للعبید) مذکورہ تفسیر قرآن کے اس بیان کی تردید ہے۔ اس
طلب یہ ہے کہ خدا نے انسانی نسل کے ایک حصہ اور دوسرے حصہ کے درمیان فرق کیا ہے
بر آخر الزماں کے ظہور سے پہلے پیدا ہونے والوں کو اس نے کم تر درجہ کا دین دیا اور جو لوگ
بر آخر الزماں کے ظہور کے بعد پیدا ہوئے ان کو برتر دین عطا فرمایا۔ یہ بات یقینی طور پر خدا کی
ن کے خلاف ہے۔ خدا اپنی رحمت کی تقسیم میں کبھی ایسا امتیاز کرنے والا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نجات کا ذریعہ اس لیے ہے کہ اب وہی ایک محفوظ دین ہے۔
پلے دور میں آنے والے دین بھی اپنے زمانہ میں اتنا ہی مقبول دین تھے جتنا کہ اسلام آج مقبول
ن ہے۔ مگر جب ان کی آسمانی کتابوں میں تحریف ہوگئی۔ ان کے حاملین نے ان میں کمی
ثی کر دی تو اب وہ خدا کی ہدایت کو جاننے کا مستند ذریعہ نہ رہے۔ اسلام مکمل طور پر ایک
فوظ دین ہے اس لیے وہ خدا کی ہدایت کو جاننے کا مستند ذریعہ ہے۔ یہی واحد وجہ ہے جس
بنا پر پچھلے تمام دین بعد کے زمانہ میں رد کر دیے گئے اور صرف اسلام ہدایت کے ذریعہ
حیثیت سے باقی رہا۔

اسلام اور دوسرے ادیان میں اصلی فرق یہ ہے کہ اسلام محفوظ ہے اور دوسرے ادیان غیر محفوظ۔

یہ فرق

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو یہ تعلیم دی کہ اپنے مخالفوں سے کہو کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اس کو جھٹلا دیا (قل انی علی بینۃٍ من ربی وکذبتم بہ، الانعام ۵۷) اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اس دنیا میں دلیل کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے، اس کے برسرِ حق ہونے کا ثبوت واضح دلیل ہوتی ہے نہ کہ محض ادعار۔

دوسری طرف قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اور کفر کرنے والوں نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں خلل ڈالو تاکہ تم غالب آجاؤ (وقال الذین کفروا لاتسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون، حم السجدہ ۲۶) اس آیت کی تفسیر میں حسب ذیل روایت آئی ہے:

قال الضحاک عن ابن عباس (والغوا فیہ) عیبوہ (تفسیر ابن کثیر)

ضحاک راوی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا کہ والغوا فیہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کو عیب لگاؤ۔

جو لوگ کسی بات کو دلیل سے رد نہ کر پائیں اور وہ اس کو ماننے کے لیے بھی تیار نہ ہوں، تو اس کے بعد وہ تعییب کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی طرح طرح کے عیب لگا کر اس کو بدنام کرنا۔ پیغمبروں کے مخالفین ہر زمانہ میں اپنے پیغمبروں کے ساتھ ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔

کہنے والے کے الفاظ کو اگر کمی بیشی کے بغیر اس کی اصلی صورت میں نقل کیا جائے اور پھر اس کو عقلی یا نقلی دلیل سے رد کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ تنقید ہے، اور تنقید عین جائز ہے۔ لیکن اگر کہنے والے کے الفاظ کو اس کی اصلی صورت میں نقل کیے بغیر اس پر بے دلیل مخالفانہ ریمارک دیا جائے تو یہ تعییب ہے، اور تعییب سراسر ناجائز ہے۔

جب ایک شخص دلیل کی زبان میں کلام کرے، اور اس کے مخالفین اس کے برعکس عیب جوئی اور الزام تراشی کی زبان بول رہے ہوں تو یہ فرق اس بات کا ثبوت ہے کہ شخص مذکور بلاشبہ حق پر ہے اور اس کے مخالفین بلاشبہ ناحق پر۔ کیوں کہ قرآن کے مطابق دلیل کی زبان پیغمبروں کی زبان ہے۔ اور عیب جوئی کی زبان اہلِ کفر کی زبان۔

شکایت

شکایت ایسی چیز ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ نہ صرف عام انسان بلکہ پیغمبروں کے بارہ میں بھی بڑی بڑی شکایتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ نعوذ باللہ خود خدا بھی شکایتوں سے مستثنیٰ نہیں۔ بے شمار لوگ ہیں جو اپنی مصیبتوں کے لیے خدا کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ فلسفہ میں ایک مستقل بحث ہے جس کو بگاڑ کا مسئلہ (Problem of evil) کہا جاتا ہے۔ اس کے دعویدار کہتے ہیں کہ یا تو خدا کا وجود نہیں ہے۔ اور اگر خدا ہے تو وہ کامل معیار والا نہیں۔ خدا اگر کامل معیار والا ہوتا تو دنیا میں بگاڑ کیوں ہوتا۔

شکایت کبھی واقعہ ہوتی ہے اور کبھی محض شکایت کرنے والے شخص کے اپنے ذہن کا نتیجہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تم کسی کے خلاف کوئی بات سنو تو اس کی تحقیق کرو (الحجرات ۶) تحقیق سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ بات صحیح تھی یا صحیح نہ تھی۔

شکایت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں سب سے بری قسم وہ ہے جو احساس کمتری کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک شخص اپنے کو بطور خود بڑا سمجھ لیتا ہے۔ اب اگر اس کا سابقہ کسی ایسے شخص سے پڑے جس کو خدا نے اس سے اوپر کر دیا ہو تو یہ اول الذکر شخص کے لیے بڑا سخت لمحہ ہوتا ہے۔ عام طور پر وہ تسلیم نہیں کر پاتا کہ دوسرا شخص بڑا ہے اور وہ چھوٹا۔ وہ اپنی بڑائی کے ٹوٹنے کو برداشت نہیں کر پاتا۔ اس کی شخصیت پھٹ جاتی ہے وہ اپنی بڑائی کو باقی رکھنے کے لیے دوسرے شخص کو غلط ثابت کرنا شروع کر دیتا ہے۔

وہ اس پر جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ وہ اس کی تحقیر کرتا ہے تاکہ اپنے جذبہ برتری کی تسکین حاصل کرے۔ وہ اس کی عزت پر حملہ کرتا ہے تاکہ اس کو بے عزت کر کے اپنی متکبرانہ نفسیات کو غذا فراہم کرے۔ وہ خود ساختہ طور پر طرح طرح کی باتیں نکال کر اس کو چھوٹا ظاہر کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے یہ اطمینان حاصل کر سکے کہ وہ بڑا ہے ہی نہیں۔ آدمی اگر حقیقت واقعہ کے اعتراف کے لیے تیار رہے تو تمام شکایتوں کی جڑ کٹ جائے۔ آدمی چونکہ حقیقت کا اعتراف نہیں کرتا، اس لیے وہ اپنے آپ کو شکایت سے اوپر اٹھانے میں بھی کامیاب نہیں ہوتا۔

ایک حقیقت

ایک " مولوی صاحب " بستی میں آئے اور لوگوں کے سامنے تقریر کی۔ انھوں نے پہلے یہ کیا کہ لوگوں کو نماز روزہ کی فرضیت کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے بعد اپنے مدرسہ کے لیے چندہ کی اپیل شروع کر دی۔ تقریر ختم ہوئی تو لوگ خاموشی سے اٹھ اٹھ کر چلے گیے۔ غالباً کوئی شخص بھی نہ تھا جس کے اندر یہ ارادہ جاگا ہو کہ آئندہ وہ نماز روزہ کی پابندی کرے گا اور رسول اللہ کی سنت کے مطابق زندگی گزارے گا۔

سامعین میں سے ایک شخص کسی قدر بے باک تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر کہا: مولوی صاحب، جب آپ کو مدرسہ کا چندہ ہی مانگنا تھا تو سیدھے سیدھے مانگا ہوتا۔ پھر آپ کو وعظ و تبلیغ کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ مولوی صاحب نے اگرچہ قرآن و حدیث سنایا تھا اور نماز روزہ کے بارہ میں شریعت کا حکم بتایا تھا۔ مگر جب انھوں نے اسی کے ساتھ اس میں چندہ کا مطالبہ بھی شامل کر دیا تو سننے والے کی نظر میں ان کی تقریر صرف چندہ کا مطالبہ بن کر رہ گئی۔ نماز روزہ کی تبلیغ کی حیثیت سے ان کی تقریر کی اہمیت ختم ہوگئی۔ اپنے نزدیک انھوں نے نماز روزہ کی اپیل کی، مگر سننے والوں کے نزدیک وہ صرف چندہ کی اپیل تھی اور بس۔

آج اس طرح کے بے شمار سفیر ہمارے مدرسوں اور دار العلوموں کی طرف سے مقرر ہیں۔ وہ روزانہ بستیوں بستیوں میں جاتے ہیں اور وہاں لوگوں کے سامنے تقریریں کرتے ہیں۔ مگر ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ ان سفیر صاحبان کی تقریروں سے کسی شخص کے اندر بھی دینی انقلاب نہیں آیا۔ کسی کے اندر بھی نماز روزہ کی زندگی پیدا نہیں ہوئی۔

اس کے برعکس مثال تبلیغی جماعت کی ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ تبلیغی جماعت کی کوششوں سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ نمازی بن گیے۔ اور بے دینی کو چھوڑ کر دینی زندگی گزارنے لگے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ مدرسوں کے سفیر ایک طرف دینی تقریر کرتے ہیں اور دوسری طرف چندہ کی اپیل کرتے ہیں۔ وہ دینے والے

بھی ہیں اور "مانگنے والے" بھی۔ جب کہ تبلیغی جماعت چندہ کی کوئی بات نہیں کرتی۔ وہ صرف دیتی ہے، وہ مانگتی نہیں۔

یہی فرق ہے جس کی بنا پر مدرسوں کے سفیر ناکام ہیں اور تبلیغ کے لوگ کامیاب۔ جب آپ کسی کے سامنے دینے والے اور مانگنے والے دونوں بن کر جائیں تو اس کو آپ صرف مانگنے والے نظر آئیں گے، دینے والے کی حیثیت سے آپ کی تصویر اس کی نظر میں اوجھل ہوجائے گی۔

تبلیغی جماعت نے جو طریقہ مسلمانوں کے سلسلہ میں اختیار کیا وہی طریقہ غیر مسلموں کے سلسلہ میں بھی لازمی طور پر ضروری ہے۔ اگر ہمیں غیر مسلموں کو "قرآن" دینا ہے تو اس سے پہلے ہمیں اپنی تمام مانگوں کو چھوڑنا ہوگا۔ آج ہمارے تمام لیڈر غیر مسلموں کے مقابلہ میں احتجاج اور حقوق طلبی کی مہم چلا رہے ہیں۔ خدا کے پیغمبر اپنی مخاطب قوموں سے کہتے تھے کہ لا اسئلکم علیہ من اجر (میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا) اس کے برعکس مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اسئلکم علیہ من اجر (میں اس پر تم سے اجر کا طالب ہوں) کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کوئی مسلم رہنما یہ کرے کہ وہ ایک ہاتھ سے وزیر اعظم کو شکایات اور مطالبات کا میمورنڈم دے اور دوسرے ہاتھ سے قرآن کا ایک نسخہ بھی انھیں پیش کر دے تو یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک مذاق ہوگا نہ کہ خدا کی کتاب کو غیر مسلم حکمراں تک پہونچانا۔

اگر ہم واقعۃً دعوت کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں تو ہم کو اول مرحلہ میں یہ جان لینا چاہیے کہ دوسری قوموں تک خدا کے دین کا پیغام پہونچانے کے لیے ہمیں خدائی اخلاقیات کی سطح پر آنا پڑے گا۔ یعنی یک طرفہ عمل کے ذریعہ انھیں خدا کے دین رحمت کا مخاطب بنانا، بغیر اس کے کہ کسی بھی معاملہ میں ہم ان کے خلاف احتجاج کر رہے ہوں، یا ان کے ساتھ حقوق طلبی کی مہم میں مشغول ہوں۔

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ اس لیے یہ قدرتی بات ہے کہ اس دنیا میں ہمارے کچھ مادی اور تہذیبی مسائل ہوں۔ لیکن اگر ہمیں خدا کے یہاں داعی کا کریڈٹ لینا ہے تو ہمیں اپنے

مسائل کا ذمہ دار خود اپنے آپ کو قرار دینا ہوگا۔ ہمیں اپنے مسائل کو اپنی داخلی کوششوں کے ذریعہ حل کرنا ہوگا نہ یہ کہ ایک یا دوسری وجہ بتا کر ہم اپنی مدعو اقوام کے خلاف مطالباتی مہم شروع کر دیں۔

غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہونچانے کے لیے ہمیں ان کے مقابلہ میں وہی کرنا ہوگا جو مسلمانوں کے سلسلہ میں تبلیغی جماعت کر رہی ہے۔ یعنی یک طرفہ قربانی کے ذریعہ ان کے سامنے بالکل بے غرض بن جانا۔ اگر ہم اس ملک میں "مانگنے والے" بنے ہوئے ہوں تو عین اسی وقت ہم انھیں "دینے والے" نہیں بن سکتے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو غیر مسلموں کے لیے بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا مسلمانوں کے لیے۔

اصل یہ ہے کہ ہر چیز کی ایک قیمت ہے، اسی طرح داعی بننے کی بھی ایک قیمت ہے۔ مسلمان ابھی تک اس ملک میں داعی نہیں بنے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ابھی تک اس کی قیمت ادا نہیں کی۔ داعی بننے کی قیمت کیا ہے۔ وہ قیمت یہ ہے کہ آدمی مدعو کی نظر میں آخری حد تک بے غرض بن جائے، خواہ اس کے لیے اسے کتنی ہی بڑی قربانی دینی ہو اور اسے کچھ بھی برداشت کرنا پڑے۔ مدعو کی نظر میں اس کی ایک ہی تصویر ہو۔ اور وہ داعی کی تصویر ہو۔ مدعو کی نظر میں داعی کا مقام حاصل کرنے کے لیے وہ یک طرفہ طور پر مدعو سے اپنے تمام قومی اور مادی جھگڑے ختم کر دے۔

مدعو سے قومی نزاع کھڑی کرنا، مدعو سے مادی مطالبات کرنا، حتی کہ تہذیبی تشخص حاصل کرنے کے نام پر مدعو کے مقابلہ میں احتجاج کی مہم چلانا، یہ سب دعوتی مصالح کے سراسر خلاف ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو داعی اپنے داخلی عمل کے زور پر حاصل کر سکتا ہے۔ اور جس چیز کا حصول خود اپنے عمل کے ذریعہ ممکن ہو اس کے لیے مدعو سے احتجاج و مطالبہ کی مہم چلانا دعوتی شریعت میں جائز نہیں۔ ایسا ہر فعل دعوت کے امکانات کو ذبح کرنے کے ہم معنی ہے۔ جو لوگ ایسی سرگرمیوں میں مشغول ہوں وہ نہ اللہ کی نگاہ میں داعی قرار پا سکتے ہیں اور نہ بندوں کی نگاہ میں۔

مصنوعی مسائل

کیلی فورنیا کے ایک کروڑ پتی رابرٹ گراہم (Dr Robert Graham) نے ایک انوکھا بینک قائم کیا۔ اس کا نام انھوں نے نوبیل اسپرم بینک (Nobel Spermbank) رکھا۔ اس "بینک" میں نوبیل انعام یافتہ افراد کے مادۂ منویہ کو حاصل کر کے محفوظ کیا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے عورتوں کو بارآور کیا جائے اور زیادہ اعلیٰ ذہانت (Above-average intelligence) والے بچے پیدا کیے جائیں۔ بانی کا کہنا تھا کہ یہ بینک اس نے نااہل شوہروں (Infertile husbands) کے لیے قائم کیا ہے۔ تاہم جدید خواتین کی اباحیت پسندی اس پابندی کو ختم کر رہی ہے۔ بہت سی خواتین نکاح کے بغیر بچہ پیدا کرنا چاہتی ہیں، نیز وہ چاہتی ہیں کہ ان کی اولاد اعلیٰ استعداد کی مالک ہو، ایسی خواتین آزادانہ طور پر اس بینک کی خدمات حاصل کر رہی ہیں۔

انھیں خواتین میں سے ایک کیلی فورنیا کی ڈاکٹر آفٹن بلیک (Afton Blake) ہے۔ اس کی عمر اس وقت ۴۴ سال ہے۔ اس نے مذکورہ نوبیل اسپرم بینک سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اپنے لیے جس قسم کی اولاد چاہتی تھی، اس کے مطابق اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ نمبر ۲۸ (Number 28) کا مادہ حاصل کرے۔ واضح ہو کہ اس بنک میں جن لوگوں کے مادۂ منویہ جمع کیے گیے ہیں ان کو ان کے نام سے پکارا نہیں جاتا۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کو ایک نمبر دیا گیا ہے اور اسی خاص نمبر سے اس کو یاد کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر بلیک "نمبر ۲۸" کے مادہ کو اپنے رحم میں داخل کر کے حاملہ ہوئی۔ مقرر وقت پر اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام اس نے ڈورون (Doron) رکھا۔ یہ یونانی لفظ ہے جس کے معنی تحفہ یا عطیہ کے ہوتے ہیں۔ یہ بچہ اب چار سال سے زیادہ کا ہو چکا ہے اور وہ اب اسکول جانے لگا ہے۔ اس کی تصویر ہندستان ٹائمس، ستمبر ۱۹۸۶ (میگزین صفحہ) پر شائع ہوئی ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف کا نمائندہ آئن بروڈی (Ian Brodie) مذکورہ خاتون سے اس کے لاس اینجلس (کیلی فورنیا) کے مکان پر ملا۔ اس کی رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر بلیک کی خوشیاں دھیرے دھیرے غم میں تبدیل ہو رہی ہیں باپ کے بغیر بچہ کی ولادت اس کے لیے طرح طرح

کے مسئلے پیدا کر رہی ہے۔ ان مسائل کی طویل فہرست میں سے ایک یہ ہے کہ نومولود اب بولنے لگا ہے۔ وہ بار بار پوچھتا ہے کہ میرے باپ کہاں ہیں۔ ڈاکٹر بیک نے بتایا کہ ایک بار ایسا ہوا جب کہ ڈورون مجھ سے غصہ ہوگیا۔ اس نے کہا کہ وہ باہر جا رہا ہے تاکہ وہ اپنے باپ کے ساتھ رہے:

There was one occasion when Doron got angry with me. He said he was going off to live with his dad

خاتون کے لیے شوہر کے بغیر اولاد حاصل کرنا پہلے ایک دلچسپ تجربہ معلوم ہوتا تھا، مگر اب وہ نازک مسائل کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ نومولود ڈورون اپنے لیے ایک باپ سے محروم ہے:

One thing Doron is deprived of is a Daddy

وحی والہام

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ نے شہد کی مکھی کو وحی کی (وَاَوْحیٰ رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں میں بعض ایسی نشانیاں ہیں جو وحی سے مشابہت رکھتی ہیں۔ ان کا مطالعہ وحی الٰہی کے معاملہ کو انسان کے لیے قابل فہم بنا دیتا ہے۔

وحی کے عقیدہ کا مطلب خارجی ذریعہ علم سے رہنمائی کا آنا ہے۔ جانوروں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کے درمیان اس قسم کا ذریعہ علم واضح طور پر موجود ہے۔ جانوروں میں ایسی صفات پائی جاتی ہیں جن کی توجیہہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کی جا سکتی کہ یہ مانا جائے کہ ان کو اپنے باہر سے ہدایات مل رہی ہیں۔ انہیں صفات میں سے ایک صفت جانوروں کی مہاجرت (Migration) کا معاملہ ہے۔ خاص طور پر مچھلیوں اور چڑیوں کی مہاجرت اپنے اندر ایسی نشانیاں رکھتی ہے جس کے بعد وحی والہام کے معاملہ کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں رہتا۔

یہاں ہم مہاجر چڑیوں (Migratory birds) کا حوالہ دیں گے۔ بہت سی چڑیاں ہیں جو خوراک کی تلاش میں یا موسم کی تبدیلی کی بنا پر ایسا کرتی ہیں کہ خاص خاص وقتوں میں اپنے اصل مقام سے ہجرت کرکے دوسرے موزوں تر مقامات پر جاتی ہیں اور پھر ایک خاص مدت کے بعد دوبارہ اپنے سابق مقام پر واپس آجاتی ہیں۔

ان پروازوں کے بارہ میں موجودہ زمانہ میں نہایت وسیع مشاہدات کیے گیے ہیں۔ ان سے معلوم ہوا ہے کہ یہ پروازیں بے مقصد اڑان کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ بلکہ ایک ماہر طیور کے الفاظ میں ان کی حیثیت نہایت اعلیٰ درجہ کے جغرافی بندوبست (Geographical arrangement) کی ہے۔ وہ اتنا ہی بامعنی ہیں جتنا کسی انسان کا سوچا سمجھا ہوا سفر بامعنی ہوتا ہے۔ نیز مشاہدات کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ پروازیں انتہائی صحیح طور پر مقرر راستوں (Well-defined flyways) پر انجام پاتی ہیں۔

چڑیوں کا یہ سفر نہایت عجیب ہے۔ انسان کے لیے صحیح طور پر ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ اس نے راستہ اور منزل کی پوری معلومات خارج

سے حاصل کرلی ہوں۔ یہ ، خارجی ذریعہ ، انسان کے لیے دوسروں سے سننا یا دوسروں کی تحقیق کو پڑھنا یا خود بیرونی احوال کا تجربہ کرنا ہے۔ اگر انسان کو تاریخی طور پر جمع شدہ معلومات سے ۔ آپس کے تبادلہ خیال سے ، یا تعلیم گاہوں کی تعلیم سے کاٹ دیا جائے تو انسان کچھ بھی نہ کرسکے۔

مثال کے طور پر الادریسی نے زمین کے گول ہونے کا ابتدائی تصور ہندی نظریہ عرین (Arin) سے لیا۔ پھر الادریسی کی کتاب کا لاتینی ترجمہ پڑھ کر یہ فکر کولمبس تک پہونچا۔ پھر کولمبس کے تجربات سے بعد والوں کے علم میں اضافہ ہوا۔ یہ سلسلہ ایک کے بعد ایک اسی طرح بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ جغرافیہ کا علم ترقی کے اس درجہ تک پہونچا جو آج کے انسان کو حاصل ہے۔ آج جب سمندری جہاز کا ایک کپتان وسیع سمندر میں داخل ہوکر اس ساحل سے اُس ساحل تک اپنا جہاز لے جاتا ہے۔ یا ہوائی جہاز کا پائلٹ ایک براعظم سے اڑکر دوسرے براعظم میں اترتا ہے تو اس عمل کے پیچھے سیکڑوں سال کے انسانی تجربات کا علم شامل ہوتا ہے۔

چڑیاں اس طرح کا کوئی ذریعہ علم نہیں رکھتیں۔ وہ اس قسم کے ذریعہ معلومات سے مکمل طور پر کٹی ہوئی ہیں۔ چڑیوں کے اندر باہم تبادلہ خیال نہیں ہوتا جس طرح انسانوں کے اندر ہوتا ہے۔ اس بنا پر چڑیوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ایک چڑیا دوسری چڑیا کے تجربات سے فائدہ اٹھاکر اپنی معلومات کو بڑھائے۔ کوئی چڑیا اپنی معلومات کو کتاب کی صورت میں قلم بند نہیں کرتی کہ دوسری چڑیا اس کو پڑھ کر اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ اس قسم کی ہر سہولت سے کامل محرومی کے باوجود یہ چڑیاں بالکل انسانوں کی مانند سفر کرتی ہیں۔ وہ اس درجہ صحت کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتی ہیں جیسے کہ ریڈیائی کنٹرول کے ذریعہ کوئی راکٹ خلا میں چلایا جارہا ہو۔

مہاجر چڑیوں کا مطالعہ کرنے والے ایک محقق نے لکھا ہے کہ چڑیوں کی ہجرت کی پروازیں متعین راستوں پر ہوتی ہیں۔ بعض اوقات لمبے فاصلوں پر حد درجہ عمدہ تعین کے ساتھ :

The migration flights of birds follow specific routes, sometimes quite well defined over long distances (12/181).

افریقہ میں چڑیوں کی مہاجرت کا جو اندازہ ہے اس میں انوکھا انضباط پایا جاتا ہے۔ مثلاً بعض چڑیاں

جو ایک مخصوص حلقہ میں گھونسلے بناتی ہیں جو خطِ استوا پر مغرب میں سینیگال اور مشرق میں کینیا تک پھیلا ہوا ہے، وہ خاص وقتوں میں شمال کی طرف ہجرت کر جاتی ہیں تاکہ وہ بارش کے موسم سے بچ سکیں:

The migratory behaviour of birds has a unique regularity in Africa. The standard-wing night jar, which nests in a belt extending from Senegal in the west to Kenya in the east along the equatorial forest, migrates northward to avoid the wet season (12/180).

اگلے صفحہ پر ہم ایک نقشہ دے رہے ہیں۔ یہ نقشہ چڑیوں کے بین براعظمی سفر کو بتا رہا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ روس اور دوسرے یورپی علاقوں کی چڑیاں کس طرح سرد موسم میں اپنے علاقے سے نکل کر افریقہ اور ایشیا کے گرم علاقوں کی طرف جاتی ہیں۔ اس لمبے سفر میں انھیں تین سمندروں سے واسطہ پیش آتا ہے ــــــ انھیں کیسپین سمندر (Caspian Sea) اور بحر اسود (Black Sea) اور بحر متوسط (Mediterranean Sea) کو پار کرنا پڑتا ہے۔ یہ چڑیاں ایسا نہیں کرتیں کہ بے خبری کے عالم میں بس اپنے مقام سے اڑ کر کسی طرف بھی روانہ ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے وہ نہایت صحت کے ساتھ اس رخ کا تعین کرتی ہیں جو ان کے لیے موزوں ترین ہے۔ وہ نہایت صحت کے ساتھ عین وہ راستے اختیار کرتی ہیں جدھر سے جانے میں انھیں کم سے کم سمندر کے اوپر سے گزرنا پڑے۔ کیوں کہ خشکی پر بوقت ضرورت وہ نیچے اتر سکتی ہیں مگر سمندر میں اترنا ان کے لیے ممکن نہیں۔

اس نقشہ کو دائیں سے بائیں کی طرف دیکھیے۔ اس میں چڑیوں کا پہلا جھنڈ وہ ہے جو یورپ سے آتے ہوئے وہاں پہونچتا ہے جہاں ان کی راہ میں بحر کیسپین حائل ہے۔ یہاں وہ مڑ جاتی ہیں وہ بحر کیسپین کو کنارے چھوڑتے ہوئے ایک طرف قراقرم کی جانب سے اور دوسری طرف کاکیشیا کی جانب سے پرواز کر کے ایشیا میں داخل ہوتی ہیں اور اپنے مطلوبہ مقامات پر اتر جاتی ہیں۔

یہ چڑیاں ٹھیک یہی معاملہ بحر اسود کے ساتھ بھی کرتی ہیں۔ چنانچہ ان کا جھنڈ یہاں پہونچ کر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ ان کا ایک حصہ بحر اسود کے مغربی ساحل سے اور دوسرا حصہ مشرقی ساحل سے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایشیائی علاقہ میں داخل ہو جاتا ہے۔
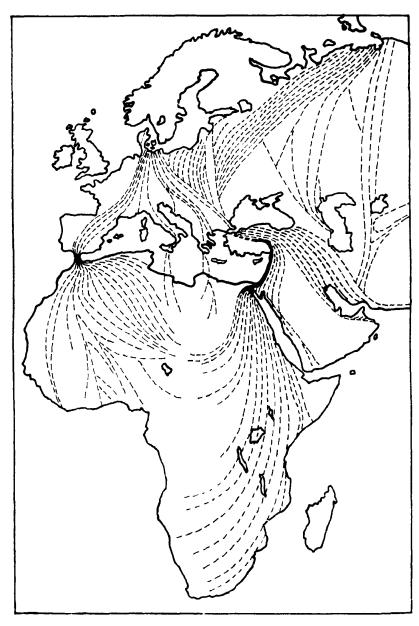
Principal routes taken by the European white stork (*Ciconia ciconia*) between nesting grounds in Europe and wintering grounds in Africa.

ایک ماہر طیور نے لکھا ہے کہ یہ بخوبی طور پر الگ الگ راستے غالباً چڑیوں نے اس لیے اختیار کیے ہیں کہ وہ سمندر کے اوپر لمبی پرواز سے بچ سکیں :

These well-separated routes are probably a result of the stork's aversion to long flights over water (12/180).

اس کے بعد چڑیوں کے تیسرے جھنڈ کا منظر ہے۔ یہ چڑیاں بلغاریہ تک آکر ترکی کی طرف مڑجاتی ہیں۔ پھر شام، لبنان اور فلسطین کے سواحل کا تتبع کرتے ہوئے وہ سوئز تک پہونچتی ہیں۔ یہاں سے وہ مصر کی سرزمین میں داخل ہوتی ہیں اور پھر آگے افریقی علاقوں میں چلی جاتی ہیں۔

چڑیوں کا چوتھا جھنڈ یونان کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جس کی خشکی لمبی نوک کی مانند بہت دور تک سمندر کے اندر چلی گئی ہے۔ یہ چڑیاں یونان اور کریٹ کی خشکی کا سہارا لیتے ہوئے سمندر میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ سمندر کا وہ مقام ہے جو سب سے کم چوڑا ہے۔ وہ اپنے طویل سفر میں سمندر کو عین اس نقطہ پر عبور کرتی ہیں جہاں جغرافی طور پر اس کی چوڑائی سب سے کم ہوجاتی ہے۔ چڑیاں اس راستہ کو واضح طور پر اس لیے اختیار کرتی ہیں کہ انھیں کم سے کم سمندر کے اوپر پرواز کرنا پڑے۔ یعنی عین وہی وجہ جس کی بنا پر قدیم زمانہ میں انسانی قافلے بیچ سمندر میں اپنی کشتی ڈالنے کے بجائے "آبنائے" کے مقام پر سمندروں کو عبور کیا کرتے تھے۔

چڑیوں کا پانچواں جھنڈ وہ ہے جو آگے بڑھ کر اٹلی کے راستے پر مڑجاتا ہے۔ وہ اٹلی کے اوپر پرواز کرتے ہوئے سسلی میں داخل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے دائیں اور بائیں سمندر کو چھوڑتا ہوا لمبا راستہ خشکی کے اوپر اوپر طے کرتا ہے اور پھر سسلی کے ساحل سے سمندر میں داخل ہوکر افریقہ میں پہونچ جاتا ہے۔ دوبارہ عین اسی مقام پر جہاں سمندر کی چوڑائی سب سے کم تھی

چڑیوں کا چھٹا جھنڈ اس نقشہ میں فرانس کی طرف جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور پھر وہ اسپین کی طرف مڑکر خشکی کے اوپر اڑتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ جبرالٹر کے پاس پہونچ جاتا ہے۔ جہاں وسیع سمندر صرف دس میل چوڑا رہ جاتا ہے۔ یہ چڑیاں سمندر کو عبور کرنے کے لیے اس

موزوں ترین مقام کا انتخاب کرتی ہیں۔ وہ یہاں پہونچ کر سمندر میں داخل ہوتی ہیں اور آبنائے جبرالٹر کو پار کرکے افریقہ کی زمین پر اتر جاتی ہیں۔

چڑیوں کے یہ اسفار انتہائی حد تک حیرت انگیز ہیں۔ آج کا ایک انسان جب اس قسم کا طویل سفر کرتا ہے تو وہ بہت سے علوم سے مدد لیتا ہے۔ مگر چڑیوں کے اندر نہ انسانی ذہن ہے اور نہ علوم سے مدد لینے کا انتظام۔ پھر چڑیاں کیوں کر اس قسم کے پیچیدہ اسفار میں کامیاب ہوتی ہیں، ایک ماہر طیور نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے:

> Birds have evolved a highly efficient means for travelling swiftly over long distances with great economy of energy (12/179).

چڑیوں نے نہایت اعلیٰ درجہ کے ارتقا یافتہ موثر ذریعے دریافت کر لیے ہیں تاکہ وہ لمبے فاصلوں پر کم سے کم طاقت خرچ کرکے بخوبی سفر کر سکیں۔ مگر یہ محض الفاظ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چڑیوں کے اندر یا ان کے حالات میں ہرگز ایسے شواہد موجود نہیں ہیں جو یہ ثابت کریں کہ چڑیوں نے کسی ارتقائی عمل کے ذریعہ یہ صلاحیت اپنے اندر پیدا کی ہے۔

گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو اس معاملہ کی توجیہہ کے لیے دو ہی ممکن مفروضے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان چڑیوں کو یورپ اور ایشیا اور افریقہ کے جغرافیہ کا اور اس کی خشکی اور تری کا مکمل علم حاصل ہو۔ مگر کوئی بھی تحقیق ایسا ثابت نہیں کرتی۔ ہماری تمام معلومات کے مطابق چڑیاں بذاتِ خود کسی بھی قسم کے جغرافی علم سے قطعاً نابلد ہیں۔ اس مفروضہ کو ثابت کرنے کے لیے جو کچھ کہا جاتا ہے وہ محض بے بنیاد قیاس ہے جس کے حق میں کوئی علمی شہادت موجود نہیں۔

اس کے بعد دوسرا ممکن مفروضہ صرف یہ ہے کہ کوئی "واقفِ جغرافیہ" ان کی رہنمائی کر رہا ہو۔ یہاں کوئی مخفی قسم کا ریموٹ کنٹرول ہو جو چڑیوں کو ٹھیک اسی طرح مسلسل رہنمائی دے رہا ہو جیسے ہمارے غیر انسان بردار راکٹ کو ریڈیائی کنٹرول کے ذریعہ دور سے رہنمائی دی جاتی ہے۔ یہی دوسری صورت زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ اس عقیدہ کو پوری طرح قابلِ فہم بنا دیتا ہے جس کو آسمانی مذہب میں وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جانوروں کی زندگی میں ایسے واقعات ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہوتی کہ یہ مانا

جائے کہ ان کو ایک خارجی خزانۂ علم سے رہنمائی مل رہی ہے۔ اسی کا نام مذہبی زبان میں وحی ہے۔ جانوروں کی زندگی کا مطالعہ وحی کے معاملہ کو قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔ اور قرآن کے ذریعہ کسی چیز کا قابلِ فہم ہونا ہی کافی ہے کہ اس کی واقعیت وصداقت پر یقین کیا جائے۔

وحی کے عقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا اپنے مخفی ذریعہ سے ایک انسان پر اپنی رہنمائی بھیجتا ہے۔ یہ رہنمائی بتاتی ہے کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ خدا اور بندہ (پیغمبر) کے درمیان وحی کا یہ اتصال بظاہر دکھائی نہیں دیتا، اس لیے کچھ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہم کیوں کر اسے مانیں۔

مگر دوسری مخلوقات، مثلاً مہاجر چڑیوں کے سفر کے معاملہ پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں "وحی" کی نوعیت کی رہنمائی موجود ہے۔ ان چڑیوں کا حددرجہ صحت کے ساتھ سفر کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جو وحی کے معاملہ کو ہمارے لیے قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔ کیوں کہ چڑیوں کے ان اسفار کی کوئی بھی حقیقی توجیہہ اس کے سوا نہیں کی جاسکتی کہ یہ مانا جائے کہ ان کو خارج سے کوئی مخفی قسم کی رہنمائی مل رہی ہے۔ جب چڑیوں کے اپنے اندر اس کے معلوم اسباب موجود نہیں ہیں تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کو خارج سے آنے والی چیز قرار دیا جائے۔

پیغمبر کا یہ دعویٰ کہ اس کو خدا کی طرف سے مخفی رہنمائی آتی ہے، بلاشبہ عجیب ہے۔ مگر اس قسم کی مخفی رہنمائی موجودہ کائنات میں عجیب نہیں۔ یہاں دوسرے ایسے واقعات کثرت سے موجود ہیں جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس قسم کی رہنمائی کائنات میں بطور واقعہ موجود ہے۔ مہاجر چڑیوں کا معاملہ ان بے شمار مثالوں میں سے صرف ایک مثال ہے جس کو نہایت مختصر طور پر یہاں بیان کیا گیا ہے۔

نادانی کا کلمہ

اخبارات میں ایک کیس شائع ہوا ہے۔ یہ نادرہ بیگم قریشی کا کیس ہے۔ وہ بلاسپور (مہاراشٹر) کی رہنے والی ہے۔ اس کے شوہر نے ایک لڑکی کی پیدائش کے بعد اس کو طلاق دے دیا۔ اب وہ عدالت کے ذریعہ اپنے سابقہ شوہر سے گذارہ وصول کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا یکم مئی ۱۹۸۶ کی رپورٹ کے مطابق جب نادرہ بیگم قریشی سے پوچھا گیا کہ وہ کیوں اندور کی شاہ بانو کے راستہ پر چل رہی ہے اور فوجداری قانون کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت اپنے لیے گذارہ وصول کرنا چاہتی ہے (جب کہ یہ اسلام کے خلاف ہے) تو اس نے تیزی سے جواب دیا کہ اسلام نے میرے لیے کیا کیا ہے کہ میں اس کے اصولوں کی پابندی کروں۔ نہ جج اور نہ وکیل اس میں کامیاب ہو سکے کہ وہ مسز قریشی کو اپنا مقدمہ واپس لینے پر راضی کر سکیں۔ اس نے مسٹر قریشی کی اس پیش کش کو بھی رد کر دیا کہ وہ اس کو اور اس کی لڑکی کو دوبارہ واپس لینے پر تیار ہیں۔ اس نے پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے عدالت سے درخواست کی کہ وہ اس کو پانچ سو روپیہ ماہوار گذارہ دلائے۔ مسز شاہ بانو کے برعکس وہ ابھی جوان (۳۰ سال) ہے اور اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی ہے :

"What has Islam done for me that I should follow its tenets? shoots back Mrs Nadira Begum Qureshi when asked why she is following in the footsteps of Mrs Shah Bano of Indore and seeking maintenance allowance under Section 125, Cr. P.C. Neither the judge nor lawyers could persuade Mrs Qureshi to withdraw her case. She rejected Mr Qureshi's offer to take her and her daughter back. The offer rejected, she called upon the court to get her Rs 500 a month as allowance. Unlike Mrs Shah Bano, she is young (30) and educated (Graduate)

یہ ایک نادان عورت کا کلمہ ہے نہ کہ واقف کار عورت کا کلمہ۔ مذکورہ خاتون اگر تاریخ سے واقف ہوتی تو وہ جانتی کہ عورت کو جو کچھ ملا ہے اسلام ہی کے ذریعہ ملا ہے۔ حتی کہ ایک عورت کا کھڑے ہو کر یہ کہنا کہ "اسلام نے میرے لیے کیا کیا" یہ بھی اسلام ہی کا عطیہ ہے۔ اسلام سے پہلے عورت کو یہ درجہ ہی حاصل نہ تھا کہ وہ برسر عام اس طرح آزادی کا کلمہ کہہ سکے۔

سنت کے خلاف

جنوری ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔ شہر کی ایک بس ایک بڑی مسلم تعلیم گاہ کے سامنے سے گذری۔ اتفاق سے ایک مسلمان طالب علم بس کی زد میں آگیا اور اس کے نیچے دب کر ہلاک ہوگیا۔ حادثہ کی خبر سن کر تعلیم گاہ کے مسلم طلبہ وہاں آئے تو ڈرائیور بھاگ چکا تھا۔ البتہ بس سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ طلبہ نے بس کو آگ لگادی۔ مزید انھوں نے یہ کیا کہ جو بس ادھر سے گذرتی اس کو روکتے اور آگ لگاتے۔ آگ بجھانے کے لیے فائر بریگیڈ کے لوگ آئے تو ان کو پتھر مار کر بھگا دیا۔ پولیس آئی تو انھوں نے پولیس پر بھی پتھر مارنے شروع کیے۔

اب پولیس کی باری تھی۔ پولیس غصہ میں بے قابو ہو کر طالب علموں کے اوپر ٹوٹ پڑی۔ اس کے پاس ہتھیار تھے۔ اس نے نہ صرف یہ کیا کہ سڑک پر کھڑے ہوئے طالب علموں کو مارا بلکہ وہ ہاسٹل میں اور تعلیم گاہ کے کمروں میں گھس گئی۔ اس نے سیکڑوں طالب علموں کو مار مار کر بری طرح زخمی کر دیا۔ وغیرہ۔

اس طرح کے واقعات ہندستان میں پچھلے ۴۰ سال سے مسلسل پیش آرہے ہیں۔ ان کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں مگر کہانی سب کی ایک ہے۔ ایسا ہر واقعہ ہمیشہ مسلمانوں کی کسی اشتعال انگیز کارروائی سے شروع ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ مسلمانوں کے شدید جانی و مالی نقصان پر ختم ہوتا ہے۔ چھوٹے بڑے تمام واقعات کو شمار کیا جائے تو چالیس سال میں ان کی تعداد ۴۰ ہزار تک پہونچ چکی ہوگی۔ جب بھی ایسا واقعہ ہوتا ہے تو مسلمانوں کے تمام اصاغر اور اکابر بلا استثنار یہ کرتے ہیں کہ وہ یک طرفہ طور پر پولیس اور انتظامیہ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ کوئی ایک بھی قابل ذکر شخص ایسا نہیں جو اس طرح کے معاملات میں مسلمانوں کو سمجھائے اور انھیں تنبیہ کرے۔

ہمارے یہ تمام لیڈر بلا شبہہ سنت کے خلاف عمل کر رہے ہیں۔ اور حدیث کے مطابق، ہر بات جو سنت کے خلاف ہو وہ بدعت ہے۔ اور ہر بدعت کا آخری انجام تباہی ہے۔ پچھلی نصف صدی سے مسلمان جو کچھ بھگت رہے ہیں وہ سنت سے اسی انحراف کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کا مذکورہ عمل سنّت سے انحراف کیوں ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک حدیث کا مطالعہ کیجئے:

قال الامام احمد حدثنا عمرو بن عاصم عن ... حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

حماد بن سلمة عن علی بن زید عن الحسن عن جندب عن حذیفة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : لاینبغی لمسلم ان یذل نفسہ۔ قیل وکیف یذل نفسہ۔ قال : یتعرض من البلاء لما لا یطیق۔ وکذا رواہ الترمذی وابن ماجہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کیسے کوئی شخص خود اپنے کو ذلیل کرے گا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ایسی بلا کا سامنا کرے جس سے نپٹنے کی اسے طاقت نہ ہو۔

اس حدیث کی روشنی میں دیکھئے تو مذکورہ قسم کے واقعات میں پولیس یا اکثریتی فرقہ کی شکایت کرنا سراسر غیر مسنون فعل ہے۔ ایسا ہر واقعہ خود اپنی غیر اسلامیت کی داستان ہے نہ کہ اغیار کے ظلم کی داستان۔ کیوں کہ اس ملک میں مسلمان جب اقلیت میں ہیں اور جب یہ معلوم ہے کہ مسلمانوں کی متشددانہ کارروائی کے بعد پولیس آئے گی۔ اور موجودہ حالت میں یہ بھی معلوم ہے کہ پولیس جب آئے گی تو وہ یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی مارپیٹ کرے گی اور مسلمان اس کو ہرگز روک نہ سکیں گے۔ ایسی صورت میں مذکورہ قول رسولؐ کے مطابق، مسنون طریقہ یہ ہے کہ مسلمان ابتدائی اشتعال کا واقعہ نہ کریں۔ وہ ایسے آغاز سے اپنے آپ کو بچائیں جس کے متعلق معلوم ہے کہ اس کا انجام لازمی طور پر ان کے خلاف نکلے گا۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مومن ایک بل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ (المومن لایلدغ من جحر مرتین) مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ایک ہی بل میں وہ روزانہ ہاتھ ڈالتے ہیں اور ہر روز اس سے ڈسے جاتے ہیں۔ کسی نادان شخص نے بھڑ کے چھتہ میں صرف ایک بار ہاتھ ڈالا ہوگا۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ روزانہ بھڑ کے چھتہ میں ہاتھ ڈال رہے ہیں اور روزانہ اس کا انجام بھگت رہے ہیں۔ کیا اس کے باوجود ان کا یہ دعویٰ درست ہو سکتا ہے کہ اسلام کو وہ اپنا دین سمجھتے ہیں۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول مانتے ہیں۔ دین اور رسول کا مفہوم اگر وہی ہو جو لغت کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے تو ان کا دعویٰ درست نہیں۔ اور اگر مسلمانوں کا اپنا کوئی علیحدہ لغت ہو جس میں انھوں نے بطور خود ان الفاظ کا کوئی دوسرا مفہوم لکھ رکھا ہو تو البتہ ان کا دعویٰ درست ہو سکتا ہے۔ مگر مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ایسے کسی لغت کی قیمت ان کے اپنے نزدیک خواہ کتنی ہی زیادہ ہو، خدا اور خلق کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں۔

ایک سفر
پہلی قسط

مذہبی آزادی کی عالمی کونسل (The World Council on Religious Liberty) کا صدر دفتر نیویارک (امریکہ) میں ہے۔ اس کے زیر اہتمام ۱۳-۱۵ اکتوبر ۱۹۸۶ کو جنیوا (سوئزر لینڈ) میں ایک بین اقوامی کانفرنس ہونے والی تھی۔ اس کا ابتدائی دعوت نامہ (مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۸۶) مجھے پہلے ملا تھا۔ مگر اس وقت جنیوا کا سفر کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے میں اس دعوت نامہ کو قبول نہ کر سکا اور معذرت نامہ لکھ کر بھیج دیا۔

میں اپنی مشغولیتوں میں اس کانفرنس کو بھول چکا تھا کہ نومبر کے تیسرے ہفتہ میں رات کے وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ مذکورہ ادارہ کے ذمہ دار نیویارک سے بول رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بعض اسباب سے کانفرنس کی تاریخیں ملتوی ہو گئی تھیں۔ اب یہ کانفرنس ۷-۹ دسمبر ۱۹۸۶ کو جنیوا میں ہو رہی ہے۔ کیا آپ اس میں شرکت کر سکتے ہیں۔ ان کو بتایا گیا کہ اس کا جواب ہم آپ کو چند دن کے بعد دے سکیں گے۔ چنانچہ ۱۷ نومبر کو دوبارہ ان کا ٹیلی فون آیا تو میں نے شرکت کے لیے رضامندی دے دی۔ اس کے بعد نیویارک سے بار بار ان کے ٹیلی فون آتے رہے۔ چوں کہ وقت کم تھا، وہ کانفرنس کی تمام تفصیلات ٹیلی فون پر بتاتے رہے۔

ان کا ٹیلی فون اکثر نصف شب کو آتا تھا۔ وہ خود اگرچہ دن کے "۱۲ بجے" ٹیلی فون کرتے تھے۔ مگر وہ ہم کو رات کے "۱۲ بجے" وصول ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں سے یہاں تک ٹیلی فون کے پہونچنے میں ۱۲ گھنٹہ لگتا تھا۔ ٹیلی فون تو دنیا کے کسی بھی حصہ میں ایک سکنڈ سے بھی کم مدت میں پہونچ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس وقت امریکہ میں نصف دن (دوپہر) کا وقت ہوتا ہے، اس وقت ہندستان میں نصف شب کا وقت ہوتا ہے۔ وہ اپنے لحاظ سے دن کے "۱۲ بجے" ٹیلی فون کرتے تھے۔ مگر دہلی میں ہم کو ان کا ٹیلی فون رات کے "۱۲ بجے" ملتا تھا۔ ایک ملک اور دوسرے ملک میں وقت کا یہ فرق دراصل زمین کی محوری گردش کے سبب سے پیدا ہوتا ہے۔

دعوت نامہ کی اطلاع تو ٹیلی فون پر مل گئی۔ مگر اب دوسرا مسئلہ سوئزرلینڈ ایمبیسی سے ویزا حاصل کرنے کا تھا۔ مگر ان کا اصول یہ ہے کہ وہ ویزا صرف اس وقت دیتے ہیں جب کہ آدمی کے پاس تحریری دعوت نامہ اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ موجود ہو۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ دعوت نامہ اور ٹکٹ معمول کی ڈاک سے روانہ کیا جائے۔ موجودہ تیز رفتار دنیا میں اس کا حل بھی تلاش کر لیا گیا ہے۔

چنانچہ انھوں نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ پی ٹی اے (Prepaid Ticket Advice) کے ذریعہ بھیجا جو کمپیوٹر پر اگلے دن آگیا۔ اور فوری خطوط کے لیے موجودہ زمانہ میں ایک نظام قائم کیا گیا ہے جس کو کورئیر سروس (Courier Service) کہا جاتا ہے۔ اس میں خطوط یا ٹکٹ محکمہ ڈاک کے حوالے کرنے کے بجائے براہِ راست ہوائی جہاز کے ذریعہ بھیجے جاتے ہیں اور منزل پر اس کی ایجنسیاں پیکٹ کو وصول کر کے مکتوب الیہ کے دفتر میں دستی طور پر پہونچا دیتی ہیں۔ اس طرح نیویارک سے چلا ہوا خط ہم کو تین دن کے اندر ۲۵ نومبر کو دہلی میں وصول ہو گیا۔

دعوت نامہ کے ساتھ مجھ کو "جنرل انفارمیشن" کے جو کاغذات ملے تھے اس میں درج تھا:

Participants holding U.S. passports do not need a visa.

یعنی کانفرنس کے جو شرکار امریکہ کا پاسپورٹ رکھتے ہوں ان کے لیے ویزا کی ضرورت نہیں۔ "ہندستان" جیسے ملک کے لوگ جب باہر نکلتے ہیں تو ان کو ایک عجیب قسم کے بین اقوامی امتیاز کا تجربہ ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں دنیا کی قومیں دو قسم کے طبقات میں بٹ گئی ہیں۔ ایک دینے والی، اور دوسری لینے والی۔ دینے والی قوم کے افراد جب کسی غیر ملک میں جاتے ہیں تو ان کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس لینے والی قوم کا فرد جب کسی غیر ملک میں جاتا ہے تو اس کو توحش کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اول الذکر کے لیے نسبتاً نرم قوانین ہیں اور ثانی الذکر کے لیے نسبتاً سخت قوانین۔ یہ ایک عجیب المیہ ہے کہ ہندستان، اپنے بے شمار وسائل کے باوجود، ابھی تک دوسری قسم کے ممالک کی فہرست میں شامل ہے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ جنیوا سے واپسی کے وقت ۱۰ دسمبر کو پیش آیا۔ روانگی کے وقت میں نے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل (جنیوا) کے ریپشن پر پوچھا کہ کیا یہاں سے جانے والے مسافروں پر کوئی ایرپورٹ ٹیکس ہے۔ ریپشن کے آدمی نے مسکرا کر جواب دیا:

No Airport tax here, that's only in India.

اگرچہ ایسا نہیں کہ ایرپورٹ ٹیکس صرف ہندستان میں ہو، مگر ریپشنسٹ نے جس معنی میں یہ بات کہی وہ صرف اس برصغیر کی خصوصیت ہے جس کا مجموعی نام ہندستان رہا ہے۔

دعوت نامہ کے ساتھ "جنرل انفارمیشن" کے جو کاغذات آئے تھے۔ ان میں دوسری باتوں کے ساتھ ایک ہدایت ان الفاظ میں درج تھی:

Please remember to bring a warm coat as you
know Geneva in December can be rather cold.

یعنی براہ کرم ایک گرم کوٹ لانا یاد رکھیے، کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ جنیوا دسمبر میں کافی ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ اس بات کی آگاہی تھی کہ آپ "گرم ملک" سے نکل کر "سرد ملک" میں جا رہے ہیں۔ اس ہدایت کو میں نے پڑھا تو مجھے یاد آیا کہ اسی قسم کی اس سے سخت تر آگاہی وہ ہے جو ہر روز موت کے ذریعہ دی جا رہی ہے۔ موت ہر انسان کو خاموش زبان میں بتاتی ہے کہ تم بہت جلد "اپنی دنیا" سے نکل کر "خدا کی دنیا" میں داخل ہونے والے ہو۔ پہلے انتباہ پر ہر آدمی چوکنا ہو جاتا ہے، مگر دوسرے انتباہ پر کوئی چوکنا ہونے والا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں آدمی گرم ملک اور سرد ملک دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ جب کہ دوسری صورت کا معاملہ یہ ہے کہ اپنی دنیا تو ہر آدمی کو براہ راست دکھائی دے رہی ہے، اور خدا کی دنیا کسی کو براہِ راست دکھائی نہیں دیتی۔

ایک مسلمان سے اس سفر کا ذکر ہوا۔ انھوں نے کہا کہ "آپ جنوا جا رہے ہیں۔ جنوا میں تو مسلمانوں نے ایک زمانہ میں حکومت کی ہے" میں نے کہا کہ ایسا تو نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے حال میں ایک کتاب میں اس کو پڑھا ہے۔

اس کے بعد وہ ڈاکٹر افضل اقبال (سابق پاکستانی سفیر) کی کتاب لائے

م ہے (Islamization of Pakistan) اس کتاب میں فاطمی حکمرانوں کا ذکر کرتے
صفحہ ۱۰ پر یہ فقرہ تھا :

Sicily for a time acknowledged the Fatimid sovereignty extended over Genoa.

ملی نے ایک وقت میں فاطمیوں کا اقتدار تسلیم کیا جو جنوا تک پھیلا ہوا تھا) میں نے
و دیکھنے کے بعد کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے جنوا (Genoa) کا
ہے۔ یہ جنوبی اٹلی کا ایک شہر ہے۔ جب کہ میرا سفر جنیوا (Geneva) کے لیے ہو رہا ہے
رلینڈ میں واقع ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سسلی اور جنوبی اٹلی پر ایک زمانہ میں مسلمانوں
ت رہی ہے۔ مگر سوئزرلینڈ میں کبھی ان کی باقاعدہ حکومت قائم نہیں ہوئی ـــــــ
تراک سے بعض اوقات بڑی عجیب غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔
دہلی سے سفر کا آغاز برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۲۰ سے ہوا۔ یہ جہاز ہانگ کانگ سے
، اور دہلی ہوتے ہوئے لندن جاتا ہے۔ "ہم ایک لمبی پرواز پر روانہ ہو رہے ہیں۔
کے بعد ہم لندن ایرپورٹ پر اتریں گے" اس اعلان کے ساتھ، دسمبر ۱۹۸۶ کی
۲ بجے ہمارا جہاز فضا میں بلند ہوا۔ اس سفر کا بیشتر حصہ سونے میں گزرا، اس لیے
سکان کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔ نیند بھی اللہ تعالیٰ کی کیسی عجیب نعمت ہے۔ جو
کل ہوتے ہیں، اکثر اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ان کی نیند اڑ جاتی ہے۔ دنیا میں اگر
یھ ہو، صرف نیند اس سے اٹھالی جائے تو تمام انسان اپنا ذہنی توازن کھو دیں
ی دنیا ایک بہت بڑا پاگل خانہ بن کر رہ جائے۔
لندن ایرپورٹ سے اگلی فلائٹ پکڑنے کے لیے ٹرمنل نمبر ا پر جانا تھا۔ میں ایرپورٹ
سے روانہ ہوا تو وہاں میرے ساتھ چار آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ کسی مختلف
ں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگ کون سی زبان بول رہے ہیں۔
نے جو جواب دیا وہ مجھے "جومن" سنائی دیا۔ پہلی بار میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ
یں۔ انھوں نے دہرایا تو میں سمجھا کہ وہ جرمنی کے رہنے والے ہیں اور جرمن زبان بول رہے

رہے ہیں۔

اسی کا نام لہجہ کا فرق ہے۔ ہر گروہ کا لہجہ الگ الگ ہوتا ہے۔ اس لیے الفاظ کی ادائگی میں ایک اور دوسرے کے درمیان فرق ہو جاتا ہے۔ اسی ایک لفظ کو کوئی جرمن کہتا ہے، کوئی جومن، کوئی جمن۔ مگر معنوی اعتبار سے سب کی مراد ایک ہوتی ہے۔ اسی کی روشنی میں اس حدیث کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے جس میں آیا ہے کہ قرآن سات حرفوں میں اترا ہے۔ یہاں "سات" سے مراد تعدد ہے۔ یعنی الفاظ کی ادائگی (لہجہ) کے اعتبار سے قرأت قرآن کے کئی طریقے ہیں۔

یہ حدیث دراصل اسلام کی عالم گیریت کو بتاتی ہے۔ اس ارشاد سے رسول اللہ ؐ کا مطلب یہ تھا کہ اسلام صرف مذہبی پیشواؤں (کلرجی) کا مذہب نہ ہوگا اور نہ وہ کسی ایک قوم میں محدود رہے گا۔ وہ عمومی سطح پر پھیلے گا اور مختلف قبیلے اور قومیں اس کو قبول کریں گی۔ اس لیے بالکل قدرتی بات ہے کہ لہجات کے اختلاف کی وجہ سے اس کی ادائگی کے کئی طریقے ہو جائیں۔

لندن سے جنیوا کا سفر برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۷۲۲ کے ذریعہ ہوا۔ جہاز میں مشہور ہفتہ وار اکانومسٹ (The Economist) کا شمارہ ۶ دسمبر ۱۹۸۶ پڑھا۔ اس میں ایک مضمون ایران۔ عراق کے مسئلہ کے بارہ میں تھا۔ اڈیٹر نے مختلف وجوہ بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ ایران کا مسئلہ مغرب کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ ایران کے مقابلہ میں عراق کی انسانی طاقت صرف ایک تہائی ہے۔ اس لیے یہ بظاہر ناممکن ہے کہ عراق اس جنگ سے فاتح ہو کر نکلے۔ مزید یہ کہ جنگ ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔ وہ کبھی نہ کبھی ختم ہوگی۔ آنے والے وقت کے پیش نظر مغرب کو ضرورت ہے کہ وہ ایران کے بارہ میں اپنی پالیسی پر ٹھنڈے طریقہ سے غور کرے:

That is why the west needs to be thinking coolly about an Iran policy.

زندہ لوگ دشمن کے ساتھ دوستی کرنا بھی جانتے ہیں۔ جب کہ مردہ لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب وہ ایک رخ پر چل پڑیں تو اس سے پھرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

جہاز کے اندر برٹش ایرویز کا ماہانہ میگزین ہائی لائف (Highlife) تھا۔ اس

کے نیچے حسب معمول یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے :

Your personal copy to take away.

یہ دسمبر ۱۹۸۶ کا پرچہ تھا جو آرٹ پیپر کے ڈیڑھ سو صفحات پر نہایت عمدہ چھپا ہوا تھا۔ مگر وہ مفت دیا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دراصل میگزین نہیں بلکہ ایک قسم کا اشتہار نامہ ہے۔ پورا پرچہ اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ تاہم انھوں نے پرچہ پر "ہمارا تحفہ" کا لفظ نہیں لکھا، بلکہ "آپ کی اپنی کاپی" لکھا۔ یہ وہ تجارتی زبان ہے جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوئی ہے۔ جدید تجارتی اصول یہ ہے کہ "میں" کو حذف کرکے "آپ" کا استعمال کیا جائے ہر آدمی کو طبعاً اپنی ذات سے دل چسپی ہوتی ہے، دوسرے سے کسی کو دلچسپی نہیں ہوتی۔ تجارت کی کامیابی اسی نفسیات کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہے۔ ایک تاجر نے کہا کہ تجارت میں سب سے کم اہم لفظ "میں" ہے اور سب سے زیادہ اہم لفظ "آپ"۔

دنیا کا نقشہ اپنے سامنے رکھیے تو دہلی سے یورپ کی طرف جاتے ہوئے جنیوا پہلے نظر آئے گا اور لندن اس کے بعد۔ گویا دہلی سے لندن جاکر جنیوا آنے کے لیے ہمیں دوبارہ پیچھے کی طرف سفر کرنا پڑا۔

اس کی وجہ "کنکٹنگ فلائٹ" کا مسئلہ ہے۔ دہلی سے جنیوا کے لیے براہ راست پرواز نہیں ہے۔ اگر آپ قریبی راستہ سے دہلی سے جنیوا کے لیے روانہ ہوں تو راستہ میں جہاں آپ جہاز بدلیں گے وہاں سے فوری طور پر آپ کو دوسرا جہاز نہیں ملے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اگلے جہاز کے انتظار میں آپ کو درمیانی ہوائی اڈہ پر لمبی مدت تک پڑے رہنا ہوگا۔ مگر لندن دنیا کا سب سے بڑا ہوائی مرکز ہے۔ یہاں سے ہر جگہ کے لیے کم سے کم وقت میں جہاز مل جاتے ہیں۔ دہلی سے سیدھے راستہ کے ذریعہ جنیوا جانے میں ہمیں زیادہ وقت لگتا۔ جب کہ لندن کے راستے سے جانے میں نسبتاً کم وقت لگا۔ لینن نے کہا تھا کہ "ہندستان کا وہ راستہ قریب ہے جو لندن ہو کر جاتا ہے" اسی طرح ہمارے لیے جنیوا کا وہ راستہ زیادہ قریب تھا جو لندن ہو کر گیا ــــــ کبھی دور کا راستہ قریب ہوتا ہے، اور قریب کا راستہ دور ہو جاتا ہے۔

لندن میں شہر کے اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ ہوائی جہاز میں اڑتے ہوئے پورے

لندن کا منظر صاف دکھائی دیا۔ لندن میں ۱۶۶۶ میں زبردست آگ لگی تھی۔ اس میں لندن کا دو تہائی حصہ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ ۸۷ گرجا گھر بالکل کھنڈر ہو گیے۔ اس کے بعد بعض ماہرین تعمیر نے یہ نقشہ بنایا کہ لندن کی نئی تعمیر میں اس کی سڑکیں زیادہ چوڑی کر دی جائیں۔ مگر مالکان زمین کو معاوضہ دینے کے لیے اس وقت ضروری رقم حکومت کے پاس موجود نہ تھی۔ اس لیے اس منصوبہ پر صرف جزئی عمل ہو سکا۔ تاہم گرجا گھروں کی نئی تعمیر پر اہل لندن نے زبردست طاقت خرچ کی۔ سینٹ پال کے عظیم گرجا گھر کی تعمیر ثانی میں پورے ۳۵ سال لگ گیے۔ وہ ۱۷۱۱ میں دوبارہ بن کر مکمل ہوا۔ تاہم یہ تین سو سال پہلے کی بات ہے۔ آج کے لندن میں گرجا (چرچ) کے مقابلہ میں دوسری چیزیں زیادہ اہمیت اختیار کر چکی ہیں۔

تازہ اطلاعات کے مطابق برطانیہ میں ۱۷۵۰۰ سکھ آباد ہیں اور پورے ملک میں ان کے تقریباً ۱۵۰ گوردوارے ہیں۔ ہندو مذہب کو ماننے والوں کی تعداد ایک لاکھ ۵۰ ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ برطانیہ میں انھوں نے بھی تقریباً ۱۵۰ مندر بنائے ہیں۔ ہندو مراکز کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مذہبی رسوم کی ادائگی کے علاوہ سماجی اور تہذیبی خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۱۵ لاکھ ہے جس میں زیادہ تعداد پاکستان اور بنگلہ دیش کے باشندوں کی ہے۔ لندن ایرپورٹ کی ایک ملازم خاتون مجھے "مسلمان" صورت دیکھ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ اس نے اپنا نام ماریہ بیگ بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ اصلاً پرتگال ہے۔ اس نے اسلام قبول کر کے مسٹر بیگ سے نکاح کر لیا ہے۔ مسٹر بیگ پاکستانی ہیں۔ اور لندن میں بحیثیت انجینیر کام کرتے ہیں۔ برطانیہ میں تقریباً ایک ہزار مسجدیں ہیں۔ لندن میں بہت بڑا اسلامک سینٹر اور مسجد ہے۔ اس کی شاندار تصویر الدعوۃ (ریاض) ۸ دسمبر ۱۹۸۶ کے ٹائٹل کے آخری صفحہ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

۷ دسمبر کی دوپہر کو ہم جنیوا اتر گیے۔ یہاں ایرپورٹ پر ایک عجیب قصہ پیش آیا۔ توقع کے مطابق وہاں کانفرنس کے منتظمین کو ڈبلو سی آر ایل (WCRL) کا کارڈ لے کر موجود رہنا چاہیے تھا تاکہ میں فوراً انھیں پالوں اور وہ ہوٹل تک میری رہنمائی کر سکیں۔ مگر جب میں ایرپورٹ سے باہر آیا تو وہاں اس قسم کی کوئی علامت مجھے نظر نہ آئی۔ کچھ دیر کے لیے میں عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ ایک صاحب سے ذکر کیا تو انھوں نے ایرپورٹ سے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کو ٹیلی فون کیا۔

ہوٹل والوں نے بتایا کہ یہاں سے کئی آدمی ریسیو کرنے کے لیے جا چکے ہیں۔ آپ دوبارہ انھیں ایرپورٹ پر تلاش کریں۔ اس کے بعد مزید چل کر دیکھا تو وہ وہاں کارڈ لیے ہوئے میرے انتظار میں کھڑے تھے۔

قصہ یہ تھا کہ وہ لوگ دوسرے گیٹ پر تھے اور میں ایک اور گیٹ سے باہر آیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک مقام پر اپنے مطلوب کو نہ پاکر مایوس ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ تلاش کرے تو وہ پائے گا کہ اس کا مطلوب دوسرے مقام پر خود اس کے انتظار میں کھڑا ہوا ہے۔

جنیوا میں میرا قیام انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں تھا۔ میرے کمرہ کا نمبر ۵۲۱ تھا۔ ہوٹل میں جو پبلسٹی لٹریچر رکھا ہوا تھا، اس میں کافی لٹریچر عربی میں بھی نظر آیا " سویسرا " نام کی ایک مکمل گائڈ بک عربی زبان میں موجود تھی۔ اس کے علاوہ مختلف کاغذات پر عربی زبان میں اندراجات نظر آئے۔ مثلاً ایک دو ورقہ میں ہوٹل کا تعارف کرایا گیا تھا۔ اس میں لکھا ہوا تھا: اکثر من ۸۰ فندق فخم حول العالم (ساری دنیا میں ہمارے ۸۰ سے زیادہ بڑے ہوٹل ہیں) کمرہ کے باتھ روم میں پلاسٹک کی ایک تھیلی میں نہانے کی ٹوپی (Shower cap) رکھی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر مختلف زبانوں میں اندراجات تھے، اسی کے ساتھ اس پر عربی میں غطاء للرأس بھی لکھا ہوا تھا۔ کمرہ میں لمبے شیشے کی کھڑکی پر عربی میں لکھا ہوا تھا:

یرجی قفل النافذة عند تشغیل تکییف الهواء مع الشکر

براہ کرم ایرکنڈیشنر چلانے کے وقت کھڑکی کو بند رکھیں۔ جنیوا میں عرب لوگ کافی آتے ہیں۔ یہ عربیت اسی کی بنا پر ہے۔

ہوٹل کے کمرہ میں ایک بہت عمدہ چھپا ہوا جرنل تھا۔ جس میں تصویروں کے ذریعہ دکھایا گیا تھا کہ اس ہوٹل کو کس قسم کے لوگوں کی میزبانی کا موقع ملتا رہتا ہے۔ ان شخصیتوں میں وزیر اعظم ہندستان راجیو گاندھی، صدر انڈونیشیا جنرل سوہارتو، سلطان بن عبد العزیز (سعودی عرب) اور دوسری بہت سی ممتاز شخصیتوں کے نام شامل تھے۔

یہ ہوٹل مختلف طریقوں سے اپنے اعلیٰ میزبانوں کو متاثر کرتا ہے۔ مثلاً اس کے ایک باتصویر نوٹ میں بتایا گیا تھا کہ جرمنی کا ایک ممتاز شخص (Udo Lattek) اپنی پارٹی کے ساتھ

اس ہوٹل میں ٹھہرا۔ اتفاق سے انھیں تاریخوں میں اس آدمی کی برتھ ڈے تھی۔ ہوٹل والوں نے عین اس تاریخ کو اچانک برتھ ڈے کا کیک اس کو پیش کر کے اسے حیرت میں ڈال دیا :

The Management surprised him with a birthday cake.

تاجر اپنی تجارت میں اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ وہ یک طرفہ اخلاقیات کے ذریعہ اپنے گاہک کے دل کو جیت لے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دعوت حق کا بھی ہے۔ حق کے داعی کو بھی یک طرفہ عمل کے ذریعہ مدعو کے دل کو جیتنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر کسی کے اندر وہ گہرا تاثر پیدا نہیں ہو سکتا جو ایک آدمی کو اپنے راستہ کی تبدیلی پر مجبور کر دے۔

" سوئزرلینڈ " کے نام سے غالباً سب سے پہلے میں اس وقت واقف ہوا جب کہ ابھی میری کم عمری کا زمانہ تھا اور میرے گھر والوں نے مجھے ایک آٹومیٹک گھڑی پہننے کے لیے دی۔ اس پر سوئس گھڑی (Swiss Watch) لکھا ہوا تھا۔ اس سے میرے ذہن پر یہ تصور قائم ہوا کہ سوئزرلینڈ گھڑیوں کا ایک ملک ہے۔ مگر بعد کی معلومات نے صرف جزئی طور پر اس کی تصدیق کی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سوئزرلینڈ اسی درجہ میں گھڑیوں کا ملک ہے جس درجہ میں عرب اونٹوں یا کھجوروں کا ملک۔

میری یہ گھڑی کنجی دیئے بغیر اپنے آپ چلتی تھی۔ اپنی کم عمری کی بنا پر اس وقت میں نے یہ سمجھا کہ وہ شاید نبض کی حرکت سے چلتی ہے۔ یہ غلط فہمی اس وقت رفع ہوئی جب کہ کچھ عرصہ بعد گھڑی بند ہو گئی۔ اس وقت میں نے اس کو ایک گھڑی ساز کو صفائی کیلئے دیا۔ اس نے کھول کر دکھایا کہ گھڑی کے اندر ایک خاص طرح کا پہیہ نما پرزہ ہے جو ایک تہائی کے بقدر کٹا ہوا ہے۔ یہ پہیہ ہاتھ کی حرکت سے برابر گھومتا رہتا ہے اور گھڑی کو کوک دیتا رہتا ہے۔ اس پرزہ کو روٹر (Rotor) کہا جاتا ہے۔ یہ آٹومیٹک گھڑی کی قدیم تکنیک تھی۔ اب نئے قسم کی آٹومیٹک گھڑیاں بازار میں ملنے لگی ہیں۔ کم عمری کے اس واقعہ نے مجھے ہمیشہ کے لیے یہ سبق دیدیا کہ کسی چیز کے بارہ میں محض قیاس سے کوئی رائے قائم نہیں کرنا چاہیے۔ صحیح رائے وہ ہے جو مکمل معلومات کی بنیاد پر قائم کی جائے۔

سوئزرلینڈ کے ایک شہر لی لاکل (Le Locle) کے چوراہے پر ایک نوجوان کا اسٹیچو لگا ہوا ہے۔ یہ ڈینیل جین ریچرڈ (Daniel Jean-Richard) کا اسٹیچو ہے۔ وہ ۱۶۶۵ میں پیدا ہوا، ۱۷۴۱ میں اس کی وفات ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار گھوڑے کا ایک انگریز تاجر ادھر سے گزرا

اس نے مذکورہ نوجوان کے والد کو اپنی ٹوٹی ہوئی گھڑی مرمت کے لیے دی۔ نوجوان نے منت سماجت کرکے یہ گھڑی اس سے مانگ لی۔ اس چھوٹی سی مشین سے اس کو اتنی دل چسپی ہوئی کہ وہ ایسی ہی ایک نئی مشین بنانے میں لگ گیا۔ ۱۸ مہینے کی لگاتار محنت کے بعد اس نے ویسی ہی ایک نئی گھڑی بنالی۔ اس طرح ۱۷۰۵ میں باقاعدہ طور پر سوئزرلینڈ میں گھڑی کی صنعت قائم ہوئی۔ یعنی عین اس وقت جب کہ ہندستان میں اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت (۱۷۰۷-۱۶۵۸) کا آخری زمانہ تھا۔ مذکورہ نوجوان اگرچہ "ترقی یافتہ سوئزرلینڈ" کو دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہا، مگر ایک شخص کی قربانی اور ہوش مندی نے پوری قوم کو ایک نئے دور میں داخل کر دیا۔

اب اسی معاملہ میں اس کے برعکس مثال لیجئے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب تلاش ہند (Discovery of India) میں لکھا ہے کہ ہندستان کے مغل امراء بکثرت گھڑیاں استعمال کرتے تھے۔ پرتگالی، اور بعد میں انگریز ہندستان میں یہ گھڑیاں لاتے تھے۔ گھڑیوں کا استعمال مغل امراء کے تکلفات میں شامل تھا۔ تاہم اس وقت کے ہندستان میں نہ کسی نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ کمانی کی گھڑیاں (Spring clocks) جو یورپی تاجر ہندستان میں لاکر فروخت کرتے ہیں، وہ کیسے بنتی ہیں نہ ایسی گھڑیاں کبھی یہاں بنائی گئیں۔ مغل دور کے ہندستان میں میکانکی رجحان (Mechanical bent) کی یہ کمی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ (صفحہ ۲۷۵)

سوئزرلینڈ ارباب سرمایہ کی پناہ گاہ ہے۔ سوئزرلینڈ کے بینکوں میں کھاتہ کھولنے کے لیے وہ پابندیاں نہیں ہیں جو دوسرے ملکوں میں ہوتی ہیں۔ یہاں ہر آدمی کھاتہ کھول سکتا ہے، خواہ وہ سوئزرلینڈ کا شہری ہو یا نہ ہو۔ مزید یہ کہ یہاں خفیہ کھاتے کھولنے کے نہایت وسیع امکانات ہیں۔ یہاں کے بینکوں میں ایسے کھاتے کھولنے کی سہولت ہے جن سے مطلوبہ رقم صرف خفیہ نمبر یا لفظ بتاکر نکالی جا سکتی ہے۔ ان خفیہ کھاتوں کا علم بینک کے اسٹاف کے دو افراد کو ہوتا ہے۔ دو افراد اس لیے تاکہ اگر ایک شخص موجود نہ ہو تو دوسرا شخص فوراً اس کی تعمیل کر سکے۔

اس نظام نے دنیا بھر کے ارباب دولت (بادشاہوں، سیاسی لیڈروں، صنعت کاروں وغیرہ) کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ سوئزرلینڈ کے بینکوں میں بھاری رقم کے خفیہ کھاتے کھول سکیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ سوئزرلینڈ کے بینکوں میں جمع شدہ ہندستانی باشندوں کی رقوم تقریباً

ساڑھے تیرہ ارب روپے تک پہونچ چکی ہیں۔

سوئزرلینڈ کے خفیہ کھاتے ناجائز دولت جمع کرنے کا محفوظ ترین ذریعہ بن گیے ہیں۔ ان کھاتوں کے ذریعہ جاسوسوں اور تخریب کاروں کو رقمیں فراہم کی جاتی ہیں۔ اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کہ ۱۹۸۵ میں ایران نے سوئزرلینڈ کے بینکوں میں ۱۲ ملین ڈالر جمع کیے اور اس کے ذریعہ سے خفیہ طور پر امریکی ہتھیار خریدا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ امریکی ہتھیار اسرائیل کے راستہ سے ایران پہونچے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲۳ نومبر ۱۹۸۶، صفحہ ۱۶)

ہمارے جہاز میں دوسرے اخبارات ورسائل کے ساتھ امریکہ کا ٹائم میگزین بھی موجود تھا۔ ٹائم نے پچھلے ۷۰ سال میں " ۴۷ کور اسٹوری " چھاپی ہے۔ اس کی اشاعت ۸ دسمبر ۱۹۸۶ میں اس کی ۴۷ ویں کور اسٹوری تھی۔ یہ ایران کے لیے امریکی ہتھیار کی سپلائی کے بارہ میں تھی اور اس کا عنوان تھا :

A scandal involving arms for Iran

ٹائم کی اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ایران نے سوئزرلینڈ کے بینکوں میں خفیہ کھاتے کھول رکھے ہیں۔ ان کے ذریعہ وہ مغربی ملکوں سے بھاری قیمت دے کر ہتھیار خریدتا ہے۔ ٹائم کے مطابق، اس دوران اسرائیل نے ایران کے ہاتھ ۴۲ ملین ڈالر کے امریکی ہتھیار فروخت کیے۔ یہ ہتھیار امریکہ کی اصل قیمت کے لحاظ سے ۱۲ ملین ڈالر کے تھے۔ اس طرح اسرائیل نے تقریباً ۲۵۰ فی صد زیادہ قیمت وصول کی۔ اسرائیل نے اصل رقم (Exact amount) امریکہ (سی آئی اے) کو ادا کی اور باقی رقم خود رکھ لی :

Israel sold Iran $ 12 million worth of weapons at a price that included a mark-up as high as 250%, or $ 42 million (p 20).

جنیوا کی جس عمارت میں ایران نے ہتھیاروں کا یہ معاملہ کیا، اس کی تصویر ٹائم (۱۵ دسمبر ۱۹۸۶) صفحہ ۱۳ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

ایران کے اپنے اعلان کے مطابق امریکہ اور اسرائیل دونوں عالم اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ ان عظیم تر دشمنوں سے امام خمینی کا اتحاد ہوجاتا ہے، مگر عراق کے صدام حسین سے ان کا

اتحاد نہیں ہو سکتا، جب کہ وہ خود صلح کی اور اتحاد کی پیش کش کر رہا ہو۔ کیسا عجیب ہے وہ اسلام جو موجودہ زمانہ کے مجاہدین اسلام کے حصہ میں آیا ہے۔

۱۹۸۲ میں سوئزرلینڈ کے ۲،۵ بینکوں میں جو رقم جمع تھی، وہ ہندستانی سکہ میں 305,000 کرور روپئے ہوتی ہے (ریڈرز ڈائجسٹ، فروری ۱۹۸۴)

سوئزرلینڈ کا ایک طبقہ بینکوں میں خفیہ کھاتے رکھنے کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اس سے ظالم حکمراں اور غلط ذرائع سے دولت حاصل کرنے والے دوسرے لوگ اپنی دولت کو چھپا کر دوبارہ اس کو باعزت طور پر استعمال کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ایک سوشل ڈیموکریٹ نے بینک رازداری کو ختم کرنے کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ کالا دھن ہمارے بینکوں کے علی بابا کے کھوہ میں غائب ہو جاتا ہے اور پھر وہ جائز دولت بن کر باہر آتا ہے تاکہ اس کو حسب منشا استعمال کیا جا سکے :

Black money disappears into the Ali Baba caves of our banks and emerges respectably white and ready for investment.

سوئزرلینڈ یورپ کا ایک نسبتاً چھوٹا ملک ہے۔ اس کو ساحل سمندر بھی حاصل نہیں۔ مگر سوئزرلینڈ کو اس کی کمیوں نے عمل کا مزید حوصلہ دیا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں، خام مواد سے محرومی نے سوئزرلینڈ کو مایوس نہیں کیا۔ اس نے اپنی محنت سے اپنے یہاں نہایت اعلیٰ اور معیاری صنعتی بنیاد تعمیر کر لی۔ حتی کہ وہ یوروپ میں فی کس سب سے زیادہ آمدنی کا ملک بن گیا :

Undismayed by a lack of raw material, the Swiss have constructed a **high-quality**, high-technology industrial base for Europe's highest per capita income.

سوئزرلینڈ میں چار زبانیں (جرمن، فرنچ، اطالین، رومانش) رائج ہیں۔ یہاں غیر ملکی کارکنوں کی تعداد نصف ملین ہے (کل تعداد کا ۱۷ فی صد) سوئزرلینڈ کی کل آبادی تقریباً ۶۳ لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ صدفی صد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔

جنیوا زیادہ بڑا شہر نہیں۔ آپ اگر چاہیں تو پیدل چل کر اس کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچ سکتے ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں بھی وہ بہت زیادہ عظیم نظر نہیں آتا۔ تاہم اس کی تاریخ نے اس کو عظیم بنا دیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اکثر بین اقوامی اہمیت کے

واقعات جنیوا میں پیش آئے۔

جنیوا، سرینگر کی مانند پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع ہموار میدان میں آباد ہے۔ وہ اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے یوروپ کا ایک ممتاز شہر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا رقبہ ۱۱۰ مربع میل (۲۸ کلومیٹر) ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۳۲۰ ہزار ہے۔ جنیوا کی معاشی اور تہذیبی اہمیت اپنے رقبہ سے بہت زیادہ ہے۔ سولھویں صدی تک جنیوا تنزل کا شکار رہا۔ اس کے بعد ۱۵۳۰ سے اٹلی، جرمنی، فرانس وغیرہ ملکوں کے نکلے ہوئے لوگ یہاں آکر آباد ہوئے۔ اس سے جنیوا کو نیا خون (New blood) ملا اور اس کی ترقیاں شروع ہوئیں۔ ان لوگوں نے غیر معمولی محنت سے یہاں گھڑی سازی، پرنٹنگ اور دوسرے صنعتی میدانوں میں ملک کو آگے بڑھایا ——— ہر قوم کی ترقی کے لیے "نیا خون" درکار ہوتا ہے، خواہ یہ نیا خون اندر سے حاصل ہو یا باہر سے۔

عیسائیت میں ریفارمیشن کی تحریک نے جنیوا میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اس شہر کو پروٹسٹنٹ روم (Protestant Rome) کہا جانے لگا۔ جنیوا کی مقامی آبادی میں پروٹسٹنٹ لوگ کسی قدر زیادہ ہیں۔ مگر مجموعی آبادی میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک تقریباً نصف نصف ہیں۔ جنیوا میں میں نے بعض پروٹسٹنٹ چرچ اندر سے دیکھے۔ وہ کیتھولک چرچ کے برعکس، بالکل سادہ تھے۔ جیسے مسلمانوں کی مسجدیں سادہ ہوتی ہیں۔

جنیوا کو ایک بین اقوامی شہر (International city) کہا جاتا ہے۔ یہاں ڈیڑھ سو سے زیادہ بین اقوامی اداروں کے صدر دفتر ہیں۔ اور اکثر بین اقوامی اداروں کی شاخیں موجود ہیں۔ جنیوا کو بین اقوامی حیثیت دینے میں اس کا بھی دخل ہے کہ یہاں تقریباً ۳۵ فی صد بیرونی افراد آباد ہیں۔ اس واقعہ نے جنیوا کو ایک قسم کی عالمی حیثیت دیدی ہے۔ فرانس کے سیاست داں ٹالی رینڈ (Talleyrand) نے کہا تھا کہ دنیا میں پانچ براعظم ہیں اور پھر جنیوا ہے۔

There are five continents, and then there is Geneva

جنیوا میں دور جدید کے بعض انتہائی بڑے مفکر پیدا ہوئے۔ مثلاً روسو اور والٹیر۔ اس بنا پر جنیوا کو یہ حیثیت بھی حاصل ہوئی کہ وہ اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

دور اول میں مسلمان جب اسپین کے راستے سے یورپ میں داخل ہوئے تو وہ بیش قدمی

کرتے ہوئے سوئزرلینڈ تک پہونچ گئے ۔ اسپین اور سسلی اور جنوبی اٹلی اور جنوبی فرانس میں انھوں نے باقاعدہ حکومتیں قائم کرلیں ۔ تاہم سوئزرلینڈ میں اس قسم کی کوئی حکومت قائم نہ ہو سکی ۔

سوئزرلینڈ میں عرب مسلمانوں کے داخلہ کے بارہ میں قدیم عربی کتابوں میں بہت کم معلومات ملتی ہیں ۔ اس سلسلہ میں زیادہ معلومات ان کتابوں میں ہیں جو عیسائی حضرات نے جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں لکھی ہیں ۔ امیر شکیب ارسلان (۱۹۴۶ - ۱۸۶۹) جرمن اور فرانسیسی زبان جانتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا ۔ نیز انھوں نے ان یورپی علاقوں کے سفر کیے ۔ اس کے بعد انھوں نے اس موضوع پر تین سو صفحات کی ایک کتاب (۱۳۵۲ھ) عربی زبان میں لکھی ہے جس کا نام یہ ہے :

تاریخ غزوات العرب فی فرنسا و سویسرا و ایطالیا وجزائر البحر المتوسط

امیر شکیب ارسلان کی اس کتاب میں دوسری معلومات کے علاوہ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ انھوں نے اس میں ایک جرمن کتاب کا خلاصہ شامل کر دیا ہے جو خاص اسی موضوع پر لکھی گئی تھی ۔ اس کتاب کا جرمن نام یہ ہے :

Der einfall der Sarazenenen in die Schweiz.
Von dr Ferdinand Keller

سوئس انسائکلوپیڈیا *(Dictionnaire historique et biographique de la Suisse)* میں سراسین (Saracen) کے باب کے تحت بھی عربوں کے سوئزرلینڈ میں داخلہ کی بابت کافی معلومات درج ہیں ۔

امیر شکیب ارسلان نے اپنی تحقیق کے دوران خود سوئزرلینڈ کا سفر کیا تھا ۔ اس سلسلہ میں وہ سوئزرلینڈ کے شہر سیون (Sion) گئے ۔ وہاں سے دریافت کرتے ہوئے وہ ایک گاؤں میں پہونچے جو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے ۔ یہاں ایک بوڑھے واقف کار شخص نے انھیں بتایا کہ ہم سنتے آئے ہیں کہ اس گاؤں کے تمام باشندے یا کم از کم ان میں سے کچھ عرب نسل سے ہیں (ان اهالی هذه القریة او بعضهم علی الاقل هم من اصل عربی ، صفحہ ۲۷۹) اس نے مزید بتایا کہ اس طرح کی اور بستیاں بھی سوئزرلینڈ میں پائی جاتی ہیں ۔ سوئزرلینڈ کے بعض مقامات کے نام اب بھی عربی انداز

پر ہیں۔ مثلاً علی العین (Allalin) اور الماجل (Almagell) وغیرہ۔

مغربی مورخین نے اپنی کتابوں میں عربوں کے سوئزرلینڈ میں داخلہ کی یہ تصویر پیش کی ہے کہ وہ یہاں لوٹ مار کرنے آتے تھے۔ چنانچہ خود امیر شکیب ارسلان نے اپنی مذکورہ کتاب میں اس طرح کے عنوانات قائم کیے ہیں ——— نزول العرب فی بروفانس وغاراتہم من هناك على سافوای و بییمونت، سویسرة، غارات العرب علی سویسرة فی اواسط القرن العاشر۔

پروفیسر ہٹی نے اپنی کتاب (تاریخ عرب) میں سوئزرلینڈ میں قدیم مسلمانوں کے داخلہ کے بارہ میں ایک پیراگراف لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اغالبہ اپنی پیش قدمی کے دوران صرف اٹلی کے ساحل تک نہیں رکے۔ ۸۶۹ء میں انھوں نے مالٹا کو فتح کر لیا۔ اٹلی اور اسپین سے ان کے حملے دسویں صدی میں الپائن کے دروں کے ذریعہ وسطی یورپ تک پہونچے تھے۔ الپ کے علاقہ میں متعدد عمارتیں اور دیواریں ہیں جن کو سیاحوں کی گائڈ بک قدیم مسلمانوں کے حملوں سے منسوب کرتی ہیں۔ سوئزرلینڈ میں کچھ جگہوں کے نام عرب اصل سے تعلق رکھنے والے نظر آتے ہیں، مثلاً گابی اور الگابی جو بظاہر الجابی (محصل) کی بدلی ہوئی صورت ہے:

> The Aghlabids did not limit their operations to the Italian coasts. In 869 they captured Malta. From Italy and Spain piratical raids in the tenth century extended through the Alpine passes into mid-Europe. In the Alps are a number of castles and walls which tourists' guides attribute to the invasion of the Saracens. Certain Swiss place-names, such as Gaby and Algaby (al-jabi', tax collector) which appear in Baedeker's Switzerland, may possibly be of Arabic origin.
>
> Philip K. Hitti, *History of The Arabs*,
> Macmillan, London, 1968, p. 605

مسلمان اغالبہ اور فاطمیہ کے دور میں سوئزرلینڈ میں داخل ہوئے۔ مگر یہاں ان کی کبھی حکومت قائم نہ ہو سکی۔ اگرچہ بعض مسلم مصنفین نے یہاں قیام حکومت کا دعوی کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب تعارف اسلام *(An Introduction to Islam)* میں لکھا ہے کہ عباسی دور میں تیونس کے گورنر کو دعوت دی گئی کہ وہ سسلی کی خانہ جنگی میں مداخلت کرے۔ اس کے بعد تیونس کے مسلم گورنر نے جزیرہ سسلی پر قبضہ کر لیا۔ مزید وہ اٹلی کے بڑے حصہ پر بھی قابض ہو گیا۔ حتی کہ مسلمان

پیش قدمی کرتے ہوئے روم کی دیواروں تک پہونچ گیے۔ اس زمانہ میں فرانس کا جنوبی حصہ اور اسی کے ساتھ سوئزرلینڈ کا قابل لحاظ حصہ بھی مسلم سلطنت میں شامل کرلیا گیا :

The south of France was annexed as also a considerable part of Switzerland (p. 246).

مگر سوئزرلینڈ کے بارہ میں یہ بات تاریخ سے ثابت نہیں ہوتی۔

دسمبر ۱۹۳۱ میں ایک سفر کے دوران مہاتما گاندھی جنیوا آئے تھے۔ انھوں نے وکٹری ہال (Victory Hall) میں ایک تقریر کی۔ اس کا موضوع تھا: سچائی خدا ہے (Truth is God) اس کا ذکر کرتے ہوئے لوئی فشر نے لکھا ہے کہ لامذہب قسم کے لوگ گھنٹوں تک ان پر سوالات کی بوچھار کرتے رہے۔ مگر مہاتما گاندھی نے کامل سکون کے ساتھ ان کا جواب دیا، ان کے چہرہ کی ایک رگ بھی حرکت میں نہیں آئی :

He was heckled for hours by atheists and others. He answered them in perfect calm, not a muscle of his face twitching.
Louis Ficher, *The Life of Mahatma Gandhi*
Harper Row, New York, 1983, p. 293

موجودہ زمانہ کے بے شمار مسلم لیڈروں میں سے کسی ایک کے یہاں بھی برداشت کی یہ مثال نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ کسی ایک مسلم لیڈر نے بھی وہ کامیابی حاصل نہیں کی جو مہاتما گاندھی نے موجودہ زمانہ میں حاصل کی۔

سوئزرلینڈ کی ایک مشہور گھڑی ہے جس کا نام رولکس (Rolex) ہے۔ اس کا اشتہار ایک میگزین میں نظر سے گزرا۔ اشتہار میں گھڑی کے ساتھ ایک فلم پروڈیوسر (Placido Domingo) کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ گھڑی میرے لیے بہترین ہے۔ کیوں کہ میرے طریقہ کے برعکس اس کو کبھی آرام کی ضرورت نہیں :

Because, unlike me, Rolex never needs a rest.

گھڑی ایک بہت چھوٹی چیز ہے، مگر وہ ایک بہت بڑی چیز کی یاد دلاتی ہے۔ اور وہ خدا کا عظیم الشان نظام ہے۔ زمین ہر لمحہ گھومتی ہے، وہ کبھی آرام نہیں کرتی۔ اسی طرح اس دنیا کی تمام

چیزیں ہر آن متحرک ہیں تاکہ وہ انسان کی ضروریات پوری کریں۔ انسان جب سوتا ہے اس وقت بھی کائنات کا کارخانہ اس کے لیے چلتا رہتا ہے اور جب جاگتا ہے اس وقت بھی۔ انسان کو خبر ہو یا نہ ہو وہ اپنے آپ مسلسل حرکت میں ہے تاکہ انسان کی تمام ضرورتیں فراہم کرے۔ کیسا عجیب ہوگا وہ خدا جس نے اس عجیب "کائناتی گھڑی" کو بنا کر کھڑا کر دیا۔

کانفرنس میں مختلف ملکوں کے تقریباً ۸۰ آدمی شریک ہوئے۔ ہر مذہب کے نمائندہ نے اپنے مذہب میں مذہبی آزادی کی اہمیت بتائی۔ پھر مختلف ملکوں میں مذہبی آزادی کی عملی صورت حال پر اظہار خیال ہوا۔ اس کے بعد یورپ، ایشیا، افریقہ، امریکہ کے الگ الگ گروپ بنائے گئے۔ ہر گروپ نے اپنے اپنے براعظم کے اعتبار سے مذہبی آزادی کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس تبادلہ خیال کا خلاصہ ایک مختصر رپورٹ کی صورت میں کانفرنس کے عام اجتماع میں پیش کیا گیا۔

موجودہ زمانہ ایک اعتبار سے اجتماعات اور کانفرنسوں کا زمانہ ہے۔ دنیا بھر میں ہر روز مختلف قسم کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں مسلمانوں کی دینی شخصیتوں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے مگر مسلمانوں کی دینی شخصیتیں عام طور پر صرف مسلمانوں کے اجتماعات میں شرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیرونی ملکوں میں ان کے اسفار بھی صرف وہاں کے بسنے والے مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

راقم الحروف کے ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس کو مسلمانوں کے علاوہ بار بار غیر مسلم صاحبان کے اجتماعات میں شرکت اور خطاب کے مواقع ملے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ اجتماعات یہ ہیں:

۱۔	آل مذاہب کانفرنس	بجنور	نومبر ۱۹۵۹
۲۔	وشودھرم سمیلن	الٰہ آباد	مئی ۱۹۶۰
۳۔	ورلڈ فیلوشپ آف ریلیجنز	نئی دہلی	فروری ۱۹۶۵
۴۔	انٹرنیشنل سیمینار آن ریلجن	نئی دہلی	دسمبر ۱۹۷۳
۵۔	مسلم کرسچین ڈائیلاگ	طرابلس (لیبیا)	فروری ۱۹۷۶
۶۔	اسمبلی آف دی ورلڈ ریلیجنز	نیویارک (امریکہ)	نومبر ۱۹۸۵
۷۔	کونسل فار دی ورلڈ ریلیجنز	بنگلور	جون ۱۹۸۶
۸۔	ورلڈ کونسل آن ریلجس لبرٹی	جنیوا (سوئزرلینڈ)	دسمبر ۱۹۸۶

۱۔ الرسالہ (انگریزی) کے اجرار اور انگریزی کتب کی اشاعت سے پہلے ہمارے اور غیر اردو داں طبقہ کے درمیان ایک قسم کا مواصلاتی فصل قائم تھا۔ اب خدا کے فضل سے وہ فصل ٹوٹ چکا ہے۔ انگریزی الرسالہ اور انگریزی تراجم کے ذریعہ وسیع تر حلقہ میں اسلامی مرکز کا پیغام مسلسل پہونچ رہا ہے۔ عام انگریزی دانوں کے علاوہ خواص کی طرف سے بھی اس کی اطلاعات برابر ملتی رہتی ہیں۔ حال میں ہم کو ملیشیا کے پرائم منسٹر ڈاکٹر مہاتیر بن محمد (Dr. Mahathir Bin Mohammad) کا خط مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۸۶ ملا ہے انھوں نے صدر اسلامی مرکز کی کوششوں کو سراہتے ہوئے لکھا ہے :

I scanned through the book 'Mohammad: The Prophet of Revolution' and find it very lucid and interesting. My congratulations to you on your contribution to Islamic thought.

۲۔ الرسالہ کو اللہ تعالیٰ ایسے عجیب طریقوں سے پھیلا رہے ہیں کہ پیشگی طور پر اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک صاحب ظہران (سعودی عرب) سے اپنے خط ۴ دسمبر ۱۹۸۶ میں لکھتے ہیں کہ میرا تاثر یہ ہے کہ الرسالہ کا انداز فطرت کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی بھی اس کو ایک مرتبہ دیکھ لیتا ہے، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ دو دن پہلے کی بات ہے، میں پوسٹ بکس سے الرسالہ انگریزی لیے چلا آرہا تھا۔ لفٹ میں اس کو دیکھ رہا تھا کہ ایک صاحب کی نظر اس کے پہلے صفحہ پر پڑی جس میں لکھا ہوا تھا :

What is sympathy. Sympathy is your pain in my heart.

ان صاحب نے اس کو دیکھ کر فوراً کہا :

Where from you get this magazine?

میں نے یہ سن کر فوراً انھیں وہ رسالہ دے دیا اور طریقہ بتا دیا کہ آپ اس طرح اس کو انڈیا سے منگا سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ الرسالہ ضمیر میں ایک قسم کا بھونچال مچا دیتا ہے اور آدمی اس کی ہر تحریر کا تقابل اپنے آپ سے کرنے لگتا ہے۔ میرے لیے الرسالہ بہت مددگار ثابت ہوا ہے۔ میرے سوچنے کے انداز کا رُخ بدل چکا ہے۔ (محمد مختار)

۳۔ اسلامی مرکز کا مشن اللہ کے فضل سے دن بدن وسیع ہوتا جارہا ہے۔ اس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ہر طبقہ کے لوگ مرکز کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ ۲۸ نومبر ۱۹۸۶ کو کناڈا کے ایک پروفیسر (Dr M. Darrol Bryant) اسلامی مرکز میں آئے اور کئی گھنٹے تک صدر اسلامی مرکز سے تبادلہ خیال کیا۔ انھوں نے اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات اور الرسالہ (انگریزی) کے بارہ میں غیر معمولی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

۴۔ الرسالہ اپنے قارئین میں کس قسم کا ذہن بنا رہا ہے، اس کا اندازہ مختلف طریقوں سے ہوتا رہتا ہے۔ ایک صاحب اپنے خط (۹ دسمبر ۱۹۸۶) میں لکھتے ہیں کہ حسن پور میں بہت سے لوگ الرسالہ کی آمد کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ اور میرے بہت سے دوست اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز فرمائے۔ آپ نے ہمیں اسلام سے متعارف کیا ہے۔ ہمیں محبت کرنا سکھایا ہے۔ الرسالہ کا پڑھنے والا کوئی بھی کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ یہ آپ ہی کی دین ہے۔

۵۔ ناندیڑ سے مولانا عبدالقدیر صاحب لکھتے ہیں کہ "یہاں قارئین الرسالہ کی تعداد مسلسل بڑھتی جارہی ہے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۸۶ کو قارئین الرسالہ کا ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع کا عنوان تھا: موجودہ دور میں الرسالہ کی اہمیت و افادیت۔ ناندیڑ کے علاوہ دوسرے قریبی مقامات کے لوگ بھی اس میں شریک ہوئے۔ یہ اجتماع توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ ہم نے محسوس کیا کہ کم از کم فکری اور نظریاتی طور پر بہت سے لوگ بلکہ بہت سے علماء اس تحریک سے متفق ہو رہے ہیں"

۶۔ الرسالہ (نومبر ۱۹۸۶) میں "ایک تقاضا" کے عنوان کے تحت ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ آج یہ ضرورت ہے کہ اسلام کے شرعی قانون کو وقت کے علمی اور عقلی معیار پر مدلل کرکے پیش کیا جائے۔ اس سلسلہ میں قارئین الرسالہ کی طرف سے متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں کہ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے اسلامی مرکز نے کیا کیا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ صدر اسلامی مرکز نے اس سلسلہ میں کافی تحقیق اور جدوجہد کے بعد خاص اس موضوع پر ایک کتاب تیار کی ہے، جو "خاتون اسلام" کے نام سے چھپ گئی ہے۔

۷۔ قارئین الرسالہ کی طرف سے مختلف قسم کے سوال نامے مرکز میں آتے رہتے ہیں اور صدر اسلامی مرکز ان کا جواب دیتے ہیں۔ اس قسم کے ایک سوال نامہ کا جواب اگلے صفحہ پر نقل کیا جارہا ہے۔ آیندہ بھی انشاء اللہ اس قسم کا سلسلہ جاری رہے گا۔

۸۔ ایک صاحب ایجنسی نے اطلاع دی ہے کہ ان کے ذریعہ سے جو لوگ الرسالہ خرید رہے تھے، ان میں سے کچھ افراد نے خریداری بند کر دی۔ صاحب ایجنسی کو فوری طور پر خیال ہوا کہ اس کے بقدر ایجنسی کی تعداد میں کمی کر دیں۔ مگر بعد کو ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ دفتر کو خط لکھنے سے پہلے نئے افراد کے اندر خریدار تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے نئے لوگوں کو الرسالہ دکھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی نئے خریدار بن گیے۔ حتی کہ انھیں اپنی ایجنسی میں الرسالہ کی تعداد کم کرنے کے بجائے اس کی تعداد میں اضافہ کا خط دفتر الرسالہ کو لکھنا پڑا۔ یہ ایک مفید تجربہ ہے۔ دوسرے صاحبان ایجنسی کو بھی اپنے حلقہ میں اس کا تجربہ کرنا چاہیے۔

۹۔ ایک صاحب لکھتے ہیں "پیغمبر انقلاب" بدست ہوئی۔ جس کے مطالعہ نے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا بہترین نقش میرے ذہن پر چھوڑا۔ اس سے قبل سیرت پاک پر مولانا شبلی نعمانی کا پہلا حصہ پڑھا تھا۔ جس سے حضور پاکؐ کی عملی زندگی کا پورا خاکہ ذہن میں آگیا تھا۔ تاہم آپ کی تصنیف نے علمی اور تاریخی پیرائے میں جن واقعات کی تشریح کی وہ قابل مبارکباد ہے۔ الرسالہ کے مسلسل مطالعہ سے یہ بات مجھ پر خصوصی طور پر واضح ہو چکی ہے کہ آپ کا انداز فکر قرآن کے مطلوب انسان کی مکمل ترجمانی ہے۔ یہ مسلمانوں سے منفی نفسیات کو چھوڑ کر مثبت رد عمل اپنانے کی دعوت دیتا ہے۔ آپ کا مشن وہی ہے جس کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوۂ حسنہ میں ظاہر فرمایا۔ بحمداللہ آپ کی تصنیفات پڑھنے کے بعد زندگی میں نئی تازگی، اُمنگ اور جینے کا ولولہ پیدا ہوا ہے۔ اسلام اور قرآن کے تعلق سے جتنے شکوک و شبہات تھے رفتہ رفتہ دور ہو رہے ہیں۔ اسلام کو علمی اور فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی کم ہی کوشش کی گئی ہے۔ میری طرح سائنس کے طالب علم جو ہر بات کو تجربہ اور ریسرچ کے پیمانہ میں دیکھنے کے عادی ہیں اور ہمارا تعلیمی نظام جو سیکولر ذہن بناتا ہے۔ ایسے حالات میں آپ کا لٹریچر بہت مفید ہے۔ (پربھنی، ۷ جون ۱۹۸۶)

مکرمی جناب حکیم عبدالقوی صاحب، لکھنؤ   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آپ کا خط مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۸۶ ملا۔ آپ نے میرے بیان کی تردید میں تین مسلمانوں کی مثالیں پیش کی ہیں جنھوں نے قرآن کو مسز اندرا گاندھی کے سامنے "تحفۃ" پیش کیا تھا۔ عرض ہے کہ آپ نے الرسالہ نومبر ۱۹۸۶ کا صفحہ ۴۲-۴۳-۴۴ غالباً زیادہ غور سے نہیں پڑھا ورنہ آپ کو معلوم ہو جاتا کہ میں نے جو لکھا ہے کہ کسی مسلم قائد نے مسز اندرا گاندھی کے سامنے خدا کی کتاب پیش نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی نے بطور تحفہ قرآن پیش نہیں کیا۔ بلکہ واضح طور پر میری مراد یہ ہے کہ قرآن کو جس طرح پیش کرنا تھا اس طرح پیش نہیں کیا۔

ایک کتاب جب کسی کو دی جائے تو سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ پانے والا شخص واقعی معنوں میں اس کو لائق مطالعہ سمجھے، دینے والا اس کتاب کے حق میں تجسس کی فضا پیدا کر سکے۔ مسٹر پریم نارائن گپتا کے ہاتھ میں جب اندرا گاندھی نے مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن کو دیکھا تو "پریم نارائن گپتا" کا نام ہی تجسس پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔ مگر جب دینے والا "عبدالرحیم" ہو تو صرف نام مطلوبہ تجسس پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں۔ ایسی حالت میں لازمی طور پر کچھ مزید چیزوں کی ضرورت ہو گی۔

۱۔ ہندستان کے مسلمانوں نے اس ملک میں مسلسل جو قومی سیاست اختیار کر رکھی ہے اس کے نتیجہ میں وہ اس ملک میں صرف "مانگنے والی قوم" بن کر رہ گیے ہیں۔ اس ملک کے غیر مسلموں کی نظر میں مسلمانوں کی یہ تصویر باقی نہیں رہی ہے کہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز بھی ہے جسے وہ دوسروں کو دے سکیں۔ مسلمانوں کو سب سے پہلے یک طرفہ قربانی کے ذریعہ اپنی اس تصویر کو بدلنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ان کی دی ہوئی کتاب غیر مسلم صاحبان کو قابل مطالعہ کتاب نظر آئے۔

۲۔ دوسری چیز فرد سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں براہ کرم میری مطبوعہ تحریر کے ان الفاظ کو دوبارہ پڑھیں: "مسلم قائدین میں سے کوئی ایک بھی قائد نہیں جس نے ایسا کیا ہو کہ وہ اپنی رات کی تنہائیوں میں نمازیں پڑھ کر مسز اندرا گاندھی کی ہدایت کے لیے دعا کرے۔ صبح کو اٹھ کر وہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجہ پڑھے اور رو رو کر اللہ سے مدد کی درخواست کرے۔ اس کے بعد وہ قرآن کا ترجمہ لے کر مسز اندرا گاندھی کے یہاں جائے اور درد و سوز کے انداز میں ان سے گفتگو کر کے انھیں خدا کی کتاب پیش کرے"۔ یہ آخری کم سے کم بات ہے جو کسی مسلمان فرد کو قرآن پیش کرنے والا بناتی ہے۔ اگر یہ آخری بات بھی نہ پائی جائے تو قرآن کو بطور تحفہ پیش کرنا موجودہ حالت میں صرف ایک مذاق ہے۔ اس کو خدا کی کتاب پیش کرنے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ (۲۶ دسمبر ۱۹۸۶)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نیہ کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۴ مارچ ۱۹۸۷

فہرست

سبق آموز

حضرت امیر معاویہؓ نے ایک بار دمشق میں کچھ چادریں تقسیم کیں۔ ان میں سے ایک چادر دمشق کے ایک بوڑھے آدمی کو پہونچی جو انصار سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ چادر انصاری بزرگ کو پسند نہیں آئی۔ انھوں نے غصہ میں آکر کہا کہ خدا کی قسم، میں اس چادر کو معاویہ کے سر پہ ماروں گا۔ (واللّٰہ لاضربنّ بہا رأس معاویۃ)

حضرت امیر معاویہ اس وقت عظیم اسلامی سلطنت کے خلیفہ تھے۔ انھیں یہ بات پہونچی تو وہ اس کو سن کر غصہ نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس جو کچھ پیش آیا وہ واقعہ بیان کرنے والے کے الفاظ میں یہ تھا:

فاستدعاه الخليفة وكشف له عن رأسه وقال أوف بيمينك وليرأف الشيخ بالشيخ

(الدعوة ۱۲ جمادی الاول ۱۴۰۷)

حضرت امیر معاویہ نے اس انصاری بزرگ کو اپنے یہاں بلایا اور ان کے سامنے اپنا سر کھول دیا اور کہا کہ اپنی قسم پوری کرو۔ البتہ ایک بوڑھے کو چاہیے کہ وہ دوسرے بوڑھے پر نرمی کرے۔

انصاری نے شرمندہ ہو کر معافی مانگی اور خاموشی کے ساتھ واپس چلے گیے۔

حضرت امیر معاویہ اگر اس کے جواب میں خود بھی غصہ ہو جاتے اور مذکورہ شخص کے خلاف انتقامی کارروائی کرتے تو مسئلہ اور بڑھتا۔ دونوں طرف سے کینہ گی میں اضافہ ہوتا۔ پورے سماج میں منفی رجحانات جنم پاتے۔ مگر انھوں نے اس سے کوئی منفی اثر نہیں لیا اور غصہ کا جواب ٹھنڈک سے دیا تو فریق ثانی خود جھک گیا۔ مزید یہ کہ پورا سماج منفی رجحانات کی پرورش سے بچ گیا۔

حضرت امیر معاویہ سوچ سکتے تھے کہ اگر میں مذکورہ رویہ اختیار کروں تو رعایا کے اوپر خلیفہ کا دبدبہ ختم ہو جائے گا اور حکومت کا نظم قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ مگر یہ نہایت سطحی سوچ ہے ایسا تاریخ میں کبھی نہیں ہوا، اور نہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاملہ اس عام مفروضہ کے بالکل برعکس ہے۔ اس دنیا میں اس سے زیادہ طاقتور کوئی شخص نہیں جو سختی کا جواب نرمی سے دے۔ جو سرکشی کے جواب میں فریق ثانی کو نرمی اور محبت کا تحفہ پیش کرے۔

نازک پارسل

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سامانوں کے بعض پارسل پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ احتیاط سے اٹھاؤ (Handle with care) یہ وہ پارسل ہیں جن میں کوئی نازک چیز (مثلاً شیشہ) پیک ہوتا ہے۔ اس طرح کے پارسلوں کے ساتھ اگر بے احتیاطی کا طریقہ اختیار کیا جائے تو ان کے اندر کا سامان ٹوٹ سکتا ہے۔ اس لیے ایسے پارسلوں کے اوپر یہ ہدایت لکھ دی جاتی ہے کہ ان کو اٹھانے اور رکھنے میں احتیاط کرو۔

پارسلوں میں تو ایسے پارسل بہت کم ہوتے ہیں جن کے ساتھ اس قسم کا نازک مسئلہ وابستہ ہو۔ مگر آج کل کے انسانوں کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگ اسی قسم کے نازک پارسل ہیں۔ ہر آدمی گویا مسٹر پرابلم (Mr. Problem) یا مسٹر ہینڈل وِدھ کیر (Mr Handle with care) بنا ہوا ہے۔

یہ وہ انسان ہیں جن کے ساتھ ذرا سا بھی کوئی خلاف مزاج بات پیش آجائے تو وہ فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے خلاف اس قسم کی شکایتیں لیے پھرتے ہیں کہ اُس نے یہ کہدیا، اِس نے وہ کہہ دیا۔ ایسے لوگ خدا کی زمین پر بوجھ ہیں۔ ان کے ذریعہ کبھی کوئی طاقتور سماج نہیں بن سکتا۔

بہترین انسان وہ ہے جو لوہے کی مانند ہو۔ جس کو آہستہ رکھیے تب بھی وہ لوہا رہتا ہے اور اگر زور سے پٹک دیجئے تب بھی وہ لوہا رہتا ہے۔ وہ جھٹکوں سے غیر متاثرہ کر جینا جانتا ہے۔ رسول اللہؐ کے اصحاب ایسے ہی لوہا صفت انسان تھے۔ وہ اِس قسم کی باتوں سے بہت اوپر اٹھ گیے تھے۔ عمر فاروقؓ نے خلیفۂ اول ابوبکر صدیقؓ کے ایک فرمان کو کھلے عام پھاڑ ڈالا (مزقه عمر) مگر خلیفہ اول نے اس کو کچھ بھی برا نہیں مانا۔ عائشہ صدیقہؓ نے ایک صحابی (ابوہریرہؓ) کے متعلق کہہ دیا کہ ابوہریرہ نے جھوٹ کہا (کذب ابوهريرة) مگر صحابی نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا، وغیرہ۔

سیرت کی کتابوں میں اس طرح کے سیکڑوں واقعات ملتے ہیں۔ ایک صحابی کو دوسرے صحابی سے بار بار ناموافق تجربہ ہوتا تھا مگر وہ لوگ اس کا اثر لیے بغیر آپس میں بھائی بھائی بنے رہتے تھے۔ وہ اس طرح کی باتوں کی بالکل پروا نہیں کرتے تھے۔ اصحاب رسول اگر آج کل کے لوگوں کی طرح نازک پارسل ہوتے تو وہ کبھی وہ طاقتور انقلاب برپا نہیں کر سکتے تھے جس نے تاریخ عالم کے رُخ کو موڑ دیا۔

گہرا کام

لندن میں ۱۸۸۴ میں فیبین سوسائٹی (Fabian Society) قائم ہوئی۔ اس کا مقصد صنعتی انقلاب سے پیدا شدہ معاشی نابرابری کو ختم کرنا تھا۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ سوشلزم کے انداز کا نظام لانا تھا۔ اس سوسائٹی میں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے ان میں سے ایک جارج برنارڈ شا (۱۸۵۶ - ۱۹۵۰) تھا۔ برنارڈ شا بہت موثر تقریر کرتا تھا۔ اس نے اپنی تقریروں اور مضامین کے ذریعہ اس تحریک کے گرد ایک بھیڑ جمع کر لی اس کے بعد اس نے عوامی مظاہرہ کا منصوبہ بنایا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک جلوس نکالا۔ اس جلوس میں زیادہ تر درمیانی طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ جب مارچ کرتے ہوئے لندن کے ان علاقوں میں پہونچے جہاں بڑے بڑے دولت مند رہتے تھے تو ان کے کچھ افراد تشدد پر اتر آئے اور توڑ پھوڑ کرنے لگے۔

اس پہلے تجربہ کے بعد ہی برنارڈ شا جلوس اور مظاہرہ کا سخت مخالف ہو گیا۔ اس نے کہا کہ عوام کو "پُرامن مظاہرہ" کا پابند رکھنا انتہائی حد تک مشکل ہے۔ اس لیے ہم اپنے مقصد کے لیے مظاہرہ کے بغیر جدوجہد کریں گے۔ اس کے بعد فیبین سوسائٹی پریس، اجتماعات، علمی ریسرچ وغیرہ جیسے غیر مظاہراتی طریقوں کی پابند رہ کر کام کرنے لگی۔ فیبین سوسائٹی نے جارج برنارڈ شا اور اس کے ساتھیوں کی رہنمائی میں تدریجی طریقہ کار کی ناگزیریت (Inevitableness of gradualism) پر زور دیا۔
اس تحریک کے لوگ سوشلزم کو مانتے ہیں مگر وہ ارتقائی سوشلزم پر عقیدہ رکھتے ہیں نہ کہ انقلابی سوشلزم پر:

The Fabians put their faith in evolutionary Socialism rather than in revolution (EB–IV/20).

غیر مظاہراتی طریق عمل اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ موجودہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس کام میں اپنے آپ کو روکنا پڑتا ہے۔ توسیع کے بجائے استحکام پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ شہرت اور مقبولیت کے مواقع ہوتے ہوئے اپنے آپ کو گمنامی میں دفن کرنے کے لیے راضی ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ فیبین سوسائٹی کے ساتھ یہ سب کچھ پیش آیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فیبین سوسائٹی

نے برطانیہ میں اپنی ایک زبردست تاریخ بنائی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برطانی عظمت کو قائم رکھنے کے لیے اسے اپنی ذاتی عظمت سے دستبردار ہونا پڑا۔

چنانچہ فیبین سوسائٹی کبھی برطانیہ کی عوامی تحریک نہ بن سکی۔ ۱۹۴۶ کا زمانہ اس کے عروج کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے۔ مگر اس عروج کے زمانہ میں بھی فیبین سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد ساڑھے آٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ وہ ہمیشہ "خواص" کی تحریک شمار کی جاتی رہی۔ اس طریق کار کے بارہ میں اس کے اندر رائے کے اختلافات بھی ہوئے۔ اس کے کچھ ممبروں نے اصرار کیا کہ تحریک کو عوامی انداز پر چلایا جائے۔ مگر سوسائٹی کے رہنماؤں نے اس کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فیبین سوسائٹی نے اپنی فکری سرگرمیوں کے ذریعہ برطانیہ کے ذہین طبقہ پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ ملک کی عام آبادی میں اس کے ارکان کی تعداد اگرچہ ایک فی صد سے بھی کم تھی مگر یہ تمام لوگ اعلیٰ ذہنی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اگلے مرحلہ میں برطانیہ کی لیبر پارٹی میں شریک ہوگئے۔ وہ لیبر پارٹی کا دماغ بن گیے۔ چنانچہ ۱۹۴۵ کے انتخابات میں لیبر پارٹی برطانیہ میں برسراقتدار آئی تو اس کے ممبرانِ پارلیمنٹ کی نصف تعداد وہ تھی جو فیبین سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ وزیر اعظم ایٹلی بھی اس کے ایک ممبر تھے۔

۱۹۴۵ سے پہلے برطانیہ میں سرونسٹن چرچل کی پارٹی برسراقتدار تھی۔ چرچل وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز تھے۔ انھوں نے برطانی مقبوضات کو آزاد کرنے کا مطالبہ یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ: میں یہاں اس لیے نہیں ہوں کہ سلطنت برطانیہ کے خاتمہ کی تقریب کی صدارت کروں۔ مگر فیبین سوسائٹی کے افراد کے زیراثر لیبر پارٹی نے پورے معاملہ پر ازسرنو غور کرنا شروع کیا۔ ان کے حقیقت پسندانہ انداز فکر نے انھیں بتایا کہ نوآبادیاتی مقبوضات کو آزاد کرنا برطانیہ کے لیے کھونے سے زیادہ پانے کے ہم معنی ہے۔ فیبین دماغ کے تحت ہی برطانیہ کے لیے یہ ممکن ہوا کہ ۱۹۴۷ میں ہندستان کو پُرامن طور پر آزاد کرکے برصغیر میں اپنے مفادات کو ازسرنو محفوظ کرلے۔

عوامی اشو کھڑا کرکے بھیڑ اکٹھا کرلینا بہت آسان ہے۔ مگر اس قسم کی بھیڑ کبھی تاریخ نہیں بناتی۔ تاریخ بنانے کے لیے ہمیشہ اعلیٰ ذہن درکار ہوتے ہیں۔ اعلیٰ ذہن کو جمع کرنے کی واحد کی تدبیر یہ ہے کہ عوامی انداز کے ہنگاموں سے بچا جائے اور تحریک کو اول سے آخر تک سنجیدہ فکری انداز میں چلایا جائے۔

انسانی دماغ

ایک سائنس داں نے انسانی دماغ کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ انسانی دماغ ہمارے تمام
وٹراور سپر کمپیوٹر سے بے حساب گنا زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر ایک ایسا دیو پیکر
وٹر بنایا جائے جس کا سازوسامان (Infrastructure) سات منزلہ بلڈنگ میں پھیلا ہوا ہو تو
انسانی دماغ کا صرف ایک سادہ خاکہ (Rough sketch) ہوگا۔

ایک اور سائنس داں نے لکھا ہے کہ انسانی دماغ ۱۰ بلین سے لے کر ۱۵ بلین الگ الگ
سابی خلیوں یا نیورون پر مشتمل ہوتا ہے، یعنی دنیا کی موجودہ آبادی سے پانچ گنا زیادہ۔ اس کے
ابلہ میں شہد کی ایک مکھی کے دماغ کے خلیوں کی تعداد ۹۰۰ ہوتی ہے اور چیونٹی کے دماغ کے خلیوں
تعداد صرف ۲۵۰ :

The brain of man contains between 10 and 15 billion separate nerve cells or neurons, just about five times the present population of the world. By comparision, the brain of a bee has 900 cells and that of an ant only 250. (*The Hindustan Times*, 21 February 1982)

ایک مرد کے دماغ (Brain) کا وزن تقریباً ۱۴۰۰ گرام ہوتا ہے۔ اس مختصر مادہ میں اتنے
رت ناک اوصاف بھرے ہوئے ہیں جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ دماغ آدمی کے جسم کی تمام
رزمیوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے اور فیصلے کرتا ہے۔ وہ نئی نئی باتیں دریافت کرتا ہے۔ وہ
سم کی معلومات کو بے اندازہ مقدار میں اپنے حافظہ کے خانہ میں جمع رکھتا ہے اور عین وقت پر
ں کو نکال کر ذہن کے حوالے کر دیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

دماغ کا یہ معجزانہ واقعہ ایک برتر دماغ (خدا) کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ اگر ایک برتر دماغ
کھنے والا خالق موجود نہ ہو تو دماغ جیسی حیرت ناک چیز وجود میں نہیں آسکتی۔

جانوروں میں بھی ذہانت ہوتی ہے۔ مثلاً بیور (Beavers) بند کی قسم کے پُل بناتے ہیں۔ چڑیاں
ھونسلے بناتی ہیں۔ شہد کی مکھیاں چھتہ بناتی ہیں۔ مگر یہ تمام جانور ہمیشہ ایک ہی قسم کی چیز بناتے ہیں۔ وہ
دپچ کر اس میں کوئی فرق کرنا یا اس میں کوئی ارتقاء کرنا نہیں جانتے۔ جب کہ انسان سوچتا ہے۔

آخرت کا معاملہ

ستمبر ۱۹۸۶ میں مجھے دہلی کی ایک کانفرنس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ اس کانفرنس کا افتتاح ایک انتہائی اعلیٰ سیاسی شخصیت کے ذریعہ ہونے والا تھا۔ اس بنا پر وہاں حفاظت کا غیر معمولی انتظام تھا۔ اجتماع گاہ میں داخل ہونے والے ہر شخص کی جانچ الکٹرانک آلات کے ذریعہ ہو رہی تھی۔ میں جب اجتماع گاہ کے گیٹ پر پہونچا تو فوراً حفاظتی پولیس کے کئی آدمی میری طرف بڑھے تاکہ میری باقاعدہ جانچ کریں۔ مگر اس وقت میرے ساتھ کانفرنس کی انتظامیہ کمیٹی کے ایک اعلیٰ عہدیدار (مسٹر بجاج) تھے۔ انھوں نے فوراً مداخلت کی اور کہا : انھیں اندر آنے دو، ان کی جانچ نہیں کرنی ہے۔

جب یہ واقعہ ہوا تو اچانک مجھے قیامت کا منظر یاد آگیا۔ میں نے سوچا کہ آخرت میں اسی طرح جب آدمی آگے کی طرف بڑھنا چاہے گا تو خدا کے فرشتے فوراً اس کو جانچ کے لیے روک لیں گے۔ اس وقت وہی شخص بچے گا جس کے متعلق خدا یہ کہہ دے کہ اس کی جانچ مت کرو۔ اس کو اندر آنے دو۔ اس کے برعکس جو شخص جانچ کرنے والے فرشتوں کے حوالے کر دیا گیا اس کی نجات کی کوئی صورت نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں وہی لوگ نجات پائیں گے جن کا آسان حساب (حساب یسیر) لیا جائے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص جانچا گیا وہ ہلاک ہوا (من نوقش فقد هلك) ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت میں کوئی شخص اپنے عمل سے نہیں بچ سکتا، وہاں صرف وہ شخص بچے گا جس کو اللہ اپنی رحمت اور فضل کے سایہ میں ڈھانپ لے۔

آدمی کو اگر قیامت میں پیش آنے والی اس سنگین صورت حال کا احساس ہو تو دنیا میں اس کا رویہ بالکل بدل جائے گا۔ کسی بھائی کو وہ سختی میں مبتلا ہوتے ہوئے دیکھے گا تو اس کے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ وہ اس کے معاملہ میں غیر جانبدار ہو جائے۔ کیوں کہ وہ ڈرے گا کہ موت کے بعد جب جانچ کے فرشتے اس کی طرف بڑھیں گے اس وقت خدا اگر میرے معاملہ میں غیر جانبدار ہو جائے تو میرا کیا انجام ہوگا۔ اس کے بعد کون سی دنیا ہوگی جہاں مجھے پناہ مل سکے۔

اختلاف کا سبب

خباب بن الارت کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار معمول کے خلاف بہت لمبی نماز پڑھی۔ صحابہ نے اس کی بابت سوال کیا تو فرمایا: یہ رغبت اور خوف کی نماز تھی۔ میں نے اس میں اللہ سے تین دعائیں کیں۔ ان میں سے دو قبول ہوگئیں۔ ایک کے بارہ میں انکار کر دیا گیا۔

فرمایا: میں نے پہلی دعا یہ کی کہ میری ساری امت قحط سے ہلاک نہ ہو جائے۔ یہ قبول ہوگئی۔ دوسری دعا یہ کی کہ میری امت پر کوئی ایسا دشمن مسلط نہ ہو جو ان کو بالکل مٹا دے۔ یہ بھی قبول ہوگئی۔ تیسری دعا یہ کی کہ میری امت کے اندر آپس میں لڑائی جھگڑے نہ ہوں۔ یہ قبول نہیں ہوئی۔

اس کی تصدیق ایک اور روایت سے ہوتی ہے:

عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الشیطان قد ایس من ان یعبدہ المصلون فی جزیرۃ العرب، ولکن فی التحریش بینھم
(رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب فی الوسوسہ)

حضرت جابر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ مسلمان جزیرۂ عرب میں اس کی عبادت کریں۔ لیکن مسلمانوں کے درمیان دشمنی کی آگ بھڑکانے سے (وہ مایوس نہیں ہوا ہے)

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ اندیشہ حیرت انگیز طور پر مسلمانوں کی بعد کی تاریخ میں صحیح ثابت ہوا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ نفسیات کیوں ہے کہ شیطان بہت آسانی سے ان کو باہمی جدال کے بے فائدہ مشاغل میں الجھا دیتا ہے۔

اس کی وجہ اسلام کے بجائے اپنے آپ کو برحق سمجھ لینا ہے۔ مسلمان اگر اسلام کو برحق سمجھیں تو سب کا مرکز توجہ ایک ہوتا ہے۔ یہ ذہن تمام لوگوں کو اسلام پر متحد کر دیتا ہے۔ مگر دور زوال میں یہ ہوتا ہے کہ ہر مسلمان اپنے آپ کو برحق سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مرکز تقسیم ہوتا ہے اور لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مسلمان اسلام کو سچا سمجھیں تو اس سے اتحاد پیدا ہوتا ہے، اور اگر وہ اپنے آپ کو سچا سمجھیں تو اس سے اختلاف۔

ایک حدیث

عن ابی ھُرَیرۃ رضی اللہ عنہ اَنّہٗ سَمِعَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: اِنَّ العبدَ لیتکلّم بالکلمۃِ مایَتَبَیَّنُ فیھا یَزِلُّ بھا الی النّارِ ابعدَ ممابین المشرقِ والمغرب۔

(متفق علیہ)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ بندہ بے سوچے سمجھے بات کہتا ہے، اس کی وجہ سے وہ جہنم میں گر کر اس سے بھی زیادہ دور چلا جاتا ہے جتنا مشرق اور مغرب میں فاصلہ ہے۔

تَبَیَّنَ یَتَبَیَّنُ کے معنی عربی زبان میں غور کرنے کے ہیں۔ یعنی بولنے سے پہلے یہ سوچنا کہ آدمی جو کچھ کہنے جا رہا ہے وہ ٹھیک ہے یا بے ٹھیک۔ اس حدیث کے مطابق بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو بظاہر آدمی معمولی سمجھتا ہے مگر وہ اتنی سنگین ہوتی ہیں کہ آدمی کو جہنم میں گرانے کا سبب بن جاتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کچھ باتیں پراسرار طور پر بری ہیں۔ یعنی بظاہر ان کا برا ہونا آدمی کو معلوم نہیں ہوتا۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ اللہ کے یہاں بری قرار پا جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر بری بات کا برا ہونا لوگوں کو معلوم ہے۔ البتہ جو بات لوگوں کو معلوم نہیں ہے وہ یہ کہ ایک بری بات جس طرح ایک ایسے شخص کے حق میں بولنا غلط ہے جو ہماری اچھی فہرست میں شامل ہو، اسی طرح اس شخص کے لیے بھی اس کو بولنا غلط ہے جو ہماری بری فہرست میں چلا جائے۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ جس آدمی سے وہ خوش ہوں اس کے بارے میں بولنا ہو تو وہ سوچے سمجھے الفاظ اپنی زبان سے نکالتے ہیں۔ مگر جس شخص سے ان کو شکایت ہو جائے یا جس کو وہ کسی وجہ سے حقیر سمجھ لیں اس کے بارہ میں وہ کسی احتیاط کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ایسے شخص کے معاملہ میں وہ بلا تحقیق کوئی بھی برا لفظ بول دیں گے۔ ایسے شخص پر وہ کوئی بھی بے بنیاد الزام لگا دیں گے اور یہ نہیں سوچیں گے کہ دلیل اور ثبوت کے بغیر کسی شخص پر الزام لگانا کسی بھی حال میں کسی کے لیے جائز نہیں۔ خواہ وہ لوگوں کی نظر میں کتنا ہی بڑا بزرگ کیوں نہ ہو۔ خواہ بظاہر اس نے دین یا دنیا کے کتنے ہی بڑے کارنامے انجام دیئے ہوں۔

حسد کے بجائے دعا

لطیفہ ہے کہ ایک غریب دیہاتی تھا۔ وہ معاشی اعتبار سے بہت پریشان رہتا تھا۔ کسی شخص نے اس سے کہا کہ تم اکبر بادشاہ کے پاس جاؤ۔ اس کے پاس بہت پیسہ ہے اور وہ ہر مانگنے والے کو دیتا ہے۔ وہ تم کو بھی ضرور دے گا اور تمہارا معاشی مسئلہ حل ہو جائے گا۔ دیہاتی آدمی نے کہا کہ اکبر بادشاہ کو کس نے دیا ہے۔ بتانے والے نے بتایا کہ خدا نے۔ دیہاتی نے کہا کہ پھر ہم خدا ہی سے کیوں نہ مانگیں، ہم اکبر سے کیوں مانگیں۔

اس کے بعد وہ ایک روز اپنے گھر سے نکلا اور سنسان جنگل کی طرف چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے اپنا میلا کپڑا زمین پر بچھایا اور اس پر بیٹھ کر خدا سے دعا کرنے لگا۔ اس نے اپنی دیہاتی زبان میں کہا: اے اکبر کو دینے والے، مجھے بھی دیدے۔ وہ اسی طرح دعا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ فارغ ہوا اور اس نے اپنا کپڑا اٹھایا تو اس کے نیچے اشرفیوں کی بھری ہوئی تھیلی موجود تھی۔ یہ لطیفہ بتاتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے دماغ اور اونچے پڑھے لکھے لوگ اپنے شعور اور کردار کے اعتبار سے اس سطح پر بھی نہیں ہیں جہاں مذکورہ دیہاتی آدمی تھا۔

آج یہ حالت ہے کہ جب بھی کوئی شخص یہ دیکھتا ہے کہ دوسرا آدمی اس سے بڑھ گیا ہے، خواہ یہ بڑھنا مال کے اعتبار سے ہو یا حیثیت کے اعتبار سے، تو فوراً وہ حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے سینے میں بڑھنے والے آدمی کے خلاف نفرت اور جلن کی کبھی نہ ختم ہونے والی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ حسد اور جلن میں مبتلا ہونے والے لوگ اگر یہ سمجھیں کہ کسی کو جو کچھ ملا ہے وہ خدا کے دیئے سے ملا ہے، وہی کم بھی دیتا ہے اور وہی زیادہ بھی دیتا ہے، تو وہ بھی وہی کریں جو مذکورہ دیہاتی نے کیا۔ وہ پانے والے انسان کے بجائے دینے والے خدا کی طرف دوڑیں۔ وہ خدا کو پکارتے ہوئے کہیں کہ جس طرح تو نے میرے بھائی کو دیا ہے اسی طرح تو مجھے بھی دیدے۔ اگر لوگوں میں یہ مزاج آجائے تو سماج کی تمام برائیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

کسی کی بڑائی کو دیکھ کر اپنی کمی کا احساس ابھرنا بذات خود ایک فطری جذبہ ہے۔ اس جذبہ کا رُخ اگر خدا کی طرف ہو تو وہ صحیح ہے اور اگر اس کا رُخ آدمی کی طرف ہو تو غلط۔

جہاد یا سرکشی

بنگلور کے انگریزی اخبار دکن ہرالڈ (۷ دسمبر ۱۹۸۶) نے ایک کہانی چھاپی جس میں پیغمبر اسلامؐ کے خلاف گستاخی کا پہلو پایا جاتا تھا۔ اس پر مقامی مسلمان بگڑ گیے۔ انھوں نے اخبار کا گودام جلاڈالا جس میں ایک کرور روپیہ کا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ پاکستان کے انگریزی اخبار فرنٹیر پوسٹ (۹ جنوری ۱۹۸۷) میں کسی مغربی پرچہ سے ایک مضمون نقل کیا گیا۔ اس کے ساتھ آدم اور حوا کی ایک تصویر تھی وہ بھی فرنٹیر میل میں چھپ گئی۔ اس کے بعد ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں بپھرے ہوئے مسلمانوں نے اخبار کی وسیع عمارت کو گھیر لیا اور اس کو سازوسامان سمیت جلا کر خاکستر کر دیا۔

اس قسم کے واقعات ایک یا دوسری شکل میں ہر اس ملک میں ہو رہے ہیں جہاں مسلمانوں کو عمل کی آزادی حاصل ہے۔ مسلمان اپنی ملی ہوئی آزادی کو اسی قسم کی تخریب کاری میں استعمال کر رہے ہیں اور اس کا نام انھوں نے اسلامی جہاد رکھا ہے۔

اس قسم کا ہر عمل بلاشبہہ غیر اسلامی عمل ہے۔ یہ جہاد نہیں بلکہ سرکشی ہے اور سرکشی اللہ تعالیٰ کے یہاں بدترین جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس معاملہ کی شرعی حیثیت کو سمجھنے کے لیے ایک حدیث کا مطالعہ کیجیے:

عَن ابی هُریرةَ، قَال: انَّ رَسولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَليهِ وسلم أُتِیَ برجلٍ قَدْ شَرِبَ الخمرَ فقال: "إضربوهُ" فمنَّا الضاربُ بيدِهٖ، وَالضاربُ بثوبِه، وَالضاربُ بنَعلِه۔ ثُمَّ قَال: "بكتوه" فَاقبَلوا عَليْهِ يَقولونَ: ما اتَّقيتَ اللهَ، ما خشيتَ اللهَ، وَمَا استحييتَ من رَسول اللهِ صَلّى اللهُ عَليهِ وَسلَّم۔ فَقال بعضُ القَوم: اَخزَاكَ اللهُ۔ قَال: "لاتَقولُوا هٰكذا، لَاتُعينوا عَليهِ الشيطٰنَ ولٰكِن قولُوا: اَللّٰهُمَّ اغفِرلَه، اَللّٰهمَّ ارحمه" رواہ ابوداود

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ وہ شراب پیے ہوئے تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو مارو۔ پس ہم میں سے کوئی شخص اس کو ہاتھ سے مارنے لگا اور کوئی شخص کپڑے سے اور کوئی شخص جوتے سے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس کو عار دلاؤ۔ پس لوگ کہنے لگے کیا تم کو ڈر نہیں، کیا تم کو اللہ کا خوف نہیں، کیا تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرم نہیں آئی۔ پھر حاضرین میں سے بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ خدا تمہیں رسوا کرے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا

کہ اس طرح مت کہو۔ اس کے مقابلہ میں شیطان کے مددگار نہ بنو۔ بلکہ یہ کہو کہ اے اللہ اس کی مغفرت فرما۔ اے اللہ اس پر رحم فرما۔

اس حدیث سے چند باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ صحابۂ کرام نے جب ایک شارب خمر کو دیکھا تو وہ خود اس کو مارنے نہیں لگے۔ بلکہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے جو اس وقت مدینہ میں صاحبِ امر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر ایک ایسا فعل کرے جو ثابت شدہ شرعی جرم کی حیثیت رکھتا ہو تب بھی عوام کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بطور خود اس پر مقررہ سزا کا نفاذ شروع کر دیں۔ سزا کے نفاذ کا حق صرف صاحبِ امر کو ہے۔ اور اسی کی طرف معاملہ کو لوٹایا جانا چاہیے۔

دوسری بات یہ کہ ایک ثابت شدہ مجرم کو سزا دینے کا کام بھی خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس کو صرف " سزا " دی جائے، اس کو " ذلیل " نہ کیا جائے۔ کوئی بھی قولی یا عملی روش جو ذلیل کرنے کے ہم معنی ہو وہ مجرم کے اندر منفی نفسیات پیدا کرے گی۔ مجرم کو سزا دینے کے ساتھ ذلیل ورسوا کرنا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ وہ دین اور اہلِ دین سے متنفر ہو جائے۔ اس طرح کی روش کے نتیجہ میں اس کے اندر ضد اور نفرت کا جذبہ بھڑک اٹھے گا۔ اس سے پہلے اگر وہ حق سے ایک قدم دور تھا تو اب وہ اس سے سو قدم دور ہو جائے گا۔ شیطان اس کے اندر مخالفانہ جذبات بھڑکا کر اس کو اپنا شکار بنالے گا۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات ہے جس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ کسی جرم کی شرعی سزا وہی ہے جو کتاب وسنت سے ثابت ہو۔ اس کے سوا کوئی اور سزا دینا یقینی طور پر فعلِ حرام کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً شاربِ خمر کے لیے اگر شریعت میں یہ سزا مقرر کی گئی ہے کہ اس آدمی کو مارا جائے جس نے شراب پی ہے تو کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ شاربِ خمر کے بھائی بہنوں کو مارنے لگے، یا وہ شاربِ خمر کا گھر جلانے لگے، یا وہ اس کے کارخانے کو لوٹنا شروع کر دے۔

سزا نافذ کرنے والے ادارہ کا کام صرف یہ ہے کہ جب ایسا کوئی کیس سامنے آئے تو وہ تحقیق کرے۔ جب تحقیق اور شہادت سے ثابت ہو جائے کہ متعلقہ شخص فی الواقع مجرم ہے تو ایسے جرم کے لیے شریعت کی جو مقررہ سزا ہے اس کو اس شخص پر نافذ کرے۔ کوئی دوسری سزا نافذ کرنا شریعت کی تعمیل نہیں بلکہ شریعت

سے بغاوت ہے۔ ایسا شخص خود سب سے بڑا مجرم ہے، اس کو حق نہیں کہ کسی دوسرے شخص کو مجرم قرار دے کر اس کے اوپر اپنی خود ساختہ سزا کا نفاذ کرنے لگے۔

زمانہ جاہلیت میں یہود اور اہل عرب نے یہ دستور بنا رکھا تھا کہ وہ اونچے خاندان کے مجرم اور نیچے خاندان کے مجرم کے درمیان سزا میں فرق کرتے تھے۔ اس پر قرآن میں قصاص کی آیت (البقرہ ۱۷۸) اُتاری گئی۔ اس میں کہا گیا کہ اے ایمان والو، تم پر مقتولین کے معاملہ میں برابری اور مساوات کو فرض کیا گیا ہے۔ سزائے قتل کے معاملہ میں جو لوگ قصاص (برابری) کے شرعی اصول کو اختیار نہ کریں۔ یا مثلاً معافی اور دیت قبول کرنے کے بعد مزید یہ کریں کہ وہ قاتل کو قتل کر ڈالیں تو یہ اعتدار (زیادتی) ہے اور اس قسم کا اعتدار کرنے والوں کے لیے خدا کے یہاں دردناک عذاب ہے۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص قتل کیا جائے تو اس کے وارثوں کے لیے تین میں سے ایک چیز ہے۔ قصاص، یا معاف کر دینا، یا دیت لینا۔ اس کے بعد اگر وہ کوئی چوتھی چیز چاہے تو اس کا ہاتھ پکڑ لو۔ جو اس کے بعد بھی زیادتی کرے تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا (ومن اعتدیٰ بعد ذالک فلہ نار جھنم خالدا فیھا، تفسیر ابن کثیر جلد اول)

اس حکم شریعت کے مطابق جرم اور سزا میں برابری ہونا ضروری ہے۔ کسی مجرم کو حدِ شرعی سے زیادہ سزا دینا یا مقررہ سزا کے سوا کوئی اور سزا دینا سراسر حرام ہے۔ ایک شخص سے کوئی شرعی جرم سرزد ہو تو خود مجرم پر شرعی سزا کا نفاذ کیا جائے گا۔ اس کے بجائے اگر اس کے ہم قوموں کو مارا جانے لگے یا مجرم کی جائداد کو تباہ کیا جائے تو یہ سراسر فعلِ حرام ہے۔ جو لوگ ایسا کریں یا جو لوگ ایسا کرنے والوں کی حمایت کریں حتی کہ جو لوگ ایسے فعل کو دیکھ کر خاموش رہیں وہ اپنے آپ کو اس خطرہ میں مبتلا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی سخت ترین بازپرس کی جائے۔

ملک کا اقتدار اگر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جن سے یہ امید نہ ہو کہ وہ مجرم کے اوپر شرعی سزا کا نفاذ کریں گے تب بھی مسلمانوں کے لیے قانون اپنے ہاتھ میں لینا جائز نہیں۔ ایسے ماحول میں مسلمانوں کے لیے نصیحت اور صبر ہے نہ کہ سزا کا نفاذ۔ یہ اصول مکی دور کے عمل سے ثابت ہے۔ اس وقت مکہ کے لوگ کھلے طور پر شراب پیتے تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے اصحاب نے ان پر حد جاری کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ حد کا نفاذ اقتدار ملنے کے بعد کیا گیا۔

گھر کا امام

قرآن میں جو دعائیں سکھائی گئی ہیں ان میں سے ایک دعا یہ ہے : اے ہمارے رب ، ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما ۔ اور ہم کو متقیوں کا امام بنا دے (ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریاتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماما)

یہ آیت دعا کے انداز میں بتا رہی ہے کہ اہل ایمان کا گھرانا کیسا ہوتا ہے اور ایک مومن کو اپنے گھر والوں کے ساتھ کس طرح رہنا چاہیے ۔ اس کا مطلب بدلے ہوئے الفاظ میں یہ ہے کہ گھر کے اندر جو معاملات پیدا ہوں ان میں ہم اپنے گھر والوں کو متقیانہ رہنمائی دیں ۔ ہم اپنے گھر والوں کو مفسدانہ رہنمائی دینے والے نہ بنیں ۔

گھر کی زندگی میں بار بار مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں ۔ ایسے مواقع پر گھر کے چھوٹے وہی کرتے ہیں جو گھر کے بڑے کریں ۔ گھر کے بڑے جس رُخ پر چلیں ، گھر کے چھوٹے بھی اسی رُخ پر چل پڑتے ہیں ۔ گھر کے معاملات میں گھر کا بڑا شخص گھر کا رہنما ہوتا ہے ۔ اگر اس بڑے شخص کے اندر فساد ہو تو اس کی مفسدانہ رہنمائی گھر کے تمام لوگوں کو مفسد بنا دے گی ۔ وہ مفسدوں کا امام بن کر ظاہر ہوگا ۔ اور اگر اس بڑے شخص کے اندر تقویٰ ہو تو اس کی متقیانہ رہنمائی سب کو متقی بنا دے گی ۔ وہ متقیوں کا امام بن کر ظاہر ہوگا ۔

مثال کے طور پر گھر والوں کو کسی سے شکایت پیدا ہو گئی ۔ اب گھر کا بڑا شخص اگر انصاف پسندی کا طریقہ اختیار کرے ، وہ ایسی بات کہے جس سے شکایتی ذہن دبے اور لوگوں کے جذبات ٹھنڈے ہوں تو ناخوش گوار واقعہ پیش آنے کے باوجود گھر کی فضا برہم نہیں ہوگی ۔ گھر کے تمام لوگ حقیقت پسندی اور خیر خواہی کے ساتھ اس کا استقبال کریں گے ۔ گھر کے لوگوں کی روش متقیانہ روش ہوگی اور گھر کا بڑا شخص صحیح رہنمائی کے ذریعہ ایک متقیانہ گھر کی امامت کر رہا ہوگا ۔

اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ کسی سے ایک شکایت پیدا ہوئی اور گھر کا بڑا شخص اس سے بھڑ اٹھا تو وہ بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرے گا ۔ اس کی منفی باتوں سے لوگوں کے اندر چھپے ہوئے

نفرت اور عداوت کے جذبات ابھر آئیں گے۔ گھر کے ہر فرد کا دماغ تخریبی سوچ کا کارخانہ بن جائے گا۔ گھر کے اندر معانی کے بجائے انتقام، اعراض کے بجائے ٹکراؤ کی باتیں ہونے لگیں گی۔ اپنی کمیوں کا اعتراف کرنے کا مزاج ختم ہو جائے گا۔ ہر شخص بس فریق ثانی کو برا بھلا کہنے میں مصروف ہوگا۔ یہ سب کچھ گھر کے بڑے شخص کی رہنمائی میں ہوگا۔ گھر کا بڑا شخص اپنی باتوں سے سب کے ذہن کو بگاڑ دے گا۔ گھر کے تمام لوگ مفسد بن جائیں گے اور وہ ان تمام مفسدوں کا امام۔

ھب لنامن ازواجنا وذریاتنا قرۃ اعین کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ان کو نیک عمل بنا دے تاکہ انھیں دیکھ کر ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں (یعنی اجعلھم صالحین تقر بھم اعیننا التفسیر المظہری) اجعلنا للمتقین اماما کی تفسیر مفسرین نے یہ کی ہے کہ ہم کو نمونہ بنا دے جس کی پیروی متقی لوگ کریں (ای اجعلنا قدوۃ یقتدیٰ بنا المتقون، صفوۃ التفاسیر)

گھر کے بڑے کے اندر اگر یہ مزاج ہو کہ اپنے بیوی بچوں کو صالح دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہوں، اس کے لیے اپنے گھر کے اندر سب سے زیادہ محبوب منظر یہ ہو کہ اس کے بیوی بچے خدا پرستی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔ اگر ایسا ہو، جبھی یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے امام خیر بنے۔ امام خیر بننے کی ایک قیمت ہے۔ اور وہ قیمت دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دینا ہے۔ جو شخص یہ قیمت ادا کرے اسی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے امام خیر بن سکے۔

اس کے برعکس اگر گھر کے بڑے کی آنکھوں کی ٹھنڈک یہ ہو کہ اس کے بیوی بچوں کے گرد دنیا کی رونقیں جمع ہوں۔ اس کا سب سے زیادہ پسندیدہ منظر یہ ہو کہ اس کے گھر والے دنیوی ترقیوں کے گنبد پر کھڑے نظر آئیں تو وہ اپنے گھر والوں کے لیے صرف امام شر بن سکتا ہے۔ کیوں کہ امام شر بنے بغیر بیوی بچوں کی دنیوی خواہشات کی تکمیل ممکن نہیں۔

ایسا شخص لازماً مفاد پرستی کا طریقہ اختیار کرے گا۔ وہ ناجائز کو جائز بنائے گا۔ وہ اپنے بچوں کی خاطر خود سب سے پہلے غیر خدا پرست بنے گا، اور پھر اس کو دیکھ کر اس کے گھر والے بھی غیر خدا پرستانہ طریقہ پر چل پڑیں گے۔ اس کی روش آخر کار اس کو اپنے گھر والوں کے لیے شر کا امام بنا دے گی۔

یونانی علوم

سکندر اعظم (۳۲۳ - ۳۵۶ ق م) قدیم یونان کا بادشاہ تھا۔ اس نے ایران سے لے کر ترکستان اور چین تک بہت سے ممالک فتح کر ڈالے۔ اس کے بعد رومی ابھرے اور انھوں نے دوسرے ملکوں کے ساتھ یونان کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اب دونوں سلطنتیں ایک ہو گئیں۔ اس طرح یونانیوں اور رومیوں نے اسلام سے پہلے قدیم زمانہ کی سب سے بڑی سلطنت قائم کی۔ سیاسی کامیابیوں نے قوم کے اندر حوصلہ پیدا کیا۔ ان کی بڑھتی ہوئی خوشحالی نے انھیں علمی کام کے مواقع دیئے۔ ان حالات میں یونان میں فلسفہ اور دوسرے علوم کو فروغ حاصل ہوا۔ تاہم یہ فلسفہ زیادہ تر منطقی بحثوں اور دور از کار قیاس آرائیوں پر مشتمل تھا۔ قسطنطین کے بعد جب رومیوں نے عیسائیت قبول کی تو اس قسم کی کتابوں کو مذہب کے لیے مضر سمجھ کر ممنوع قرار دے دیا گیا۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید کو فلسفیانہ کتابوں کی تلاش ہوئی تو اس نے شاہ روم کو خط لکھا کہ فلسفہ کے متعلق یونانی اور رومی مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے ان کو بھیج دے۔ اس زمانہ کا رومی بادشاہ خود بھی اس قسم کی کتابوں سے بے خبر تھا۔ اس نے معلومات کیں تو ایک بوڑھے راہب نے اس کو ایک بند مکان کا پتہ دیا جہاں عیسائیت کے فروغ کے بعد فلسفہ کی تمام کتابیں لوگوں سے چھین کر رکھ دی گئی تھیں اور باہر سے اس پر بھاری تالا ڈال دیا گیا تھا۔ شاہ روم نے راہب سے پوچھا، کیا یہ کتابیں مسلمانوں کے ملک میں بھیج دی جائیں۔ راہب نے جواب دیا: آپ ضرور ان کو مسلمانوں کے پاس بھیج دیں۔ کیوں کہ یہ کتابیں جس قوم میں پڑھی جائیں گی اس کو لایعنی بحثوں میں الجھا کر اس کے عقائد کو متزلزل کر دیں گی اور نتیجۃً اس قوم کی کمزوری کا باعث ہوں گی۔ چنانچہ شاہ روم نے یہ کتابیں اس مکان سے نکالیں اور ان کو پانچ اونٹوں پر لاد کر بغداد کی طرف روانہ کر دیا۔ جمال الدین قفطی نے لکھا ہے:

ووجدوا فيه كتبا كثيرة فاخذوا	ان کو اس گھر میں بہت سی کتابیں ملیں۔
من جانبها بغير علم وخمس خمسة	انھوں نے کسی تحقیق و جستجو کے بغیر ایک طرف

احمال وسیرت الی السماموں   سے پانچ بوجھ کے بقدر کتابیں لیں اور ان کو
(اخبار الحکماء)   مامون کے پاس بھیج دیا۔

عیسائی راہب کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ دوسری صدی ہجری میں اس قسم کی کتابوں کے اثر سے مسلمان قرآن کے فطری اسلوب سے ہٹ گیے۔ قرآن میں استدلال کی بنیاد حقائق فطرت پر رکھی گئی تھی، قدیم فلسفیانہ کتابوں سے متاثر ہوکر مسلمانوں نے استدلال کی بنیاد قیاسی منطق پر رکھ دی۔ یہ طریق بحث اور طرز استدلال سراسر قرآن سے ہٹا ہوا تھا۔ مگر بعد کو وہ مسلمانوں کے دینی تعلیم کے نصاب میں شامل ہوکر دھیرے دھیرے مقدس بن گیا۔ اس واقعہ کو اب ایک ہزار سال سے زیادہ ہورہے ہیں مگر آج بھی مسلمان منطق و فلسفہ کے اس طلسم سے نکلنے کے لیے تیار نہیں۔

مسلمانوں کے اوپر اس غیر اسلامی علم کے ابدی تسلط کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی صدیوں کے بعد مسلمانوں کے جو علوم مدون ہوئے وہ تمام تر اسی منطقی اسلوب میں مدون ہوئے۔ یہ طرز ہمارے علوم میں اتنا زیادہ دخیل ہوا کہ اب ایک شخص جو قدیم منطق میں کامل درک نہ رکھتا ہو وہ ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ مثلاً شرح ملّا علم نحو کی کتاب ہے اور ہمارے مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ مگر منطق کی اصطلاحات اور منطقی طرز بحث کو جانے بغیر اس کتاب کو سمجھنا ممکن نہیں۔ یہی حال فنون اسلامی کی دوسری کتابوں کا ہے۔ اس طرح منطق اسلامی علوم کی فنی تدوین میں داخل ہوئی اور بالآخر وہ اسلامی کتب خانہ کا ایک مستقل جزو بن گئی۔ اب غیر ضروری طور پر یہ سوال سامنے آگیا کہ قدیم منطق کو چھوڑنا ہے تو اسلام کی قدیم فنی کتب کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج درس نظامیہ میں معقولات کا عنصر اتنا چھا گیا ہے کہ خود اسلامی علوم اس کے نیچے دب کر رہ گیے ہیں۔

تجربات کے درمیان

زندگی کے تجربات کے درمیان آدمی کی جنت یا جہنم کا فیصلہ ہوتا ہے۔ زندگی کا ہر تجربہ آدمی کو ایسے نازک مقام پر کھڑا کر دیتا ہے جس کے ایک طرف خدا کی ناراضی ہے اور دوسری طرف خدا کی رضامندی۔ ایک طرف جھک کر وہ خدا سے دور ہو جاتا ہے اور دوسری طرف جھک کر خدا کی قربت حاصل کرتا ہے۔ زندگی ایک مسلسل امتحان ہے۔ ہر آدمی مسلسل اس نزاکت میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ یا تو حق پرستی کا ثبوت دے کر خدا کی عنایات حاصل کرے یا حق کے خلاف رویہ اختیار کر کے خدا کی رحمتوں سے دور ہو جائے۔

دنیا میں جو کچھ کسی کے ساتھ گزرتا ہے، خواہ وہ دکھ ہو یا سکھ، عزت ہو یا ذلت، سب آزمائش کے لیے ہوتا ہے۔ یہ سب امتحان کے پرچے ہیں۔ ہمارا خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کن حالات میں اس کے بندے نے کس قسم کا جواب پیش کیا۔ تاہم ایسے مواقع پر آدمی تنہا نہیں ہوتا۔ اس کا خدا اس کے پاس ہی کھڑا ہوتا ہے۔ اگر آدمی آزمائش کے موقع پر خدا کی طرف لپکے تو وہ فوراً اس کو سہارا دے کر اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ موقع کے لحاظ سے صحیح ترین جواب پیش کرے۔ اور اگر آدمی آزمائش کے موقع پر خدا کو بھول جائے تو خدا بھی اس کو بھول جاتا ہے۔ وہ اس کو تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ اور جو اس کائنات میں تنہا ہو جائے اس کا ساتھی شیطان کے سوا اور کوئی نہیں۔

جب دکھ کا موقع سامنے آئے تو مومن کو صبر کا جواب پیش کرنا ہے نہ کہ بے صبری کا۔ دنیا کا ساز و سامان اس کو کم ملے تو اس کو اپنے رب کی خدمت میں شکر کے احساسات بھیجنا ہیں نہ کہ ناشکری کے احساسات۔ کسی کو کوئی عزت یا رتبہ مل جائے تو اس کو تواضع میں ڈھل جانا ہے نہ کہ وہ گھمنڈ کرنے لگے۔ کسی کے لیے خدا دولت کے دہانے کھول دے تو اس کو اپنی یہ تصویر پیش کرنی ہے کہ وہ حقوق کی ادائیگی اور دین کی خدمت میں سب کچھ دے کر خالی ہاتھ ہو جانے والا آدمی ہے نہ کہ گن گن کر ان کا ڈھیر لگانے والا۔ غرض آزمائشوں میں پورا اترنے والا بندہ وہ ہے جس کا حال یہ ہو کہ دنیا کا ہر تجربہ اس کے اندر خدا پرستی کی نفسیات جگائے۔ زندگی کا

ہر واقعہ اس کو خدا سے قریب کرنے والا ثابت ہو۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جو زندگی کے معرکوں میں صبر اور شکر کا جواب نہ پیش کر سکیں۔ زندگی کے تجربات میں پڑنا ان کے لیے خدا سے دور کرنے کا سبب بن جائے۔ ایک شخص مسلمان ہے اور ایمانی جذبہ کے تحت زندگی کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ مگر جب دنیا کے فتنوں میں سے کوئی فتنہ پیش آتا ہے تو وہ اس کو اپنی طرف بہالے جاتا ہے۔ دنیا کی چیزوں میں کمی ہوتی ہے تو وہ مایوس ہو کر طرح طرح کے شک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عزت و مرتبہ کا کوئی دروازہ کھلتا ہے تو اس کی کشش اس کو جاہ پسند بنا دیتی ہے۔ وہ اپنی تمام دوڑ دھوپ کو انھیں سمتوں میں موڑ دیتا ہے جو اس کے مقام کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے والی ہوں۔ کسی کو دولت کا کوئی حصہ ہاتھ آجاتا ہے تو اس کی چمک دمک اس کو مبہوت کر دیتی ہے اور وہ دولت کمانے کی راہوں میں اس طرح گم ہو جاتا ہے گویا وہی اس کا دین و ایمان ہے۔

کامیابی کا راز

قال عبد الله بن جعفر یوصی ابنته عند زواجها : یا بنیة ، ایاك والغیرة فانها مفتاح الطلاق ۔ وایاك والمعاتبة فانها تورث الضغینة ۔

حضرت عبد اللہ بن جعفر نے نکاح کے وقت اپنی لڑکی کو نصیحت کی ۔ انھوں نے کہا کہ اے میری بیٹی ، تم غیرت اور نخوت سے بچو ، کیونکہ وہ طلاق کا دروازہ کھولنے والی چیز ہے ۔ اور تم غصہ اور ناراضگی سے بچو ، کیوں کہ اس سے کینہ پیدا ہوتا ہے ۔

یہ بہترین نصیحت ہے جو ایک باپ اپنی بیٹی کو شادی کے وقت کر سکتا ہے ۔ شادی کے بعد لڑکی ایک غیر شخص کے گھر جاتی ہے ۔ اس سے پہلے وہ خونی رشتہ داروں کے درمیان رہ رہی تھی ۔ اب وہ ایسے لوگوں کے درمیان جاتی ہے جن سے اس کا خون کا کوئی رشتہ نہیں ۔ خونی رشتہ دار (باپ ، ماں ، بھائی ، بہن) لڑکی کی ہر بات کو برداشت کرتے ہیں ۔ وہ اپنے میکے میں نخوت دکھا کر بھی بے قدر نہیں ہوتی ۔ وہ غصہ دکھائے تب بھی لوگ اس سے بیزار نہیں ہوتے ۔ مگر سسرال کا معاملہ اس سے سراسر مختلف ہوتا ہے ۔

سسرال میں لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے وہ پیدائشی نرمی نہیں ہوتی جو میکے کے لوگوں میں ہوتی ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سسرال میں اس کا ہر عمل ایک رد عمل پیدا کرتا ہے ۔ میکہ میں لوگ اس کی نخوت کو نظر انداز کر دیتے تھے ، مگر سسرال میں اس کی نخوت کو لوگ اپنی یادوں میں رکھ لیتے ہیں ۔ میکہ میں لوگ اس کے غصہ کو بھلا دیتے تھے ، مگر سسرال میں کوئی شخص اس کے غصہ کو بھلانے کے لیے تیار نہیں ہوتا ۔

ایسی حالت میں سسرال میں نباہ کی واحد شرط یہ ہے کہ لڑکی اپنے مزاج کو نئے ماحول کے مطابق بنا کر رہے ۔ وہ ایسے عمل سے بچے جو ناموافق رد عمل پیدا کرنے والا ہو ۔ کوئی بات اپنی پسند کے خلاف ہو تو اس کو گوارا کرے ۔ کسی بات سے اس کے دل کو رنج پہنچے تو اس کو دل ہی دل میں ختم کر دے ۔ کسی سے امید کے خلاف سلوک کا تجربہ ہو تو اس کی اچھی توجیہ کر کے اس کو دماغ

سے نکال دے۔ ایک لڑکی کے لیے سسرال میں کامیاب زندگی بنانے کی یہی واحد تدبیر ہے۔ اس کے سوا سسرال کے مسئلہ کا کوئی دوسرا حل نہیں۔

آج کا باپ اپنی بیٹی کو یہ سبق دیتا ہے کہ سسرال میں اکڑ کر رہنا ورنہ لوگ تم کو دبالیں گے۔ اس کے برعکس پہلے زمانہ کے باپ اپنی بیٹی کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ سسرال میں دب کر رہنا ورنہ لوگ تم سے اکڑیں گے۔ انہیں دو فقروں میں ماضی اور حال کے فرق کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔

سبق آموز

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں کوئی شخص مجھ سے زیادہ حدیثیں بیان کرنے والا نہیں، سوا عبداللہ بن عمرو بن العاص کے، کیوں کہ وہ آپ سے سن کر حدیثوں کو لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا (ما من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد اکثر حدیثا عنہ منی الا ما کان من عبد اللہ بن عمرو بن العاص فانہ کان یکتب ولا اکتب)

بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایتوں کی تعداد حضرت ابو ہریرہ کی روایتوں سے زیادہ ہو، مگر عملاً ایسا نہیں ہے۔ کیوں کہ حضرت ابو ہریرہ کی روایتوں کی تعداد ۵۳۷۴ تک شمار کی گئی ہے۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایتوں کی تعداد صرف ۷۰۰ ہے۔ یہاں ایک شخص الجھن میں پڑے گا کہ ایسا کیوں ہے۔ حالاں کہ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ یہ صورت حال ہجرت کے ابتدائی زمانہ تک تھی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کو ان کی فوجی صلاحیت کی بنا پر اسلامی فوج کا سردار بنا دیا گیا۔ اب ان کا زیادہ وقت مدینہ سے باہر گزرنے لگا۔ حضرت ابو ہریرہ حسب سابق بیشتر اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہتے اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص زیادہ تر باہر ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداءً اگر حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایتوں کی تعداد زیادہ تھی تو بعد کو حضرت ابو ہریرہ کی روایتوں کی تعداد زیادہ ہو گئی۔

اسی طرح اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک معاملہ کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ جو بات معاملہ کے ایک رخ کے پہلو سے کہی گئی ہو اس کو معاملہ کے دوسرے پہلو پر چسپاں کر دیا جائے تو بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اور معاملہ کی صحیح تصویر آدمی کے سامنے نہیں آتی۔

ایک آیت

قرآن میں اہل نفاق کی ایک خصوصیت یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کا معاملہ کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے : اور لوگوں میں کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر، حالاں کہ وہ بالکل ایمان والے نہیں ہیں۔ وہ فریب دیتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو۔ اور وہ اپنے آپ کے سوا کسی کو فریب نہیں دیتے۔ لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ (ومن الناس من یقول آمنا باللہ وبالیوم الآخر وماھم بمؤمنین۔ یخادعون اللہ والذین آمنوا ومایخدعون إلا أنفسھم ومایشعرون، بقرہ ۸-۹) اس آیت کی تفسیر ایک حدیث سے ہوتی ہے جس کو قرطبی نے اپنی تفسیر میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاتخادع اللہ فانہ من یخادع اللہ یخدعہ اللہ، ونفسہ یخدع لو یشعر قالوا یارسول اللہ وکیف یخادع اللہ قال تعمل بما امرک اللہ بہ وتطلب بہ غیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اللہ کو دھوکا نہ دو کیوں کہ جو اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کو دھوکا دیتا ہے۔ اور وہ شخص خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے اگر وہ جانے۔ لوگوں نے کہا اے خدا کے رسول، کوئی شخص خدا کو کیسے دھوکا دیتا ہے۔ فرمایا : تم وہ عمل کرو جس کو کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور اس کے ذریعہ خدا کے سوا کسی اور چیز کی طلب رکھو۔

ایک آدمی بظاہر اسلامی کام اور دینی عمل میں مشغول نظر آتا ہے۔ مگر اس اسلامی کام اور اس دینی عمل میں وہ اس لیے مشغول ہے کہ اس کے ذریعہ اس کو شہرت وعزت حاصل ہوتی ہے۔ ایسا شخص گویا خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیوں کہ اس کا اصل مقصود تو دنیوی منافع ہیں مگر بظاہر وہ اپنے آپ کو دین کے خادم اور اسلام کے مجاہد کے روپ میں پیش کر رہا ہے۔

ایک اعتراف

۱۹۷۶ میں لندن میں جشن اسلام (Festival of Islam) کے نام سے ایک تقریب منائی گئی تھی۔ اس موقع پر لندن کے مشہور اخبار ٹائمس (۲ اپریل ۱۹۷۶) نے اپنا ایک خصوصی نمبر شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا اسلامی دنیا (The World of Islam)

ٹائمس کی اس خصوصی اشاعت میں ولفرڈ بلنٹ (Wilfred Blunt) کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ میں موصوف نے لکھا تھا کہ انسان کی پوری لمبی تاریخ میں شاید اس سے زیادہ اچنبھے میں ڈالنے والا کوئی واقعہ نہیں ہے جیسا کہ غیر معمولی تیز رفتاری کے ساتھ اسلام کا پھیلاؤ۔ کون اندازہ کر سکتا تھا کہ درمیانی عمر کا ایک شخص جو کسی وقت مکہ کا تاجر اور تجارتی قافلہ کا سردار ہو، جس کو ۶۲۲ء میں اس کے وطن سے نکال دیا گیا ہو اور وہ مدینہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوا ہو، وہ ایک ایسے مذہب کی بنیاد رکھے گا جو اس کی موت کے ایک صدی کے اندر مہذب دنیا کے آدھے حصہ میں قائم ہو جائے گا۔ جو مغرب میں فرانس کے قلب تک پہونچ جائے گا اور مشرق میں وہ دریائے سندھ کو عبور کر کے چین کی سرحد تک جا پہونچے گا۔

ولفریڈ بلنٹ مزید لکھتے ہیں کہ فرض کرو کہ اسلام کا یہ سیلاب نہ آتا تو کیا ہوتا۔ مغرب میں سائنس کی ترقی کی تاخیر کی سب سے بڑی وجہ رومی ہندسہ کا بے ڈھنگا پن تھا۔ عربی ہندسہ جو آٹھویں صدی عیسوی کے آخر میں ہندستان سے بغداد پہونچ چکا تھا، اگر وہ جلد ہی مغربی یورپ پہونچتا اور مجموعی طور پر اختیار کر لیا جاتا تو وہ بہت سی سائنسی ترقی جس کو ہم اٹلی کی نشأۃ ثانیہ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں، وہ کئی سو سال پہلے حاصل ہو جاتیں۔

ولفرڈ بلنٹ (۱۸۴۰ - ۱۹۲۲) اسلامی تہذیب سے بہت متاثر تھا۔ اس کی ایک کتاب کا نام ہے اسلام کا مستقبل (*The Future of Islam*) یہ کتاب پہلی بار ۱۸۸۲ میں شائع ہوئی تھی۔ اس نے کئی مسلم ملکوں کا دورہ بھی کیا تھا۔ اگلے صفحے پر اس کے اصل الفاظ نقل کیے جاتے ہیں۔

Most Amazing Event

Islam is one of the great religions of the world — numerically second only to Christianity. Iranis no more than a small corner of that vast territory, stretching from the Atlantic to the South China Sea, where the Muezzin's voice is still to be heard, though today often recorded, calling the faithful to prayer.

There is, perhaps, nothing more amazing in the whole long history of mankind that the extent and the rapidity of the dissemination of Islam. Who could possibly have foreseen that a middle-aged one-time Meccan tradesman and caravan leader, driven in the year 622 from his birth-place to take refuge in Yathrib (Medina), was to found a religion which within a century of his death would have established itself over half the civilized world, would have struck westwards into the heart of France and eastwards crossed the Indus and penetrated to the frontiers of China.

And supposing the tide of Islam had not been stemmed? Nothing so delayed the advance of science in the West as the clumsiness of the Roman numerals. Had the Arabic numerals, which had reached Baghdad from India towards the end of the eighth century, been soon afterwards introduced into and adopted by western Europe as a whole, much of that scientific progress which we associate with the Renaissance in Italy might have been achieved several centuries earlier.

by Wilfrid Blunt, *The Times* (London) April 2, 1976

سوئزرلینڈ کا سفر
دوسری قسط

جنیوا کی کانفرنس (۷-۹ دسمبر ۱۹۸۶) کے موقع پر میں نے جو انگریزی مقالہ پیش کیا، منتظمین کی طرف سے اس کی فوٹو کاپی کر کے تمام لوگوں کے درمیان اس کو تقسیم کیا گیا۔ اس مقالہ کا عنوان تھا :

Religious Liberty in Islam

یہ تقریباً آدھ گھنٹہ کا مقالہ تھا۔ اس میں میں نے قرآن اور حدیث اور اسلامی تاریخ کے حوالوں سے دکھایا کہ اسلام اگرچہ اس کا قائل نہیں کہ سچائی کئی ہے یا کئی ہو سکتی ہے۔ اسلام کے نزدیک سچائی صرف ایک ہے۔ اس کے باوجود اسلام اس کا قائل نہیں کہ سچائی کو منوانے کے لیے جبر کیا جائے۔ سچائی کو بزور منوانا سچائی کی توہین ہے۔ اس دنیا میں لین دین کا اصول رائج ہے۔ اس لیے اگر ہم اپنے لیے فکر کی آزادی چاہتے ہوں تو ہمیں دوسروں کو بھی فکر کی آزادی دینی ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ سچائی وہ ہے جو آدمی کو بطور دریافت ملے اور دریافت کے طور پر سچائی کسی آدمی کو اسی وقت ملتی ہے جب کہ وہ آزادانہ طور پر سوچے اور آزادانہ طور پر ایک نتیجہ تک پہونچے۔

مزید میں نے تاریخی حوالوں سے بتایا کہ اسلام ساتویں صدی میں آیا جب کہ عام طور پر ساری دنیا میں مذہبی جبر کا رواج تھا۔ مگر اسلام نے زمانی رواج کے سراسر خلاف مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ اس سلسلہ میں میں نے مختلف تاریخی حوالے نقل کیے۔ مثلاً ایک مستشرق نے لکھا ہے کہ اسلام نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں اپنے ماتحت غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی مکمل آزادی دی۔ یہ بات ساتویں صدی کی تاریخ میں انتہائی انوکھی تھی :

They were allowed the free and undisturbed exercise of
their religion — so striking i 1 the history of the seventh century.

اس کانفرنس میں ہر مذہب کے لوگ شریک تھے۔ تاہم عیسائی حضرات کی تعداد زیادہ تھی جو امریکی اور یورپی علاقوں سے آئے تھے۔ یہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ متعدد لوگ بڑے بڑے

اداروں کے ذمہ دارانہ مناصب سے تعلق رکھتے تھے ۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ ذاتی ملاقاتیں رہیں۔ یہ ذاتی ملاقاتیں زیادہ تر کھانے اور ناشتہ کی میز پر ہوتی تھیں ۔ ان کی اکثریت کا یہ حال تھا کہ جب وہ میرے بارہ میں معلوم کرتے کہ میں "اسلامک سنٹر" کا صدر ہوں تو وہ غیر معمولی دل چسپی کے ساتھ اسلام کے بارہ میں باتیں کرنے لگتے ۔ بیشتر لوگوں نے اس تاثر کا اظہار کیا کہ ہم اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ۔ مگر اسلام کے بارہ میں ہم کو اپنی زبان میں کتابیں نہیں ملتیں ۔

ڈاکٹر گوریری (Dr Claudio J. Guerrieri) ارجنٹینا سے آئے تھے ۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے حال میں عالمی مذاہب پر ۲۰۰ کتابیں منگائی ہیں مگر ان میں ایک لفظ بھی اسلام پر نہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ اسلام کے بارہ میں اس بلیک آوٹ کا کون ذمہ دار ہے۔

اس کانفرنس میں میں تنہا مسلمان تھا جو کسی ملک سے اسلام کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ اسی طرح شرکار کانفرنس میں ایک ہندو تھے ۔ ان کا نام ڈاکٹر موہن کانت گوتم تھا۔ ان کی پیدائش ہندستان (کاس گنج) میں ہوئی ۔ مگر پچھلے ۲۰ سال سے وہ باہر رہتے ہیں۔ آج کل وہ ندرلینڈ میں ساوتھ ایشین اسٹڈیز کے ڈائرکٹر ہیں ۔ انھوں نے مجھ سے گفتگو کے دوران کہا کہ اگرچہ میں ایک ہندو ہوں ۔ مگر مجھے اسلام کے مطالعہ سے بہت دل چسپی ہے ۔ انھوں نے اسلام پر چند کتابیں پڑھی ہیں ۔ میں نے انھیں اسلامی مرکز کی چند مطبوعات پیش کیں ۔ بدھزم کے نمائندہ پھنسوگ ونگیال (لندن) تھے ۔ ان کو بھی انگریزی مطبوعات دی گئیں ۔

مسز سوسن ٹیلر (Dr Susan Taylor) ایک تعلیم یافتہ معمر خاتون تھیں ۔ وہ امریکہ (واشنگٹن ڈی سی) سے آئی تھیں ۔ وہ اگرچہ ایک عیسائی مذہبی ادارہ کی عہدیدار ہیں ۔ تاہم انھوں نے اسلام کے مطالعہ کے لیے اپنی گہری دل چسپی کا اظہار کیا ۔ انھوں نے بھی یہی شکایت کی کہ اسلام پر مطالعہ کے لیے انگریزی میں کتابیں نہیں ملتیں ۔ ان کو بھی اسلامی مرکز کی چند انگریزی مطبوعات پیش کی گئیں ۔

اگلے صفحہ پر کانفرنس کے پروگرام میں باضابطہ طور پر حصہ لینے والوں کی فہرست کا عکس دیا جارہا ہے۔ یہ فہرست خود کانفرنس کی طرف سے شائع کرکے تقسیم کی گئی تھی ۔ اس فہرست میں ڈاکٹر جوزف پیج کا نام اٹھارویں نمبر پر ہے ، حالاں کہ وہ ڈبلوسی آر ایل کے صدر ہیں جس کی طرف سے یہ کانفرنس کی گئی تھی ۔ ہندستان جیسے ملکوں میں اس قسم کی ترتیب ناممکن ہے ۔

WORLD COUNCIL ON RELIGIOUS LIBERTY (WCRL)

HOTEL INTERCONTINENTAL GENEVE
Geneva, Switzerland
December 7-9, 1986

PROGRAM PARTICIPANTS

Ms. Berdina Auma: Director of Public Affairs, All Africa Conference of Churches, Nairobi, Kenya

Mr. Adepoju Akomolafe: Vice President, Christian Council of Nigeria, Logos, Nigeria

Dr. Petro Bilaniuk: Professor, Faculty of Theology, University of St. Michael's College, Toronto, Ontario; and Honorary Canon of the Ukranian Catholic Church

Rabbi Daniel Cohan-Sherbok: Professor, Faculty of Humanities, University of Kent, Canterbury, England

Msgr. Freddie Delgado: Member and Former Coordinator of the Human Rights Commission of El Salvador and Former Secretary of the Episcopal Conference, 1973-82, El Salvador

Dr. Frances Dessart: Pasteur; Professor, Director, Eglise Evangelique International, Nanur, Belgium

Rev. Oka Fau'olo: General Secretary, Samoa Council of Churches, Aspia, Western Samoa

Rev. Kenneth M.J. Fernando: Director, Ecumenical Institute for Study and Dialogue, Colombo, Sri Lanka

Mr. Vincent Foote. Director Baptist Laity, Greensboro, NC

Dr. Claudio J. Guerneri. Plastic Surgeon and Religious Activist, Buenos Aires, Argentina

Bro. Andrew Gonzalez: President, De La Salle University, Manila, Phillipnes

Dr. Mark N. Gretason: Dean, Central School of Religion, Worcester, United Kingdom

Honorable Horst Keilau: Chief, Prevention of Discrimination Branch, Center for Human Rights, Geneva, Switzerland

Dr. Wahiduddin Khan: President, The Islamic Center, New Delhi, India

Dr Oscar McLaughlin: Pastor St. Francis AME Zion Church, Port Chester, New York (USA): Member Board of Trustees, Shaw Divinity School, Raleigh, N.C. (USA)

Dr. L.M. Msibi: Founding Director, Ma-African House, Johannesburg, South Africa

Honorable Robert G Mueller: Assistant Secretary General, United Nations, New York, N.Y.

Dr. Joseph C. Paige: President, WCRL, Executive Vice President, Shaw Divinity School, Raleigh, North Carolina (USA)

Dr. Gioufranco Rossi: Secretary General, International Association for the Defense of Religious Liberty, Bern, Switzerland

Dr. Don Sills: President, Coalition for Religious Freedom, Washington, D.C.

Dr. Christian J.G. Vonck: Professor and Executive Director, Faculty of Comparative Religion, Antwerpen, Belgium

Mr. Phuntsog Wangyal: Representative of Dalai Lama, London, United Kingdom

Dr. Auguste-Raynold Werner: Accredited Representative to the United Nations for International Association for Religious Fredom (IARF) and International Progress Organization (IPO), Geneva

تنظیم (WCRL) کے صدر ڈاکٹر جوزف بیچ نے بتایا کہ پچھلے ایک سال (ستمبر ۱۹۸۵) سے ہم اس مشن کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہم نے اس دوران میں بہت کچھ کہا ہے اور شائع کیا ہے۔ مگر ہم کو سب سے زیادہ خط اور تار اور ٹیلی فون جس چیز پر ملے وہ صرف ایک چھوٹا سا جملہ تھا۔ یہ جملہ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا :

Atheistic communism is the number one enemy of religious liberty.

(بے خدا اشتراکیت مذہبی آزادی کی دشمن نمبر ایک ہے) یہ نفسیات تمام قوموں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے، اور خود مسلمانوں میں بھی۔ کسی دشمن کے خطرہ کی گھنٹی بجائیے تو سب سے زیادہ بھیڑ آپ کے گرد جمع ہو جائے گی۔ اور جس پیغام میں اس قسم کے خارجی خطرے کی گھنٹی نہ بجائی جائے، اس کو ہمیشہ بہت کم مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی لیڈر کی مقبولیت کا پیمانہ وہ بھیڑ نہیں ہے جو مذہبی خطرہ یا قومی خطرہ کا الارم بجا کر جمع کی گئی ہو، اس کا پیمانہ صرف وہ مجمع ہے جو مثبت پیغام کے نتیجہ میں اس کے گرد جمع ہوا ہو۔ بار بار یہ منظر سامنے آیا ہے کہ "خطرہ" کی نفسیات کو جگانے کے نتیجہ میں ایک لیڈر کے گرد بھیڑ جمع ہوئی۔ مگر جیسے ہی اس نے انھیں کوئی ایسا پیغام دینا چاہا جس میں خود اپنے آپ کو بدلنے کا تقاضا ہو تو تمام بھیڑ اس طرح منتشر ہو جائے گی جیسے وہ کبھی جمع ہی نہیں ہوئی تھی۔

ایک امریکی مقرر ڈاکٹر ڈونال سل (Dr Donal Sills) نے کہا کہ امریکہ کے چرچ اس وقت تجارت کا ذریعہ (American churches are a source of business) ہیں۔ یہی بات نائجیریا کے اینگلیکن چرچ کے ایک ذمہ دار آرکومولا (Adepoju Akomolafe) نے بھی کہی۔ امریکہ کے مسیحی چرچ کے بارہ میں خود مسیحی مقررین کی زبان سے یہ بات سن کر تھوڑی دیر کے لیے مجھے تعجب ہوا۔ مگر پھر میں نے یہ سوچا کہ یہ تو وہی بات ہے جو آج تمام مذاہب کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ حتی کہ خود مسلمانوں کے لیے بھی اب ان کا دین ایک تجارت بن گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ کسی کی تجارت یہ ہے کہ وہ دین کے نام پر پیسہ حاصل کرے اور کسی کی تجارت یہ ہے کہ وہ دین کے نام پر شہرت اور قیادت کے مقام پر پہونچے۔

ارباب عہدہ سے ذاتی طور پر ملاقات کرنے میں مجھے ہمیشہ تکلف ہوتا ہے۔ اس بنا پر میں ڈاکٹر (Dr Joseph Paige) سے ذاتی ملاقات نہ کر سکا تھا۔ ایک موقع پر انھوں نے خود اس کی
رت پیدا کر دی۔ وہ اچانک اٹھ کر آئے اور میرے پاس خالی کرسی پر بیٹھ گیے۔ انھوں نے میرے
تہ کئی تصویریں کھنچوائیں۔ اس دوران ان سے گفتگو ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے کانفرنس کے
بحث موضوع پر اسلام کا تصور پیش کیا۔ اور انھیں انگریزی الرسالہ کے دو شمارے دیئے۔
لے دن میں نے دیکھا کہ وہ الرسالہ (انگریزی) ایک صاحب کو دکھا رہے ہیں۔ وہ اس کو اہتمام
ے ساتھ اپنی فائل میں رکھے ہوئے تھے۔

اجتماعی مواقع پر ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اگر مقرر کی زبان اور سامعین کی زبان ایک دوسرے
ے مختلف ہو تو تقریر کو سامعین کے لیے کس طرح قابل فہم بنایا جائے۔ پہلے زمانہ میں اس کا طریقہ
تھا کہ مقرر کے ساتھ ایک اور آدمی بطور ترجمان کھڑا ہو اور وہ مقرر کی تقریر کو سامعین کی زبان میں
ان کرے۔ اس کے بعد ان آلات کا زمانہ آیا جن کو عام طور پر ہڈسٹ (Head set) کہا جاتا
ہے۔ اس میں تار کے ذریعہ مقرر کے الفاظ ترجمان تک پہونچائے جاتے تھے۔ اور دوبارہ تار کے ذریعہ
رجمان کی آواز سامعین تک پہونچتی تھی۔

اب الکٹرانکس کے دور میں مزید ترقی یافتہ طریقے وجود میں آگیے ہیں۔ اب ایسے ہڈسٹ بنائے
گیے ہیں جن کے لیے تار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تار کے بغیر کام کرتے ہیں۔ اعلیٰ معیار کی
کانفرنسوں میں اب یہی ہڈسٹ استعمال ہوتے ہیں۔ جنیوا کی کانفرنس میں بھی اسی کا انتظام تھا۔
ثلاً مقرر اگر فرانسیسی یا اسپینی زبان میں بول رہا ہو تب بھی عین اسی وقت چھوٹے سے ہڈسٹ کے
ذریعہ اس کو انگریزی میں سنا جا سکتا تھا۔ سامع کی نسبت سے مقرر کے الفاظ ناقابل فہم بولی کی حیثیت
رکھتے تھے۔ مگر ہڈسٹ کے استعمال سے وہ سننے والوں کے لیے قابل فہم بن جاتے تھے۔

اس قسم کی چیزیں آج عام ہو چکی ہیں۔ لوگ ان کو "سائنس کا معجزہ" کہتے ہیں۔ مگر حقیقت
یہ ہے کہ وہ خدا کا معجزہ ہے۔ میرا یہ حال ہے کہ میں جب اس قسم کی کسی سائنسی چیز کو دیکھتا ہوں تو مجھے
یسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی آیت (واعطاکم من کلّ ماسألتموہ) کی تفسیر ہے۔ وہ
راہ راست خداوند عالم کا عطیہ ہے نہ کہ حقیقۃً انسانی سائنس کا عطیہ۔

مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کی طرف سے اکثر یہ الفاظ سننے پڑتے ہیں کہ تمہارے یہاں تو ستر سے زیادہ فرقے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرے مذاہب میں اس سے بھی زیادہ فرقے ہیں۔ امریکہ کے ونسنٹ فوٹ (Vincent Foote) ایک بابٹسٹ (Baptist) تھے۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں ۲۵۰ قسم کے باپٹسٹ ہیں۔ اور مجموعی طور پر عیسائیوں میں تین ہزار فرقے ہیں۔ ابھی حال میں (۵۰ سال پہلے) ایک نیا عیسائی فرقہ بنا ہے۔ اس کا صدر دفتر امریکہ (واشنگٹن ڈی سی) میں ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Church of Scientology International

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور دوسرے مذاہب میں اصل فرق فرقے کی کثرت کا نہیں ہے بلکہ جھگڑے کی کثرت کا ہے۔ مسلمان بات بات پر آپس میں لڑتے رہتے ہیں اس لیے کم فرقہ ہونے کے باوجود وہ کثرت فرقہ کے لیے مشہور ہیں۔ جب کہ دوسرے مذاہب کے لوگ زیادہ فرقے ہونے کے باوجود اس طرح آپس میں نہیں لڑتے، اس لیے ان کا باہمی اختلاف دوسروں کو بہت کم دکھائی دیتا ہے۔

کناڈا کے ایک پادری (Petro Bilaniuk) نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اشتراکی روس میں کس طرح مذہبی تشدد ہو رہا ہے۔ انھوں نے اعداد و شمار کی روشنی میں کافی تفصیلات بتائیں۔ مگر یہ تمام تفصیلات صرف عیسائی مذہب اور عیسائی فرقہ پر تشدد کے بارہ میں تھیں۔ ان کی تقریر کے مطابق گویا اشتراکی روس میں مسلمانوں کا کوئی وجود نہیں اور نہ ان پر کوئی تشدد ہوا ہے۔

بظاہر یہ یک رُخا جائزہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر ٹھیک یہی طریقہ خود مسلمان بھی اختیار کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی کتابیں اور مضامین اشتراکی روس کے بارہ میں پڑھیے تو ان میں عام طور پر صرف اس تشدد کا ذکر ملے گا جو اشتراکی انقلاب کے بعد وہاں کے مسلم فرقہ پر ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی نظر میں اصل مسئلہ اپنی قوم کا ہے نہ کہ انسانی اصول کا۔ انھیں حقیقۃً قومی شکایت ہے نہ کہ اصولی شکایت۔

ڈاکٹر لیک (Dr Daniel Lack) نے کہا:

Religious rig!.ts are less fundamental than the other rights, like economic rights.

(مذہبی حقوق دوسرے حقوق سے کم بنیادی ہیں، مثلاً معاشی حقوق سے) یہ سن کر مجھے ایک لمحہ کے لیے

جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا کہ جدید انسان اگر مذہب کو مانتا بھی ہے تو اس کو کم درجہ دینے کے بعد مانتا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عملی طور پر مسلمانوں کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ مسلمانوں کی بڑی بڑی سرگرمیوں کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں بھی دین دوسرے درجہ پر چلا گیا ہے۔ اور دوسری دوسری چیزوں نے نمبر ایک کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ حتی کہ بہت سی تحریکیں جو بظاہر دین کے نام پر اٹھیں ان کی تہ میں بھی حقیقۃً سیاسی اور معاشی اور قومی محرک زیادہ کام کرتا ہوا ملے گا اور دینی محرک کم۔

اس طرح کی کانفرنسوں میں عمدہ الفاظ بولنے والے تو بہت ملتے ہیں۔ مگر ایسا کوئی شخص شاذونادر ہی نظر آتا ہے جو واقعۃً درد اور فکر کا حامل ہو۔ ایک صاحب کے چہرے پر دردمندی کے آثار دیکھ کر مجھے ان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ان کا نام پھنتسوگ ونگیال (Phuntsog Wangyal) تھا۔ مگر ان سے گفتگو کے بعد میرا حسن ظن باقی نہ رہ سکا۔ وہ بدھسٹ تھے اور سرے سے خدا کو ماننے نہ تھے۔ ان کی دردمندی کا راز یہ تھا کہ وہ تبتی ہیں۔ تبت میں چین میں داخلہ کے بعد انھیں تبت چھوڑنا پڑا۔ آج کل وہ لندن میں رہتے ہیں۔ وہ برطانی شہریت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اب تک انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ وہ اپنے آپ کو صرف ایک "رفیوجی" سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ ساری دنیا میں کہیں ان کا کوئی وطن نہیں۔ ان کا درد "رفیوجی" ہونے کے احساس پر مبنی تھا نہ کہ اللہ کے سامنے جواب دہی کے احساس پر۔

مسٹر ونگیال سے میں نے پوچھا: آپ لوگ کیا دلائی لاما کو خدا یا خدا کا اوتار (God-incarnate) سمجھتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ عام طور پر بدھوں کا یہی خیال ہے۔ وہ ان کو زندہ بدھا (Living Buddha) مانتے ہیں۔ مگر میں ایسا خیال نہیں کرتا۔ میرے نزدیک وہ ایک اچھے انسان ہیں اور بس۔ مسٹر ونگیال کے اس جواب کے بعد میں نے سوچا کہ دوسرے مذاہب میں بگاڑ کی وجہ سے ایسے عقیدے شامل ہو گئے ہیں جن کو جاہل عوام تو مان سکتے ہیں، مگر ان کا کوئی شخص جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے تو وہ اپنے علمی ذہن کے ساتھ ان عقائد کی موافقت نہیں پاتا، اس لیے وہ ان کو "معتدل" بنا کر مانتا ہے۔ مگر اسلام چوں کہ ہر قسم کی تبدیلی سے پاک ہے۔ اس لیے اسلام کا ماننے والا جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے تو اس کو یہ ضرورت نہیں ہوتی کہ اپنے دینی عقائد کو

"معتدل" بنائے ۔ اس کا علم اور اس کا عقیدہ دونوں اسے یکساں سطح کی چیز معلوم ہوتے ہیں ـــــ اسلام کو انسانی تحریفات سے محفوظ رکھ کر اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر کتنا بڑا احسان فرمایا ہے ۔

اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات اور الرسالہ (انگریزی) کے کچھ شمارے میرے ساتھ تھے ۔ یہ کتابیں اور الرسالہ انگریزی کانفرنس کے اکثر شرکا کو دیے گئے ۔ لوگوں نے کافی دل چسپی کے ساتھ ان کو لیا اور مزید انگریزی لٹریچر کی خواہش ظاہر کی ۔

جنیوا ہوٹل میں جن اصحاب سے میری ملاقاتیں ہوئیں ۔ ان میں ایک ممتاز شخص ڈاکٹر احمد مختار مبو تھے ۔ وہ افریقی ہیں اور اقوام متحدہ کے مشہور ادارہ یونسکو کے ڈائرکٹر جنرل ہیں ۔ ان کا دفتر پیرس میں ہے ۔ وہ ایک اور کانفرنس کے سلسلہ میں جنیوا آئے تھے اور ہوٹل انٹر کانٹی ننٹل میں مقیم تھے :

Dr Amadou-Mahtar M'Bow, Director General UNESCO
7, Place de Fontenenoy, 75700 Paris (Tel. 45681310–45681311)

یہ نہایت سنجیدہ بزرگ تھے ۔ قرآن (بغیر ترجمہ) ان کے ساتھ تھا ۔ مگر وہ عربی سے واقف نہ تھے ۔ اسلامیات پر بھی ان کا باقاعدہ مطالعہ نہیں ہے ۔ ان کو میں نے الرسالہ (انگریزی) اور پیغمبر انقلاب (انگریزی) مطالعہ کے لیے دیا ۔ اگلے دن دوبارہ ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں نے پیغمبر انقلاب (انگریزی) پڑھنا شروع کر دیا ہے ۔ یہ بلاشبہ ایک ممتاز (Excellent) کتاب ہے ۔ انھوں نے کہا کہ کتاب ختم کرنے کے بعد میں اپنے مفصل تاثرات آپ کو لکھوں گا ۔

کناڈا کے ایک پروفیسر ڈاکٹر برائنٹ سے ملاقات ہوئی ۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

Dr M. Darrol Bryant, University of Waterloo
5 Park Ave. W., Elmira, Ontario, Canada N3B 1K9
Phones – Home: 519–669–5321, Office: 519–884-4400

ڈاکٹر برائنٹ کو الرسالہ انگریزی کے چند شمارے دیے گئے ۔ انھوں نے ان کو پڑھ کر ان سے غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کیا ۔ میں نے الرسالہ کی انگریزی زبان کے بارے میں ان کی رائے پوچھی ۔ انھوں نے کہا کہ اس کی زبان بہت اچھی اور بہت واضح ہے ۔ انھوں نے کہا کہ عام طور پر ہندستانی لوگ جو انگریزی لکھتے ہیں اس کو مغربی لوگ پڑھ نہیں پاتے ۔ مگر الرسالہ کو میں نے نہایت دل چسپی کے ساتھ پڑھا ۔

اس کی زبان ایسی تھی کہ اس کو سمجھنے میں مجھے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ اتنی اچھی انگریزی آپ خود لکھتے ہیں یا کوئی اور ہے جو اس کو لکھتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کو فرشتے (Angels) لکھتے ہیں۔ یہ سن کر وہ دیر تک ہنستے رہے۔

گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ امریکہ اور کناڈا میں پچھلے برسوں میں مذہب کا مطالعہ کرنے کا رجحان بڑھا ہے اور اسلام کا مطالعہ کرنے کا بھی۔ مگر وہاں کا عام باشندہ ابھی تک اسلام کے بارہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں کا ایک عام آدمی اسلام کے نام سے صرف "خمینی" کو جانتا ہے اور خمینی کی تصویر جو امریکہ میں ہے اس کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی باتوں سے میں نے یہ تاثر لیا کہ اسلام کے تعارف پر اگر ایسی انگریزی کتابیں شائع کی جائیں جن کی زبان واقعی انگریزی ہو، وہ "انڈین انگلش" نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ یہ کتابیں جدید اسلوب میں تیار کی گئی ہوں تو مغرب کے لوگ ان کو نہایت شوق کے ساتھ لیں گے اور ان کا باقاعدہ مطالعہ کریں گے۔

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ عرصہ سے سوئزرلینڈ میں رہتے ہیں اور اب یہیں کی شہریت حاصل کرلی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر شدید غم کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت مسلمانوں کی حالت حیرت ناک حد تک درد اور کرب کی کہانی بن گئی ہے۔ وہ لوگ جو اس لیے پیدا کیے گئے تھے کہ وہ زمین پر خیر امت ہوں، وہ آج آخری بربادی کے گڑھے میں پہونچ گئے ہیں۔ وہ آج اپنے دشمنوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ آج ایک مسلمان اپنے بھائی کے مقابلے میں اپنے دشمن پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

> Those who were created to be the best nation on earth have descended to a bottomless pit. now they are subjected to their enemies to the extent that a Muslim has more trust in the enemy than in his brother.

میں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ انجام اس لیے ہے کہ انھوں نے مسلمان کی حیثیت سے اپنے فرض منصبی کو چھوڑ دیا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ فرض منصبی کیا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ دعوت الی اللہ ہے۔ یعنی خدا کے سچے دین کو تمام اقوام عالم تک پہونچانا۔ یہ طرز فکر ان کے لیے بالکل نیا تھا۔ اب تک ان کا ذہن یہ تھا کہ مسلمان جدید ترقیاتی شعبوں میں پچھڑ گیے ہیں اور ان شعبوں میں آگے بڑھ کر وہ اقوام عالم کے ہم سطح

ہوسکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مسلمان "خیر امت" اسی اعتبار سے ہیں کہ وہ خدا کے دین کی پیغام بری کریں۔ اس لیے ان کی ترقی اور سربلندی تمام تر اسی عمل پر موقوف ہے۔ اس عمل کو اختیار کرکے وہ "سب سے اعلیٰ" قوم بن سکتے ہیں۔ اور اگر وہ اس عمل کو چھوڑ دیں تو وہ سب سے بری قوم بن جائیں گے۔ اس کے بعد ان پر یرمیاہ نبی کے وہ الفاظ صادق آئیں گے جو بائبل میں اس طرح نقل کیے گیے ہیں :

Reprobate silver shall men call them, because the Lord hath rejected them (Jeremiah 6:30).

جنیوا میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عرب رہتے ہیں۔ انھوں نے میری عربی کتاب (الاسلام یتحدیٰ) پڑھی تھی اور اس سلسلہ میں ان کا ایک خط مجھے دہلی کے پتہ پر ملا تھا۔ یہاں ان سے ملاقات کا خیال ہوا۔ مگر ان کا ٹیلی فون نمبر میرے پاس موجود نہ تھا۔ کمرہ میں رکھی ہوئی ٹیلی فون ڈائرکٹری پر نظر پڑی تو میں نے سوچا کہ شاید اس میں ان کا نام ہو۔ ڈائرکٹری دیکھنا شروع کیا تو اس میں ان کا نام موجود تھا۔ چنانچہ اس کے مطابق میں نے اپنے کمرہ سے ٹیلی فون کیا تو وہ مل گیے۔ اولاً ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد وہ ہوٹل تشریف لائے تو زیادہ تفصیل کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

Yahya Basalamah, Grange-Levrier 2,
1220 Les Avanchets, Geneva. Tel. (022) 960625

ان کو الرسالہ (انگریزی) اور پیغمبر انقلاب (انگریزی) وغیرہ کتابیں دی گئیں۔ وہ تبلیغی جماعت سے واقف تھے۔ مگر انھیں تبلیغی جماعت پر بعض پہلوؤں سے اعتراض تھا۔ میرے پاس تبلیغی تحریک کا انگریزی ترجمہ تبلیغ موومنٹ (*Tabligh Movement*) موجود تھا، وہ میں نے انھیں دیا۔ عربی ان کی مادری زبان ہے۔ مگر وہ انگریزی زبان سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔

جناب یحییٰ باسلامہ سے یہ ملاقات ٹیلی فون کے ذریعہ ممکن ہوئی۔ ان کے علاوہ جنیوا میں مقیم کئی اور صاحبان سے ملاقات کی صورت بھی ٹیلی فون ہی کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ ٹیلی فون بھی کیسی عجیب نعمت ہے۔ حسب ذیل تین نمبروں پر بٹن دبا کر میں ایک منٹ کے اندر دہلی سے بات کر سکتا تھا :

0091 - 11 - 611128

مگر موجودہ زمانہ میں کثرت استعمال نے اس نعمت کی حیثیت پر غفلت کا پردہ ڈال دیا ہے۔ بے شمار

لوگ رات دن ٹیلی فون استعمال کرتے ہیں مگر شاید ہی اس زمین پر وہ انسان موجود ہو جس کا یہ حال ہو کہ جب وہ ٹیلی فون کا نمبر ڈائل کرے اور دور دراز مقام کے آدمی سے اس کی اس طرح بات ہونے لگے جیسے کہ وہ اس کے بالکل قریب موجود ہے تو احساس نعمت سے اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ انسان سے ربط قائم کرتے ہوئے اس کی روح خدا سے مربوط ہو جائے۔

جنیوا کی ملاقاتوں میں سے ایک یادگار ملاقات ڈاکٹر عبدالحکیم طبیبی کی تھی۔ وہ ایک افغانی ہیں۔ افغانستان میں روس کے داخلہ سے پہلے وہ وہاں اعلیٰ سرکاری عہدہ پر تھے۔ وہ افغانستان کی طرف سے تقریباً دس ملکوں میں سفیر رہ چکے ہیں۔ آخر وقت میں وہ اقوام متحدہ میں افغانستان کے نمائندہ تھے اور نیویارک میں مقیم تھے۔ افغانستان میں جب انقلاب آیا اور روسی فوجیں وہاں داخل ہو گئیں تو ۱۹۷۸ میں انھوں نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور جنیوا چلے آئے۔ یہاں انھوں نے ایک کافی بڑا ادارہ قائم کیا ہے۔ وہ افغانستان کی تحریک مجاہدین کے ممتاز نمائندوں میں سے ہیں اور جنیوا سے ایک ماہانہ مجلہ نکالتے ہیں جس کا نام جمال الدین افغانی کے قدیم مجلہ کے نام پر "العروۃ الوثقیٰ" رکھا گیا ہے۔ سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۲-۱۸۳۸) نے ۱۸۸۴ میں پیرس سے ایک عربی ماہنامہ العروۃ الوثقیٰ کے نام سے نکالا تھا۔ مگر چند شماروں کے بعد وہ بند ہو گیا۔ اب ڈاکٹر طبیبی اسی نام سے عربی اور انگریزی میں ایک ماہنامہ جنیوا سے نکالتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سی کتابیں عربی اور انگریزی میں شائع کی ہیں:

Dr Abdul Hakim Tabibi, 81, Rue De Lyon, Ch.
1203, Geneva. Tel. (022) 442268, (022) 983911

ڈاکٹر طبیبی نے اصرار کیا کہ میں جنیوا میں مزید قیام کروں اور ان کے "گیسٹ ہاؤس" میں ٹھہروں۔ اس طرح مجھے مزید تفصیل سے سوئزرلینڈ کو جاننے کا موقع مل جاتا نیز دعوتی کام کے مزید مواقع ملتے۔ مگر میرے لیے زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہ تھا۔ اس لیے میں ان کی پیش کش کو قبول نہ کر سکا۔ ڈاکٹر طبیبی کی لائبریری کے لیے میں نے اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات پیش کیں۔ ان میں "تبلیغ موومنٹ" کا ایک نسخہ بھی شامل تھا۔

یہاں کی ملاقاتوں میں سے ایک دل چسپ ملاقات وہ تھی جو مسٹر مک کی

سے ہوئی :

Richard Mc Kee, U.S. Mission, 11, route de Pregeny
1292 Chambesy, Geneva, Switzerland.

مسٹر مک کی امریکی ہیں اور امریکی سفارت خانہ میں مشیر کی حیثیت سے متعین ہیں۔ گفتگو کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ وہ عربی زبان جانتے ہیں۔ ان سے چند ملاقاتیں ہوئیں اور ہر بار ان سے عربی میں گفتگو ہوتی رہی۔ وہ روانی کے ساتھ عربی بولتے ہیں۔ انھیں مجھ سے کچھ کہنا ہوتا تو خالص عربی انداز میں "حضرتکم" کے لفظ سے خطاب کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی عرب بول رہا ہے۔ ایک بار تقریباً آدھ گھنٹہ کی گفتگو میں وہ بے تکلف اپنے خیالات کا اظہار عربی میں کرتے رہے۔ ان کو دینے کے لیے میرے پاس عربی کی کوئی کتاب نہ تھی۔ البتہ میں نے انھیں الرسالہ انگریزی کے چند شمارے دیے۔

۸ دسمبر کی شام کو میں ہوٹل کے ایک مقام سے گزر رہا تھا کہ ایک سفید فام امریکی خاتون نے مجھے مخاطب کیا۔ میری ٹوپی اور میرے حلیہ سے اس نے مجھے ایک مذہبی اور روحانی شخصیت سمجھا اور اسی انداز میں گفتگو شروع کی۔ اس نے نہایت سنجیدہ انداز میں اپنے خیالات پیش کیے۔ وہ امریکہ کی نئی نسل کی نمائندہ تھی۔ اس نے بتایا کہ سچائی کی تلاش میں وہ اپنے کئی امریکی ساتھیوں کے ہمراہ مختلف ملکوں کا سفر کر چکی ہے۔ اس نے کہا کہ میری نسل روحانی اصول کو جاننے کی تلاش میں ہے۔ ہم نے جان لیا ہے کہ زندگی کے لیے مادیت سے زیادہ کچھ درکار ہے۔ چنانچہ ہم نے مایوسانہ طور پر سچائی کی تلاش کی (مگر سچائی ہم کو نہیں ملی) :

My generation was on a quest to understand spiritual law.
We knew there was more to life than materialism. So,
we searched desperately for the Truth.
Miss Renee Elaine Thompson, 3906 Ernst St.,
Omaha, Nebraska 68112, U.S.A.

گفتگو کے آخر میں میں نے خاتون کو الرسالہ (انگریزی) کے چند شمارے اور بعض انگریزی کتابیں دیں۔ انھوں نے بہت دل چسپی کے ساتھ لیا اور شدت شوق میں اسی وقت پڑھنے لگیں۔ یہ واقعہ شاید میرے اس پورے سفر کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ تھا۔ اس واقعہ میں مجھے جدید انسان کی روح تڑپتی ہوئی نظر آئی۔

کتابوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں کچھ لوگ تھے جن کو حنفار کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ عرب کے جاہلی دین پر مطمئن نہ تھے۔ ان کی فطرت سچے دین کی تلاش میں تھی۔ زید بن عمرو یہ کہتے ہوئے مرگیے کہ خدایا، اگر میں جانتا کی تیری پسندیدہ عبادت کیا ہے تو اسی طرح میں تیری عبادت کرتا، مگر میں اس کو نہیں جانتا۔ ایک مرتبہ اس طرح کے کچھ لوگ جمع ہوئے۔ انھوں نے آپس میں کہا: جان لو کہ خدا کی قسم، تمہاری قوم کسی چیز پر نہیں ہے۔ انھوں نے دین ابراہیم کو بگاڑ دیا ہے پس نکلو اور سچے دین کو تلاش کرو۔ چنانچہ وہ لوگ مختلف ملکوں کی طرف نکل پڑے (سیرۃ ابن ہشام، سیرۃ ابن کثیر، جلد اول)

جنیوا کے مذکورہ تجربہ کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ عرب کے حنفار کی طرح دور جدید میں دوبارہ حنفار کی ایک نسل پیدا ہو گئی ہے جو زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ خدایا، مجھے نہیں معلوم کہ کس طرح میں تیری عبادت کروں۔ اگر میں جانتا تو میں اسی طرح تیری عبادت کرتا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ جدید انسان کی رہنمائی کا انتظام فرمائے، اور بلاشبہہ وہی انتظام فرمانے والا ہے۔

اس دوران میری ملاقات ایک امریکی سیاح سے ہوئی۔ وہ پروٹسٹنٹ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں ان سے میں نے پوچھا کہ آپ دنیا کے بہت سے ملکوں میں گیے ہیں، آپ کو سب سے زیادہ کون سا ملک پسند آیا۔ انھوں نے کہا کہ سوئزرلینڈ مجھ کو سب سے زیادہ پسند آیا۔ بے حد صاف، بے حد مستعد (Very neat, very efficient) پھر میں نے انڈیا کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے ہنس کر کہا کہ میں نے انڈیا کا سفر کیا ہے۔ انڈیا کی بہت سی چیزیں مجھے پسند ہیں۔ مگر وہاں بیوروکریسی اتنی زیادہ ہے کہ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ سوئزرلینڈ میں بھی قواعد وضوابط بہت زیادہ ہیں۔ مگر سوئزرلینڈ کے کسی سرکاری دفتر میں آپ ایک کام کے لیے جائیں تو ایک آدمی کی میز پر پہونچ کر آپ کا سارا کام ۱۰ منٹ میں پورا ہو جائے گا۔ جب کہ انڈیا میں میں دوبار گیا ہوں۔ وہاں کے کسی سرکاری دفتر میں جائیے تو ہر آدمی آپ کو دوسرے آدمی کے پاس بھیجے گا۔ آپ ایک آدمی سے دوسرے آدمی اور دوسرے آدمی سے تیسرے آدمی کے پاس جاتے رہیں گے پھر بھی یقینی نہیں ہے کہ آپ کا کام آپ کی مرضی کے مطابق ہو جائے۔

جنیوا ایک بے حد صاف ستھرا شہر ہے۔ یہاں کے بارے میں ایک دل چسپ لطیفہ معلوم ہوا۔

ایک صاحب ڈپلومیٹ تھے وہ اپنے خاندان کے ساتھ یہاں شہر کے باہر پکنک کے لیے گئے۔ وہاں ان لوگوں نے کچھ کھایا پیا اور اس کے بعد ڈبہ اور کاغذ کی قسم کی بچی ہوئی چیزیں چھوڑ کر قریب کی کسی جگہ ٹہلنے چلے گئے۔ البتہ ان کی کار وہیں پاس کھڑی ہوئی تھی جس پر ڈپلومیٹک نشان لگا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ لوگ ٹہل کر اپنے مقام پر دوبارہ واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی کار کی ونڈ اسکرین پر ایک کاغذ چپکا ہوا ہے جس کے اوپر یہ الفاظ تحریر ہیں :

Having a diplomatic licence does not give you permission to litter the countryside.

۹ دسمبر کو دوپہر بعد جنیوا شہر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک مقامی گائڈ کی رہنمائی میں ہم چند آدمی نکلے۔ گاڑی ہم کو سارے شہر میں گھماتی رہی۔ ایک مقام پر اتر کر وہاں کا بڑا چرچ دیکھا۔

جنیوا اگرچہ نسبتاً چھوٹا شہر ہے۔ مگر وہ غیر معمولی طور پر صاف اور خوبصورت ہے۔ اگرچہ شہر کا پرانا حصہ اتنا صاف نظر نہیں آیا جتنا اس کا نیا حصہ صاف تھا۔ تاہم دونوں میں فرق بہت کم تھا۔ ایک مقام پر مسجد بھی دیکھی۔ یہ مسجد کافی وسیع ہے اور جدید انداز میں تعمیر کی گئی ہے۔ اس کا افتتاح حال میں شاہ فہد نے کیا ہے۔ یہ خوبصورت مسجد جنیوا کے معیار کے مطابق بنائی گئی ہے۔ اور شہر کے مرکزی علاقہ میں واقع ہے۔

جنیوا میں میں نے اپنے ہوٹل کے کمرہ سے کچھ مقامی ٹیلی فون کیے تھے۔ بظاہر اس ٹیلی فون کا علم یا تو مجھ کو تھا یا شہر کے اس آدمی کو جس سے میں نے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔ مگر ہوٹل سے روانگی کے وقت جب میں ہوٹل کے کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے اس کے دفتر میں گیا تو وہاں ٹیلی فون کی تعداد اور اس کی رقم نہایت صحت کے ساتھ ایک کاغذ پر درج شدہ موجود تھی۔ یہ کمپیوٹر کا کرشمہ ہے۔ بڑے ہوٹلوں میں ہر کمرہ کمپیوٹر سے مربوط رہتا ہے اور کمپیوٹر آٹومیٹک طور پر ہر چیز کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ یہی معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی ایک عمل کرتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی اور نہیں جو اس کے عمل کو جانے۔ مگر خدا کے مخفی فرشتے ہر جگہ تیسرے فریق کی حیثیت سے موجود ہیں اور اس کے ہر قول و عمل کو نہایت صحت کے ساتھ ریکارڈ کر رہے ہیں۔ آدمی جیسے ہی موجودہ دنیا کو چھوڑے گا، خدا کے یہ

ملکوتی کمپیوٹر اس کی مکمل چارج شیٹ اس کے سامنے رکھ دیں گے۔

مغربی دنیا میں شراب اس قدر عام ہے کہ عملاً شراب اور پانی میں کوئی فرق باقی نہیں۔ میرے ہوٹل کے کمرے میں ایک چھوٹی الماری تھی جس کے اوپر لکھا ہوا تھا (Mini Bar) میں نے اس کو کھولا تو الماری کے تمام خانے مختلف قسم کے شراب کی بوتلوں سے بھرے ہوئے تھے ـــــ جدید میڈیکل سائنس نے شراب کا مضر ہونا ثابت کر دیا ہے۔ مگر جو چیز انسان کی عادت بن جائے اس کو چھوڑنا انسان کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام ہوتا ہے۔

۱۰ دسمبر کی صبح کو جنیوا سے واپسی ہوئی۔ جنیوا کا ہوائی اڈہ بے حد صاف اور منظم تھا۔ ٹائیلٹ سے لے کر نشانات راہ تک ہر چیز اتنی نفیس حالت میں تھی جو مجھے کسی اور ہوائی اڈے پر نظر نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی استعمالی ایرپورٹ نہیں ہے بلکہ نمونہ کا ایرپورٹ ہے جو بنا کر نمائش کے لیے رکھ دیا گیا ہے۔ ہندستان کے مقابلہ میں سوئزرلینڈ کے وسائل بہت کم ہیں۔ مگر محدود وسائل کے دانش مندانہ استعمال نے اس کو ہندستان سے زیادہ خوبصورت ملک بنا دیا ہے۔

دہلی کا جہاز پکڑنے کے لیے ہمیں فرینکفرٹ آنا تھا۔ جنیوا سے فرینکفرٹ کا سفر لفتھانزا کی فلائٹ نمبر ۲۴۹ کے ذریعہ ہوا۔ یہ جرمن کمپنی کا جہاز تھا اور جرمنی کی ترقی کا پوری طرح نمائندہ تھا۔ اس وقت فضا میں گہرا بادل اور کہر چھایا ہوا تھا۔ آگے کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے باوجود جہاز نے اپنا سفر اس طرح طے کیا جیسے اس کے پائلٹ کو سب کچھ دکھائی دے رہا ہو۔ اس قسم کا سفر موجودہ زمانہ میں وائرلیس کی ترقی کے ذریعہ ممکن ہوا ہے۔ ہوائی اڈہ پر خاص طرح کے رڈار ہوتے ہیں جو مسلسل ناقابل مشاہدہ لہریں پھینکتے رہتے ہیں۔ یہ لہریں ہوائی جہاز سے ٹکراتی ہیں اور اس کی اس طرح رہنمائی کرتی ہیں جیسے کوئی آنکھ والا کسی اندھے کا ہاتھ پکڑ کر اس کا سفر طے کرا رہا ہو۔ مادی اعتبار سے آج کا انسان اندھیرے میں سفر کرنے کے قابل ہو گیا ہے، مگر روحانی اعتبار سے وہ اجالے میں سفر کرنے کے قابل بھی نہ ہو سکا۔

فرینکفرٹ مغربی جرمنی کا ایک اہم صنعتی شہر ہے۔ اس کو رومیوں نے پہلی صدی قبل مسیح میں آباد کیا تھا۔ تاہم اس کو زیادہ شہرت نویں صدی عیسوی میں حاصل ہوئی جب کہ جرمن بادشاہوں

نے اس کو اپنا سیاسی مرکز بنایا ۔ موجودہ زمانہ میں بین اقوامی تجارتی نمائشوں کی وجہ سے فرینکفرٹ نے کافی شہرت حاصل کی ہے ۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران ۱۹۴۴ میں اس پر زبردست بمباری ہوئی ۔ اس کے نتیجہ میں فرینکفرٹ بالکل تباہ ہوگیا ۔ مگر اس بربادی میں ترقی کا نیا امکان نکل آیا ۔ اس نے جرمنوں کو موقع دیا کہ وہ اپنے قدیم شہر کو دوبارہ جدید طرز پر آباد کریں ۔ موجودہ منظم اور پر رونق شہر جنگ کے بعد اس کے کھنڈروں سے برآمد ہوا ہے ۔ مشہور جرمن شاعر گوئٹے (Goethe) فرینکفرٹ میں ہی ۲۸ اگست ۱۷۴۹ کو پیدا ہوا تھا ۔ اس کا پیدائشی مکان تاریخی یادگار کے طور پر محفوظ رکھا گیا تھا ۔ مگر وہ بھی دوسری عالمی جنگ میں جل کر تباہ ہوگیا ۔ جرمنوں نے اس کو دوبارہ اس کے سابقہ نمونہ پر بنا دیا ہے ۔

فرینکفرٹ میں جرمنی کا سب سے بڑا ایر پورٹ ہے ۔ لندن اور پیرس کے بعد فرینکفرٹ کو یورپ میں تیسرے سب سے بڑے ایر پورٹ کی حیثیت حاصل ہے ۔ سالانہ ایک کرور سے زیادہ مسافر یہاں کے ایر پورٹ سے گزرتے ہیں ۔ فرینکفرٹ میں نوے ہزار سے زیادہ بیرونی ملکوں سے آئے ہوئے لوگ آباد ہیں ۔ ان میں تقریباً ۱۶ فی صد ترک ہیں ۔

فرینکفرٹ سے دہلی کے لیے لفتھانسا کی فلائٹ نمبر ۶۶۶ کے ذریعہ سفر ہوا ۔ یہ آٹھ گھنٹہ کی طویل پرواز تھی ۔ تاہم سفر باسانی طے ہوگیا ۔ ہندستان کے اندر انڈین ایر لائنز سے سفر کرتے ہوئے کئی بار میرے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ ایر پورٹ پر پہونچ کر معلوم ہوا کہ فلائٹ روک دی گئی ہے ۔ کیوں کہ آگے جس ہوائی اڈہ پر اس کو اترنا ہے وہاں کہر کی وجہ سے رویت (Visibility) کم ہے ۔ مغربی ملکوں میں اگر یہ چیز رکاوٹ بنے تو وہاں روزانہ ہی فلائٹ روکی جاتی رہیں ۔ کیوں کہ وہاں تو اکثر فضا میں کہر چھایا ہوا ہوتا ہے ۔

ترقی یافتہ ملکوں میں رڈار (Radar) اور کمپیوٹر کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کر لیا گیا ہے ۔ جنیوا اور فرینکفرٹ دونوں جگہ ایسا ہوا کہ ہمارا جہاز وہاں پہونچا تو فضا کے اوپر گہرا کہر چھایا ہوا تھا ۔ مگر جہاز کو لینڈ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی ۔

اس مسئلہ کا حل اس نظام کے ذریعہ نکال لیا گیا ہے ۔ جس کو آج کل فی الفور نظام

(On the line system) کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں جہاز کو صحیح مقام پر اتارنے کا کام انسانی
آنکھ کے بجائے مشینی آنکھ کرتی ہے۔ ہوائی اڈہ پر لگا ہوا رڈار لہریں پھینکتا ہے۔ یہ لہریں ہوائی جہاز
سے ٹکرا کر لوٹتی ہیں تو رڈار سے متصل کمپیوٹر ان کا تجزیہ کرکے جان لیتا ہے کہ ہوائی جہاز کا رُخ،
اس کی بلندی وغیرہ کیا ہے۔ اس تجزیہ کے مطابق وہ وائرلیس پر جہاز کے مشینی نظام کو رہنمائی
دیتا ہے کہ وہ اپنے رخ اور بلندی میں کیا تبدیلی کرے کہ وہ صحیح مقام پر صحیح رُخ سے اتر سکے۔
یہ ایک مسلسل عمل ہے جس کا ہر جزء ایک سکنڈ کے دس لاکھویں حصہ میں انجام پاتا رہتا ہے، اسی
لیے اس کو مائیکرو سکنڈ (Micro second) کہا جاتا ہے۔

ایک الکٹرانک انجینیر نے کہا: آٹومیشن کا بیسک کانسپٹ بے خطا نظام
(Error-free system) کو وجود میں لانا ہے۔ ایک انسان لازماً غلطی کرتا ہے۔ لیکن مشین
کی صورت میں غلطی کا امکان بہت زیادہ کم ہو جاتا ہے:

A man is bound to make error, but by machine,
this probability gets very much reduced.

فرینکفرٹ میں ایک ہندستانی مسٹر ورما سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھوپال کے رہنے والے ہیں
اور شکاگو (امریکہ) میں تجارت کرتے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ ہندستان میں اور امریکہ میں کیا
فرق ہے۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں کوئی کام کرنا بے حد آسان ہے اور ہندستان میں کام کرنا
بے حد مشکل۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ہندستان میں ایک انڈسٹری لگائی ہے۔ مگر اس کو لگانے کے
لیے دفتری لڑائی میں مجھے دس سال بیت گیے۔ جب کہ ان کے بیان کے مطابق ان کے وزیروں تک
سے تعلقات تھے۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں عام آدمی کو بھی وہی مواقع حاصل ہیں جو خواص کو۔
جب کہ ہندستان میں رشوت اور بیوروکریسی اتنی زیادہ ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں۔ انھوں نے
کہا کہ اس وقت امریکہ میں ہندستانی لوگ بہت بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔ یہ سب ہندستان
واپس آسکتے ہیں اور اپنے دیش کو ترقی دے سکتے ہیں۔ مگر جو شخص واپس آتا ہے وہ اتنی مشکلوں
میں پھنس جاتا ہے کہ اس کے سارے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے
کئی قصے سنائے۔

میں نے سوچا کہ مغرب اور ہندستان کے درمیان یہ فرق ہے کہ مغرب کی مثال زندہ جسم کی ہے اور ہندستان کی مثال مردہ جسم کی۔ ہندستان گویا جگسا پزل کے ٹکڑوں کے ذریعہ بننے والا جسم ہے۔ زندہ جسم ایک مربوط کل ہوتا ہے۔ اس کا ہر حصہ اس طرح عمل کرتا ہے کہ وہ دوسرے کے حصہ کا کام بھی کر سکے۔ اس کے برعکس ہندستان کے افراد جگسا پزل کے الگ الگ ٹکڑوں کی مانند ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو صرف اپنی خبر ہے، کسی کو بھی نہ تو دوسرے کے وجود کی خبر ہے اور نہ وہ اس کے سلسلہ میں اپنی کوئی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ یہی وہ فرق ہے جس نے مغرب کے عام انسان کی زندگی کو عافیت کی زندگی بنا دیا ہے اور ہندستان کے عام انسان کی زندگی کو بے عافیت کی زندگی۔

اس سفر میں مجھے مغرب کے تین بڑے مراکز میں جانے کا اتفاق ہوا۔ لندن (انگلینڈ) جنیوا (سوئزرلینڈ) اور فرینکفرٹ (جرمنی) سفر کے خاتمہ پر جنیوا سے میں ۱۰ دسمبر ۱۹۸۶ کو صبح سات بجے روانہ ہوا۔ واپسی کے سفر میں مجموعی طور پر تقریباً ۱۵ گھنٹے لگے۔ اس لحاظ سے مجھے ۱۰ بجے رات تک دہلی پہونچ جانا چاہیے تھا۔ مگر میں دہلی پہونچا تو یہاں کی گھڑیوں میں رات کے ۲½ بج رہے تھے۔ یہ اس لیے ہوا کہ ہندستان اور سوئزرلینڈ کے وقت میں ساڑھے چار گھنٹہ کا فرق ہے۔

اعلان

الرسالہ یا الرسالہ کیسٹ یا الرسالہ کی مطبوعات کے سلسلہ میں ہم نے کسی کو پیشگی رقم وصول کرنے کا مجاز نہیں بنایا ہے۔ اس لیے کوئی صاحب کسی شخص کو پیشگی رقم ادا نہ کریں۔ رقم کے سلسلہ میں براہ راست مرکز دہلی سے رجوع فرمائیں۔

سکریٹری اسلامی مرکز

لوگ چندہ نہیں دیں گے

پھلواری شریف کے چند نوجوان جلسۂ سیرت کا پروگرام بنا رہے تھے، ان کا جذبہ یہ تھا کہ پھلواری شریف ایک تاریخی بستی ہے، لہذا جلسہ بھی تاریخی نوعیت کا ہونا چاہیے۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر لکھتے ہیں کہ میں نے ان سے پوچھا کہ کتنا روپیہ خرچ کروگے، جواب ملا کہ تقریباً پانچ ہزار روپیہ چندہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا بلاشبہ ہمارے لیے یہ بات باعث فخر ہے کہ ہم حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہیں۔ ان کی محبت ہماری سب سے قیمتی متاع ہے۔ لیکن ان کی یاد کو تازہ رکھنے، ان کے اسوۂ حسنہ کو عام کرنے کے لیے جلسہ ہی کیا ضروری ہے، پھلواری شریف میں کوئی اچھی لائبریری نہیں، اتنی رقم سے ایک اچھی لائبریری کی بنیاد ڈالی جاسکتی ہے جس میں سیرت پر اعلیٰ درجہ کا لٹریچر ہو اور اسی لائبریری میں تعلیم بالغان کا ایک مرکز بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ جلسہ کی تقریریں ہوا میں تحلیل ہو جائے گی، لائبریری کا فیض پورے سال بھر لوگوں کو پہونچتا رہے گا۔ نوجوان میری بات کے قائل ہو گیے، تاہم وہ اپنے پروگرام کو بدلنے پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا" لیکن لائبریری کے لیے لوگ چندہ نہیں دیں گے، جب کہ میلاد النبی کے جلسہ کے لیے آسانی سے رقم فراہم ہو جائے گی" (نقیب، پٹنہ ۱۶ جنوری ۱۹۷۸)

اس واقعہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ لوگ چندہ نہیں دیں گے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ لوگ چونکہ اس کے لیے چندہ نہیں دیں گے اس لیے ہمیں وہی کام کرنا ہے جس میں لوگ چندہ دیں۔

یہ چھوٹا سا واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی وجہ کیا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں میں کام کرنے کے لیے اٹھتے ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں کاموں کی طرف چلے جاتے ہیں جن میں چندہ زیادہ جمع ہوتا ہو، جن میں شہرت زیادہ ملتی ہو، جن میں عوام کی بھیڑ زیادہ اکٹھا ہوتی ہو، جن میں فوراً کے فوراً لیڈری حاصل ہو جائے۔ عوام کے اس مزاج کو بدلنے کی واحد صورت یہ ہے کہ ان کے رہنما اپنا مزاج بدلیں۔ وہ ایسے کاموں میں طاقت لگائیں جن میں "چندہ" نہیں ملتا۔ ایک نسل جب اس طرح قربانی دے گی، اس کے بعد ہی وہ وقت آئے گا جب کہ اگلی نسل اس کا پھل پاسکے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۲۸

صدر اسلامی مرکز نے ورلڈ کونسل آف ریلیجس لبرٹی (نیویارک) کی دعوت پر دسمبر ۱۹۸۶ میں سوئزرلینڈ کا دورہ کیا تھا۔ اس سفر کی روداد کی پہلی قسط فروری ۱۹۸۶ کے شمارہ میں چھپ چکی ہے۔ اس سفر کی دوسری اور آخری قسط زیر نظر شمارہ میں دی جا رہی ہے۔

- صدیقی ٹرسٹ (کراچی) الرسالہ کے مختلف مقالات کو پمفلٹ کی صورت میں چھاپ کر مفت تقسیم کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے شائع کردہ کئی پمفلٹ ہمارے دفتر میں موصول ہو چکے ہیں۔

- ۱۰ جنوری ۱۹۸۷ کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ اصحاب کا ایک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک تقریر کی۔ اس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں بتایا کہ مسلمانوں کے کرنے کا اصل کام کیا ہے۔

- "بابری مسجد ایکشن کمیٹی" نے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ کو ریپبلک ڈے کا بائیکاٹ کریں اور اس طرح بابری مسجد (اجودھیا) کے معاملہ میں حکومت کے خلاف اپنی ناراضی کا اظہار کریں، یہ ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ چنانچہ مختلف سنجیدہ افراد نے اس کے خلاف بیانات دیئے۔ صدر اسلامی مرکز نے بھی اس سلسلہ میں ایک اختلافی بیان دیا جو مختلف اخبارات (ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس، اسٹیٹسمین وغیرہ) میں شائع ہوا اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اصل اشو سے اتفاق کرتے ہوئے موجودہ طریق کار کو غلط قرار دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کو اپنے موقف کی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے ۲۴ جنوری ۱۹۸۷ کی شام کو اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔

۵۔ اسلامی مرکز کے پیغام کو اللہ تعالیٰ بے شمار طریقوں سے پھیلا رہے ہیں۔ مثلاً ڈیرہ اسماعیل خاں، صوبہ سرحد سے جناب فضل مسعود خاں کا خط (۱۷ نومبر ۱۹۸۶) ہم کو ملا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ "چند مہینے پہلے میں نے مولانا وحید الدین صاحب کی کتاب (مذہب اور جدید چیلنج) پڑھی جو مجھے بے حد پسند آئی۔ اس کے بعد ابھی نومبر ۱۹۸۶ کے پہلے ہفتہ

میں راوے ونڈ (پاکستان) کا سالانہ تبلیغی اجتماع ہوا جس میں مکتبہ اشرفیہ لاہور والوں نے مولانا صاحب کی بہت سی کتابوں کا اسٹال لگایا تھا جس میں ظہورِ اسلام، الاسلام وغیرہ کتابیں تھیں۔ میں نے بہت سی کتابیں لے لیں۔ اللہ پاک مولانا صاحب سے بہتر سے بہتر طریقہ پر دین کا کام لے لیں، اور ان کی زندگی میں برکت عطا فرمائیں "

۶۔ الرسالہ وقت کا واحد دینی پرچہ ہے جو علماء اور خطباء کو ہر ماہ ایسا نیا مواد فراہم کرتا ہے جس کو استعمال کر کے وہ اپنی گفتگو اور تقریر کو جدید اعتبار سے مدلل کر سکیں۔ ایک عالم گلبرگہ سے لکھتے ہیں: الرسالہ کا ایک صفحہ میری ایک گھنٹہ کی تقریر کا متن ہوتا ہے۔ ہمارے عربی مدرسہ کے طلبہ کی تقریریں اکثر الرسالہ کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ میں نے کئی علماء کو دیکھا کہ وہ الرسالہ کی اکثر باتوں کو اپنی تقریروں میں استعمال کرتے ہیں۔ اگر الرسالہ اسی طرح چلتا رہا تو بعید نہیں کہ یہ شمال وجنوب اور مشرق ومغرب کے ہر گوشہ میں پھیل جائے۔
(۲۶ دسمبر ۱۹۸۶)

۷۔ الرسالہ کن طریقوں سے عوام میں اپنا نفوذ حاصل کر رہا ہے، اس کی ایک مثال خط (مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۶) ہے جو ہم کو بلند شہر سے موصول ہوا ہے۔ مکتوب نگار لکھتے ہیں: گزشتہ کل میں دہلی گیا تو ایک دوست کے یہاں اسلامی ٹاپک پر کچھ بات چھڑ گئی۔ لہذا اس نے ایک الرسالہ میرے سامنے پیش کیا جس کو میں شروع سے آخر تک پڑھے بغیر نہ رہ سکا۔ اور معلوم ہوا کہ خود ہم لوگوں میں کمی ہے۔ میں اس کو ہر مہینہ اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں کسی کے پاس آپ کی ایجنسی ہو تو مجھے مطلع کریں (اے۔ ایم ساجد)

۸۔ کشمیر سے ایک صاحب لکھتے ہیں: میں الرسالہ پچھلے کئی ہفتوں سے برابر پڑھ رہا ہوں۔ یہ ایک ایسا پرچہ ہے کہ پڑھتے ہی حساب، قیامت اور حشر کا تصور دل میں آجاتا ہے۔ یہ امتِ اسلامیہ کے لیے ایک سرمایۂ عظیم ہے۔ اکتوبر ۱۹۸۶ کا الرسالہ پڑھ کر میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی جب یہ پڑھا کہ مولانا محترم نے تذکیر القرآن نامی تفسیرِ قرآن پاک کی تفسیر مکمل کر دی ہے۔ لہذا میری طرف سے مولانا محترم کو مبارکباد پہونچائیں۔ یہ ایک کارِ عظیم تھا جو مولانا نے مکمل کر دیا۔

۹۔ ایک صاحب اپنے مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۸۶ میں کلکتہ سے لکھتے ہیں کہ الرسالہ کے ۱۰۰ سے زیادہ شمارے پڑھ چکا ہوں مگر طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ مجھ جیسے گرم مزاج، شعلہ بیان اور تیز طبیعت انسان پر الرسالہ کے اثرات کچھ یوں پڑے جیسے کسی نہایت ہی بھڑکتی ہوئی آگ پر موسلا دھار بارش برسے۔ بلا مبالغہ الرسالہ، سب سے ہٹ کر، دنیا اور آخرت کی حقیقی زندگی کی دعوت دیتا ہے۔ اور الفاظ کے پھندوں سے ہٹا کر غوّاص کو صدف چھوڑ کر گُہر کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کاش اگر ہم مسلمان اپنے موجودہ ماحول سے نکل کر الرسالہ کے پیش کردہ ماحول میں اپنی زندگی گزاریں تو انشاء اللہ ہماری زندگی کا نقشہ ہی کچھ اور ہوگا۔ (قاری حفظ الرحمٰن)

۱۰۔ میں نے آپ کے قلم کا جادو "عقلیاتِ اسلام" پڑھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد تو میری کائنات ہی بدل گئی۔ قسم ہے خدائے پاک کی جس کی دی ہوئی زندگی جی رہا ہوں، میرا ذہن ناستک، کمیونسٹ اور کافر کی طرح تھا، شبوت اور چمتکار کا عاشق تھا میں۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے، آپ کی وجہ سے میں نے اپنے حقیقی مالک کو پہچان لیا۔ آپ کے علم کی تعریف کرنا نہ تو میرے بس کی بات ہے اور نہ اتنی صلاحیت ہے (بمبئی، ۷ مئی ۱۹۸۶)

۱۱۔ مسٹر ارن شوری (اکزیکٹیو اڈیٹر ٹائمس آف انڈیا) کے نام ایک صاحب نے اپنی طرف سے الرسالہ (انگریزی) جاری کرایا ہے۔ اس سلسلہ میں مسٹر ارن شوری نے انھیں ایک خط (مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۸۶) لکھا ہے جس کی کاپی ہم کو روانہ کی ہے۔ اس خط میں مسٹر ارن شوری لکھتے ہیں:

I am indeed grateful to you for this kindness
and will read the magazine diligently.

۱۲۔ جنیوا کے سفر میں صدر اسلامی مرکز کی ملاقات یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر احمد مختار مبو سے ہوئی تھی۔ انھوں نے ان کو پیغمبر انقلاب (انگریزی) برائے مطالعہ دیا تھا۔ اب ان کا خط مورخہ ۵ جنوری ۱۹۸۷ موصول ہوا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے پیغمبر انقلاب (انگریزی) پڑھی۔ اس کے بعد مجھے اسلامی مرکز کی مزید مطبوعات پڑھنے کا شوق پیدا ہوگیا ہے۔ اس خط کے مطابق ڈاکٹر احمد مختار مبو کو انگریزی مطبوعات روانہ کردی گئی ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ **اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ** کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے **الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی** مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ **تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں**۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح **الرسالہ** (**انگریزی**) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے **اور ملت کے** اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ **الرسالہ** (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نیے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۵ — اپریل ۱۹۸۷

فہرست

دو نمونے

یہ دہلی کا واقعہ ہے۔ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر میں مسجد کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا کہ ایک صاحب بول اٹھے۔ وہ بھی میری طرح نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکل رہے تھے: " آپ نے دیکھا نہیں اس آدمی کو " اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنا شروع کیا " نماز پڑھ رہا تھا اور کہنیاں یہاں تک کھلی ہوئی تھیں۔ شیطان بھی خوش اور رحمان بھی خوش۔ اللہ بچائے ایسے نمازیوں سے۔" وہ کہہ رہے تھے اور حال یہ تھا کہ نفرت اور حقارت ان کے لفظ لفظ سے ٹپک رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو خدا کی مسجد سے تواضع کے بجائے کبر کا سبق لے کر نکلتے ہیں۔ جن کو کہنیاں کھلنے کا مسئلہ معلوم ہے، مگر یہ مسئلہ ان کو معلوم نہیں کہ مسلمان پر مسلمان کا احترام فرض ہے۔ ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے، اور اس کا ذکر نفرت اور حقارت کے ساتھ کرے۔

یہ تو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا طریقہ ہے۔ اب دیکھئے کہ اس طرح کے معاملات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا۔

صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ایک مسلمان کا واقعہ نقل ہوا ہے۔ وہ نو مسلم تھے اور ابھی نماز کے آداب سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مدینہ کی مسجد نبوی میں نماز با جماعت میں شریک ہوا۔ اور کسی وجہ سے نماز کے درمیان کچھ بول پڑا۔ نمازیوں نے مجھ کو ترچھی نظر سے دیکھنا شروع کیا گویا کہ میں نے بہت غلط کام کیا ہے۔ کسی نے میرے زانو پر ہاتھ مار کر مجھ کو چپ کرنا چاہا۔ اس کے بعد جب نماز ختم ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت نرمی کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ مذکورہ راوی اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فواللہ ما رأیتُ اَحسَن منہ مُعلِّماً قبلہ اوبعدہ۔ ما قھرنی وما شتمنی وقال انّما المساجد لذِکرِاللہ۔ لایصلح فیھا من کلام الناس

خدا کی قسم، آپ سے زیادہ اچھا معلم میں نے نہیں دیکھا نہ آپ سے پہلے اور نہ آپ کے بعد۔ آپ نے مجھ کو نہ جھڑکا اور نہ برا کہا۔ آپ نے صرف یہ فرمایا کہ مسجدیں اللہ کی یاد کے لیے ہیں مسجدوں میں انسانی گفتگو مناسب نہیں۔

عبرت ناک

مسلمان اسپین میں ۹۲ ھ میں داخل ہوئے اور وہاں حکومت قائم کی۔ آٹھ سو سال تک بااقتدار رہنے کے بعد ۸۹۷ ھ میں وہاں سے ان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس لمبی مدت کا بڑا حصہ عیسائی طاقتوں سے لڑنے میں گزرا۔ آخری دور میں مسلمانوں کی حکومت غرناطہ کے محدود علاقہ میں رہ گئی تھی۔ اور اسپین کے وسیع حصہ پر فرڈیننڈ دوم (۱۵۱۶ - ۱۴۵۲) کی حکومت قائم تھی۔

۸۷۰ ھ میں سلطان ابوالحسن غرناطہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس وقت سلطنت غرناطہ کا رقبہ کم ہوکر صرف چار ہزار مربع میل باقی رہ گیا تھا۔ جب کہ شاہ فرڈیننڈ کی حکومت کا رقبہ تقریباً سوا لاکھ مربع میل تک پھیلا ہوا تھا۔ فرڈیننڈ نے مطالبہ کیا کہ سلطان ابوالحسن اس کو خراج دینا منظور کرے۔ سلطان ابوالحسن نہایت بہادر آدمی تھا۔ اس نے عیسائی بادشاہ کو جواب میں لکھا کہ: غرناطہ کے دارالضرب میں اب سونے چاندی کے سکّے ڈھالنے کے بجائے لوہے کی تلواریں تیار ہورہی ہیں تاکہ تم عیسائیوں کی گردنیں ماری جائیں"۔ اس کے بعد دونوں بادشاہوں میں جنگ چھڑ گئی۔ سلطان ابوالحسن نے ان جنگوں میں بار بار شاہ فرڈیننڈ کو شکست دی۔ تاہم آخری فتح فرڈیننڈ کو ہوئی۔

اس کا سب سے بڑا سبب خود سلطان ابوالحسن کا بیٹا ابوعبداللہ محمد تھا۔ ۲۷ جمادی الاول ۸۸۷ھ کو لوشا کے میدان میں سلطان ابوالحسن نے فرڈیننڈ کی فوجوں کو زبردست شکست دی۔ مگر جب وہ دشمن کو شکست دے کر واپس ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کے بیٹے ابوعبداللہ محمد نے غرناطہ پر قبضہ کرکے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کے بعد سلطان اور باغی شہزادے میں جنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ ۲ جنوری ۱۴۹۲ء (۸۹۷ھ) کو عیسائی بادشاہ نے آخری طور پر سلطنتِ غرناطہ پر قبضہ کرلیا۔

مسلمانوں کو ماضی میں جتنی شکستیں ہوئی ہیں، سب آپس کے اختلافات کے نتیجہ میں ہوئی ہیں۔ مگر تاریخ اسلام کا یہی وہ سب سے بڑا واقعہ ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو سب سے کم معلوم ہے۔ ماضی کی طرح آج بھی وہ اسی طرح آپس میں لڑرہے ہیں جیسے کہ انھوں نے اپنے ماضی سے کچھ سبق نہیں سیکھا۔

دعوت کے آداب

حِمیرؔ قدیم عرب کا ایک طاقتور قبیلہ تھا۔ اس نے موجودہ یمن کے علاقہ میں کئی سو سال تک حکومت کی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد جب اطرافِ عرب کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط بھیجے تو حمیر کے شاہی خاندان کے افراد (حارث، مسروح، نعیم بن کلال) کے نام بھی دعوتی مکتوب روانہ فرمایا۔ اس واقعہ کی تفصیلات طبقات ابن سعد، البدایہ والنہایہ اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔

مذکورہ دعوتی مکتوب کو لے کر جو صحابی یمن گئے تھے ان کا نام عیاش بن ربیعہؓ ہے۔ حضرت عیاش کو اپنا مکتوب حوالہ کرنے کے ساتھ آپ نے کئی خصوصی ہدایات بھی انھیں دی تھیں۔ ان میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ راستہ میں اَعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھتے ہوئے جائیں اور جب منزل پر پہونچیں تو پہلے دو رکعت نماز ادا کریں اور اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی دعا کریں۔ اس کے بعد ان لوگوں کے یہاں جاکر انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوتی مکتوب پیش کریں (طبقات ابن سعد، جلد اوّل)

حضرت عیاشؓ نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے راستہ میں اَعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھنے کا اہتمام کیا۔ اور پھر دو رکعت نماز پڑھ کر اپنے اور مدعو کے حق میں دعائیں کیں۔ اس کے بعد وہ ان کی قیام گاہ میں داخل ہوئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تینوں اشخاص غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کرلیا۔ یہ واقعہ ۹ھ کا ہے۔

اس واقعہ سے داعی کا اخلاق معلوم ہوتا ہے۔ جب ایک شخص کسی بھٹکے ہوئے آدمی کے سامنے حق کی دعوت پیش کرے تو اس کا امکان رہتا ہے کہ اس کی انا جاگ اُٹھے اور وہ بُرے طریقہ سے اس کا جواب دے۔ ایسے موقع پر داعی کو چاہیے کہ وہ مکمل طور پر اشتعال سے بچے۔ اور اگر بالفرض اس کے اندر جوابی اشتعال پیدا ہو تو اس کو شیطانی فعل سمجھ کر وہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے۔ داعی کے دل میں مدعو کی اس حد تک خیر خواہی ہونی چاہیے کہ وہ اس کی ہدایت کی دعا کرنے لگے۔ وہ آخری حد تک اس کی ہدایت اور اصلاح کا حریص بن جائے۔

علم کی قیمت

جناب عبدالرحمٰن انتولے (بیرسٹرایٹ لا، اور سابق چیف منسٹر مہاراشٹر) نے ۵ فروری ۱۹۸۷ کی ملاقات میں ایک واقعہ بتایا۔ غالباً ۱۹۵۴ کی بات ہے۔ اس وقت وہ لندن کی کونسل آف لیگل ایجوکیشن میں قانون کے طالب علم تھے۔ ایک لکچر کے دوران ایک قانونی مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے انگریز پروفیسر نے انھیں یہ واقعہ سنایا تھا۔

پروفیسر نے بتایا کہ ایک بڑا صنعتی کارخانہ چلتے چلتے اچانک بند ہوگیا۔ کارخانہ کے انجنیر اس کو دوبارہ چلانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے۔ آخر ایک بڑے اکسپرٹ کو بلایا گیا۔ وہ آیا تو اس نے کارخانہ کا ایک راونڈ لیا۔ اس نے اس کی مشینیں دیکھیں۔ اس کے بعد وہ ایک جگہ رک گیا۔ اس نے کہا کہ ایک ہتھوڑا لے آؤ۔ ہتھوڑا لایا گیا تو اس نے ایک مقام پر ہتھوڑے سے مارا۔ اس کے بعد مشین حرکت میں آگئی اور کارخانہ چلنے لگا۔

مذکورہ اکسپرٹ نے واپس جاکر ایک سو پونڈ کا بل بھیج دیا۔ کارخانہ کے منیجر کو یہ بل بہت زیادہ معلوم ہوا۔ اس نے ایکسپرٹ کے نام اپنے خط میں لکھا کہ آپ نے تو کوئی کام کیا نہیں، یہاں آکر آپ نے صرف ایک ہتھوڑا مار دیا۔ اس کے لیے ایک سو پونڈ کا بل ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ براہِ کرم آپ ہمارے نمائندہ کو مزید اور زیادہ بہتر تفصیلات عطا فرمائیں:

Please furnish my client with further and better particulars.

اس کے جواب میں مذکورہ اکسپرٹ نے لکھا کہ میں نے جو بل روانہ کیا تھا وہ بالکل صحیح ہے۔ اصل یہ ہے کہ ۹۹ پونڈ اور ۱۹ شلنگ تو یہ جاننے کے لیے ہیں کہ مشین میں غلطی کیا ہے اور کہاں ہے۔ اور ایک شلنگ ہتھوڑا اٹھاکر مارنے کے لیے:

£ 99.19 to diagnose the disease and one shilling to
pick up the hammer and to strike at the right spot.

اس دنیا میں سب سے زیادہ قیمت علم کی ہے۔ اسی طرح آخرت میں سب سے زیادہ قیمت معرفت کی ہوگی۔ جو شخص معرفت خداوندی میں جتنا بلند ہوگا اتنا ہی وہ آخرت میں بلند کیا جائے گا۔

دریافت کے ذریعہ

فن تعلیم کی ایک اصطلاح ہے جس کو اکتشافی طریقہ (Discovery method) کہا جاتا ہے. یہ طریقہ جین پائگے (Jean Piaget) اور جیروم برونر (Jerome Bruner) وغیرہ کی تحقیقات کی بنیاد پر قائم ہوا ہے ۔ اس طریقہ میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ طالب علم کو ہر بات بتائی نہ جائے، بلکہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ وہ اپنے دماغ کے استعمال سے باتوں کو خود جانے۔ یہ طریقہ مسئلہ حل کرنے پر زور دیتا ہے ، اس میں استاد کی رہنمائی کو کم کیا جاتا ہے اور طالب علم کے لیے اس موقع کو بڑھایا جاتا ہے کہ وہ چیزوں کو اپنے آپ دریافت کرے :

> This method emphasizes problem - solving, minimizing guidance by the teacher and maximizing the student's opportunity for exploration and trial and error (EB - III/572).

بچوں کی تعلیم کے لیے یہ اصول انسانی فطرت کے مطالعہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے ۔ انسان کے اندر فطری طور پر یہ طاقت ور مادہ موجود ہے کہ وہ اپنے علم کو بڑھانا چاہتا ہے ۔ مزید یہ کہ آدمی جو بات خود اپنی دریافت کے ذریعہ جانتا ہے وہی حقیقی معنوں میں اس کے ذہن کا جزء بنتی ہے ۔ بتائی ہوئی باتیں اکثر بھول جاتی ہیں مگر دریافت کی ہوئی باتیں کبھی نہیں بھولتیں۔ آدمی کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے زیادہ دخل انھیں باتوں کا ہوتا ہے جن کو وہ خود جانے نہ کہ وہ جن کو اس نے دوسروں سے سن لیا ہو ۔

یہی اکتشافی طریقہ دین میں بھی اختیار کیا گیا ہے ۔ قرآن نے اپنے مطلوب انسانوں کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں (الذین یومنون بالغیب) غیب پر ایمان لانا کیا ہے۔ یہ دوسرے لفظوں میں، نامعلوم کو معلوم بنانا ہے ۔ ایک چیز جو انسان کے شعوری علم سے باہر تھی اس کو شعوری علم کے دائرہ میں لے آنا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو اور عالم آخرت کو انسان کی نظروں سے چھپا دیا ہے ۔ اب انسان کو اسے دریافت کرنا ہے ۔ جو چیز غیب میں ہے اس کو شہود بنانا ہے ۔ اسی کا نام ایمان ہے ۔ اس ایمان میں جو شخص جتنا آگے ہوگا اتنا ہی وہ آخرت میں آگے رہے گا ۔

کامیابی کا راز

ڈاکٹر سی وی رمن (۱۹۷۰ - ۱۸۸۸) ہندستان کے مشہور ترین سائنس داں ہیں۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۸ کو انھیں فزکس کا نوبیل انعام ملا۔ اس کے بعد وہ عالمی شہرت کے مالک ہوگیے۔ ان کی سائنسی دریافت رمن ایفکٹ (Raman Effect) آج سائنس کے مسلمات میں شمار ہوتی ہے۔ رمن ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد دس روپیہ ماہوار پر اسکول ٹیچر تھے۔ انھوں نے انتہائی مشکل حالات میں اپنی غیر معمولی محنت کے ذریعہ علم کی دنیا میں اپنا موجودہ مقام حاصل کیا۔ انھوں نے اپنی کامیابی کے سفر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے —— شکست، مایوسی، محنت اور ہر قسم کے دکھ کی ایک لمبی تاریخ :

A long history of frustration, disappointment, struggle and every kind of tribulation.

ایک شخص نے رمن کی علمی کامیابی کو گھٹانے کے لیے کہا کہ آپ اپنی دریافت تک محض اتفاق کے ذریعہ پہونچے ہیں، جیسا کہ اکثر دوسرے سائنس داں بھی محض اتفاق کے ذریعہ اپنی دریافتوں تک پہونچے۔ رمن نے اس کو سن کر سنجیدگی کے ساتھ کہا :

The idea that a scientific discovery can be made by accident is ruled out by the fact that the accident, if it is one, never occurs except to the right man.

یہ تصور کہ سائنسی دریافت اتفاق کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے، اس حقیقت کی بنا پر خارج از بحث ہے کہ اتفاق، اگر واقعۃً پیش آئے، تو وہ کبھی ایک صحیح آدمی کے سوا کسی اور کے ساتھ پیش نہیں آتا۔ ڈاکٹر رمن نے اپنی زندگی کی آخری دریافت کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

The right man, right thinking, right instruments, and right results.

صحیح آدمی، صحیح فکر، صحیح آلات، اور پھر صحیح نتیجہ۔ (ہندستان ٹائمس ۱۷ جنوری ۱۹۸۷)

دوسروں کے ذمہ

اپریل ۱۹۸۶ کا واقعہ ہے۔ عرب دنیا کے ایک معروف ادیب (ڈاکٹر عبدالحلیم عویس) ہمارے مرکز میں آئے اور چند دن ہمارے ساتھ قیام کیا۔ ۱۰ اپریل کو وہ اپنا کوٹ ایک ہینگر پر لٹکا رہے تھے۔ اس وقت وہ مسکرائے اور ایک لطیفہ بیان کیا۔ انھوں نے ایک عرب شخصیت کا نام لیتے ہوئے کہا کہ ان کا قول ہے :

نحنُ نُعَلِّق علیٰ شمّاعة (علّاقة) الاستعمار کُلَّ اَخطائنا

یعنی ہم اپنی تمام غلطیوں کو استعمار کے ہینگر پر لٹکا دیتے ہیں ۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر یہ صحیح ترین تبصرہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر جو لکھنے اور بولنے والے پیدا ہوئے ان کو پڑھیے اور سنیے تو تقریباً بلا استثناء یہ ملے گا کہ ہر آدمی مسلمانوں کی بربادی کا مرثیہ پڑھ رہا ہے اور ہر آدمی مسلمانوں کی بربادی کا ذمہ دار دوسری قوموں کو قرار دے رہا ہے ۔

یہ بات اتنی زیادہ عام ہے کہ جو لوگ بظاہر اس سے مختلف بات کہتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ بھی حقیقۃً اس سے مختلف نہیں ہیں۔ ایک شخص سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے ایک رہنما کا نام لیا جنھوں نے اپنی تقریر میں جوش و خروش کے ساتھ غیر اقوام کی سازشوں کا انکشاف کیا تھا اور کہا تھا کہ ان سازشوں نے مسلمانوں کو زبردست نقصان پہونچایا ہے۔ مذکورہ شخص نے فوراً کہا کہ نہیں۔ آپ اس رہنما کی فلاں تقریر کو پڑھیے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کی بربادی کا ذمہ دار خود مسلمانوں کو قرار دیا ہے۔ میں نے یہ کہا کہ آپ کا یہ حوالہ صرف مذکورہ رہنما کی تضاد فکری کو بتاتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انھوں نے اصل حقیقت کو نہیں سمجھا ہے، اس لیے مجمع کی رعایت سے وہ کبھی ایک بات کہہ دیتے ہیں اور کبھی دوسری بات ۔

اس دنیا میں آدمی صرف اپنے کیے کو بھگتتا ہے۔ اگر دوسروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے تو بربادی کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ کیوں کہ اصل سبب تو خود اپنے اندر تھا، اور وہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا ۔

ایک مشورہ

یوسف اسلام ایک انگریز نومسلم ہیں۔ ان کا پچھلا نام کیٹ اسٹیونس (Cat Stevens) تھا۔ ۱۹۷۷ میں انھوں نے لندن کی ایک مسجد میں اسلام قبول کیا۔

لندن کے انگریزی ماہنامہ دی مسلم (مئی۔ جون ۱۹۸۰) میں یوسف اسلام صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے۔ انٹرویو لینے والے شخص نے ان سے پوچھا کہ انگلینڈ کے اخبارات مسلسل اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں، اس کا حل کیا ہے۔ یوسف اسلام صاحب نے جواب دیا: لوگ اتنے نادان نہیں ہیں کہ ہر چیز جو اخبار میں چھپے اس پر یقین کرلیں۔ لوگ اپنی رائیں خود بناتے ہیں۔ تاہم اگر وہ مسلمانوں کو مذکورہ برائی میں ملوث دیکھیں گے تو عین ممکن ہے کہ وہ اخبار کی رپورٹ پر یقین کرلیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل چیز صورت واقعہ ہے نہ کہ اخبار کی خبر۔ اگر مسلمانوں کی عمومی زندگی اس سے مختلف ہو جو اخبار میں کسی "دشمن اسلام" نے چھاپی ہے تو کوئی بھی پڑھنے والا اس کو کسی قسم کی اہمیت نہیں دے گا۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے اخبار میں یہ چھاپے کہ ہندستان میں جہالت کی شرح سب سے زیادہ عیسائیوں میں ہے۔ پارسیوں میں سب سے زیادہ فقیر ہوتے ہیں۔ سردار قوم سب سے زیادہ بزدل قوم ہے، تو اس قسم کی باتوں سے کوئی بھی اثر نہیں لے گا۔ کیوں کہ یہ باتیں معلوم واقعات کے سراسر خلاف ہیں۔

اسی طرح اگر لوگوں کی نظر میں مسلمانوں کی تصویر اچھی بن جائے تو ان کے بارہ میں لوگوں کے برے بیانات اپنے آپ بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔

اگر لوگوں کی نظر میں مسلمانوں کی عملی تصویر یہ ہو کہ وہ حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں متحد رہتے ہیں۔ وہ لین دین میں بے انصافی نہیں کرتے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل نہیں ہوتے۔ وہ انسان کی جان و مال اور عزت کا احترام کرتے ہیں۔ اگر آج لوگوں کے نزدیک مسلمان ہونے کا مطلب یہ بن جائے تو لوگ اخبارات کی مخالفانہ سرگرمیوں کو کوئی اہمیت نہ دیں گے۔ وہ اس قسم کی رپورٹوں اور خبروں کو اتنا غیر اہم سمجھیں گے کہ سرخی دیکھنے کے بعد شاید وہ اس کا مطالعہ بھی نہ کریں۔

ملّت کی کہانی

لارڈ لوتھین (۱۸۸۲ – ۱۹۴۰) برطانیہ کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنی وفات سے دو سال پہلے ۱۹۳۸ میں ہندستان آئے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے موقع پر خطبہ پڑھا۔ اس خطبہ میں انھوں نے مسلمان نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"یورپ اپنے سیاسی، معاشی، تمدنی اور عائلی مسائل کا تسلی بخش حل دریافت کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ آپ حضرات کا دعوی ہے کہ اسلام زندگی کا مکمل دستور العمل ہے۔ اور اس میں اجتماعی مسائل کا بہترین حل موجود ہے۔ اس لیے میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بلاد مغرب میں جاکر وہاں کے باشندوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کریں۔"

یورپ کے ایک ذمہ دار شخص نے ایک مسلم ادارہ میں یہ بات اب سے ۵۰ سال پہلے کہی تھی۔ مگر نصف صدی گزر گئی اور اس پوری مدت میں کوئی ایک بھی قابل ذکر مسلمان نہیں اٹھا جو خدا کا دین لے کر اہل یورپ کے درمیان دیوانہ وار داخل ہو جائے۔ موجودہ زمانہ میں مختلف اسباب کے تحت مسلم شخصیتوں کے یورپ کے سفر ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ تمام اسفار صرف یورپ میں قیام کرنے والے مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں نہ کہ حقیقۃً یورپ کے ان اصل باشندوں کے درمیان جن کے ایک فرد لارڈ لوتھین تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے "اسلامی کیرکٹر" کی حفاظت کے لیے ہمارے تمام چھوٹے بڑے لیڈر میدان جہاد میں سرگرم ہیں۔ مگر کسی لیڈر کو یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ کیا وجہ ہے کہ پچھلے ۵۰ سال کے اندر علی گڑھ نے کوئی ایک قابل ذکر فرد ایسا پیدا نہیں کیا جو انگریزی زبان اور نئے علوم سے واقفیت حاصل کر کے یورپ جائے اور وہاں کے غیر مسلم باشندوں کو اسلام کا پیغام پہونچائے "اسلامی کیرکٹر" کی حفاظت کا مطلب اگر صرف یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے داخلہ اور ملازمت کا حق محفوظ رہے تو یہ اسلام کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔ یہ اپنے قومی اغراض کے لیے اسلام کا نام استعمال کرنا ہے۔ اور جو لوگ اپنے قومی اغراض کے لیے اسلام کا نام استعمال کریں

وہ اللہ کے یہاں غضب کے مستحق ہوتے ہیں نہ کہ رحمت ونصرت کے مستحق ۔
لارڈ لوتھین کی مذکورہ تجویز پر عمل کرنے کے لیے انگریزی دانی کی ضرورت تھی، اس لیے عام مسلم رہناؤں کے لیے یہ عذر ہو سکتا ہے کہ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں ایک اور دعوتی موقع پیدا کیا تھا، اور اس موقع کو استعمال کرنے کے لیے اپنی مادری زبان ہی کافی تھی ۔ مگر یہاں بھی ہمارے رہنما صد فی صد ناکام رہے ۔

یہ امکان نوآبادیاتی نظام نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کی قومیں جدید طاقت کے زور پر ساری دنیا میں پھیل گئیں ۔ اور جگہ جگہ انھوں نے اپنا اقتدار قائم کیا ۔ اس قسم کے لوگ خود اپنی ضرورت اور مصلحت کے تحت ہر جگہ کی مقامی زبان بھی سیکھتے تھے ۔ مثلاً جو انگریز اس زمانہ میں ہندستان آئے انھوں نے یہاں کی مقامی زبان بھی سیکھی اور یہ حیثیت اس زمانہ میں جس زبان کو حاصل تھی وہ اردو زبان تھی ۔

جن ہندستانیوں کی عمریں پچاس سال سے اوپر ہیں وہ بخوبی طور پر اس واقعہ کو جانتے ہیں کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب سے پہلے ہندستان میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو تھی ۔ تاہم جو لوگ بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں، ان کے سمجھنے کے لیے یہاں میں ایک حوالہ نقل کرتا ہوں ۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اردو زبان (Urdu Language) کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کی ملکی تقسیم سے پہلے اردو زبان شمالی ہند کی عمومی طور پر بولی جانے والی زبان تھی جو اس وقت ہندستانی یا کھڑی بولی کہی جاتی تھی :

> The spoken language, referred to before the 1947 partition as Hindustani or Khari Boli, was the lingua franca of northern India (X/297).

ایک واقعہ

میجر جنرل اجیت انیل رودرا ۱۹۱۵ میں ہندستانی فوج میں داخل ہوئے ۔ اب ان کی عمر ۹۰ سال ہو چکی ہے ۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۵ اکتوبر ۱۹۸۶) کے ایک اسٹاف رپورٹر سے بات چیت کرتے ہوئے انھوں نے پچھلے زمانہ کی اپنی بہت سی یادداشتیں بتائیں ۔ انھوں نے

اس سلسلے میں جو واقعات بتائے ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا ۔

"۱۹۴۷ سے پہلے جب وہ فوج کی باقاعدہ سروس میں تھے تو فیض احمد فیض بھی ان کے تحت کام کرتے تھے۔ فیض کا تعلق فوج کے رابطۂ عامہ (Public relations) کے شعبہ سے تھا۔ ایک بار فیض کے ذمہ یہ کام سپرد ہوا کہ وہ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کا ہندستانی زبان میں ترجمہ کریں۔ فیض نے ترجمہ کرکے بھیج دیا۔ اس کے بعد فیض احمد فیض اور میجر جنرل ردرا دونوں وائسریگل لاج (راشٹرپتی بھون) بلائے گیے تاکہ وہ ادائیگی الفاظ کے معاملہ میں وائسرائے کی رہنمائی کرسکیں۔ اس کے بعد میجر جنرل ردرا کے الفاظ یہ ہیں :

When Faiz and myself called on the Viceroy to help him with the diction, Mountbatten was pacing up and down his room in the now christened Rashtrapati Bhawan rehearsing his speech. He was speaking Hindustani quite well, much to our surprise.

جب فیض احمد فیض اور میں وائسرائے کی ملاقات کے لیے گیے تاکہ الفاظ کی ادائیگی کے معاملہ میں ان کی مدد کریں، تو ماونٹ بیٹن اپنے موجودہ راشٹرپتی بھون کے کمرہ میں اِدھر سے اُدھر چل رہے تھے اور اپنی تقریر کو دہرارہے تھے ۔ اس وقت وہ بالکل صاف ہندستانی بول رہے تھے ۔ یہ دیکھ کر ہم کو سخت تعجب ہوا ۔

یہ واقعہ ۱۹۴۷ سے پہلے اس دور کی یاد دلاتا ہے جب کہ ملک میں ہندستانی (یا اردو) کا غلبہ تھا۔ ملک کے اعلیٰ ترین حکام بھی اردو اور ہندستانی کو بولتے اور سمجھتے تھے ۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہندستان کی اردو بولنے والی قوم اور حکمرانوں کے درمیان زبان کا وہ فاصلہ (Language gap) موجود نہ تھا جو آج پایا جارہا ہے ۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت داعی کی جو زبان تھی وہی مدعو کی زبان بھی تھی ۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ داعیوں کے گروہ نے اس امکان کو ایک فیصد بھی استعمال نہیں کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے لیڈروں نے اس زمانہ میں ان حکمرانوں سے بے شمار ملاقاتیں کیں ۔ مگر یہ تمام لیڈر ان حکمرانوں سے صرف مانگنے کے لیے ملتے تھے نہ کہ انھیں دینے کے لیے ۔ وہ یہی کرتے رہے یہاں تک کہ وہ دور ختم ہوگیا جس میں اردو زبان نے عوامی اہمیت حاصل کی تھی ۔

دعوتی عمل

"اس جزیرہ میں تو صرف مگرمچھ اور سانپ اور کنکھجورے ہیں" مسیحی سیاح نے اپنی سیاحت سے واپس آکر مسیحی مشنری کو رپورٹ دی۔

"خیر انھیں ہونے دو، یہ بتاؤ کہ کیا وہاں کچھ انسان بھی ہیں"

"ہاں، ہیں کیوں نہیں۔ مگر ایسے وحشی اور خونخوار ہیں کہ ان کے درمیان قدم رکھنے کا تو خیال بھی نہ کیجئے"

"بس معلوم ہوگیا۔ اتنی اطلاع کافی ہے۔ انسان جہاں کہیں بھی آباد ہیں، مشنری کا وہاں پہونچنا ضروری ہے"

یہ خلاصہ ہے اس گفتگو کا جو ایک مسیحی سیاح اور لندن مشنری سوسائٹی کے ایک ذمہ دار کے درمیان ۱۸۷۱ میں جزیرہ نیوگنی کے جنوبی ساحل پر ہوئی۔ اس کے بعد جزیرہ میں مشنری کا کام شروع ہوگیا۔ اور اب اس گفتگو کے سو برس بعد جزیرہ نہ صرف مہذب ہوچکا ہے بلکہ اس کی بیشتر آبادی عیسائی ہے۔ دو ہزار برس پہلے مسیحؑ اس دنیا سے گئے تو ان کے پیچھے صرف ایک درجن عیسائی تھے۔ مگر مسلسل تبلیغ کے نتیجہ میں آج عیسائیوں کی تعداد تمام مذاہب میں سب سے زیادہ ہے۔ عیسائیوں کے تبلیغی ادارے اتنے منظم ہیں اور اتنے وسیع پیمانہ پر کام کر رہے ہیں جس کی کوئی دوسری مثال ساری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس کے برعکس مسلمانوں پر ان کے پیغمبر نے یہ ذمہ داری ڈالی تھی کہ وہ قیامت تک ساری قوموں تک اسلام کا پیغام پہونچاتے رہیں۔ مگر پیغمبر اسلام کے ابتدائی پیرووں کے بعد یہ کام تقریباً بند ہوگیا۔ بلاشبہ اسلام بعد کی صدیوں میں بھی پھیلتا رہا ہے۔ مگر وہ زیادہ تر خود اپنے زور پر پھیلا ہے۔ ورنہ مسلمانوں کا محبوب ترین مشغلہ جس میں وہ موجودہ سائنٹفک دور میں بھی انتہائی انہماک کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، وہ جنگ وجدل اور سیاسی معرکہ آرائی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور چیز انھیں کام ہی نظر نہیں آتی جس میں وہ اپنے آپ کو مشغول کریں۔ اس عموم میں بعض استثنار ضرور ہے۔ مگر وہ استثنار اصاغر کا ہے نہ کہ اکابر کا۔

دعوتی عمل کی اہمیت صرف اس اعتبار سے نہیں ہے کہ وہ اسلام کی توسیع اور اشاعت کا ذریعہ ہے۔ اس کی اہمیت خود موجودہ مسلمانوں کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ ہے۔

گڑھے کے پانی میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے مگر دریا کے پانی میں کبھی بدبو پیدا نہیں ہوتی۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ گڑھے کا پانی ٹھہرا ہوا ہوتا ہے۔ گڑھے کا پانی ہمیشہ وہی پانی رہتا ہے۔ اس میں نیا پانی داخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس دریا کا پانی جاری پانی ہے اس میں ہر وقت نیا پانی آتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گڑھے کے پانی میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور دریا کے پانی میں بدبو پیدا نہیں ہوتی۔ ایسا ہی کچھ معاملہ قوموں کا بھی ہے۔ قومیں اسی وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک ان میں نیا خون داخل ہوتا رہے۔ جس قوم میں نیا خون داخل ہونا بند ہو جائے وہ بند گڑھے کی طرح بے جان ہو کر رہ جائے گی۔

اسلام کی تاریخ اس اصول کی تصدیق کرتی ہے۔ اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر بنوامیہ کے زمانہ تک اس کو زبردست عروج حاصل رہا۔ اس کے بعد بنوعباس کے دور کے نصف آخر میں زوال شروع ہو گیا۔ عروج کی تاریخ پستی کی تاریخ میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے بعد اسلام کو دوبارہ عروج اس وقت ہوا جب کہ ترک اقوام بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہو گئیں۔ ترکوں کے ذریعہ اسلام کو دوبارہ عروج حاصل ہوا جو کئی سو سال تک جاری رہا۔ اسلام کے جسم میں نئے خون نے داخل ہو کر اسلام کو نئی زندگی دیدی۔

انیسویں صدی میں مغربی طاقتیں ابھریں۔ انھوں نے مغلوں اور ترکوں کو مغلوب کر کے تقریباً ساری دنیا میں اپنا غلبہ قائم کر لیا۔ اسلام کی تاریخ دوبارہ تنزل کا شکار ہو گئی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اسلام کے جسم کو دوبارہ نئے خون کا انتظار ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول تک کا زمانہ اسلامی تحریکوں کا زمانہ ہے۔ اس سو سالہ مدت میں بے شمار تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کے سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھیں غیر معمولی پھیلاؤ حاصل ہوا۔ وہ مجموعی طور پر تقریباً تمام مسلمانوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرنے میں کامیاب ہو گیے۔ مگر عظیم الشان ہنگاموں کے

باوجود ان کے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ اسلام کی تاریخ کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانے میں کامیاب ہو سکیں۔

ان تحریکوں کی عظیم الشان کامیابیوں کے درمیان عظیم الشان ناکامی کا سبب صرف ایک تھا۔ وہ یہ کہ تمام کی تمام تحریکیں صرف مسلمانوں میں کام کرتی رہیں۔ ان میں کوئی بھی قابلِ ذکر تحریک نہیں ہے جس کی جدوجہد کا نشانہ غیر مسلموں میں اسلام کا پیغام پہونچانا ہو۔ سب کے سب "پرانے خون" پر محنت کرتے رہے۔ "نئے خون" کے لیے ان میں سے کوئی متحرک نہ ہو سکا۔

یہی ان تحریکوں کی ناکامی کا اصل سبب ہے۔ اسلام کی تاریخ کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانے کے لیے "نئے خون" کی ضرورت تھی۔ مگر موجودہ دور میں ہماری تمام تحریکیں صرف "پرانے خون" پر اپنی طاقت صرف کرتی رہیں۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ کی بے شمار کوششیں ضائع ہو کر رہ گئیں۔ اور اسلام کی تاریخ دوبارہ نہ بنائی جا سکی۔ بے جان افراد کے ذریعہ جاندار قوم کی تعمیر ممکن نہیں۔

بنو امیہ کے بعد اسلامی تاریخ پر جو زوال آیا اس کو دوبارہ عروج نئے خون کے ذریعہ ملا۔ اب موجودہ زمانہ میں اسلام کی تاریخ جس زوال سے دوچار ہے اس کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ اسلام کی صفوں میں نئے خون کو داخل کیا جائے۔ یہی پہلے بھی اس مسئلہ کا حل تھا اور یہی آج بھی اس مسئلہ کا حل ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ نہیں جس کے ذریعہ سے دورِ جدید میں دوبارہ اسلام کی نئی تاریخ بنائی جا سکے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم (محمد ــ آخر)	اور اگر تم پھر جاؤ تو اللہ تمہاری جگہ دوسروں کو لائے گا، پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔

دین ایک ابدی حقیقت ہے۔ البتہ دین کے حاملین بدلتے رہتے ہیں اور تبدیلی کا یہ عمل ہی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ حاملین دین کے اندر مطلوبہ کردار باقی رہے۔

اتحادِ ملّت

اتحاد کیا ہے۔ اتحاد نام ہے اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا۔ موجودہ دنیا میں کوئی گروہ اختلاف فکر سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے موجودہ دنیا میں کسی گروہ کے اندر اتحاد صرف اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہونا جانتا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اتحاد ہمیشہ صبر کی زمین پر قائم ہوتا ہے۔ اتحاد صرف کسی ایسی قوم کے اندر ظہور میں آتا ہے جس کے اندر برداشت کی طاقت ہو۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں صبر و برداشت کو کھو دیا ہے، اس لیے وہ اتحاد کو بھی کھوئے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کو بے برداشت بنانے کے اصل ذمہ دار مسلمانوں کے عین وہی رہنما ہیں جو مسلمانوں کو اتحاد کا پیغام دینے میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ ایک رہنما جب اپنے خلاف تنقید سن کر مشتعل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اس عمل سے لوگوں کو بے برداشت ہونے کا سبق دے رہا ہے۔ ایک رہنما جب کسی مسلم حکمراں کی "غلطی" کو دیکھ کر بھڑ اٹھتا ہے اور اس کے خلاف ہنگامہ آرائی شروع کر دیتا ہے تو عین اسی وقت وہ قوم کو بے برداشت بنا رہا ہوتا ہے۔ ایک رہنما جب غیر قوم کے جلوس پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ قوم کو بے برداشت بنانے میں بھی اپنا حصہ ادا کر رہا ہوتا ہے۔ وغیرہ

ہمارے رہنما ہر روز اپنے عمل سے اسی قسم کے نمونے پیش کر رہے ہیں۔ وہ ہر اختلافی بات پر پرجوش ردعمل ظاہر کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ مسلسل قوم کو یہ سبق دے رہے ہیں کہ کسی خلاف مزاج بات کو برداشت نہ کرو، ہر چیز جو تمہیں پسند نہ آئے اس کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑے ہو جاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے رہنماؤں کا یہی مزاج ہے۔ ان کا یہ مزاج مسلمانوں کو بے صبری کی تربیت دے رہا ہے۔ اور بلاشبہ بے صبری ہی اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے —— ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور اتحاد کی بھی ایک قیمت ہے۔ یہ قیمت ہے خلافِ اتحاد باتوں کو برداشت کرنا۔

خاموشی ضروری ہے

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت)

حقیقت یہ ہے کہ چپ رہنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ بولنا۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں بولنا انتہائی ضروری ہوتا ہے اس لیے اس شخص کو گونگا شیطان (شیطان اخرس) کہا گیا ہے جو بولنے کے موقع پر نہ بولے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جب کہ چپ رہنا ہی زیادہ صحیح اور ضروری ہے۔

خاموشی کے ضروری ہونے کی ایک مثال غزوۂ احد کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے تھے اور ایک غار میں لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے اعلان کر دیا کہ محمدؐ قتل کر دیئے گیے۔ صحابہ پر سراسیمگی چھا گئی۔ اس دوران ایک صحابی کی نظر آپ پر پڑی۔ وہ بول پڑے کہ رسول اللہ یہاں ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بولے بغیر اشارہ سے ان کو منع کیا کہ چپ رہو (اشار الیہ الرسول ان اصمت) اس کی ایک مثال وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنے ساتھی سے کہو کہ چپ رہو، جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تم نے لغو فعل کیا (اذا قلت لصاحبك اسکت والامام یخطب فقد لغوت)

انفرادی مجالس میں بھی خاموشی کا یہ اصول ضروری ہے۔ مگر جب معاملہ قوم کا ہو تو اس کی اہمیت لاکھوں گنا بڑھ جاتی ہے۔ کسی نازک موقع پر ایک رہنما کی خاموشی ایک بڑے فساد کو روکنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی طرح ایک رہنما کی بے موقع تقریر ایک ایسا فساد برپا کر سکتی ہے جس میں سیکڑوں انسان مارے جائیں اور کروروں روپے کی جائداد جلا کر خاک کر دی جائے۔ اسی مفہوم میں سسٹر کنسولتا (Sister Consolata) نے کہا ہے کہ کسی قوم کی ناکامیوں کی سب سے زیادہ تعداد کا سبب خاموشی کے اصول کو توڑنا ہے:

The greatest number of failings in a community come from breaking the rule of silence.

دین میں غلو

اسلام میں جو چیزیں منع ہیں ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو غلو کہا گیا ہے۔ یعنی حد سے تجاوز کرنا۔ غلو کا یہ فعل ہمیشہ دینی معاملات میں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں نصاریٰ کو غلو سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ لا تغلوا فی دینکم (المائدہ ۷۷) یہ نہیں فرمایا کہ لا تغلوا فی کفرکم۔

میرے ہم وطنوں میں ایک صاحب تھے ان کا نام قمرالدین تھا۔ بہت مخلص آدمی تھے۔ نماز روزہ کے حد درجہ پابند تھے۔ مگر اکثر ایسا ہوتا کہ جمعہ کی نماز کے لیے وقت پر مسجد پہونچنا ان کے لیے دشوار ہو جاتا۔ اس کی وجہ "شرعی غسل" کے بارے میں ان کا انتہا پسندانہ تصور تھا۔ جمعہ کے دن جب وہ نہانا شروع کرتے تو بار بار انھیں شبہہ ہو جاتا کہ ان کا غسل مکمل نہیں ہوا۔ فلاں جگہ کے بال تک پانی نہیں پہونچا۔ جسم کا فلاں حصہ دھونے سے رہ گیا۔ چنانچہ وہ گھنٹوں غسل خانہ میں نہاتے رہتے۔ بعض اوقات یہ مدت اتنی لمبی اور اتنی تکلیف دہ ہو جاتی کہ غسل کے عمل میں حوض کے پانی کے ساتھ ان کی آنکھوں کے آنسو بھی شریک ہو جاتے۔

یہ ایک غیر ضروری قسم کا شک تھا۔ شریعت کی نظر میں یہ غلو ہے نہ کہ اسلامی احتیاط۔ غلو کی یہ برائی ہمیشہ دینی جذبہ کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ مگر اپنے انجام کے اعتبار سے وہ دین کی ضد بن جاتی ہے۔ ابتدائی نیت کے اعتبار سے وہ بظاہر معصوم ہوتی ہے مگر عملی صورت اختیار کرنے کے بعد غیر معصوم۔

اللہ کی عبادت کرنا اسلام کے فرائض میں سے ہے۔ لیکن اگر کوئی عبادت گذار مغرب کے وضو سے فجر کی نماز پڑھے یا ہر رات کو سارا قرآن ختم کرنے لگے تو اس طرح کا فعل عبادت میں غلو بن جائے گا۔

اسلام میں غیرت مندی کو پسند کیا گیا ہے۔ لیکن کسی کی غیرت اگر اس حد تک بڑھے کہ اس کو اپنے خلاف سچائی کے اعتراف میں بھی غیرت آنے لگے تو ایسی غیرت غلو کی فہرست میں شامل ہو جائے گی۔ اسلام میں اہلِ علم کا احترام کرنا سکھایا گیا ہے۔ لیکن اگر اہلِ علم کے احترام کا مطلب یہ لیا جائے کہ اہلِ علم پر تنقید نہ کرو تو یہ غلو بن جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ محض دینی جذبہ کسی عمل کو دینی نہیں بناتا۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عمل خدا کے حکم اور رسول کے نمونہ کے مطابق ہو۔

فیض بقدر استعداد

حدیث میں ہے کہ تمہارے دین کی سب سے بہتر چیز تفقہ ہے (خیر دینکم الفقہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس کے لیے ان الفاظ میں دعا فرمائی : اللّٰھم فقّھہ فی الدّین وعلّمہ التاویل (خدایا، اس کو دین کی فہم عطا فرما اور اس کو تاویل کلام کی صلاحیت دے) بخاری و مسلم میں ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے :

عن ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال : اِنَّ مثلَ مابعثنی اللہُ بہ من الھدیٰ والعلم کمثل غیث اصاب ارضًا، فکانت منھا طائفۃ طیبۃ قبلت الماء فانبتت الکلأ والعشب الکثیر... وکان منھا اجادب امسکت الماء فنفع اللہ بھا الناس... فشربوا منھا وسقوا وزرعوا.... واصاب طائفۃ منھا اخریٰ، انّما ھی قیعان لاتمسک ماء ولا تنبت کلأ ... فذالک مثل من فقہ فی دین اللہ ونفعہ مابعثنی اللہ بہ فعلم وعلّم، ومثل من لم یرفع بذالک رأسا ولم یقبل ھدی اللہ الذی ارسلت بہ۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے جس ہدایت اور علم کے ساتھ مجھے بھیجا ہے اس کی مثال ایک بارش کی ہے جو زمین پر برسے۔ اس کا ایک حصہ زرخیز تھا۔ اس نے پانی کو قبول کیا اور خوب گھاس اور سبزہ اُگایا۔ اور اس زمین کا ایک حصہ بنجر زمین ہو۔ اس نے پانی کو روکا تو اللہ نے اس سے لوگوں کو فائدہ پہونچایا۔ اور زمین کا ایک اور حصہ ڈھلوان تھا۔ وہ نہ پانی کو روکتا تھا اور نہ سبزہ اُگاتا تھا۔ پس یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی، اس سے اس کو نفع ہوا۔ اس نے سیکھا اور سکھایا۔ اور (دوسری) مثال اس شخص کی ہے جس کو اس میں سے کوئی حصہ نہ ملا اور اس نے اس ہدایت کو قبول نہ کیا جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں۔

زمین کو بارش کا فائدہ اس کی استعداد کے بقدر ملتا ہے، یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ خدا کی ہدایت تمام انسانوں کے لیے عام ہے۔ مگر جو شخص جتنی استعداد کا ثبوت دے گا اتنا ہی فائدہ اس کو حاصل ہوگا۔ اور سب سے بڑا فائدہ جو ہدایت الٰہی سے کسی کو ملتا ہے وہ معرفت ہے۔

ذہنی ارتکاز

چارلس ڈارون (۱۸۸۲ - ۱۸۰۹) موجودہ زمانہ کا مشہور ترین مفکر ہے۔ اس کے نظریہ سے اگرچہ راقم الحروف کو اتفاق نہیں۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید انسان کی فکری تشکیل میں جتنا ڈارون کا حصہ ہے اتنا شاید کسی دوسرے مفکر کا نہیں۔

ڈارون نے موجودہ دنیا میں یہ غیر معمولی مقام اپنی غیر معمولی محنت کے ذریعہ حاصل کیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کے حالات بتاتے ہوئے لکھا ہے:

> All his mental energy was focussed on his subject, and that was why poetry, pictures, and music ceased in his mature life to afford him the pleasure that they had given him in his earlier days (5/495).

ڈارون کی تمام ذہنی طاقت اس کے موضوع پر وقف ہو گئی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ شاعری، تصویر اور موسیقی اس کی بعد کی زندگی میں اس کو وہ خوشی نہ دے سکیں جو کہ اس کی ابتدائی زندگی میں انھوں نے اس کو دیا تھا۔

یہ ذہنی ارتکاز کسی کام میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے لیے انتہائی طور پر ضروری ہے، خواہ وہ صحیح کام ہو یا غلط کام۔ آدمی جب تک اپنے مقصد میں اتنا زیادہ گم نہ ہو جائے کہ بقیہ تمام چیزیں اسے بھول جائیں۔ کسی اور چیز میں اس کے لیے لذت باقی نہ رہے، اس وقت تک وہ کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ تمام بڑے لوگوں نے اسی طرح کام کیا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی بڑا کام کرنے کا طریقہ نہیں۔

جب ایک آدمی کسی کام میں ہمہ تن مشغول ہوتا ہے تو اس وقت اس پر اس کام کے تمام چھپے ہوئے راز کھلتے ہیں۔ اسی وقت وہ اس کام کے تمام ضروری پہلوؤں پر توجہ دینے کے قابل بنتا ہے۔ اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ اس کی تمام فطری صلاحیتیں اس کے مقصد کے حصول میں لگ جائیں۔ یکسوئی اور لگن کے بغیر کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اکثر لوگ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا کام نہیں کرتے۔ اسی لیے اکثر لوگ کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر پاتے۔

یک طرفہ اقدام کی ضرورت

صلح حدیبیہ (۶ ھ) تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے۔ اس موقع پر مخالفین اسلام نے صلح کی جو شرطیں پیش کیں، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بحث کے بغیر منظور کر لیا۔ یہ شرطیں سب کی سب مخالفینِ اسلام کے حق میں تھیں۔ چنانچہ جو مسلمان آپ کے ساتھ تھے ان کی اکثریت پر یہ صلح بے حد شاق گزری۔ حتی کہ بعض صحابہ یہ کہہ پڑے کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ اور کیا فریق ثانی باطل پر نہیں ہے۔ اگر ہم حق پر ہیں اور فریق ثانی باطل پر ہے تو ہم اس قسم کی ذلت آمیز شرائط پر صلح کیوں کریں۔

پیغمبر اسلام اور عام مسلمانوں کے درمیان رائے کا یہ فرق کیوں ہوا۔ اس کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام مسئلہ کو یک طرفہ طور پر دیکھ رہے تھے اور عام مسلمان دو طرفہ طور پر۔ عام مسلمانوں کا خیال تھا کہ کچھ ہم جھکیں اور کچھ وہ جھکیں۔ کچھ شرطیں ہماری مانی جائیں، کچھ شرطیں ان کی مانی جائیں۔ یعنی معاملہ کو دو طرفہ بنیاد پر طے کیا جائے۔ جب کہ پیغمبر اسلام کا خیال تھا کہ ہم اس بحث کو نہ چھیڑیں کہ اس معاملہ میں کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ اس بحث سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم یک طرفہ طور پر فریق ثانی کی پیش کی ہوئی شرطوں پر راضی ہو جائیں۔

مسلمانوں کی رائے خالص منطقی اعتبار سے بالکل درست تھی۔ نظری انصاف کے اعتبار سے یقیناً یہی ہونا چاہیے تھا کہ دونوں میں سے کوئی فریق ضد نہ کرے، بلکہ اصولی بنیاد پر جو بات صحیح ہے اس پر دونوں فریق راضی ہو جائیں۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم معاملہ کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ اگر اصول اور منطق کی بنیاد پر اصرار کیا گیا تو فریق ثانی ہرگز راضی ہونے والا نہیں ہے۔ اس لیے عملی اعتبار سے مسئلہ کا ممکن حل صرف یہ ہے کہ فریق ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا جائے۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہوگا کہ دونوں فریقوں میں ٹکراؤ کی صورت حال ختم ہو جائے گی۔ اور مسلمانوں کے لیے کام کے مواقع نکل آئیں گے۔ دو طرفہ بنیاد پر اصرار عملاً دونوں فریقوں کے درمیان ٹکراؤ کو برقرار رکھنے کے ہم معنی تھا۔ جب کہ یک طرفہ بنیاد پر راضی ہونے کا مطلب یہ تھا کہ جنگی ٹکراؤ ختم

ہو، اور میدانِ جنگ سے باہر جو ممکن دائرہ ہے، اس میں مسلمانوں کے لیے دعوت اور تعمیر کی جدوجہد کی راہیں کھل جائیں۔

دورِ نبوت کا یہ واقعہ موجودہ حالات میں ہمارے لیے رہنما واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان آج جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں وہ انتہائی پیچیدہ ہیں۔ پچھلے پچاس سال کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مسئلہ کا منطقی تجزیہ کرنا یا فریقِ ثانی کے سامنے اصولی مطالبات کا میمورنڈم پیش کرنا موجودہ حالات میں اتنا زیادہ بے فائدہ ہے کہ اس کی قیمت کاغذ کے اس ٹکڑے کے بقدر بھی نہیں ہے جس پر یہ منطق اور اصولی مطالبات لکھے جاتے ہیں۔ اصولی مطالبہ صرف اس وقت بامعنی ہوتا ہے جب کہ فریق ثانی اصول کے آگے جھکنے کے لیے تیار ہو۔ اور موجودہ صورت حال میں اس کا کوئی ادنی امکان بھی نہیں۔

مسلمان اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مسئلہ کو دوطرفہ بنیاد پر طے کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ مسئلہ کا واحد قابل عمل حل صرف یہ ہے کہ اس کو یک طرفہ بنیاد پر طے کیا جائے۔ اس وقت مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں نے فرصتِ عمل کو کھو دیا ہے۔ ان کے لیے ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے لیے کوئی تعمیری منصوبہ بنائیں اور اس کی طرف اپنا سفر شروع کریں۔ اگر مسلمان اس قربانی پر راضی ہو جائیں کہ وہ فریقِ ثانی سے اپنے تمام جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں تو اس کا نقد فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان فوراً ہی اپنے لیے عمل کا موقع پالیں گے۔ جس کو وہ تقریباً نصف صدی سے کھوئے ہوئے ہیں۔ عمل کا موقع پانا گویا سفر کے آغاز کو پانا ہے۔ اور جو لوگ اپنے سفر کے آغاز کو پالیں وہ یقیناً ایک روز اپنے سفر کے اختتام کو پہونچ کر رہتے ہیں۔

یہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں جو نقصان کو برداشت کرے وہی فائدہ کو حاصل کرتا ہے۔ یک طرفہ طور پر مسئلہ کو ختم کرنا اسی اصول کی تعمیل ہے۔ یک طرفہ طور پر مسئلہ کو ختم کرنے پر راضی ہونا بلاشبہ اپنے اندر نقصانات کے پہلو رکھتا ہے مگر موجودہ دنیا میں کسی بھی قسم کی ترقی کا یہی واحد زینہ ہے۔ موجودہ دنیا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ صرف فائدہ چاہیں ان کے حصہ میں آخر کار صرف نقصان آئے، اور جو لوگ ابتدائی نقصان کو برداشت کریں وہ بالآخر ہر قسم کے فائدوں کے مالک بنیں۔

کم سمجھنا

زندگی نام ہے ناخوشگواریوں کو خوش گواری کے ساتھ قبول کرنے کا۔ تھیوڈور روز ویلٹ (Theodore Roosevelt) نے اسی بات کو ان الفاظ میں کہا کہ زندگی کا سامنا کرنے کا سب سے زیادہ ناقص طریقہ یہ ہے کہ حقارت کے ساتھ اس کا سامنا کیا جائے :

The poorest way to face life is to face it with a sneer.

اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص اکیلا نہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ دوسرے بہت سے لوگ بھی یہاں زندگی کا موقع پائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے منصوبہ کے تحت ہر ایک کو اس کا سامانِ حیات دے رہا ہے۔ کسی کو ایک چیز، کسی کو دوسری چیز اور کسی کو تیسری چیز۔ ایسی حالت میں آدمی اگر دوسروں کو حقیر یا کم سمجھ لے تو وہ حقیقت پسندانہ نظر سے محروم ہو جائے گا۔ وہ نہ اپنے بارہ میں صحیح رائے قائم کر سکے گا اور نہ دوسروں کے بارے میں۔

تاریخِ انسانی میں جو سب سے بڑا جرم کیا گیا ہے وہ عدم اعتراف ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں خدا کے نیک بندے حق کا پیغام لے کر اٹھے، انھوں نے لوگوں کو سچائی کی طرف بلایا۔ مگر ہمیشہ ایسا ہوا کہ ان کے مخاطبین کی اکثریت نے ان کو نظر انداز کر دیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے ان سچے انسانوں کو حقیر سمجھ لیا، صرف اس لیے کہ ان کے آس پاس انھیں دنیا کی رونقیں نظر نہ آئیں، وہ ان کو تختِ عظمت پر بیٹھے ہوئے دکھائی نہیں دیئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایک چھوٹے آدمی کے سامنے کیوں اپنے آپ کو جھکائیں۔

یہی معاملہ قومی رویہ کا بھی ہے۔ اگر ہم ایک قوم کو حقیر سمجھ لیں تو اس کے بارے میں ہمارا پورا رویہ غلط ہو کر رہ جائے گا۔ ہم اس قوم کی اچھائیوں کو بھی برائی کے روپ میں دیکھنے لگیں گے، ہم اس قوم کی طاقت کا غلط اندازہ کریں گے اور اس سے ایسے مواقع پر غیر ضروری طور پر لڑ جائیں گے جہاں بہترین عقل مندی یہ تھی کہ اس سے اعراض کیا جائے۔

دوسروں کو کم سمجھنا باعتبار نتیجہ خود اپنے آپ کو کم سمجھنا ہے۔ دوسروں کو حقیر سمجھنے کا آخری انجام صرف یہ ہے کہ آدمی خود دوسروں کی نظر میں حقیر ہو کر رہ جائے۔

بامعنی کائنات

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہماری قریبی کہکشاں ایک لاکھ سال نور کی وسعت میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کہکشاں کے اندر تین لاکھ ملین ستارے پائے جاتے ہیں۔ ہمارا شمسی نظام اس کے مرکز سے ۲۷ ہزار سال نور کے فاصلہ پر واقع ہے۔ کہکشاں کے اکثر ستارے ممکن طور پر کسی نہ کسی قسم کا سیاروں کا سلسلہ رکھتے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر سیارے زندگی کے لیے غیر موزوں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ستارہ سے یا تو بہت زیادہ قریب ہیں یا بہت زیادہ دور ہیں۔ تاہم چوں کہ ستاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے، خالص حسابی اعتبار سے یہ امکان ہے کہ بہت سے سورج جیسے ستارے ہوں اور اسی طرح بہت سے زمین جیسے سیارے:

> It is estimated that our Milky Way galaxy, which is 100,000 light years across, is composed of over 300,000 million stars. Our solar system is situated 27,000 light years away from the centre. Most of the stars are likely to have planets of some sort. But most of these planets will be unsuitable for life, because they are either too near or too far from their parent star. Yet because the number of stars is so great, there must, by sheer statistical probability, be many sun-like stars and earth-like planets.
> *The Hindustan Times*, July 31, 1986, p. 9

تاہم بے شمار سیاراتی نظاموں میں صرف ایک ہی سیاراتی نظام ہے جس میں انسان جیسی زندہ مخلوق آباد ہو سکتی ہے۔ اور وہ وہی نظام ہے جس میں ہماری زمین واقع ہے۔ اس قسم کا کوئی اور سیاراتی نظام ابھی تک ساری کائنات میں معلوم نہ کیا جا سکا۔ موجودہ زمانہ میں سائنس کا ایک مستقل شعبہ وجود میں آیا ہے جس کو ایس ای ٹی آئی (SETI) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے —— بالائے خلا ذہانت کی تلاش:

Search for Extra-Terrestrial Intelligence

زندگی کے ارتقائی نظریہ کے تحت سائنس دانوں کا گمان ہے کہ کائنات کے دوسرے مقامات پر بھی انسان جیسی ذہین مخلوق ہونی چاہیے۔ کیوں کہ ارتقائی عمل عموم چاہتا ہے۔ ارتقائی عمل میں استثنا کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس فرضی قیاس پر جدید انسان کو اتنا زیادہ یقین ہے کہ ایک سائنسی مصنف اسحاق ایسمو

(Issac Assimov) نے حساب لگا کر اعلان کیا ہے کہ ہماری کہکشاں میں چار سو ملین سیارے ایسے ہیں جن میں پودے اور حیوانات پائے جاتے ہیں یا پائے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ سب کا سب محض حسابی قیاس ہے۔ کھربوں ڈالر خرچ کر کے روس اور امریکہ نے اس سلسلے میں جو تحقیقات کی ہیں ان کے ذریعہ اب تک زمین جیسے کسی ایک سیارے کا بھی کوئی ادنیٰ نشان دریافت نہ کیا جا سکا۔

سورج ایک اوسط درجہ کا ستارہ ہے۔ اس کا قطر آٹھ لاکھ ۶۵ ہزار میل ہے وہ ہماری زمین سے تقریباً بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ سورج کی سطح پر جو حرارت ہے اس کا اندازہ بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ ٹمپریچر کیا گیا ہے۔

زمین سے سورج کا فاصلہ تقریباً نو کرور ۳۰ لاکھ میل ہے۔ یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے۔ یہ واقعہ ہمارے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اگر یہ فاصلہ گھٹ یا بڑھ جائے تو زمین پر انسان جیسی مخلوق کی آبادکاری ناممکن ہو جائے۔ مثلاً اگر ایسا ہو کہ سورج نصف کے بقدر ہم سے قریب ہو جائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس کی شدت سے کاغذ جلنے لگے۔ اور اگر زمین اور سورج کا موجودہ فاصلہ دگنا زیادہ ہو جائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ زمین پر زندگی جیسی چیز باقی نہ رہے۔ یہی صورت اس وقت پیدا ہوگی جب کہ موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آجائے۔ مثلاً ایک ستارہ ہے جس کی گرمی ہمارے سورج سے اسی ہزار گنا زیادہ ہے، اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو پوری زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا۔
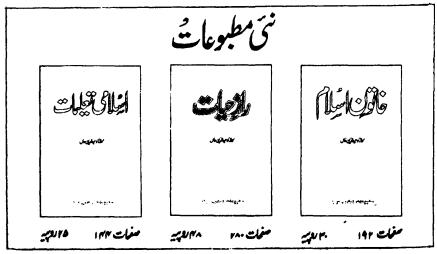
یہودی کردار

روایات میں آتا ہے کہ مدینہ میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ مال آیا۔ آپ نے اس کو لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ اس تقسیم میں کسی کو زیادہ ملا اور کسی کو کم۔ چنانچہ اس بنا پر کچھ لوگوں نے آپ کی دیانت داری پر شبہ ظاہر کرنا شروع کیا۔ ایک صحابی کہتے ہیں:

مررت برجلین واحد هما یقول لصاحبه واللہ ما اراد محمد بقسمته وجه اللہ ولا الدار الآخرة	میں دو آدمیوں کے پاس سے گزرا۔ ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم محمدؐ نے اپنی اس تقسیم میں اللہ کی رضا اور آخرت کا گھر نہیں چاہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا: موسیٰ پر اللہ کی رحمت ہو، ان کو اس سے بھی زیادہ ستایا گیا مگر انھوں نے صبر کیا (رحمة اللہ علی موسیٰ لقد اوذی باکثر من هذا فصبر، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۵۲۱) قرآن کی حسب ذیل آیت میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

یا ایها الذین آمنوا لا تکونوا کالذین آذوا موسیٰ فبرأه اللہ مما قالوا وکان عند اللہ وجیها (الاحزاب ۶۹)	اے ایمان والو، تم ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے موسیٰ کو ستایا پھر اللہ نے ان کی کہی ہوئی باتوں سے موسیٰ کی برأت کر دی اور وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھا۔

یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس طرح ستایا اس کی تفصیل بائبل کی کتاب خروج اور کتاب گنتی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہودی انسائیکلوپیڈیا میں کہا گیا ہے کہ موسیٰؑ کو اپنی قوم کے باغی اور منحرف لوگوں سے بہت سی ذلت اور توہین برداشت کرنی پڑی، حتی کہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی جو کہ ان کی قیادت پر حسد کرتا تھا:

(Moses had) to suffer many indignities and insults from a rebellious and recalcitrant people, even from his closest relatives, who were jealous of his leadership.
Jewish Encyclopedia, Volume V, p. 442

یہ فرق کیوں

قرآن میں اہلِ جنت کو دو بڑے طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک مقربین خاص۔ اور دوسرے عام انعام یافتہ لوگ۔ پھر بتایا گیا ہے کہ مقربین خاص کی تعداد پہلے لوگوں میں زیادہ ہوگی اور بعد کے لوگوں میں کم ہوگی۔

وکنتم ازواجاً ثلاثة۔ فاصحاب الميمنة ما اصحابُ الميمنة واصحاب المشئمة ما اصحاب المشئمة۔ والسابقون السابقون۔ اولئك المقربون۔ فی جنات نعيم۔ ثلة من الاولين۔ وقليل من الآخرين۔ (الواقعہ)

اور تم لوگ (قیامت میں) تین قسم کے ہو جاؤ گے۔ پھر دائیں والے، کیا خوب ہیں دائیں والے۔ اور بائیں والے، کیسے برے ہیں بائیں والے۔ اور آگے والے تو آگے ہی والے ہیں۔ وہ مقرب لوگ ہیں۔ نعمت کے باغوں میں۔ ان کی بڑی تعداد اگلوں میں سے ہوگی، اور تھوڑی تعداد پچھلوں میں سے ہوگی۔

اس قرآنی بیان کی تشریح کرتے ہوئے ابن کثیر اپنی تفسیر کی کتاب میں لکھتے ہیں:

لاشك ان اوّل كلّ امة خير من آخرها فيحتمل ان تعم الآية جميع الامم كلّ امة بحسبها۔ ولهذا ثبت فی الصحاح وغيرها من غير وجه ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال: خير القرون قرنی ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم (الجزء الرابع، صفحہ ۲۸۴)

اس میں شک نہیں کہ ہر امت کا پہلا گروہ اس کے بعد کے گروہ سے بہتر ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ آیت حسب حیثیت تمام امتوں کے لیے ہو۔ اور صحاح اور دوسری کتب حدیث میں ایک سے زیادہ طریقوں سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے۔ اس کے بعد جو لوگ آئیں گے اور اس کے بعد جو لوگ آئیں گے۔

پہلے گروہ اور دوسرے گروہ میں اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ایک مفسر قرآن لکھتے ہیں: "ہر امت کے پہلے طبقہ میں نبی کی صحبت یا قرب عہد کی برکت سے

اعلیٰ درجہ کے مقربین جس قدر کثرت سے ہوئے ہیں، پچھلے طبقوں میں وہ بات نہیں رہی۔ مگر یہ توجیہہ صحیح نہیں۔ اگر یہ فرق صحبت کی وجہ سے پیدا ہوتا تو قرآن میں یہ درج ہونا چاہیے تھا کہ دورِ اوّل کے تمام لوگ "السابقون" ہوں گے اور دورِ ثانی کے تمام لوگ "اصحاب الیمین"۔

اس کے برعکس قرآن کے مطابق "صحبت یافتہ" طبقہ میں بھی دونوں قسم کے افراد ہوں گے اور "غیر صحبت یافتہ" طبقہ میں بھی دونوں قسم کے افراد۔

اصل یہ ہے کہ یہ فرق اصلاً نوعیت ایمان کے اعتبار سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ صرف نوعیتِ زمانہ کے اعتبار سے۔ پیغمبر کا دور دعوت کا دور ہوتا ہے۔ اس وقت جو لوگ اسلام میں داخل ہوتے ہیں وہ دعوت کے ذریعہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ شعوری انقلاب کے ذریعہ اسلام قبول کرتے ہیں۔ ان کا اسلام ان کے لیے ایک دریافت ہوتا ہے۔ یہ چیز ان کو وہ برتر ایمان عطا کرتی ہے جو ان کو السابقون کی صف میں داخل کر دیتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں بعد والوں کا اسلام نسلی اسلام ہوتا ہے۔ ان کو اسلام بطور وراثت ملتا ہے نہ کہ بطور دریافت۔ ظاہر ہے کہ وراثت والے اسلام میں وہ خصوصیات نہیں ہو سکتیں جو دریافت والے اسلام میں ہوتی ہیں۔ تاہم بعد کے دور میں بھی جن افراد کو اللہ کی توفیق سے دریافت والا اسلام حاصل ہو جائے تو وہ بھی اللہ کے نزدیک اس کے مستحق قرار پائیں گے کہ انھیں السابقون کی صف میں داخل کیا جائے۔

ایک سفر

فروری ۱۹۸۷ میں حیدر آباد کا سفر ہوا۔ یہ حیدر آباد کے لیے میرا دسواں سفر تھا۔ ابتدائی چھ سفروں کا تذکرہ الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۳ میں شائع ہو چکا ہے۔ میرا ساتواں سفر اسلامی مرکز کی شاخ حیدر آباد کے افتتاح کے سلسلہ میں تھا۔ اس موقع پر وہاں افتتاحی جلسہ ہوا جس میں دیگر شخصیتوں کے علاوہ جناب سید مکثر شاہ صاحب اور جناب سید ہاشم علی صاحب شریک ہوئے۔ اس سفر کی روداد مقامی اخبارات (مثلاً سیاست، رہنمائے دکن، منصف ۱۲ فروری ۱۹۸۴) میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوئی۔

حیدر آباد کے لیے میرا آٹھواں سفر جولائی ۱۹۸۵ میں ہوا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ نومبر ۱۹۸۵ میں شائع ہو چکی ہے۔ نواں سفر جنوری ۱۹۸۶ میں ہوا۔ یہ ایک تنظیمی اور انتظامی نوعیت کا سفر تھا۔ اس موقع پر کوئی عمومی پروگرام نہیں کیا جا سکا۔ دسواں سفر موجودہ سفر تھا جو فروری ۱۹۸۷ میں پیش آیا۔

۱۳ فروری ۱۹۸۷ کی صبح کو ۶ بجے دہلی ایرپورٹ پر پہونچا تو حسب معمول ایرپورٹ پر آدمیوں کی زبردست چہل پہل تھی۔ کوئی ایک طرف جا رہا تھا اور کوئی دوسری طرف۔ کسی کے چہرہ پر سکون تھا اور کسی کے چہرہ پر اداسی۔ میں نے سوچا کہ کوئی شخص خوشی کی خبر سن کر جا رہا ہے اور کوئی شخص غم کی خبر سن کر۔ کوئی اپنے تجارتی فائدہ کی طرف جا رہا ہے اور کوئی اپنے تجارتی نقصان کی طرف۔ بظاہر ہر آدمی الگ الگ منزل کا مسافر ہے۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو سب کی منزل ایک ہے۔ اور وہ موت ہے۔ ہر ایک بالآخر موت کے کنارے پہونچنے والا ہے۔ مگر یہی وہ یقینی منزل ہے جس کا علم کسی کو نہیں۔

جہاز کے اندر "انفلائٹ ریڈنگ" کے لیے انڈین ایرلائنز کا ماہنامہ سواگت (فروری ۱۹۸۷) تھا۔ اس میں ایک مضمون ہندستان کے عیسائی چرچ کے بارہ میں تھا۔ اس مضمون کے ساتھ کئی تصویریں تھیں جن میں چرچ کی اندرونی تصویر بھی تھی۔ اس میں حضرت مسیح کو (نعوذ باللہ) اس حال میں دکھایا گیا تھا کہ جسم کے کپڑے اترے ہوئے ہیں اور ہاتھ پاؤں میں

مینیں ٹھونک کر آپ کو بالکل بے چارگی کے عالم میں ہلاک کیا جا رہا ہے۔

اس کو دیکھ کر مجھے یورپ کے ایک عیسائی کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ مغربی دنیا میں عیسائیت کے زوال کا اصل سبب عیسائی مذہب نہیں بلکہ عیسائی چرچ ہیں۔ عیسائی چرچ ایک طرف حضرت مسیح کو خدا بتاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ دکھاتے ہیں کہ آپ کو بے چارگی کے ساتھ صلیب پر لٹکا کر ہلاک کر دیا گیا۔ اب آج کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان جب وسیع کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کو یہ تصور بالکل ناقابلِ فہم معلوم ہونے لگتا ہے کہ جو خدا اتنی بڑی کائنات کا خالق و مالک ہے، وہ اس بے چارگی کے ساتھ انسانوں کے ہاتھ سے ہلاک کر دیا جائے۔

آج حیدر آباد ایک شہر کا نام ہے۔ چالیس سال پہلے حیدر آباد ایک اسٹیٹ کا نام تھا جس کا رقبہ اٹلی کے برابر تھا۔ یہاں کا نواب دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔

حیدر آباد کا ابتدائی بانی سلطان قلی قطب شاہ تھا۔ وہ بہمنی سلطنت میں ایک فوجی افسر تھا۔ ۱۵۱۲ء میں اس نے بغاوت کر کے اس علاقہ میں اپنی آزاد سلطنت قائم کر لی۔ جو تاریخ میں قطب شاہی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سلطنت چلتی رہی۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب نے ۱۶۸۵ میں اس کو فتح کر کے مغل سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد یہاں مغل گورنر رہنے لگے۔ نظام الملک آصف جاہ اسی قسم کا ایک گورنر تھا۔ ۱۷۱۳ میں اس کا تقرر ہوا۔ اس کے بعد اس کے اندر آزادی کے رجحانات پیدا ہوئے۔ ۱۷۲۴ میں اس نے اس علاقہ کو دہلی کی مغل سلطنت سے کاٹ لیا اور یہاں اپنی آزاد سلطنت قائم کر لی۔ غیر منقسم ہندستان میں یہ ملک کی سب سے بڑی ریاست تھی۔

ہندستان کی آزادی کے بعد سابق مسلم نواب (نظام دکن) ریاست کو سابقہ حیثیت پر باقی رکھنا چاہتے تھے۔ وہ نئی ہندستانی حکومت سے موجودہ صورت حال کی بحالی کا معاہدہ (Standstill agreement) کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ کو اس معاہدہ پر دستخط ہو گئے تھے۔ اس معاہدہ کے تحت حیدر آباد کو ایک قسم کی نیم آزاد ریاست کی حیثیت حاصل رہتی۔ مگر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں، نظام حیدر آباد کا منصوبہ ناکام ہو گیا جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مقامی طور پر ایک مقبول مسلم لیڈر (قاسم رضوی) نے ایک عسکری

تحریک رضا کار کے نام سے چلادی۔ اس نے ہندستان کی فوجی طاقت کو موقع دیدیا کہ وہ ریاست میں مداخلت کرکے ستمبر ۱۹۴۸ میں اس کو اپنے کنٹرول میں لے لے۔ (چار روزہ پولس ایکشن کے بعد) حیدر آباد نے دوسری دیسی ریاستوں کی حیثیت کو قبول کرلیا۔ بعد کو وہ تقسیم کردی گئی اور جغرافی نقشہ سے اس کا وجود مٹ گیا :

> His plan miscarried, largely because a local populist Muslim leader launched a militant movement (the Razakars) that provided a motive for Indian military forces to intervene and restore order, in September 1948. Hyderabad accepted the same conditions as other former princely states and was later partitioned and disappeared from the map (9/423).

حیدر آباد کی مسلم ریاست ۱۷۲۴ میں اپنے مرکز سے بغاوت کے نتیجہ میں قائم ہوئی تھی۔ اور ۱۹۴۸ میں وہ خود مسلم قیادت کی نادانی کے نتیجہ میں ختم ہوگئی۔ یہی کہانی پچھلے کئی سو سال سے مسلم تاریخ میں دہرائی جارہی ہے۔ اپنے مرکز سے بغاوت کرکے اتحاد کو ختم کرنا اور پھر مزید نادانیوں کے نتیجہ میں اپنا وجود مٹا لینا ـــــ حیدر آباد کا آغاز مسلم تاریخ کے ایک المیہ کو بتاتا ہے اور اس کا اختتام مسلم تاریخ کے دوسرے المیہ کو۔

پاکستان کی شائع شدہ ایک کتاب میں حیدر آباد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے ـــــ قائد اعظم کی وفات (۱۱ ستمبر ۱۹۴۸) کی خبر سن کر تمام پاکستانی سوگ میں مصروف تھے۔ وہ شخصیت اس دنیا سے اُٹھ گئی تھی جس سے بھارتی لیڈر خائف تھے۔ اس لیے انھوں نے حیدر آباد کے خلاف فوجی کارروائی کرکے اسے زبردستی بھارت میں شامل کرلیا (تاریخ پاکستان و ہند، صفحہ ۴۷۶)

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے ایسے فانی لیڈر تو پیدا کرلیے جن سے دیگر اقوام خائف ہوں۔ مگر وہ ایسے غیر فانی خدا کو نہ پاسکے جو دیگر اقوام کے مقابلہ میں ان کا مددگار بن سکے۔ کیسی عجیب ہے ان کی محرومی اور کیسی عجیب ہے ان کی کامیابی۔

شہر حیدر آباد کی ۳۰ لاکھ آبادی میں ۱۴ لاکھ مسلمان ہیں۔ یعنی کل آبادی کا تقریباً ۴۵ فی صد۔ تاہم مسلمانوں کی اس آبادی کا ۸۰ فی صد سے زیادہ حصہ قدیم حیدر آباد میں بسا ہوا ہے۔ جدید حیدر آباد میں ان کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے۔ مسلمانوں کی آبادی کا یہی تناسب ہندستان

کے اکثر شہروں میں نظر آتا ہے۔ ہر شہر میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ قدیم شہر میں زیادہ ہیں اور جدید شہر میں کم۔ یہ گویا ایک علامت ہے کہ مسلمان قدیم دور میں دنیا سے آگے تھے، مگر جدید دور میں وہ دنیا سے پیچھے ہو گیے۔

موجودہ حیدر آباد کے تین بڑے حصے ہیں۔ نیا حیدر آباد، پرانا حیدر آباد، سکندر آباد۔ یہاں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں وہ سب پرانے حیدر آباد میں ہوتے ہیں۔ نئے حیدر آباد یا سکندر آباد میں کوئی فساد نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نئے حیدر آباد اور سکندر آباد میں زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں۔ مگر پرانے حیدر آباد میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ "تعلیم" فرقہ وارانہ فساد کے خلاف ایک روک کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو لوگ فی الواقع اس ملک میں فرقہ وارانہ فساد کو ختم کرنا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کریں۔ جب معاشرہ کے زیادہ لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو فساد کا سلسلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

پرانے حیدر آباد کا شاید سب سے بڑا مسئلہ ٹریفک کا ہجوم ہے۔ تنگ سڑکیں اور زیادہ ٹریفک، اسی کا دوسرا نام پرانا حیدر آباد ہے۔ بعض اوقات آدمی محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ پیدل چلے تو شاید وہ سواری سے پہلے اپنی منزل پر پہونچ جائے گا۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے یہاں کا لطیفہ بیان کیا۔ ایک شخص پرانے حیدر آباد کے علاقہ سے پیدل گزر رہا تھا، اتنے میں اس کا کوئی جاننے والا اپنی کار پر ادھر سے گزرا۔ اس نے اپنی کار روک کر اس آدمی سے کہا کہ گاڑی میں آجائیے، آگے میں آپ کو آپ کی منزل پر چھوڑ دوں گا۔ آدمی نے یہ سن کر جواب دیا: آپ کا شکریہ، مگر مجھے ذرا جلدی ہے۔

حیدر آباد میں بہت سی تاریخی چیزیں ہیں جن کو دیکھنے کے لیے لوگ کثیر تعداد میں وہاں جاتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک سالار جنگ میوزیم ہے۔ اس میوزیم میں ۴۰ ہزار سے زیادہ نادر نمونے رکھے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مشرقی دنیا میں یہ اپنی قسم کا واحد میوزیم ہے۔ اس کو ریاست کے ایک سابق وزیر اعظم نے بنایا تھا۔

اس میوزیم میں جو چیزیں رکھی گئی ہیں ان میں سے ایک عجیب چیز ایک سنگ مرمر کا مجسمہ ہے۔ اس مجسمہ میں ایک عورت کو اس حال میں دکھایا گیا ہے کہ وہ نہا کر غسل خانہ سے نکلی

ہے اور اس کے جسم پر بھیگا ہوا کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ اس مجسمہ کو اس قدر فن کاری کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سچ مچ کوئی بھیگے کپڑے میں کھڑا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا: ۔ٰہ تعالیٰ نے انسان کے اندر آرٹ کو تخلیق کرنے کی یہ نادر صلاحیت شاید اس لیے رکھی ہے کہ آدمی ،ابق اصغر کو دیکھ کر خالق اکبر کا تصور قائم کر سکے۔

حیدر آباد کے ریاستی دور میں جو شخصیتیں ابھریں ان میں سے ایک ہیں نواب عماد الملک ولوی سید حسین بلگرامی (-۱۸۴۲) وہ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ اردو کے علاوہ نگریزی، فرانسیسی، عربی، فارسی زبانیں بھی بخوبی جانتے تھے۔ حیدر آباد ریاست میں وہ ختلف عہدوں پر مامور رہے۔ آخر میں وہ ناظم تعلیمات تھے۔ ۳۰ سال سے زیادہ مدت تک ہ ریاست کے تعلیمی امور کے ذمہ دار اعلیٰ رہے۔ بہت سے اعزازات وخطابات سے سرفراز کیے گیے۔ ۱۹۱۰ میں انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ بھی شروع کیا تھا۔ مگر وہ نصف قرآن سے زیادہ نہ ہو سکا۔

نواب عماد الملک نہایت صاف گو آدمی تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی کتاب چند ہم عصر" میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ سابق نظام دکن میر محبوب علی خاں نے اعلیٰ ارکانِ سلطنت سے پوچھا کہ عوام کا ان کی نسبت کیا خیال ہے۔ ہر ایک نے تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ نواب ماد الملک خاموش رہے۔ مکرر دریافت کرنے پر فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ شراب پیئے ہوئے ڑے رہتے ہیں۔ کام کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ نظامِ دکن نے ان کی اس راست گوئی و پسند کیا اور اس کے صلہ میں ان کو الماس کی ایک بیش قیمت انگوٹھی عطا فرمائی۔

میر محبوب علی خاں کے بعد ان کے صاحبزادے میر عثمان علی خاں ۱۹۱۱ میں حیدر آباد کے رماں روا مقرر ہوئے اور خاتمہ ریاست (۱۹۴۸) تک اس کے فرماں روا رہے۔ مولوی عبدالحق ماحب نے نواب عماد الملک کا دوسرا قصہ اس طرح لکھا ہے کہ ایک بار نواب میر عثمان علی خاں آخری فرماں روائے دکن) نے مسئلہ ازدواج پر بحث کے دوران کہا کہ اسلام میں تعدد ازواج کے بارہ میں سہولت ہے۔ نواب عماد الملک نے فوراً ٹوکا اور کہا کہ اسلام نے اس معاملہ میں یسی کڑی شرط لگا رکھی ہے کہ کوئی شخص ایک سے زاید بیوی نہیں رکھ سکتا۔ شاہ دکن اس

صاف گوئی پر خفا ہوگیے۔ اس وقت وہ ڈنر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہِ دکن نے اسی وقت ان کو ڈنر کی میز سے اٹھا دیا۔

نواب میر عثمان علی خاں نے اپنے ایک ماتحت کو کھانے کی میز سے اٹھا دیا۔ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ بہت جلد وہ خود حکمرانی کی میز سے اٹھائے جانے والے ہیں تو وہ کبھی ایسا نہ کرتے۔ سرکشی کے تمام واقعات صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ آدمی اپنے مستقبل سے بے خبر رہتا ہے۔ آدمی اگر اپنے مستقبل کو جانے تو وہ کبھی سرکشی نہ کرے۔

حیدر آباد کی تاریخ میں ایک نہایت اہم سبق ہے۔ ریاست کے دور میں یہاں وزیر اعظم کے عہدہ پر اکثر کوئی ہندو شخصیت ہوتی تھی۔ مثلاً ایک زمانہ میں مہاراجہ سرکشن پرشاد (وفات ۱۹۴۰) ریاست کے صدر اعظم تھے۔ وہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ تاہم اس سے نیچے کی ملازمتوں میں عام طور پر مسلمان لیے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی معاش کا واحد سب سے بڑا ذریعہ سرکاری ملازمت ہی تھی۔

یہ صورت حال ریاست کے ہندوؤں کے لیے ڈِس ایڈوانٹج کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر یہ ڈِس ایڈوانٹج ان کے لیے ایڈوانٹج بن گیا۔ سرکاری ملازمت سے مایوس ہو کر انھوں نے تجارت کے میدان میں اپنی کوشش شروع کر دی۔ یہاں تک کہ وہ ریاست کی تقریباً پوری تجارت پر قابض ہوگیے۔ یہ مثال ظاہر کرتی ہے کہ ہر محرومی میں ایک نئی شاندار تر کامیابی کا پہلو موجود ہوتا ہے، بشرطیکہ آدمی اس کو دریافت کرے اور اس کی طرف اپنی زندگی کا سفر شروع کر دے۔

حیدر آباد کے سفر کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ اس کا ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔ ۱۵ فروری کی شام کو میں باغ عامہ میں تقریر کر کے نکلا۔ لوگ مصافحہ کرنے کے لیے ہر طرف گھیرے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک نوجوان بھیڑ کو چیرتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک آپ کی سب سے بہتر تصنیف کون ہے۔ میں نے کہا: میری سب سے بہتر تصنیف آپ ہیں۔ یہ انسان جو میرے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ یہی میری سب سے بہتر تصنیف ہے۔ میرا یہ جواب سن کر وہ ایک لمحہ کے لیے چپ رہا، اس کے بعد بولا: جب آپ مجھ کو اپنی سب سے بہتر تصنیف

ہتے ہیں تو میں بھی اس تصنیف کو طبع کرکے دکھاؤں گا۔

یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے کہا کہ خدایا، تو اس نوجوان کے الفاظ کو پورا ز، اور ایسی بہت سی زندہ تصنیفیں تیار کر دے جو میرے مشن کو لے کر چلیں اور میرے بعد اس کو گے بڑھائیں۔

حیدر آباد میں قارئین الرسالہ کا کافی بڑا حلقہ ہے۔ ان لوگوں نے یہاں ایک خاص ام "بک اسٹال" کا شروع کیا ہے۔ وہ ہر ہفتہ میں کم از کم دو بک اسٹال ضرور لگاتے ہیں۔ ںک جمعہ کے دن جامع مسجد کے سامنے۔ دوسرا اتوار کے دن باغ عامہ کے ہفتہ وار جلسہ میں۔ طریقہ نہایت مفید ہے۔ دوسرے مقامات کے لوگوں کو بھی اس کی تقلید کرنی چاہیے۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں آپ کا سفرنامہ چھپتا ہے۔ اگر ہم سفرنامہ لکھیں تو کیا ہ الرسالہ میں چھپ سکتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ الرسالہ کا سفرنامہ دراصل سبق نامہ ہوتا ہے۔ اگر آپ بھی اسی طرح سبق نامہ لکھیں تو انشاءاللہ وہ بھی شائع ہوجائے گا۔

مسٹر پریم مرارکا (صنعت کار) کو اپنے ایک مسلم دوست سے انگریزی الرسالہ ملا۔ وہ ان کو ناپسند آیا کہ وہ اس کے باقاعدہ قاری ہوگئے۔ وہ مجھ سے ملے تو انھوں نے بتایا کہ ان کے کئی م قوم افراد نے الرسالہ کو دیکھ کر کہا کہ اس کو ہمارے نام بھی جاری کردو۔ چنانچہ ان کے ذریعہ لئی اور ہندو صاحبان الرسالہ انگریزی کے قاری بن گئے ہیں۔ مسٹر مرارکا نے کہا کہ الرسالہ کے ہلے پیج پر آپ دو سطر یا تین سطر کی جو بات لکھتے ہیں وہ ایسی ہوتی ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد دمی اس سے رک نہیں سکتا کہ وہ آگے نہ پڑھے۔

مسٹر مہا دیون ریڈی (حمایت نگر) پہلے ایک بڑے سرکاری عہدہ پر تھے۔ اب وہ ریٹائر دچکے ہیں۔ اردو زبان بخوبی جانتے ہیں۔ وہ الرسالہ کے باقاعدہ قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہ تذکیر القرآن جلد اول کو پانچ بار پڑھ چکے ہیں اور اب اس کو چھٹی بار پڑھ رہے ہیں۔ تذکیر القرآن ں دوسری جلد کا انھوں نے شدت سے تقاضا کیا۔

مسٹر عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ کی رہائش گاہ پر کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مجلس ہوئی ں گفتگو کے دوران جو باتیں معلوم ہوئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ۱۹۴۸ میں جب ریاست

کا خاتمہ ہوا تو یہاں کے مسلمان بہت پریشان ہوئے۔ کیوں کہ اس وقت تک ان کی معاشیات کا انحصار زیادہ تر سرکاری ملازمت پر تھا اور ریاست کے ختم ہونے کے بعد وہ ملازمتوں سے محروم ہوگیے۔ اس طرح وقتی طور پر تو انھیں سخت تکلیف ہوئی۔ مگر اس محرومی نے انھیں بلند تر کامیابی تک پہونچا دیا۔ ملازمت کے میدان میں راستہ بند پاکر وہ تجارت کے میدان میں داخل ہونے لگے۔ اب چالیس سال کے بعد حیدر آباد کی تجارت میں مسلمانوں کا قابلِ لحاظ حصہ ہو چکا ہے، جب کہ ریاست کے زمانہ میں یہاں کی تجارت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔

اکثر لوگ جانتے ہیں کہ وہ انفرادی ناکامی کو کس طرح دوبارہ کامیابی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس انفرادی تجربہ کو ملّی اور اجتماعی معاملات میں استعمال کرنا جانتے ہوں۔

الرسالہ (جنوری ۱۹۸۷) میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے "یہ اسلام نہیں"۔ اس مضمون میں مسلمانوں کی اس روش پر تنقید کی گئی ہے کہ کسی آدمی کی ایک بات کو غلط قرار دے کر اس کی جائداد کو جلانے پھونکنے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں متعدد واضح آیتوں کے حوالے بھی دیے گیے ہیں۔ ایک صاحب نے اس مضمون پر اعتراض کیا۔ مگر انھوں نے قرآن یا حدیث کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ میں نے کہا کہ مذکورہ مضمون میں جو بات کہی گئی ہے وہ قرآن و حدیث کی دلیل کے ساتھ کہی گئی ہے۔ آپ قرآن وحدیث کو قرآن و حدیث سے کاٹ سکتے ہیں نہ کہ اپنے خود ساختہ الفاظ سے۔

یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا عام انداز ہے۔ کسی بات کے حق میں خواہ قرآن و حدیث کے کتنے ہی دلائل پیش کر دیجئے۔ وہ اس کی تردید کے لیے اس کو کافی سمجھیں گے کہ اپنے خود ساختہ "دلائل" پیش کر دیں۔ حالاں کہ قرآن وحدیث کو اپنے خود ساختہ "دلائل" کے ذریعہ رد کرنا سراسر فعل حرام ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ قرآن و حدیث کے جواب میں قرآن و حدیث پیش کرے ورنہ خاموش رہے۔

کشن جیونت راؤ پاٹل (عمر ۴۴) اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ نانڈیر سے آئے تھے۔ وہ الرسالہ اردو بالکل شروع سے پڑھتے ہیں اور اس کا مکمل فائل نمبر اسے محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ ان کی مادری

زبان مرہٹی ہے۔ وہ پہلے ایک لفظ اردو نہیں جانتے تھے۔ جولائی ۱۹۷۵ میں ان سے میری پہلی ملاقات نانڈیر میں ہوئی تھی۔ ان سے کئی مفید گفتگوئیں ہوئیں۔ میں نے کہا کہ میں ایک اردو ماہنامہ نکالنے والا ہوں۔ وہ اتنے متاثر تھے کہ انھوں نے یہاں ۵ افروری کی ملاقات میں بتایا کہ جیسے ہی آپ میرے وطن (نانڈیر) سے روانہ ہوئے، میں نے اسی وقت اردو سیکھنے کے لیے ماسٹر کا انتظام کیا تاکہ جب الرسالہ نکلے تو میں اس کو براہِ راست پڑھ سکوں۔ چنانچہ اب وہ الرسالہ کو صد فی صد براہِ راست اردو سے سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ ایک اور شخص گنگا دھر ملاّ گرڈ (عمر ۴۰) کو بھی لائے تھے۔ وہ اردو ایک لفظ پڑھ نہیں سکتے۔ تاہم وہ ان کو الرسالہ کے مضامین پڑھ کر سناتے ہیں اور مرہٹی زبان میں ان کے سامنے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ الرسالہ سے آپ کو کیا خوراک ملی۔ انھوں نے کہا کہ "الرسالہ سے سوچنے کا ذہن بدل گیا"۔ پہلے میں ایک جانور کی طرح تھا۔ میرا مقصد تھا کہ کماؤ کھاؤ، اب الرسالہ پڑھنے سے مجھے زندگی کا مقصد مل گیا۔ کشن پٹیل صاحب نے اردو سیکھنے کے لیے بے پناہ محنت کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کے الفاظ اور حروف تہجی کو میں گھنٹوں یاد کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے جبڑوں میں درد پیدا ہو گیا۔ وہ نہایت سمجھ دار اور محنتی آدمی ہیں۔ دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔

حبیب بھائی نے کہا کہ میں ایک آفس میں گیا۔ وہاں دیوار پر ایک قدرتی منظر کی تصویر تھی، اس کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ اگر تم میری خاموشی کو نہیں سمجھ سکتے تو تم میرے الفاظ کو بھی ہرگز نہیں سمجھو گے:

If you don't understand my silence,
you will never understand my words.

یہ قول بہت بامعنی ہے۔ الفاظ کسی حقیقت کا نہایت کم تر اظہار ہوتے ہیں۔ کسی حقیقت کی گہرائی کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو الفاظ سے زیادہ سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جن کے لیے خاموشی بول بن جائے۔ جو بین السطور کو بھی اسی طرح پڑھ لیں جس طرح کوئی شخص سطور کو پڑھتا ہے۔

حبیب بھائی نے بتایا کہ ہمارے دادا یہ کہا کرتے تھے کہ ہر روز کوئی نئی بات سیکھا کرو خواہ وہ گرہ دینے کا نیا طریقہ کیوں نہ ہو۔ یہ بہت گُر کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں ٹھہراؤ نہیں۔ آدمی یا تو نیچے گرے یا اوپر اٹھے گا۔ ایسی حالت میں اپنے ارتقار کو باقی رکھنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ آدمی ہر روز کوئی نئی بات دریافت کرے، وہ اپنے ذہنی سفر کو مسلسل جاری رکھے۔

حیدر آباد کی تقریریں اور گفتگوئیں زیادہ تر چند قسم کے موضوعات پر رہیں۔ اول، ایمانیات کو جگانا۔ قرآن و حدیث کے جو درس ہوئے ان سب کا انداز یہی تھا۔ دوم، اسلام اور عصر حاضر۔ اس عنوان کے تحت یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ اسلام ایک ابدی دین ہے۔ زمانہ کی ترقیاں اس کی صداقت کو مزید واضح کرتی جارہی ہیں۔ سوم، تعمیر ملت۔ اس عنوان کے تحت یہ بتایا گیا کہ مسلمانوں کے لیے اس ملک میں راہیں بند نہیں ہیں۔ بلکہ پوری طرح کھلی ہوئی ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ حالات کو سمجھ کر ہوش مندی کے ساتھ کام کیا جائے۔ چہارم، اسلامی دعوت۔ اس سلسلہ میں خصوصی طور پر یہ واضح کیا گیا کہ مسلمان اور دیگر اقوام کا رشتہ داعی اور مدعو کا رشتہ ہے نہ کہ حریف اور رقیب کا رشتہ۔ ہمیں دوسری اقوام کی ہدایت کا حریص ہونا چاہیے۔ نہ کہ ہم ان کو دشمن سمجھ کر ان سے نفرت کریں یا ان کے خلاف بددعا دیں۔ میں نے کہا کہ مدعو پر اتمام حجت کے بغیر جو بددعا کی جائے وہ کبھی قبول ہونے والی نہیں، خواہ سو برس تک ایسی دعا کی جائے اور خواہ تمام اصاغر اور اکابر اس پر آمین کہہ رہے ہوں۔

۱۴ فروری کو پریس کانفرنس تھی۔ ابتداءً میں نے ملکی حالات پر تبصرہ کیا اور اس ذیل میں اسلامی مرکز کے مقاصد بیان کیے۔ اس کے بعد سوال و جواب کا پروگرام ہوا جو دیر تک قائم رہا۔

دوسری باتوں کے علاوہ میں نے ایک بات یہ کہی کہ نیشنل پریس میں ہندستان کے مسلمانوں کی تصویر بہت ادھوری شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ٹائمس آف انڈیا (۳ جنوری ۱۹۸۷) میں ہندستانی مسلمانوں کو شور و غل کرنے والا گروہ (Clamorous group) بتایا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات بذات خود غلط نہیں ہے۔ مگر اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں تھوڑے سے جو شور و غل کرنے والے لوگ ہیں انھیں کو نیشنل پریس میں نمایاں کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ

مسلمانوں کا زیادہ بڑا طبقہ وہ ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے تعمیری کاموں میں لگا ہوا ہے ۔ مگر اس کو نیشنل پریس میں نمایاں نہیں کیا جاتا ۔ اس کی وجہ غالباً موجودہ صحافت کا انداز ہے ۔ کیوں کہ ہمارے اخبارات میں تخریبی واقعات کو زیادہ جگہ دی جاتی ہے ۔ " سیف لینڈنگ " آپ کے نزدیک خبر نہیں ۔ لیکن " ہائی جیکنگ " ہو تو وہ آپ کے نزدیک خبر بن جاتی ہے ۔

اس سلسلہ میں میں نے مسلمانوں کی کئی تعمیری سرگرمیوں کی مثالیں دیں ۔ انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ ہمارے عربی اور دینی مدارس ایک عظیم الشان تعمیری کام انجام دے رہے ہیں ۔ وہ لاکھوں نوجوانوں میں اخلاقی شعور پیدا کرتے ہیں اور اس طرح ملک میں اخلاقی روایت کو باقی رکھنے کا واحد سب سے بڑا ذریعہ ہیں ۔ ہمارے مدارس کا پڑھا ہوا آدمی جب باہر آتا ہے تو بازار میں ، بس اور ٹرین میں اور مختلف عوامی مواقع پر وہ اخلاقی انضباط کا مظاہرہ کرتا ہے ۔ اس طرح وہ ملک میں گرتی ہوئی اخلاقی قدروں کو بحال کرنے کا اہم کردار ادا کرتا ہے ۔ مگر ملکی اخبارات کو پڑھنے والے لوگ اس واقعہ سے بالکل بے خبر ہیں ۔ اسی طرح تبلیغی جماعت نے لاکھوں لوگوں کو خارجی جھگڑوں سے ہٹا کر اندرونی اصلاح کی طرف متوجہ کیا ہے ۔ مگر اخبار بیں طبقہ کو اس کی کوئی خبر نہیں ۔ کیوں کہ یہ لوگ اخباروں میں صفحہ اول کی سُرخی نہیں بنتے ۔ میں نے کہا کہ ہمارے اخبارات کو مسلمانوں کی صحیح تصویر پیش کرنی چاہیے ۔

حیدرآباد کے علاوہ محبوب نگر میں بھی اجتماعات ہوئے ۔ ان کا نقشہ اگلے صفحہ پر درج ہے یہاں کا ہر اجتماع خدا کے فضل سے کافی کامیاب رہا ۔ خاص طور پر تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ بڑی تعداد میں شریک رہا ۔ لوگوں نے بتایا کہ جو افراد ان اجتماعات میں آئے وہ عام طور پر مسلم مقررین کے اجتماع میں کبھی دیکھے نہیں جاتے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملّت کا اعلیٰ ذہن نہایت سنجیدگی کے ساتھ اسلامی مرکز اور الرسالہ کی دعوت کا مطالعہ کر رہا ہے ۔

یہاں کے اجتماعات اور تقریروں کی رپورٹیں مقامی اخبارات رہنمائے دکن ، سیاست اور منصف وغیرہ میں روزانہ تفصیل کے ساتھ شائع ہوتی رہیں ۔ ایک صاحب ایک روز روزنامہ سیاست (۱۵ فروری ۱۹۸۷) کا ایک پرچہ لے آئے ۔ اس میں میری ایک تقریر شائع ہوئی تھی ۔ رپورٹر نے اس کی سُرخی حسب ذیل الفاظ میں قائم کی تھی :

ہندستانی مسلمانوں میں تعمیری اندازِ فکر کی ضرورت

مذکورہ بزرگ نے کہا کہ اس قسم کی سرخیاں صرف آپ کی دین ہیں۔ ورنہ ہمارے اخبارات عام طور پر اس قسم کی تعمیری سُرخیوں سے خالی ہوتے ہیں۔

۱۶ فروری کو محبوب نگر (مدرسہ سراج العلوم) میں ایک پروگرام تھا۔ یہاں "اسلام اور عصر حاضر" کے موضوع پر ایک مفصل تقریر ہوئی۔ شہر کا باشعور اور تعلیم یافتہ طبقہ بڑی تعداد میں جمع تھا۔ بعد کو ایک صاحب نے بتایا کہ لوگ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔

محبوب نگر کے پاس برگد کا ایک پرانا درخت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تقریباً چار سو سال پرانا ہے۔ اس درخت کا نام پہلے "پیرلامری" تھا۔ اب اس کا نام پلا لامری (Pillalamarri) ہے۔ ہم لوگ اس کو دیکھنے کے لیے گیے۔ یہ گویا ایک درخت کا باغ ہے۔

پروگرام حیدر آباد

۱۴ فروری ۱۹۸۷	پریس کانفرنس	ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ	اسٹیشن روڈ
	افتتاح الرسالہ بک اسٹال ولائبریری	اعظم منزل	کنگ کوٹھی
	خطاب عام (تعمیر ملت)	لطیف الدین ہال	حمایت نگر
۱۵ فروری	درس قرآن بعد نماز فجر	مسجد دار القرآن	لال ٹیکری
	خطاب عام	اردو گھر	مغل پورہ
	تقریر سیرت	دکن میڈیکل کالج	نارائن گوڑہ
	عام ملاقات	رہائش گاہ محمد حسام الدین صاحب	حمایت نگر
	خطاب عام بعد نماز مغرب (اسلام اور عصر حاضر)	مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ	باغ عامہ
۱۶ فروری	درس قرآن	مسجد سلطان نواز جنگ	آغا پورہ
	درس حدیث	مسجد سلیمہ خاتون	حمایت نگر
	خطاب عام (دعوت اسلامی کے جدید امکانات)	مدرسہ سراج العلوم	محبوب نگر
۱۷ فروری	درس قرآن	مسجد سراج العلوم	محبوب نگر

یہ اگرچہ ایک ہی درخت ہے۔ مگر وہ اس طرح پھیل پھیل کر زمین میں اگا ہے کہ ایک درخت کئی درخت معلوم ہونے لگا ہے۔

اس علاقہ کو از سرِ نو منظم کیا جا رہا ہے۔ کلکٹر نے ہندوؤں اور عیسائیوں اور مسلمانوں سے کہا کہ یہاں ہم ہر مذہب کے لیے زمین دیں گے۔ آپ لوگ اپنے اپنے طرز پر یہاں عبادت گاہ بنائیں۔ ہندوؤں اور عیسائیوں نے اس کو فوراً قبول کر لیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں جدید طرز کا ایک چرچ زیر تعمیر ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ مسلمان ابھی تک اس پیش کش کو استعمال نہ کر سکے۔ میرا اندازہ ہے کہ آئندہ یہ جگہ ترقی کرے گی اور یہاں کی زمینیں کافی مہنگی ہو جائیں گی۔ یہاں کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس موقع کو نہ کھوئیں۔ اگر انھوں نے بروقت اس موقع کو کھو دیا تو آئندہ یہاں مسجد کی تعمیر بے حد مشکل ہو جائے گی۔ یہاں سیاح آتے رہتے ہیں جن میں مسلمان بھی ہوتے ہیں۔ نیز مقامی اداروں میں مسلمان کارکن بھی موجود ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کے لیے یہاں مسجد کی تعمیر بہت مفید ثابت ہو گی۔

محبوب نگر میں ایک مسلمان تاجر اپنی رائس مل دکھلانے کے لیے لے گیے۔ انھوں نے جدید طرز کی مشینیں لگائی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ دھان کو چاول میں تبدیل کرنے کے لیے اس کو سات مرحلوں سے گزارنا پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ قدرت کا ایک سبق ہے۔ اس طرح قدرت تدریج کی اہمیت کو بتاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر کامیابی تدریجی طریقِ کار کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ چھلانگ کے ذریعہ یکایک اپنی منزل پر پہونچنا چاہیں وہ کبھی منزل مقصود کو نہیں پہونچتے۔

تاجر آدمی عملی آدمی ہوتا ہے، اس لیے وہ عملی باتوں کو بہت جلد سمجھ لیتا ہے۔ محبوب نگر کے ایک مسلمان تاجر نے کہا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا زیادہ یقینی حل یہ ہے کہ برادرانِ وطن سے اچھے تعلقات قائم کیے جائیں۔ حکومت کے خلاف تقریریں یا حکومت کے ارکان کی طرف دوڑ دھوپ سے زیادہ مفید اور اہم بات یہ ہے کہ برادرانِ وطن سے تعلقات بڑھائے جائیں۔ اپنی رائے کی تائید میں انھوں نے کئی واقعات بتائے۔

یہ نہایت صحیح بات ہے۔ مسلمانوں نے حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں جتنی طاقت

صرف کیے۔ اتنی طاقت اگر وہ برادران وطن سے تعلقات استوار کرنے میں صرف کرتے تو
اب تک ان کے تمام مسائل حل ہو چکے ہوتے۔

میں نے ایک گفتگو میں دعوت عام کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے بعد ایک صاحب نے
کہا کہ مسلمان تو خود ہی اسلام سے دور ہیں، وہ دوسروں کو اسلام کی طرف کیا بلا سکتے ہیں
میں نے کہا کہ یہ ایک نہایت مہلک غلط فہمی ہے جو شیطان نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے
ذہن میں ڈال رکھی ہے۔ کوئی شخص مسلمانوں کو دیکھ کر اسلام قبول نہیں کرتا بلکہ حق کو دیکھ
اسلام قبول کرتا ہے۔ میں نے یوسف اسلام (انگریز) اور دوسرے بہت سے نومسلموں کے
حالات کو جاننے کی کوشش کی۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہر ایک نے یہ جانتے ہوئے اسلام قبول کیا ک
موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی حالت بہت گر چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخ
مسلمانوں کے لیے اسلام قبول نہیں کرتا بلکہ اس لیے اسلام قبول کرتا ہے کہ اسلام کی اب
سچائی کے ساتھ وہ اپنے آپ کو وابستہ کر سکے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کے اوپر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ آپ کو بھارت سرکار سے
روپیہ ملتا ہے تاکہ آپ مسلمانوں کو ڈیمورالائز کریں۔

میں ابھی خاموش تھا کہ مجلس کے ایک صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ آپ تو اُل
بات کہہ رہے ہیں۔ الرسالہ تو مسلمانوں کے مورال کو بلند کر رہا ہے۔ پھر کیا آپ کا خیال ہ
کہ بھارت سرکار یہ چاہتی ہے کہ مسلمانوں کے مورال کو بلند کیا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آپ
الرسالہ کو غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ الرسالہ مسلم نوجوانوں کو اٹھانا چاہتا ہ
وہ مسلم نوجوانوں کے اندر ہیروانہ کردار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تحریک کسی کی مدد سے چلے تو مد
دینے والے کے خلاف ہیرو نہیں بنائے جاتے۔ بلکہ ایک نا اہل قوم تیار کی جاتی ہے۔ اسلا
مرکز کی مطبوعات کا ایک ایک صفحہ مسلم نوجوانوں کی کردار سازی کرتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہو
کہ وہ ان کو ہیرو بنا رہا ہے۔ وہ ان کے اندر اعلیٰ اخلاقی جذبہ ابھارنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے اند
صحیح اسلامی فکر پیدا کر رہا ہے۔ پھر کیا بھارت سرکار کی خواہش یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے
اسلامی مرکز کے خلاف اس قسم کا پروپیگنڈا کرنے والے لوگ خود وہ کام کر رہے ہیں جس کا الز

وہ اسلامی مرکز پر لگاتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو تعمیری مہم سے ہٹا کر تخریبی رخ پر ڈالنا چاہتے ہیں جو یقینی طور پر صرف بربادی کا راستہ ہے۔

۱۷ فروری ۱۹۸۰ کی شام کو فلائٹ نمبر ۵۲۹ کے ذریعہ دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔ راستہ میں میری سیٹ سے ملی ہوئی سیٹ پر مسٹر ڈی پی گپتا تھے۔ وہ بھارت ہیوی الکٹریکلس لمیٹڈ (BHEL) میں جنرل منیجر (ٹرانس میشن) ہیں۔ پورے راستے میں ان سے باتیں ہوتی رہیں۔

ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ نہایت لائق افسر ہیں اور انتہائی دیانت اور محنت کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔ مزید سوالات کے دوران معلوم ہوا کہ اس کی خاص وجہ ان کا مذہبی بیک گراؤنڈ ہے۔ ان کے والد نہایت قابل آدمی تھے۔ وہ انگریزی اور ہندی کے علاوہ عربی اور فارسی بھی جانتے تھے۔ حتی کہ قرآن کے کئی حصے کا انھوں نے حافظہ کیا تھا اور ان کو پڑھتے رہتے تھے۔ خود مسٹر گپتا بھی اچھی اردو جانتے ہیں۔

اس گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ موجودہ زمانہ میں دفتروں میں کارکردگی گھٹنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ نئی نسلیں مذہبی اور روحانی روایات سے کٹ گئیں۔ جدید نسل کو دوبارہ امانت دار اور محنتی بنانے کی واحد شکل یہ ہے کہ از سر نو سماج کے اندر مذہبی اور روحانی روایتیں قائم کی جائیں۔ اس مسئلہ کا اس کے سوا کوئی دوسرا حل نہیں۔

دوسری بات یہ کہ پچاس برس پہلے کے ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اتنے اچھے تھے کہ ہندو عربی اور فارسی زبانیں پڑھتے تھے۔ حتی کہ قرآن کی سورتیں یاد کرتے تھے۔ نادان قسم کے مسلم لیڈروں کی سیاست نے اس فضا کو بالکل برباد کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں بعض اوقات ناخوش گوار واقعات پیش آتے تھے۔ مگر ایسے واقعات ہر سماج میں اور ہمیشہ پیش آتے ہیں۔ یہ واقعات یقینی طور پر انفرادی ہوتے تھے اور ضروری تھا کہ ان محدود واقعات کو محدود دائرہ میں رکھ کر دیکھا جائے، ان کو بڑھا چڑھا کر قومی اور ملکی مسئلہ نہ بنایا جائے۔ مگر ہمارے نادان لیڈروں نے انتہائی غیر ذمہ دارانہ طور پر ان جزئی نوعیت کی باتوں کو اتنا بڑھایا کہ دونوں فرقوں کے درمیان ناقابل عبور دوری حائل ہو گئی۔ یہ غیر اہم باتوں کو اہم بنانا تھا۔ اور جو لوگ ایسا کریں ان کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ موجودہ دنیا میں کبھی کوئی بڑی کامیابی

حاصل نہ کر سکیں۔

سفر سے واپسی کے بعد وہاں سے مختلف تاثراتی خطوط موصول ہوئے ہیں۔ یہاں دو خط نقل کیے جاتے ہیں ــــ مولانا محمد امیر اللہ خاں قاسمی (محبوب نگر) اپنے خط مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۷ میں لکھتے ہیں: آپ کی آمد مسلمانان محبوب نگر کے لیے غیر معمولی مسرت اور خوشی کا سامان ہوئی۔ دو گھنٹے کی طویل تقریر کو جس دل چسپی اور شوق سے سنا گیا، میری نظر میں محبوب نگر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا ہے۔ تقریر کا غیر معمولی تاثر ہوا۔ باشعور اور سنجیدہ لوگوں نے پھر آپ کی آمد کا پروگرام بنانے کے لیے مجھے پابند کیا۔

آپ جس کام اور پیغام کو لے کر اٹھے ہیں وہ اس زمانہ کا نہایت ضروری کام ہے اور وقت کا اہم تقاضا بھی یہی ہے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۲۹

۱۔ حیدرآباد میں ایک تین روزہ اجتماع ۱۴-۱۵-۱۶ فروری ۱۹۸۷ کو ہوا۔ اس موقع پر دہلی سے صدر اسلامی مرکز شریک ہوئے۔ وہاں موصوف کے کئی کامیاب پروگرام ہوئے۔ حیدرآباد کے علاوہ محبوب نگر میں بھی تقریر ہوئی۔ اس سفر کی مفصل روداد انشاءاللہ آئندہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔ ہر پروگرام میں تعلیم یافتہ طبقہ بڑی تعداد میں شریک ہوا۔

۲۔ ۷ فروری ۱۹۸۷ کو نئی دہلی (گول مارکیٹ) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی وضاحت کی۔

۳۔ ایک سفر کے دوران صدر اسلامی مرکز کو بمبئی اور اعظم گڈھ جانا ہوا۔ دونوں مقامات پر کئی دعوتی پروگرام (۲۵ فروری ۔ ۲ مارچ) ہوئے۔ ان کی تفصیل روداد سفر میں آئندہ شائع کر دی جائے گی۔

۴۔ قارئین الرسالہ میں ایک رجحان بہت تیزی سے ابھرا ہے۔ اور وہ ہے اپنے غیر مسلم دوستوں کے نام الرسالہ انگریزی جاری کرنا۔ یہ دعوتی جذبہ بے حد قابلِ قدر ہے۔ ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس طریقہ کو اپنائیں، تاکہ ہمارے اوپر برادرانِ وطن کی نسبت سے جو دعوتی ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ ادا ہو سکے۔

۵۔ ایک صاحب لکھتے ہیں " خاتون اسلام" کا از اول تا آخر نہایت شوق سے مطالعہ کیا۔ آپ کا تجزیاتی انداز بیان، سائنٹفک طرزِ استدلال اور موثر اسلوب نگارش غیر معمولی ہے۔ پوری کتاب معلومات افزا اور دلچسپ ہے۔ جدید دور کے لحاظ سے اس کے ابواب خاص طور پر متاثر کن ہیں۔ کتاب جدید معیار تعقل پر پوری اترنے کے ساتھ اپنے موضوع پر منفرد اور جامع و مانع ہے (عبدالحمید قاسمی)

۶۔ ایک خاتون لکھتی ہیں: میں نے جو بھی کتاب آپ کی پڑھی تو نہ جانے میرے دل میں آخرت کا سوال اس طرح اٹھتا ہے جیسے گرم تیل کو پانی میں دینے کے وقت ہو جاتا ہے۔

میں ہمیشہ یہ سوچتی تھی کہ آپ کو خط ارسال کروں، اب جب کہ میں نے آپ کی کتاب زلزلۂ قیامت پڑھی تو میرا قلم آپ کو یہ خط لکھنے پر مجبور ہو گیا (کنیز فاطمہ)

۷۔ ایک صاحب جدہ سے لکھتے ہیں " ہم سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگانے کے لیے الرسالہ جیسے ہی ایک پرچہ کی ضرورت تھی۔ آپ کی تحریریں دل کے تاروں کو چھو لیتی ہیں۔ آپ عصری اسلوب میں اسلام کے تعلق سے اتنے سائنٹفک مضامین کس طرح لکھتے ہیں۔ جب مجھے الرسالہ ملتا ہے، اس کے دوسرے گھنٹہ میں ہی سارا رسالہ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر غور و فکر کے لیے بار بار پڑھتا ہوں۔ آپ کے اس مختصر پرچہ میں ایسی غیر معمولی مقناطیسی طاقت ہے کہ جو ایک مرتبہ پڑھ لیتا ہے پھر اس کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اس پرچہ کو جدّہ میں ایک دوست کے پاس دیکھا، اس کے دوسرے دن میں اس کا مستقل خریدار بن گیا۔ جو بھی میرے پاس سے پرچہ لے کر جاتا ہے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آئندہ سال کے لیے میں اپنی خریداری کی تجدید کے ساتھ دو نئے ممبر بھیج رہا ہوں جو اس پرچہ سے اور آپ کی حکمت ونصیحت سے، بھرپور تحریروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ کے پرچہ سے یہاں بہت سارے لوگ متاثر ہیں اور میرے پاس سے لے کر مطالعہ کرتے ہیں (۲۸ دسمبر ۱۹۸۶)

۸۔ ایک صاحب سعودی عرب سے لکھتے ہیں : تذکیر القرآن کی دوسری جلد کی سخت ضرورت ہے۔ تذکیر القرآن کی پہلی جلد ہم چند لوگ یہاں روزانہ عشار کی نماز کے بعد پڑھتے ہیں۔ اور کافی اثر قبول کرتے ہیں۔ سب ہی یہ محسوس کرتے ہیں کہ تذکیر القران واقعی تذکیر القرآن ہے۔ مختصر اور کھلے الفاظ میں ہمیں قرآن کا بنیادی مطلب مل جاتا ہے۔
(۲۱ فروری ۱۹۸۷)

۹۔ اسلامی مرکز کے مشن کے خلاف حال میں کچھ لوگوں نے بے بنیاد مضامین شائع کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک خط کا جواب دیتے ہوئے صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ یہ بالکل لغو باتیں ہیں اور لغو کے بارہ میں ہمیں اعراض کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کا بہترین جواب یہ ہے کہ ان کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

امیتوا الباطل بالصمت عنہ (باطل کو ہلاک کرو اس کے بارے میں چپ رہ کر) ۔

۱۰۔ الرسالہ انگریزی کا ہر طبقہ میں غیر معمولی استقبال کیا جارہا ہے۔ انگلستان کی ایک تعلیم یافتہ خاتون نے حسب ذیل الفاظ میں اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے :

I came across the Al-Risala (English) in September 1986, and have been a regular reader since then. It is intelligible. I can understand all that is being said. The language is excellent. I have read several books on Islam, but I found them badly written and unintelligible.
Ms Alexandra, 10 Horn Hill Road,
Adderbury West, Banbury, Oxon Ox16 3EW, England.

۱۱۔ ایک امریکی نومسلم جو ملیشیا میں ایک ادارہ کے ڈائرکٹر ہیں، وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

Thank you for continuing to forward Al-Risala (English) which has such a refreshing and unique approach to Islam. I wish other Muslims would imitate your positive approach.
Hj. Fadlullah Wilmot,
No. 8 Lorong SS 1/11A, Kampung Tunku
Petaling Jaya, Selangor, Malaysia.

۱۲۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان اپنے خط میں انگریزی الرسالہ کے بارہ میں لکھتے ہیں :

It was a great delight to read two issues of Al-Risala (English). The size does not restrict the content. The editorial (issue 36) 'Is this Islam' is very timely and reasonable and also speaks of a modern, truthful and sympathetic mind so much required today. Al-Risala is a very good venture and I wish it not only to be successful but also useful.
Ameeq Hanfee, A-223 Pandara Road, New Delhi 110003

۱۳۔ انگریزی الرسالہ کے ایک قاری کرناٹک سے لکھتے ہیں :

I have been a regular reader of Al-Risala (English) from the past one year. I thoroughly enjoy reading its contents, and the comparisons it puts forth essentially requires commendable appreciation. It upholds the true tenets of Islam. In fact, no month is ever complete for me without an issue of Al-Risala monthly magazine.
Mohamed Razick Sait,
Oorgaum, Kolar Gold Fields 563120 (Karnataka)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو ، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۶ مئی ۱۹۸۷

فہرست

رمضان کا سبق

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى: إِلَّا الصَّوْمَ فَإِنَّهُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ، يَدَعُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ مِنْ أَجْلِي، لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ: فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ، وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ۔ (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم کا ہر نیک عمل دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ بندہ اپنی شہوت کو اور اپنے کھانے کو میرے لیے چھوڑتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشی ہے۔ ایک خوشی افطار کے وقت اور دوسری خوشی اس وقت جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔

روزہ عام عبادات سے الگ ایک عبادت ہے۔ روزہ میں آدمی اپنی جائز خواہش کو اور اپنے جائز کھانے کو اللہ کی خاطر چھوڑ دیتا ہے۔ گویا روزہ دار روزہ رکھ کر اپنے اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ کی خاطر اگر اس کو انتہائی ضروری اور جائز چیزوں سے جدائی اختیار کرنا پڑے تو اس سے بھی وہ دریغ نہیں کرے گا۔ روزہ کی یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس کا امتیازی ثواب رکھا گیا ہے۔

موجودہ دنیا میں حق پرست بننے کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ آدمی غلط اور صحیح کے درمیان تمیز کرتا ہو۔ مختلف حالات کے اعتبار سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ممنوعات کی فہرست مزید وسیع ہو جاتی ہے۔ کبھی ضروری ہو جاتا ہے کہ آدمی کھانا پینا بھول کر اپنی ڈیوٹی انجام دے۔ وہ عمل کے بجائے اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ کرنے کا جذبہ رکھتے ہوئے بھی نہ کرے۔ الفاظ رکھتے ہوئے وہ نہ بولے اور پاؤں رکھتے ہوئے وہ نہ چلے۔ ایک کام کو بظاہر صحیح سمجھتے ہوئے بھی اس کی طرف اقدام کرنے سے باز رہے۔

روزہ اسی قربانی کا سبق ہے۔ اس دنیا میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک جائز چیز بھی آدمی کے لیے ناجائز بن جاتی ہے۔ اور ایک مطلوب چیز بھی نامطلوب کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ جو لوگ اس اعلیٰ ایمانی درجہ پر پورے اتریں ان کے لیے اللہ کے یہاں اتنا بڑا اجر ہے جس کا نہ کوئی شمار ہے اور نہ کوئی حساب۔

شیطان کا حملہ

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پچھلے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر سے شیطان کا مکالمہ ہوا۔ یہ ایک لمبی روایت ہے، اس کا ایک حصہ حسب ذیل ہے:

قَالَ النبیُّ وَاِنِیّ وَاللّٰہِ مَا اَحسَسْتُ بِكَ قَطُّ الاّ استعذتُ باللّٰہ منك۔ قال عدوّ اللّٰہ صَدقتَ بھٰذا تنجُومِنّیْ فَقَالَ النبیُّ اَخْبِرْنِی بایّ شیئٍ تغلب ابن آدم قال آخذہ عند الغضب والھوی۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۵۵۱)

(شیطان نے کہا کہ تم کس طرح مجھ سے نجات پاؤ گے) پیغمبر نے کہا کہ خدا کی قسم جب بھی میں نے تیری طرف سے کچھ محسوس کیا تو میں نے تجھ سے اللہ کی پناہ مانگی۔ دشمنِ خدا نے کہا کہ تم نے سچ کہا۔ اسی کے ذریعہ تم مجھ سے نجات پا سکتے ہو۔ پھر پیغمبر نے کہا کہ مجھے بتاؤ کہ تم کس چیز کے ذریعہ دوبارہ انسان کے اوپر غلبہ حاصل کرو گے۔ شیطان نے کہا کہ غصہ اور خواہش کے وقت۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جب غصہ میں ہوتا ہے یا جس وقت اس پر کسی خواہش کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ شیطان کے لیے غیر محفوظ (Vulnerable) بن جاتا ہے۔ ایسا ہر موقع آدمی کے اندر ایک ایسی کمزوری پیدا کر دیتا ہے جہاں سے شیطان آدمی کے اندر داخل ہو جائے اور اس کو اپنا شکار بنا لے، وہ اس کو جنت کے رُخ سے ہٹا کر جہنم کے رخ پر چلانے لگے۔

آدمی کو سب سے زیادہ جس چیز سے ڈرنا چاہیے وہ خود اس کا اپنا غصہ اور اس کی خواہش پرستی ہے۔ اس خطرہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ جب بھی آدمی اپنے اندر اس قسم کے احساسات پائے وہ اس کو شیطان کا حملہ سمجھے اور فوراً شیطان کے مقابلہ میں اللہ کی پناہ مانگنے لگے۔ جب آدمی کے اندر غصہ بھڑکتا ہے تو وہ شیطان کے زیر اثر آجاتا ہے۔ جب اس پر کوئی خواہش غالب آتی ہے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ شیطان اس کو اپنے قابو میں کرلے گا۔ ایسے ہر موقع پر گناہ اور بے انصافی سے بچنے کی واحد کارگر تدبیر یہ ہے کہ آدمی اللہ کی مدد مانگے، وہ شیطان کے مقابلہ میں اللہ کی پناہ میں آجائے۔

غلط فہمی

ایک عورت امام اوزاعی کی بیوی کے پاس آئی۔ اس نے گھر کی چٹائی کو چھوا تو وہ بھیگی ہوئی تھی۔ عورت نے کہا کہ شاید بچہ نے یہاں پیشاب کر دیا ہے۔ امام اوزاعی کی بیوی نے کہا کہ نہیں، یہ دراصل امام اوزاعی کے آنسو ہیں۔ ہر صبح کو وہ ایسا ہی کرتے ہیں :

دخلت امرأة علی زوجة الاوزاعی فلمست الحصیر فاذا هو مبتلّ فقالت : لعل الصبی بال هنا فقالت زوجة الاوزاعی : انما هی دموع الشیخ کل صباح یفعل هکذا۔

الدعوة (ریاض) ۲۳ فروری ۱۹۸۰، صفحہ ۲۹

عورت نے چٹائی کے بھیگنے کا جو سبب سمجھا وہ صرف اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تھا۔ خارج میں اس سبب کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ عورت کے سمجھنے کی غلطی تھی نہ کہ صورت حال کی واقعی تشریح۔ عورت بذات خود یہ سمجھ رہی تھی کہ اس نے جان لیا ہے، حالاں کہ اس نے کچھ نہیں جانا تھا۔ اس نے اپنی لاعلمی کو علم قرار دے لیا۔ اس نے محض ذاتی خیال کے تحت ایک رائے قائم کرلی۔ حالانکہ صحیح رائے وہ ہے جو تمام متعلقہ حقائق کا جائزہ لینے کے بعد قائم کی جائے۔

اکثر حالات میں آدمی اپنی ذہنی سطح کے مطابق رائے قائم کرتا ہے۔ عورت کی ذہنی سطح وہی تھی جس کا اظہار اس کے سوال میں ہوا۔ اس نے اپنا یہ سوال کسی بری نیت سے نہیں کیا۔ اور نہ وہ جھوٹ بولی۔ اس کے باوجود وہ مکمل طور پر غلطی پر تھی۔ اس کی غلطی کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر سوچ نہ سکی۔ اپنی روزانہ کی زندگی میں وہ جس چیز کا تجربہ کر رہی تھی، اسی پر اس نے دوسرے کے معاملہ کو بھی قیاس کر لیا۔ جس چیز سے وہ خود دوچار تھی اسی کو اس نے دوسرے کی طرف منسوب کر دیا۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ آدمی کو دوسرے کے متعلق رائے قائم کرنے میں حد درجہ محتاط ہونا چاہیے عین ممکن ہے کہ وہ " دموع الشیخ " کو " بول الصبی " سمجھ لے۔ جو واقعہ اپنے اندر ایک بندے کے خوف خدا کی کہانی لیے ہوئے ہے، نادانی کی بنا پر وہ اس کو دنیا پرستی کا نتیجہ قرار دے بیٹھے۔ جو واقعہ آخرت کی یاد دلانے والا ہے وہ اس کے ذہن میں صرف دنیا کی یاد دلانے والا بن جائے۔

روزانہ دس لفظ

مولوی لطف اللہ ایک معمولی ٹیوٹر تھے۔ وہ ۱۸۰۲ء میں مالوہ کے قدیم شہر دھارانگر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کسی انگریزی درس گاہ میں ایک دن بھی نہیں پڑھا۔ مگر ان کی خود نوشت انگریزی سوانح عمری ۱۸۵۷ میں لندن سے چھپی۔ لندن کے پبلشر اسمتھ ایلڈرا اینڈ کمپنی نے اس کا نام یہ رکھا :

Autobiography of Lutfullah: A Mohammedan Gentleman

اس کتاب کے ساتھ ایک انگریز مسٹر ایسٹ ویک کا دیباچہ شامل ہے۔ انھوں نے دیباچہ میں مصنف کی صحیح انگریزی کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ایک ہندستانی نے بدیسی زبان میں اتنی ضخیم کتاب کس طرح لکھی۔

مولوی لطف اللہ نے یہ صلاحیت کیسے پیدا کی کہ وہ انگریزی میں ایک ایسی کتاب لکھیں جو لندن سے چھپے اور انگریز ادیب اس کی زبان کی تعریف کرے، اس کا راز صرف چار حرف کا ایک لفظ ہے اور یہ وہی لفظ ہے جس کو اردو زبان میں محنت کہتے ہیں۔

مولوی لطف اللہ نے انگریزی زبان صرف اپنی محنت سے سیکھی۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کو ہندستانی، فارسی اور مرہٹی زبانیں سکھاتے تھے۔ ان کے انگریز شاگردوں کی تعداد سو سے اوپر تھی۔ انگریزوں سے تعلق کے نتیجہ میں ان کے اندر انگریزی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے ذاتی مطالعہ سے انگریزی زبان پڑھنا شروع کیا۔ اور آٹھ سال کی لگاتار محنت کے نتیجہ میں اس پر پوری طرح قدرت حاصل کر لی۔ انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس آٹھ سال کی مدت میں "کوئی ایک رات ایسی نہیں گزری جب کہ سونے سے پہلے میں نے انگریزی کے دس لفظ یاد نہ کیے ہوں اور ڈاکٹر گل کرسٹ کی قواعد کی کتابوں کے چند صفحے توجہ سے پڑھ کر ذہن میں محفوظ نہ کیے ہوں" "دس لفظ" بظاہر بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دس لفظ روزانہ کی رفتار کو جب آٹھ سال تک پھیلا دیا جائے تو وہ ایک شخص کو غیر زبان کا ایسا ادیب بنا دیتے ہیں کہ اہلِ زبان بھی اس کی زبان دانی کا اعتراف کریں۔

مقصد کا تقاضا

ٹائمس آف انڈیا (۲۶ مارچ ۱۹۸۷) کے ساتھ ایک ضمیمہ *(The Times Offspring)* شائع ہوا ہے۔ اس ضمیمہ میں مشہور انگریزی صحافی مسٹر خوشونت سنگھ کا ایک انٹرویو درج ہے۔ اس انٹرویو کا ایک سوال وجواب یہ ہے :

> **Q:** You are a media man. How is it that you are so against television, as you once mentioned in your 'Malice' column?
> **A:** Well, I am against my viewing it. I had one set in Bombay at my residence. As a result I could not concentrate on anything else. I would simply switch onthe T.V. and see the programme being transmitted, whatever nonsense it might be. So I told the television company to take it back, since I prefer to read and write.

سوال : آپ میڈیا کے ایک آدمی ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ آپ ٹیلی ویژن کے اس قدر مخالف ہیں جیسا کہ آپ نے ایک بار اپنے مستقل کالم میں لکھا تھا۔

جواب : جی ہاں، میں اپنے ٹیلی ویژن دیکھنے کے خلاف ہوں۔ بمبئی میں میرے مکان میں ایک ٹیلی ویژن سٹ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کسی بھی دوسری چیز پر اپنے ذہن کو لگا نہیں پاتا تھا۔ میں بس ٹی وی کا بٹن دبا دیتا اور جو کچھ اس پر آتا اس کو دیکھتا رہتا، خواہ وہ کتنا ہی بے معنی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ میں نے ٹیلی ویژن کمپنی سے کہا کہ وہ اس کو واپس لے جائے۔ کیوں کہ میں لکھنے پڑھنے کو زیادہ پسند کرتا تھا۔

مسٹر خوشونت سنگھ نے اس معاملہ میں جو کچھ کیا اس کو ہماری زبان میں "ترجیح" کہا جاتا ہے۔ ترجیح کا یہ اصول کسی بامقصد انسان کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اگر آپ کے سامنے ایک مقصد ہو تو آپ کو لازماً یہ کرنا پڑے گا کہ آپ اصل مقصد کے سوا دوسری تمام چیزوں میں اپنی دل چسپی ختم کر دیں۔ اپنی توجہ کو دوسری تمام سمتوں سے ہٹا کر صرف مقصد کے رُخ پر لگا دیں۔ یہ کامیابی کی لازمی شرط ہے، اس کے بغیر موجودہ دنیا میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

ایک چیز کو پانے کے لیے دوسری چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر آپ چھوڑنے والی چیز کو نہ چھوڑیں تو اس دنیا میں آپ پانے والی چیز کو بھی نہیں پائیں گے۔

بے مسئلہ انسان

۵ ستمبر ۱۹۸۶ کو کراچی ائرپورٹ پر ہائی جیکنگ کا واقعہ ہوا۔ یہ پان ایم کا جہاز تھا۔ اس حادثہ میں جو لوگ مارے گیے ان میں سے ایک ۲۳ سالہ خاتون نیرجا بھانوت (Neerja Bhanot) بھی تھی۔ وہ اس امریکی ہوائی کمپنی میں سینئر فلائٹ پرسر (Senior purser) تھی۔ اس حادثہ کے بعد اس کے باپ ہریش بھانوت نے ایک مفصل یادداشت لکھی جو ہندستان ٹائمس (۵ اکتوبر ۱۹۸۶) میں شائع ہوئی۔ اس یادداشت میں مسٹر ہریش بھانوت نے اپنی لڑکی کے بارے میں جو باتیں لکھی تھیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ نیرجا اول دن سے بے مسئلہ لڑکی تھی :

Neerja was a no-problem child, right from day one.

عام طور پر چھوٹے بچے گھر کے اندر مسئلہ بنے رہتے ہیں۔ وہ طرح طرح سے اپنے ماں باپ کو پریشان کرتے ہیں۔ اس لیے ایسے بچہ کو بے مسئلہ بچہ (No problem child) کہا جاتا ہے جو ہر حال میں مطمئن رہے اور کسی بھی بات پر گھر والوں کے لیے مسئلہ پیدا نہ کرے۔

سب سے بہتر بچہ بے مسئلہ بچہ ہے۔ یہی بات بڑوں کے لیے بھی صحیح ہے۔ وہ آدمی سب سے زیادہ قیمتی ہے جو بے مسئلہ ہو۔ جو دوسروں کے لیے مسائل پیدا کیے بغیر دوسروں کے ساتھ رہ سکے۔ اس دنیا میں ذاتی شکایت کا پیدا ہونا لازمی ہے، اس لیے قابلِ عمل صورت صرف یہ ہے کہ آدمی خود اپنے آپ کو بے شکایت بنالے۔

یہ انسانی خصوصیت عام زندگی کے لیے بھی نہایت ضروری ہے، اور تحریکوں کے لیے تو وہ لازمی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دنیا میں وہی تحریک کامیاب ہوتی ہے جو اپنے گرد ایسے افراد کو جمع کرسکے جو مسائل پیدا کرنے والے نہ ہوں۔ جو مسائل سے بھری ہوئی دنیا میں ایسے بن جائیں گویا دوسروں کی نسبت سے ان کا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔

جو شخص بے مسئلہ ہو وہی دوسروں کے مسائل کو حل کرتا ہے۔ جو لوگ خود مسائل میں مبتلا ہو جائیں وہ صرف دنیا کے مسائل میں اضافہ کریں گے، وہ کسی بھی درجہ میں دنیا کے مسائل کو حل نہیں کرسکتے۔

روحیں منتظر ہیں

کریٹ (Crete) یونان کا ایک جزیرہ ہے۔ یہاں ۱۶۶۹ میں ترکوں کا قبضہ ہوا۔ اس کے بعد یونانیوں اور ترکوں کے درمیان کئی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر کار ۱۸۹۸ء میں کریٹ سے ترک اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ اس بنا پر ترکوں کی تاریخ میں کریٹ کے واقعات کا تذکرہ بھی لازمی طور پر شامل رہتا ہے۔

محمد حفیظ اللہ قریشی مرحوم نے ۱۹۲۲ میں لاہور سے ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام تھا "تاریخ سلاطین آل عثمان"۔ ڈھائی سو صفحہ کی اس کتاب میں خاندان عثمانیہ (ترکوں) کے حالات بیان کیے گیے ہیں۔ اس میں سلطنت عثمانیہ کی ابتدا سے لے کر سلطان عبدالمجید ثانی کی معزولی تک کے حالات مختصر طور پر درج ہیں۔ کریٹ کے ساتھ ترکوں کی جنگ کے حالات لکھتے ہوئے کتاب میں بتایا گیا ہے:

۱۰۶۶ھ میں بندقیہ والوں کا ایک عیسائی امیرالبحر مع ۳۰ سپاہیوں کے سلطان محمد خاں رابع (۱۰۹۹-۱۰۵۹ھ) سے آملا۔ اور آستانہ (ترکی) میں آکر اس نے صدق دل سے مذہب اسلام قبول کرلیا۔ چنانچہ سلطان نے اس کی قدر افزائی کی۔ اور اس کو کارخانہ جہاز سازی کا نگراں بنا دیا۔ اس نے اپنی حسن کارگزاری سے سلطان کو ہی خوش نہیں کیا بلکہ اسلام کی بے حد خدمت بجالایا اور اپنے گزشتہ گناہوں کی تلافی مافات کردی۔ (صفحہ ۱۰۶-۱۰۵)

اسلامی تاریخ میں اس طرح کے واقعات بہت ملتے ہیں کہ عین جنگ کے زمانہ میں دشمن کے افراد نے اسلام قبول کرلیا۔ وہ عین ہنگامہ کارزار میں دشمن کی صف کو چھوڑ کر اہل اسلام کی صف میں شامل ہوگیے۔ ان واقعات سے اسلام کی تسخیری طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام فطرت کا دین ہے۔ وہ اپنے اندر ہر آدمی کے لیے بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ ہر آدمی کے دل میں اسلام کی طلب چھپی ہوئی ہے۔ ہر روح اس انتظار میں ہے کہ کب موقع ملے اور وہ خدا کی ابدی دنیا میں داخل ہوجائے۔ اسلام کی یہ تسخیری طاقت اتنی زبردست ہے کہ جنگ بھی اس کے لیے رکاوٹ نہیں۔ عداوت کی فضا بھی اس کی راہ میں حائل نہیں۔

حسد کے نقصانات

بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء میں سلطان محمد بن تغلق سے بغاوت کرکے قائم ہوئی۔ اس کا بانی حسن گنگو تھا۔ حسن کا کہنا تھا کہ وہ ایران کے قدیم بادشاہ بہمن کی اولاد سے ہے۔ اس بنا پر اس کا خاندان بہمنی خاندان کہا جاتا ہے۔

حسن گنگو نے گلبرگہ کو اپنی راجدھانی قرار دیا اور اپنی سلطنت کے حدود کو بڑھانا شروع کیا۔ ۱۳۵۹ میں حسن گنگو کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد اس کا جانشین احمد شاہ بہمنی ہوا۔ اس نے شہر بیدر بسایا اور گلبرگہ کے بجائے بیدر کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔

دکن کی یہ بہمنی سلطنت ۱۸۰ سال تک رہی اور ۱۵۲۷ء میں ختم ہوگئی۔ اس سلطنت کا وزیر ۱۴۶۳ سے لے کر ۱۴۸۱ تک محمود گواں تھا۔ اس کا زمانہ بہمنی سلطنت کا سب سے زیادہ کامیاب زمانہ ہے۔ اس نے سلطنت کو مزید وسیع کیا اور اپنے تدبر سے اس کو نہایت مستحکم کیا۔ مورخین نے بالاتفاق اس کی اعلیٰ لیاقت کا اعتراف کیا ہے۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ " محمود گواں تاریخ ہند کے بہترین مدبروں اور منتظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔" انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں :

The most notable personality of the period,
a leading administrator (9/372).

(اس عہد کی سب سے زیادہ ممتاز شخصیت، ایک اعلیٰ انتظام کار) این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا (۱۹۸۷) کے مصنفین نے ان الفاظ میں اس کے اخلاص کا اعتراف کیا ہے :

Though possessed of wide powers, Mahmud Gawan never abused his authority. By virtue of his skilful diplomacy and successful military operations, he brought the dominions of the Bahmanis to an extent never achieved by former sovereigns.
An Advanced History of India (1987) p. 354

اگرچہ محمود گواں کو نہایت وسیع اختیارات حاصل تھے مگر اس نے کبھی اپنے اختیار کا بے جا استعمال نہیں کیا۔ اپنی ماہرانہ سیاست اور اپنے کامیاب فوجی اقدامات کے ذریعہ اس نے بہمنی سلطنت کے

رقبہ کو ایسی حدود تک پہونچایا جو پچھلے حکمرانوں کے زمانہ میں کبھی نہیں پہونچا تھا۔

محمود گواں اس قدر محنت کا عادی تھا کہ وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا۔ اپنی ضرورتیں اس نے بہت محدود کرلی تھیں۔ چٹائی پر سوتا، مٹی کے برتن میں کھانا کھاتا اور نہایت سادہ زندگی گزارتا۔ اس کے ذاتی کتب خانہ میں تین ہزار کتابیں تھیں۔ اس نے بہمنی سلطنت کی راجدھانی بیدر میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنی تمام کتابیں وہاں بھیج دیں۔ مدرسہ کی عمارت کے آثار اب بھی بیدر میں موجود ہیں۔ اس کے زمانہ میں بہمنی سلطنت کو بہت ترقی ہوئی۔

محمود گواں کے زمانہ میں بہمنی تخت پر محمد شاہ سوم تھا۔ یہ بادشاہ نہایت آرام طلب اور ناکارہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا سارا انتظام عملاً محمود گواں کے ہاتھ میں آگیا۔ محمود گواں نے اس اقتدار کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ پھر بھی دربار کے امراء اس کے قوت و اثر کو دیکھ کر اس سے جلنے لگے۔ انھوں نے خفیہ طریقہ سے محمود گواں کی سرکاری مہر حاصل کرلی۔ اس کے بعد ایک جعلی خط اس کی مہر کے ساتھ تیار کیا جو وجے نگر کے راجہ رائے نرسنگھ کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ فرضی خط انھوں نے بادشاہ کو دکھایا اور کہا کہ وزیر غدار ہے۔ وہ بادشاہ کو تخت سے بے دخل کرنے کے لیے وجے نگر کے راجہ کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے۔

بادشاہ امیروں کے دھوکے میں آگیا۔ اس نے ۵ اپریل ۱۴۸۱ء کو اس لائق وزیر کو قتل کرادیا۔ بعد کو بادشاہ کو پتہ چلا کہ اس نے غلطی کی ہے، اس کو بے حد صدمہ ہوا، یہاں تک کہ وہ خود بھی ایک سال کے اندر ۱۲ مارچ ۱۴۸۲ کو مرگیا۔

محمود گواں کے خلاف اس شرم ناک سازش کا اصل دماغ ملک نائب تھا۔ مگر محمود گواں کے بعد اس کو بھی چین نصیب نہ ہوسکا۔ اب دربار میں اس کے مخالفین پیدا ہوگیے۔ دوبارہ اس کے خلاف بھی سازش ہوئی اور ۱۴۸۶ میں ملک نائب کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ مقتول کے خاتمہ کے صرف پانچ سال بعد خود قاتل کا بھی ذلت کے ساتھ خاتمہ ہوگیا۔

محمود گواں کے قتل کے بعد بہمنی سلطنت دوبارہ سنبھل نہ سکی۔ ۱۵۲۴ء میں اس کے آخری حکمراں کی وفات کے ساتھ بہمنی سلطنت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد اس علاقہ میں بغاوتیں ہوئیں اور ایک سلطنت پانچ الگ الگ سلطنت میں تقسیم ہوگئی۔

یقینی حل

الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۶ کو پڑھ کر ایک صاحب نے طویل خط (۷، اکتوبر ۱۹۸۶) لکھا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: آپ کا سفرنامہ نہ صرف معلوماتی ہوتا ہے بلکہ انداز بیان کے لحاظ سے بھی منفرد۔ اس بار بھی بمبئی کا سفرنامہ ایسا ہی ہے۔ اس سفرنامہ میں ہیرالال ڈرائیور سے آپ کی ملاقات اور ایکسیڈنٹ سے بچے رہنے کی تدبیر کے بارہ میں پوچھے گئے آپ کے سوال کا جواب پڑھنے کو ملا۔ اور مجھے اس سے ملتا جلتا ایک قصہ یاد آگیا۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی ۵۵ سالہ زندگی میں ایک بھی ایکسیڈنٹ نہیں کیا۔ ایک بار وہ محفوظ ڈرائیونگ پر لکچر دیتے ہوئے بولا: مجھے یہ بتانے میں ایک منٹ کا وقت بھی نہیں لگے گا کہ محفوظ ڈرائیونگ کس طرح کی جاتی ہے۔ اس کا طریقہ بہت آسان ہے۔ ڈرائیونگ کے وقت بس یہ بات ذہن میں رکھئے کہ آپ کے سوا دنیا کا ہر ڈرائیور پاگل ہے۔ (محی الدین محمد۔ حیدرآباد)

'پاگل' اس شخص کا نام ہے جو مرفوع القلم ہو۔ جس سے کسی قسم کی توقع نہ کی جاسکے۔ اور جہاں فریق ثانی کی طرف سے کوئی توقع نہ ہو وہاں دوطرفہ بنیاد پر سوچنا بالکل بے معنی ہے۔ ایسے مواقع پر آدمی ہمیشہ یک طرفہ سوچتا ہے۔ اور یک طرفہ طور پر مسئلہ کا حل تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ ہر آدمی جانتا ہے کہ پاگل سے لڑنا نہیں ہے بلکہ پاگل سے بچنا ہے۔ پاگل کے مسئلہ کا حل اس سے اعراض کرنا ہے نہ کہ اس سے ٹکراؤ کرنا۔ جو ڈرائیور دوسرے ڈرائیور کو پاگل سمجھ لے وہ دوسروں کی شکایت نہیں کرے گا۔ وہ ساری توجہ خود اپنی طرف لگا دے گا۔ وہ کہیں اپنی گاڑی کو روک لے گا۔ کہیں وہ پیچھے ہٹ جائے گا اور کنارے کی طرف سے اپنا راستہ نکالے گا۔ سڑک کا جو مسافر اس طرح یک طرفہ طور پر ذمہ داری اپنے آپ پر ڈال لے وہ کبھی سڑک کے حادثہ سے دوچار نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ ڈرائیور نے ایک لفظ میں زندگی کا راز بتا دیا ہے۔ اس کی مراد دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ——— آپ دوسروں سے کچھ امید نہ رکھیے ساری ذمہ داری یک طرفہ طور پر

خود قبول کیجیے اور اس کے بعد آپ یقینی طور پر ایکسیڈنٹ سے دوچار نہیں ہوں گے۔

ڈرائیور نے جو بات سڑک پر حادثات سے بچنے کے بارہ میں کہی، وہی وسیع تر زندگی میں حادثات سے بچنے کے بارے میں بھی درست ہے۔ آپ اپنی زندگی میں یقینی طور پر سماجی حادثات سے بچ سکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ آپ یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار بنالیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں مسائل کا سب سے زیادہ یقینی حل وہی ہے جس پر مذکورہ ڈرائیور نے عمل کیا اور اپنی ڈرائیونگ کی طویل زندگی میں حادثات سے مکمل طور پر محفوظ رہا۔

خالص طبی معنوں میں پاگل انسانوں کی تعداد ساری دنیا میں بمشکل ایک فیصد ہوگی مگر دوسرے اعتبار سے دنیا کے ۹۹ فیصد انسان امکانی طور پر پاگل ہیں۔ عام حالات میں بظاہر لوگ بالکل ٹھیک نظر آتے ہیں۔ مگر جب آدمی کے ذاتی مفاد کا معاملہ آجائے، جب اس کی انا کو ٹھیس لگے۔ جب فریق ثانی کی کسی بات پر اس کے اندر غصہ بھڑک اٹھے۔ جب اس کا سابقہ کسی ایسے شخص سے پڑے جس سے اس کی اَن بَن ہو گئی ہو، تو اس وقت شریف آدمی بھی غیر شریف بن جاتا ہے۔ صحیح دماغ کا انسان بھی پاگل پن پر اتر آتا ہے۔

یہ موجودہ دنیا کی عام حالت ہے۔ اور یہ حالت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک دنیا اپنے موجودہ قوانین کے ساتھ باقی ہے۔ ایسی حالت میں مسئلہ کا حل صرف ایک ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کی طرف مذکورہ ڈرائیور نے اشارہ کیا۔

ایک بار حیدر آباد سے محبوب نگر جاتے ہوئے خود میرے ساتھ ایک سبق آموز واقعہ پیش آیا۔ ہماری گاڑی تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی کہ اچانک ایک بیل سڑک پر آگیا۔ جو صاحب کار کو چلا رہے تھے انھوں نے یہ نہیں کیا کہ بیل کے خلاف احتجاج کریں یا بدستور اپنی گاڑی دوڑاتے رہیں۔ انھوں نے فوراً بریک لگا کر گاڑی کو روکا۔ اور ایک لمحہ رک کر اندازہ کیا کہ بیل کدھر جا رہا ہے۔ بیل نے جب سڑک کے آدھے سے زیادہ حصہ پار کر لیا اور یہ واضح ہو گیا کہ وہ مشرق کی طرف جا رہا ہے تو انھوں نے اپنی گاڑی مغرب کی طرف گھمائی اور بیل کے کنارے کی طرف سے راستہ نکال کر آگے کے لیے روانہ ہو گیے۔

زندگی کے مسائل ہمیشہ یک طرفہ کارروائی کے ذریعہ حل ہوتے ہیں۔ جو لوگ دوطرفہ بنیاد پر مسئلہ کو حل کرنا چاہیں، موجودہ دنیا میں ان کے لیے اس کے سوا کچھ اور مقدر نہیں کہ وہ بے فائدہ احتجاج کرتے رہیں اور اسی حال میں دنیا سے چلے جائیں۔

اعلان

اسلامی مرکز اور اس کے مختلف شعبوں کے لیے آپ کے مالی تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنا تعاون بھیج کر ممنون فرمائیں۔ رقم بھیجتے وقت اس کی مد کی صراحت بھی ضرور فرما دیں

وحید الدین

صدر اسلامی مرکز

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ۔ نئی دہلی ۱۳

تاریخ کا ایک صفحہ

چودھویں صدی عیسوی میں دو بڑے مسلم حکمراں تھے۔ ایک تیمور لنگ (۱۴۰۵-۱۳۳۶) اور دوسرا بایزید اول (۱۴۰۲-۱۳۸۹) تیمور لنگ سمرقند (وسط ایشیا) میں پیدا ہوا۔ وہ چنگیز خاں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بایزید اول اناتولیہ (ترکی) میں پیدا ہوا۔ اس کا دار السلطنت ایڈریانوپل تھا۔

ان دونوں مسلم حکمرانوں کے درمیان ایک نہایت ہولناک جنگ ہوئی جس کو تاریخ میں جنگ انگورہ (Battle of Angora) کہا جاتاہے۔ انگورہ موجودہ انقرہ کا انگریزی نام ہے۔ تیمور نے چاہا کہ وہ بایزید کی سلطنت کے ایشیائی علاقہ پر قبضہ کرلے۔ یہاں سے دونوں میں اختلافات پیدا ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف کارروائی کرنے لگے۔ بایزید نے تیمور کے دشمنوں کو اپنے یہاں پناہ دی۔ تیمور نے بایزید کے دشمنوں سے تعلق قائم کیا، وغیرہ۔

اس قسم کی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ جولائی ۱۴۰۲ میں انگورہ (انقرہ) کے مقام پر دونوں کی فوجیں ایک دوسرے سے ٹکراگئیں۔ دونوں طرف نہایت بہادر لوگ تھے۔ چنانچہ دونوں کے درمیان سخت ہولناک لڑائی ہوئی۔ ایک مورخ کے الفاظ میں گویا دو پہاڑ آپس میں ٹکراگیے۔ دونوں طرف کے تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی مارے گیے۔ آخرکار بایزید کو شکست ہوئی۔ وہ گرفتار ہوا اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہوگیا۔

چودھویں صدی عیسوی میں ساری دنیا میں تیمور اور بایزید کے برابر کوئی طاقتور بادشاہ موجود نہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان جنگ چھڑی تو عالم یہ تھا کہ دور تک خون اور لاشوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس ہولناک جنگ کے سلسلہ میں کچھ لوگ تیمور کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور کچھ لوگ بایزید کو۔ تاہم ذمہ دار جو بھی ہو، نتیجہ بہرحال ایک تھا۔ وہ یہ کہ اس لڑائی سے عالمِ اسلام کو شدید ترین نقصان پہونچا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یورپ جو عثمانی ترکوں کے ذریعہ اسلامی براعظم بننے جارہا تھا، وہ اس باہمی جنگ کے نتیجہ میں عیسائی براعظم بن کر رہ گیا۔

جنگ کا فیصلہ ۲۰ جولائی ۱۴۰۲ کو ہوا۔ بایزید گرفتار ہوگیا۔ تیمور نے اس کو ایک لوہے کے

کٹہرے میں بند کروایا۔ تیمور اپنے سفروں میں اس کٹہرے کو ساتھ ساتھ لے جاتا تھا تاکہ اس کی تشہیر کرے۔ سلطان بایزید اس رسوائی کو برداشت نہ کر سکا۔ گرفتاری کے صرف آٹھ ماہ بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ خود تیمور بھی اپنی فتح کے ڈھائی سال بعد اس دنیا سے رخصت ہو کر وہیں چلا گیا جہاں اس نے اپنے مفتوح سلطان کو پہونچایا تھا۔ دنیا میں بظاہر ایک فاتح تھا اور دوسرا مفتوح۔ مگر آخرت نے دونوں کے فرق کو ختم کر دیا۔ آخرت میں دونوں یکساں طور پر خدا کے بندے کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش کر دیئے گیے۔

تیمور اور بایزید دونوں نہایت بہادر تھے۔ تیمور کی ہیبت مشرقی دنیا پر چھائی ہوئی تھی اور بایزید کی ہیبت مغربی دنیا پر جس نے اسلام کے حدود دریائے ڈینوب (ہنگری) تک پہونچا دیئے تھے۔

اگر ایسا ہوتا کہ تیمور اپنے عمل کا میدان مشرق کو بناتا اور بایزید مغرب کی سمت میں آگے بڑھتا تو وہ دونوں پورے عالم کو اسلام کے سایہ میں لانے کے لیے کافی ہو جاتے۔ مگر آپس کی لڑائی نے اس امکان کو واقعہ بننے نہیں دیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے تیمور کے تذکرے کے ذیل میں لکھا ہے :

> By defeating the Ottoman Sultan Bayezid at Angora (modern Ankara) in 1402 and thus preventing him from extending his domain into Europe, the fall of Constantinople and the death agony of Byzantium were delayed half a century by this Muslim nomad (18/242).

یعنی تیمور نے عثمانی سلطان بایزید کو انگورہ (موجودہ انقرہ) کے مقام پر ۱۴۰۲ میں شکست دی۔ اس طرح اس نے بایزید کو یورپ میں اپنا اقتدار بڑھانے سے روک دیا۔ اس کے نتیجہ میں قسطنطنیہ کی فتح اور بازنطینی سلطنت کا خاتمہ نصف صدی تک کے لیے موخر ہو گیا۔

مسلمان اکثر دوسری قوموں کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو جتنے بھی نقصان پہونچے ہیں، سب اپنوں کی وجہ سے پہونچے ہیں۔ مسلمانوں کی آپس کی لڑائیاں مسلمانوں کی بربادی کا سب سے بڑا سبب ہیں، گزرے ہوئے دور میں بھی اور حال کے زمانہ میں بھی۔ مگر تاریخ کا یہی سب سے بڑا سبق ہے جس سے مسلمانوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

شراب اور ترقی میں تضاد

۳ مئی ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔ ایک ۱۳ سالہ امریکی لڑکی کاری (Cari) کیلی فورنیا کی سڑک سے گزر رہی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے بائیسکل لین سے چل رہی تھی۔ اس اثنا میں ایک کار پیچھے سے دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ کاری سے اتنے زور کے ساتھ ٹکرائی کہ وہ اچھل کر ۲۵ میٹر اوپر فضا میں چلی گئی۔ اس حادثہ کے ایک گھنٹے کے اندر لڑکی کا انتقال ہوگیا۔ کار کا ڈرائیور گرفتار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ شراب پیے ہوئے تھا۔

اس طرح کے حادثے امریکہ میں ہر روز بہت بڑی تعداد میں ہوتے رہتے ہیں۔ تازہ اعداد وشمار سے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ میں ہر سال تقریباً ۵۰ ہزار کار کے حادثے ہوتے ہیں۔ ان حادثات میں سے نصف وہ ہیں جو شراب نوشی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ شراب نوشی کے نتیجہ میں ہونے والے سڑک کے حادثات موجودہ امریکہ میں موت کا سبب نمبر ایک ہیں۔

شراب پی کر گاڑی چلانے کے خلاف امریکہ میں حالیہ برسوں میں نیا شعور جاگا ہے۔ اس نئے شعور کی ہیرو ایک عورت ہے، اور وہ وہی ہے جو مذکورہ مقتول لڑکی کاری کی ماں ہے۔ اس کا نام کینڈی لائٹنر (Candy Lightner) ہے۔ کینڈی لائٹنر اس کو برداشت نہ کر سکی کہ اس کی لڑکی کی موت ایک خالی از معنی واقعہ ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ اس نے اپنی ملازمت چھوڑ دی۔ اپنی جائداد فروخت کر دی۔ اس نے دوڑ دھوپ کر کے کچھ اور عورتوں کو اپنا ساتھی بنایا۔ اس کے بعد اس نے ایک تنظیم قائم کی جس کا نام مدرس اگینسٹ ڈرنک ڈرائونگ (MADD) تھا۔ اس نے اپنا پورا وقت اور اپنا پورا اثاثہ اس تنظیم کے حوالے کر دیا۔ یہ تنظیم ۱۹۸۰ میں قائم ہوئی۔

کینڈی لائٹنر نے باقاعدہ طور پر ان قوانین کا مطالعہ کیا جو شراب پی کر گاڑی چلانے کی بابت بنائے گئے ہیں۔ اس نے اس سلسلہ میں ہر قسم کی متعلق معلومات اور اعداد وشمار جمع کیے۔ اس نے اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور نشر واشاعت کے دوسرے تمام ذرائع کو بھرپور طور پر استعمال کیا۔ اس نے امریکی عوام کو بتایا کہ ہر سال ۲۵ ہزار امریکی محض شراب نوش ڈرائیوروں

کے ذریعہ ہونے والے حادثات میں مرجاتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ایک ملین امریکی جو حادثات میں مرنے سے بچ جاتے ہیں وہ بھی ہمیشہ کے لیے ناقابل کار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ امریکہ میں ہر روز ۷۰ آدمی سڑک کے حادثات میں مرتے ہیں یعنی ہر ۲۰ منٹ میں ایک آدمی۔ اس قسم کی بے شمار باتوں سے کینڈی لائٹنر نے امریکی عوام کو بوکھلا دیا۔ یہاں تک کہ خود امریکی حکومت حرکت میں آگئی۔ ۱۷ جولائی ۱۹۸۴ کو صدر ریگن نے شراب پی کر گاڑی چلانے کے خلاف ایک قانون پر دستخط کر دیے۔

اس مسئلہ کی تفصیلی معلومات دیتے ہوئے ایک امریکی میگزین *Span*, September 1986 نے لکھا ہے کہ ۲۰ ویں صدی تک شراب نوشی امریکہ میں نسبتاً چھوٹا سماجی مسئلہ تھی۔ کیوں کہ شراب پینے والے شاذونادر ہی اس پوزیشن میں ہوتے تھے کہ وہ اپنے آپ کے سوا کسی اور کو کوئی سخت نقصان پہونچا سکیں۔ شراب پینے والے اس سے پہلے زیادہ سے زیادہ شراب خانہ میں چیخنے چلاتے تھے یا گھر کے اندر جھگڑا برپا کرتے تھے یا گھوڑا گاڑی دوڑاتے ہوئے اس کو الٹ دیتے تھے۔ اس وقت ایک شراب نوش زیادہ تر رحم کا مستحق سمجھا جاتا تھا نہ کہ نفرت کا۔ وہ یقینی طور پر ایسا مسئلہ نہ تھا جو حکومت کے لیے قابل توجہ ہو۔ مگر موٹروں کی ایجاد نے شراب نوشی کو ہر اس آدمی کے لیے خطرہ بنا دیا جو سڑک پر سفر کرنا چاہتا ہو:

> Until the 20th century, drunkenness was a relatively minor social problem in the United States, because drunkards were rarely in any position to cause serious damage to anyone but themselves. Drinkers might brawl in the bars and public houses, or cause family strife, or upset an applecart on a wild horseback ride through town, but for the most part a chronic drinker was more to be pitied than scorned, and certainly was not cause for government concern. With the introduction of the automobile, however, the drunkard became a menace to everyone within reach of his desire to travel.

شراب نہ پینا مذہب کی علامت ہے اور شراب پینا لامذہبیت کی علامت۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو مذکورہ مثال یہ ثابت کرتی ہے کہ لامذہبیت اور ترقی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مذہب کے مخالفین یہ کہتے رہے ہیں کہ مذہب اور ترقی دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ لامذہبیت ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے نہ کہ مذہبیت۔

۳۰ مارچ ۱۹۸۱ کو صدر امریکہ مسٹر رونالڈ ریگن پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ وہ زخمی ہوئے تاہم ہلاک ہونے سے بچ گئے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ قاتل شراب پیے ہوئے تھا۔ مزید تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ شراب اور جرم میں بہت گہرا ربط ہے۔ اکثر مجرم شراب پی کر مجرمانہ فعل کرتے ہیں۔ انسان کا اندرونی ضمیر، اور جرم کے بعد قانون کی پکڑ کا اندیشہ آدمی کو جرم سے روکتا ہے۔ اس لیے منصوبہ کے تحت جرم کرنے والے لوگ ہمیشہ شراب پی کر مجرمانہ اقدام کرتے ہیں، شراب آدمی کے نازک احساسات کو وقتی طور پر دبا دیتی ہے، اس طرح آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ بے خوف ہو کر مجرمانہ اقدام کر سکے۔

امریکہ میں آج کل بہت سے ممتاز افراد شراب کے خلاف جہاد (کروسیڈ) جاری کیے ہوئے ہیں۔ ان میں امریکہ کی خاتون اول (First Lady) مسز نینسی ریگن بھی شامل ہیں۔ پلین ٹروتھ (اکتوبر ۱۹۸۶) کی رپورٹ کے مطابق مسز ریگن نے کیلی فورنیا میں تقریر کرتے ہوئے شراب کے نقصانات گنائے اور کہا کہ شراب نوشی کے اثرات سے ہم بُری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ کیونکہ شراب نوشی اور جرم کے درمیان قطعی اور براہ راست رشتہ پایا جاتا ہے:

> It affects us when it destroys families. It affects us when it costs hundreds of millions of dollars through accidents and absenteeism in the workplace. It affects us since there is a definite and direct link between crime and drug abuse.

مسز ریگن نے مزید کہا کہ یہ ایک اخلاقی مسئلہ (Moral issue) ہے۔ اس کے متعلق ہمیں ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔ آپ خواص کی کم مقدار میں شراب نوشی اور عوام کی زیادہ مقدار میں شراب نوشی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ دونوں ہی بُرائی ہیں۔ اخلاقی اعتبار سے دونوں کی حیثیت یکساں ہے:

> You cannot separate polite drug use at a chic L.A. party from drug use in some back alley somewhere. They are morally equal.

اسلام میں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے، اور یہ کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کی کم مقدار بھی حرام ہے (ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام)۔ تہذیب جدید

اپنی ترقی کی آخری انتہا پر پہونچ کر حیرت انگیز طور پر اس دینی تعلیم کی صداقت کا اقرار کر رہی ہے۔

کیسی عجیب ہے یہ تصدیق، اور کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اس کھلی ہوئی تصدیق کے باوجود دینی تعلیمات کی ابدی صداقت کا اعتراف نہ کریں۔

ایک سفر

ایک عالمی اسلامی کانفرنس (۱۵ ستمبر تا ۲۰ ستمبر ۱۹۸۶) میں شرکت کے لیے افریقہ کا سفر ہوا۔ یہ سفر میرے تمام سفروں میں سب سے زیادہ واقعات سے بھرا ہوا (Eventful) سفر تھا۔ اگر اس کی تمام باتیں لکھی جائیں تو شاید پورا الرسالہ بھر جائے گا۔ تاہم میں اس کی مختصر روداد بیان کروں گا۔ ۱۲ ستمبر کی شام کو دہلی کے نئے ہوائی اڈہ (اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایرپورٹ) پہونچا۔ جدید طرز کا یہ ایرپورٹ دو ہزار ہیکٹر رقبہ میں بنایا گیا ہے۔ اس کا اضافہ شدہ بجٹ ۱۰۰ کرور روپیہ تھا۔ اگرچہ اس کی آخری تکمیل ابھی باقی ہے۔ تاہم اس کا رسمی افتتاح یکم مئی ۱۹۸۶ کو کیا گیا ہے۔

اب پالم کا قدیم ہوائی اڈہ ملک کی اندرونی پروازوں کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔ نیا ہوائی اڈہ جب آخری طور پر مکمل ہوگا تو وہ سالانہ ۳۵ ملین مسافروں کو چڑھا اور اتار سکے گا۔ یہاں بیک وقت ایک سو ہوائی جہازوں کے کھڑے ہونے کے لیے جگہ ہوگی۔ نئے ہوائی اڈہ کی بلڈنگ اور اس کا نظام جدید بین اقوامی معیار پر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ یہاں بیک وقت ۱۴ جہاز اتر سکتے ہیں یا روانہ ہو سکتے ہیں۔ پانی کے معقول انتظام کے لیے ۲۴ ٹیوب ویل لگائے گیے ہیں۔ سامان منتقل کرنے کی پٹی (Conveyer belt) کو جدید طرز کا بنایا گیا ہے تاکہ مسافروں کو اپنا سامان لینے کے لیے کم سے کم انتظار کرنا پڑے۔ قدیم ہوائی اڈہ پر صرف ۲۲ کاونٹر تھے۔ یہاں ۸۰ کسٹم کاونٹر بنائے گیے ہیں۔ ٹیلی فون کی ۵۰۰ لائنیں ہیں جو الکٹرانک سسٹم پر قائم ہیں۔ یہاں مشینی زینہ (Escalator) لگایا گیا ہے۔ ہوائی جہاز پر چڑھنے اور ہوائی جہاز سے اترنے کے لیے اس سے پہلے قدیم طرز کی سیڑھی (Tarmac) ہوتی تھی۔ اب جدید طرز کے معلق پل (Aero-bridge) بنائے گیے ہیں جو جہاز کے دروازہ سے جوڑ دیئے جاتے ہیں۔ وغیرہ۔ تاہم کھلی سیڑھی سے چڑھنے اترنے میں جو رومانی منظر ہوتا ہے وہ بند قسم کے ایروبرج سے چڑھنے اور اترنے میں موجود نہیں۔ نیز کارکردگی کے اعتبار سے صورت حال زیادہ اطمینان بخش نہیں۔ مثلاً اندرا گاندھی ایرپورٹ سے ہم نے اپنے دفتر میں ٹیلی فون کرنا چاہا۔ مگر بار بار نمبر ملانے کے باوجود ایسا ہوا کہ دوسری طرف سے "ہلو" کی آواز آتی تھی۔ مگر ہماری آواز نہیں

اس ایرپورٹ پر جو خصوصی اہتمام کیے گیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایرپورٹ کی دیواروں پر ہندستان کی ہوابازی کی کہانی مصور کی گئی ہے۔ یہ تصویرکشی انتہائی اعلیٰ مصوروں نے کی ہے، مثلاً ایم ایف حسین اور کے کیمیم راج۔ اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندستانی ہوابازی کی کہانی کا آغاز دیومالائی قصوں سے کیا گیا ہے جب کہ دیوتا اپنے پشپ ویمان (Flowercraft) میں سوار ہو کر سفر کرتے تھے اور اس کا آخری منظر اس مرحلہ پر ختم ہوتا ہے جب کہ سٹلائٹ اور کمپیوٹر ہوابازی کے عمل میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۵)

ماضی پرستی کے ساتھ مستقبل پسندی کی اسی ذہنیت پر اقبال احمد سہیل مرحوم نے یہ شعر کہا تھا:

آگے ہیں قدم پیچھے ہے نظر جانا ہے کہاں جانتے ہیں کدھر مبہم ہے یہاں خود سمت سفر نیرنگ زمانہ کیا کہیے

اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایرپورٹ پر آرٹ ورک کا کام اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا ہے۔ اس آرٹ ورک کے لیے ابتداءً تین لاکھ روپے کی منظوری دی گئی تھی مگر "ماہرین" نے حکومت کو مطلع کیا کہ تین لاکھ روپیہ پیش نظر کام کے لیے بہت ناکافی ہے۔ اس کے بعد حکومت نے زبردست فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے تین ملین (۳۰ لاکھ) روپے اس کے لیے منظور کر دیے۔

اس ۳۰ لاکھ روپے کے منصوبہ کا ٹھیکہ لینے کے لیے بہت سے امیدوار دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ مگر اس کا ٹھیکہ جس کو ملا وہ مشہور مسلم آرٹسٹ ایم۔ ایف حسین تھے۔ مسٹر حسین کو ٹھیکہ ملنے کی وجہ ان کی فنی مہارت کے علاوہ یہ بھی تھی کہ پہلے انھیں ایرپورٹ کا ایک جزئی کام دیا گیا تھا جس کو انھوں نے وقت سے کافی پہلے مکمل کر دیا (ہندستان ٹائمس ۳ دسمبر ۱۹۸۵)

آدمی اگر کسی اعتبار سے امتیازی کارکردگی کا مقام حاصل کرلے تو وہ تعصب اور تنگ نظری سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنا اعتراف پا کر رہتا ہے، خواہ وہ ایک فرقہ کا آدمی ہو یا دوسرے فرقہ کا۔

افریقہ کا یہ سفر براستہ کراچی ہوا۔ دہلی سے کراچی تک کا سفر پی آئی اے کے ذریعہ طے ہوا۔ جہاز کے اندر پی آئی اے کا میگزین ہم سفر (ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۶) دیکھنے کو ملا۔ اس کا نصف حصہ اردو زبان میں تھا اور نصف حصہ انگریزی زبان میں۔ جہاز کے اعلانات کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اور قرآن کی آیت (سُبحَانَ الَّذِی سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقرِنِینَ) سے ہوا۔ درمیانی اعلانات میں بھی ہمیشہ انشاء اللہ کا لفظ شامل رہتا تھا۔ کپتان وقار اس کے پائلٹ تھے۔ جہاز کے اندر کا نظام دوسری کئی ہوائی کمپنیوں سے بہتر نظر آیا۔

کراچی سے جہاز بدلنا تھا۔ یہاں دو رات اور ایک دن قیام رہا۔ کراچی میں میرا قیام ایرپورٹ ہوٹل میں تھا۔ یہ ہوٹل پی آئی اے نے اپنے ٹرانزٹ مسافروں کے لیے بنایا ہے۔ وسیع ہوٹل کے اندر ایک چھوٹی سی بغیر چھت کی مسجد بھی موجود تھی۔ وہ شاندار ہوٹل کے اندر غیر شاندار حالت میں نظر آئی۔ تاہم واپسی کے بعد جب میں دوبارہ ۲۳ ستمبر کو اس ہوٹل میں پہونچا تو معلوم ہوا کہ یہ مسجد دراصل زیر تعمیر تھی۔ چنانچہ واپسی میں وہ اپنی دیوار اور چھت کے ساتھ مکمل کھڑی ہوئی نظر آئی ـــــــ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سرسری مشاہدہ کی بنیاد پر ایک رائے قائم کر لیتا ہے جس کی تصدیق بعد کے مشاہدہ سے نہیں ہوتی۔

کراچی ایرپورٹ پر ایرپورٹ کے شایان شان چھوٹی سی خوبصورت مسجد موجود تھی۔ یہاں ہم نے سکون کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی۔

پچھلے پندرہ سال سے ایک عجیب وغریب عمل ساری دنیا میں جاری ہے جس کو فضائی قذاقی (Hijacking) کہا جاتا ہے۔ ۱۲ ستمبر کی شام کو میں کراچی ایرپورٹ پر اترا تو اس سے صرف چند دن پہلے (۵ ستمبر ۱۹۸۶) کو پان ایم کی فلائٹ ۷۳ کے ساتھ اسی قسم کا ایک دہشت خیز واقعہ یہاں ہو چکا تھا۔ آج کل ہوائی اڈوں پر مسافروں کی زبردست چیکنگ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کیسے ممکن ہوتا ہے کہ لوگ آتشیں ہتھیار لے کر ہوائی جہازوں کے اندر داخل ہو جائیں، یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہ آسکی۔ اگر چیکنگ کا موجودہ نظام اس کو روکنے کے لیے ناکافی ہے تو پھر ہزاروں بے قصور مسافروں کو اس سخت عمل سے گزارنے کا جواز کیا ہے جس کو سکیورٹی چک کہا جاتا ہے۔ کیا اس کا مقصد یہ ہے کہ گنہ گاروں کی سزا بے گناہوں کو دی جائے۔

فضائی قذاقی سے نمٹنا ایک بے حد نازک کام ہے۔ کسی ملک کی مسلح پولس ہوائی جہاز کے اندر داخل ہو کر ان کو چند منٹ میں ہلاک کر سکتی ہے۔ مگر نزاکت یہ ہے کہ فضائی قذاقوں کے ہاتھ میں خطرناک ہتھیار ہوتے ہیں۔ جب ان پر وار کیا جائے گا تو وہ بھی ضرور اپنا ہتھیار استعمال کریں گے

اور اس دوطرفہ جنگ میں بے گناہ مسافر مارے جائیں گے ، جیساکہ کراچی کے ہوائی اڈہ پر پان ایم کے جہاز کے ساتھ عملاً پیش آیا۔ اس جہاز میں چار سو مسافر تھے ان میں سے ڈیڑھ درجن آدمی مرگئے اور تقریباً ڈیڑھ سو آدمی زخمی ہوئے ۔ (ٹائم میگزین ۱۵ ستمبر ۱۹۸۶)

چنانچہ فضائی قذاقی سے نمٹنے کے لیے کچھ مسلمہ اصول (Accepted rules) ہیں ۔ جن کا خلاصہ ان مختصر الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے ——— گفت وشنید کرو ، گفت وشنید کرو ، گفت وشنید کرو ، وقت حاصل کرو ، وقت حاصل کرو ، وقت حاصل کرو :

Negotiate, negotiate, negotiate, negotiate.
Buy time, buy time, buy time, buy time.

مسئلہ جتنا زیادہ نازک ہو ، اتنا ہی زیادہ حکمت کے ساتھ اس سے نپٹنا پڑتا ہے ۔ اگرچہ نادان آدمی نازک مسئلہ اور غیر نازک مسئلہ کے فرق کو نہیں سمجھتا۔ وہ دونوں سے یکساں انداز سے نپٹنے کی کوشش کرتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف مسائل میں اضافہ کا سبب بنتا ہے ، وہ کسی درجہ میں بھی مسئلہ کو کم نہیں کرتا ۔

کراچی کے ہوٹل میں کھانے کے وقت ایک بار ایک پٹھان ہماری میز کے دوسری طرف آکر بیٹھ گیا ۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ سرحد کے رہنے والے ہیں ۔ اور ابوظبی سے آرہے ہیں ۔ میں نے پوچھا کہ آپ ابوظبی میں کیا کام کرتے ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ "مزدوری" ۔ اس کے بعد انھوں نے میرے بارہ میں سوالات پوچھنا شروع کیے ۔ جب میں نے بتایا کہ میں ہندستان کا رہنے والا ہوں اور افریقہ جا رہا ہوں ، تو انھوں نے کہا :

افریقہ میں کیا کرتے ہو ، کیا وہاں مزدوری کرتے ہو ۔

اس سوال پر میں خاموش رہا اور ان کو کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے سوچا کہ آدمی جس طبقہ کا ہو ، اسی طبقہ کے مطابق اس کا فکر بھی بنتا ہے ۔ اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچنا نہایت نادر خصوصیت ہے ۔ حتیٰ کہ خواص بھی اس معاملہ میں اتنا ہی پیچھے ہیں جتنا کہ عوام ۔

ہوائی جہاز کا سفر بے حد نازک سفر ہے ۔ کسی بھی لمحہ کوئی ہنگامی صورت پیش آسکتی ہے جو واقعات کے رخ کو تبدیل کردے ۔ ہم کراچی سے روانہ ہوئے ۔ ابتداءً یہ نہایت ہموار پرواز تھی ۔ سات گھنٹہ

کی مسلسل اڑان کے بعد ہم کو منزل پر پہونچنا تھا۔ مگر چند گھنٹہ کے بعد خطرے کا الارم بجنے لگا۔ پھر اعلان ہوا کہ بعض "ٹکنکل سبب" کے تحت جہاز درمیان میں اتارا جا رہا ہے۔ دوران پرواز پائلٹ نے عمان ایرپورٹ سے رابطہ قائم کیا اور اس سے اجازت لے کر جہاز کو نیچے اتارنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ عمان کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ جیسے ہی جہاز کے پہیے نے زمین کو چھوا، مسافروں نے خوشی کے اظہار کے طور پر تالیاں بجائیں۔ کیوں کہ یہ بھی ممکن تھا کہ جہاز ہوائی اڈہ پر اترنے کے بجائے کسی کھڈ میں جا گرے۔

عمان (اردن) میں ہم ساڑھے سات گھنٹہ تک رکے رہے۔ جہاز کے ایک انجن نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ انجینیروں نے مسلسل محنت کرکے اس کو درست کیا، اس کے بعد جہاز دوبارہ آگے کے لیے روانہ ہوا۔

تقریباً دو سو مسافر عمان کے ہوائی اڈہ پر پہونچا دیے گیے۔ عمان کا ہوائی اڈہ چھوٹا مگر خوبصورت ہے۔ یہاں ہم نے دو نمازیں پڑھیں، ایک ظہر کی اور دوسری عصر کی۔ میں نے دیکھا کہ مسافروں کی اکثریت یا تو باتیں کر رہی ہے یا سگریٹ کا دھواں اڑانے میں مشغول ہے۔ کوئی چپ کی دنیا میں مشغول ہونے والا نظر نہ آیا۔ جن لوگوں کے پاس اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لیے کچھ نہ ہو وہ بیرونی کلام میں مشغول ہوتے ہیں۔ جن کو اپنے اندر سفر کرنے کے لیے راستہ نہ ملے، وہ باہر کے راستوں پر دوڑتے ہیں۔

عمان کے ساڑھے سات گھنٹے بڑے سخت گزرے۔ بظاہر وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ کھانے پینے کا انتظام بھی موجود تھا۔ آرام دہ نشستیں تھیں جن پر کوئی بیٹھا تھا اور کوئی لیٹا ہوا تھا۔ ضروریات کا تمام سامان مہیا تھا۔ مگر مجھ پر اَلانتظارُ اشدُّ منَ الموْتِ کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے کہا: خدایا، عاجز انسان خیالی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کر سکتا، پھر آخرت میں وہ حقیقی تکلیف کو کس طرح برداشت کرے گا۔

عمان کے ہوائی اڈہ پر بڑے بڑے فریموں میں تاریخی آثار (الکرک، جرش، عقبہ، موتہ وغیرہ) کی تصویریں کثرت سے لگی ہوئی تھیں۔ موجودہ اردن کی تجارتی یا تمدنی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں۔ مگر تاریخی اعتبار سے وہ زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں سیاح کثرت سے تاریخی آثار

کو دیکھنے کے لیے آتے رہتے ہیں ۔

عمان اردن کی راجدھانی ہے ۔ جون ۱۹۶۷ میں عرب ۔ اسرائیل جنگ ہوئی تھی۔ اس جنگ میں اسرائیل نے دوسرے علاقوں کے علاوہ ، دریائے اردن کا مغربی حصہ اور یروشلم کا اردنی سکٹر اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ اسرائیل کے اس زیر قبضہ علاقہ کا رقبہ ۲۲۷۰ مربع میل ہے ، یعنی اردن کے پورے رقبہ کا ۶ فی صد ۔ اس مقبوضہ علاقہ میں اردن کا تقریباً نصف قابل زراعت حصہ شامل ہے ۔ اردن میں ۳۰۰۰ سال قبل مسیح کے آثار پائے جاتے ہیں ۔

۱۴ ستمبر کی شام کو ہم طرابلس پہونچے ۔ یہاں کے وقت اور ہندستان کے وقت میں ساڑھے تین گھنٹے کا فرق ہے ۔ طرابلس کا لفظ ٹریپولی (Tripoli) کی تعریب ہے ۔ اور ٹریپولی ٹرائی پولس (Tripolis) سے بنا ہے ۔ یہ نام اس کو ابتداءً فینیقیوں نے دیا تھا ۔ Tri کا مطلب یونانی اور لاتینی میں تین ہوتا ہے ۔ ٹرائی پولس کے معنی تین شہر کے ہیں ۔ یہی لفظ بعد کو انگریزی میں ٹریپولی ہوگیا ۔ یہ شہر ساتویں صدی قبل مسیح میں فینقیوں (Phoenicians) نے بسایا تھا۔ اس کے بعد وہ رومیوں کے قبضہ میں آیا ۔ انھوں نے بھی یہ نام باقی رکھا ۔ فینقیوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ شہر کو تین حصے کی صورت میں آباد کرتے تھے ، اور اس بنا پر اس کا نام تین شہر (ٹرائی پولس) رکھتے تھے ۔

یہاں میرا قیام فندق باب البحر (کمرہ نمبر ۵۱۹) میں تھا۔ یہ ہوٹل سمندر (میڈیٹرینین) کے عین کنارے بنایا گیا ہے ۔ کمرہ کے ایک طرف سمندر کی لہریں حد نظر تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہاں قدرت کی اتھاہ خاموشی کو صرف وہ مشینیں توڑتی تھیں جو صبح سویرے سے اپنے کام میں لگ جاتی تھیں ۔ ان کا کام تھا ، سمندر کے ساحلی حصہ کو پاٹ کر خشک زمین میں تبدیل کرنا تاکہ وہاں تعمیرات کھڑی کی جاسکیں ۔

قدیم ترین زمانہ میں آدمی خشکی پر سفر کرتا تھا ، پھر اس نے کشتی اور جہاز بنائے اور سمندروں کے ذریعہ زیادہ آسانی کے ساتھ دور دور کا سفر کیا جانے لگا ۔ اب انسان فضا میں مزید تیز رفتاری کے ساتھ ہوائی جہازوں کے ذریعہ سفر کرتا ہے ۔

ان چیزوں کو مورخین انسانی ترقی کے عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں ۔ مگر ان کو آلاء اللہ کے عنوان کے تحت بیان کیا جانا چاہیے ۔ یہ دراصل خدا ہے جو انسان کو سفر کراتا ہے ۔ خشکی اور سمندر اور

فضا کو اللہ تعالیٰ نے مخصوص قوانین کا پابند بنایا ہے۔ اگر یہ قوانین نہ ہوں یا وہ انسان کے ساتھ موافقت نہ کریں تو انسان خشکی میں بھی سفر نہیں کر سکتا، کجا کہ وہ سمندروں میں تیرے اور فضاؤں میں اڑے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ہٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ۔

سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر خدا کی عظمت کا بڑا پر رعب احساس ہوتا ہے۔ پانی کا اتھاہ خزانہ، ساحل سے ٹکراتی ہوئی موجیں، حد نظر تک پھیلا ہوا آسمان۔ یہ چیزیں آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہیں۔ اس پر عظمت منظر کو دیکھتے ہوئے میری زبان سے نکلا: بنانے والے نے کیسی عجیب دنیا بنائی، ایک ایسی دنیا جو دہشت ناک حد تک عجیب ہے۔

ایک وسیع ہال میں باجماعت نماز کا انتظام تھا۔ بعض باتیں ایسی ہیں کہ ایک مانوس ماحول میں بار بار اس کو سنا جائے تو آدمی اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ مگر وہی بات ایک غیر مانوس ماحول میں سننے کو ملے تو وہ آدمی کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتی ہے۔ یہ ہال جس کے ایک طرف سمندر کا منظر تھا اور دوسری طرف نمازیوں کے چہرے۔ اس ماحول میں ایک شخص نے کھڑے ہو کر عربی لہجہ میں فجر کی اذان دی:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَشْہَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ، اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔

یہ فجر کا اوّل وقت تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسے ماحول میں جب یہ پر شکوہ الفاظ گونجے تو دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے مؤذن کی آواز کائنات کی ہم نوا ہو گئی ہے، جیسے مؤذن عالم گیر سناٹے کو توڑتے ہوئے اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے جس کے اعلان کے لیے سارے زمین و آسمان بے قرار ہو رہے تھے۔

کانفرنس میں ایک مقرر نے نماز سے متعلق حضرت عمرؓ کا واقعہ بیان کیا۔ اس کے بعد اس نے نہایت پر جوش انداز میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ہوٹل میں ایک ہال کو مسجد کے طور پر مخصوص کیا گیا ہے۔ وہاں روزانہ اذان ہوتی ہے، مگر میں دیکھتا ہوں کہ جب اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو بہت کم لوگ ہیں جو مسجد کی طرف دوڑ کر جاتے ہوں، مگر خود مقرر صاحب

کا یہ حال تھا کہ پروگرام کے تحت ہونے والی نمازوں (مثلاً مغرب) میں تو وہ مسجد میں نظر آتے تھے۔ مگر اس کے بعد ان کو مسجد میں پانا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ میں نے ان کو نہیں دیکھا کہ وہ کبھی فجر کی جماعت میں شریک ہوئے ہوں، یہاں مغرب کی جماعت میں سب سے زیادہ آدمی ہوتے تھے اور فجر کی جماعت میں سب سے کم۔

اس کانفرنس میں تقریباً ۸۵ ملکوں کے ۴۰۰ علماء اور دانشور شریک ہوئے۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جلسہ نے کہا :

نحن هنا من كل انحاء العالم الاسلامي بل من كل انحاء العالم

یہ کانفرنس دعوت اسلامی کے موضوع پر تھی۔ یہی ایک جذبہ لے کر ہر شخص اس میں شریک ہوا تھا کہ اسلام کی دعوت کو از سر نو زندہ اور غالب کیا جائے۔ مگر یہاں اور دوسرے مواقع پر گفتگو کے بعد میرا تاثر یہ ہے کہ اس وقت ساری دنیا میں مسلمان ایک ہی قسم کے ذہنی انتشار سے دوچار ہیں۔ اور وہ یہ کہ وہ دعوت اسلام اور دفاع اسلام کو الگ الگ کر کے دیکھ نہیں پاتے۔ وہ دعوت کے عنوان پر بولنا شروع کرتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی دفاع کے موضوع پر پہونچ جاتے ہیں اور پھر تقریر کی پوری ٹرین دفاع کے موضوع پر چلتی ہے اور اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔

یہاں کئی ایسے لوگ ملے جو الرسالہ (انگریزی) کے قاری تھے۔ ہر ایک نے غیر معمولی الفاظ میں اس کی زبان و بیان کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ ایک امریکی نومسلم سے میں نے الرسالہ (انگریزی) کے بارہ میں ان کا تاثر پوچھا تو وہ بار بار ممتاز ممتاز (Excellent, Excellent) کہتے رہے۔

افریقہ میں جو لوگ الرسالہ (انگریزی) کا افریقی اڈیشن نکال رہے ہیں، ان میں سے ایک صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ افریقہ میں الرسالہ (انگریزی) کی مقبولیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ لوگ بہت شوق سے اس کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

میرا مقالہ ۱۶ ستمبر ۸۶ ۱۹ کی نشست میں تھا۔ یہ مقالہ عربی میں تھا اور اس میں دکھایا گیا تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے آج کے دور میں اپنی نفع بخشی کھو دی ہے۔ خدا کا قانون اس دنیا کے لیے یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ اپنے آپ کو نفع بخش ثابت کرے اس کو عزت اور استحکام ملے۔ مسلمان جب تک اپنے آپ اس قانون کا مصداق ثابت

نہ کریں وہ بلند مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ مقالہ (اسلام دور جدید میں) انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ یہ مقالہ کانفرنس کی طرف سے تین زبانوں میں تقسیم کیا گیا ——— عربی، انگریزی، فرانسیسی۔

یہ عالمی موتمر ۱۵ ستمبر سے ۲۰ ستمبر تک جاری رہی۔ موتمر کی صورت یہ تھی کہ مختلف اہل علم کو پیشگی طور پر متعین موضوعات بھیج دیئے گئے تھے۔ میرے محاضرہ کا عنوان تھا:

حاجۃ للمسلمین الی الاخذ باسباب التقدم العلمی والتقنی

ہر نشست میں ضروری رسمی کارروائیوں کے بعد محاضر اپنا محاضرہ پیش کرتا۔ اس کے بعد لوگوں کو اظہار خیال کا موقع دیا جاتا۔ آخر میں محاضر لوگوں کے سوالات کا جواب دیتا۔ میرے محاضرہ میں ایک بات یہ کہی گئی تھی کہ توحید اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ توحید کو ماننے ہی کے نتیجہ میں ہمارے اسلاف نے بڑے بڑے سائنسی کارنامے انجام دیئے۔ اس پر ترکی کے ایک پروفیسر نے سوال کیا کہ توحید میں اور سائنسی ترقیوں میں کیا تعلق ہے۔

میں نے کہا کہ توحید محض ایک رسمی عقیدہ نہیں، وہ ایک ذہنی و فکری انقلاب ہے، بلکہ سب سے بڑا فکری انقلاب ہے۔ اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ تمام علمی ترقیاں ذہنی انقلاب ہی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں۔ ذہنی انقلاب آدمی کی پوری شخصیت کو جگا دیتا ہے۔ اس کی تمام سوئی ہوئی صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں اور اسی کے نتیجہ کا نام علمی ترقی ہے۔ ہمارے اسلاف کے لیے توحید ایک عظیم ذہنی انقلاب تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اس قابل بنے کہ ہر قسم کی اعلیٰ ترین ترقیاں حاصل کریں۔ مسلمانوں کی موجودہ نسل کے لیے توحید محض ایک رسمی عقیدہ ہے اس لیے وہ جدید دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ بھی انجام نہ دے سکے۔

محاضرات کے علاوہ دعوت اور احوال مسلمین کے بارے میں مختلف تجویزیں پیش کی گئیں۔ مختلف ملکوں میں اسلامی دعوت کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔ اور اس کی روشنی میں پروگرام بنائے گیے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۸۶ کی نشست میں راقم الحروف کو صدر (رئیس الجلسہ) بنایا گیا۔ ایک عربی مجلہ نے میرا تفصیلی انٹرویو لیا جو اس کی کسی اگلی اشاعت میں شائع ہوگا۔ بعض اور جرائد انٹرویو

لینا چاہتے تھے، مگر میں اس کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ ٹیلی وژن پر مجھ سے انٹرویو دینے کے لیے کہا گیا، مگر میں ان کی اس فرمائش کو بھی پورا نہ کر سکا۔

مسائل کے مطالعہ میں ایک عام غلطی یہ کی جاتی ہے کہ حقیقی باتوں اور غیر حقیقی باتوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے نتیجہ میں پورا مطالعہ غلط ہو جاتا ہے۔ مثلاً نائجیریا کی خاتون (زینب) نے اپنی پرجوش انگریزی تقریر میں عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک پر سخت احتجاج کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے عورتوں کو گھر میں رکھنے کا ذکر کیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ عورتوں کا ختنہ کیا جاتا ہے جو عورتوں کے اوپر سراسر ظلم ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ گھر کا معاملہ عورتوں کے سپرد کرنا ایک صحیح اسلامی تعلیم ہے اور اس کی حکمت تقسیم کار ہے۔ جب کہ عورتوں کا ختنہ سراسر ایک جاہلانہ رواج ہے جو افریقہ کے بعض قبائل میں پایا جاتا ہے، مگر اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح ایک صاحب ساؤتھ افریقہ سے آئے تھے۔ انھوں نے حج کے "مراسم" پر تبصرہ کرنا شروع کیا۔ انھوں نے حج کے واقعی اور ثابت شدہ مراسم پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسی میں یہ بات بھی شامل کر دی کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حجر اسود پہلے سفید تھا۔ مگر وہ انسانوں کے گناہ سے کالا ہو گیا۔ مگر یہ دونوں باتیں ایک دوسرے مختلف ہیں۔ حج کے ثابت شدہ مراسم فی الواقع حج کے اجزا ہیں۔ جب کہ حجر اسود کا سفید سے کالا ہو جانا ایک بے بنیاد کہانی ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

میں ۱۹۵۷ سے ۱۹۶۳ تک جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک مجھے بہت سی جماعتوں اور تنظیموں کے اجلاس میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے مشترک طور پر ہر جگہ یہ بات پائی ہے کہ لوگ الفاظ پر اس قدر بحث کرتے ہیں جیسے کہ ان کے یہی الفاظ تاریخ بننے والے ہیں۔ جو لفظ وہ اجتماع گاہ میں کاغذ پر لکھ دیں گے وہی باہر کی دنیا میں پہونچ کر واقعہ بن جائیں گے۔

مثلاً اس موتمر کے آخری اجلاس میں ایک تجویز پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک شخص نے تجویز پیش کی کہ ایران۔عراق جنگ کے بارہ میں ایک تجویز پاس ہو اور اس کو دونوں ملکوں کے ذمہ داروں

کے نام روانہ کیا جائے۔ تجویز یہ تھی کہ دونوں ممالک شہروں میں جنگ کو بند کردیں۔ اس تجویز میں ابتدائ ایقاف الحرب فی المدن (شہروں میں جنگ نہ کرنے) کا لفظ تھا۔ دوسرے شخص نے پرجوش طور پر کہنا شروع کیا کہ نہیں، بلکہ ضرورت ہے کہ یہ جنگ مکمل طور پر بند ہو، اس لیے تجویز میں ایقاف الحرب نہائیاً کا لفظ لکھا جائے۔ اب اس پر بحث چل پڑی کہ یہ لفظ لکھا جائے کہ وہ لفظ لکھا جائے۔ اور کافی دیر تک اس پر تکرار ہوتی رہی۔

یہ طے شدہ ہے کہ اس تجویز کے نتیجہ میں نہ شہروں کی جنگ رکنے والی ہے اور نہ یہ ہونے والا ہے کہ اس کے ایران اور عراق پہونچتے ہی جنگ کا مکمل خاتمہ ہو جائے۔ اس قسم کے واقعات حقائق کے زور پر ایک یا دوسری صورت میں فیصل ہوتے ہیں نہ کہ الفاظ کے زور پر۔

سوڈان کے ایک عالم اسٹیج پر آئے۔ ان کو ایک محاضرہ پر اپنی رائے کا اظہار کرنا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس محاضرہ میں بہت سی غلطیاں کی گئی ہیں۔ میں ان کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔ مگر پروگرام کے مطابق چوں کہ بہت کم وقت دیا گیا ہے، اس لیے میں محاضر کو اس کی صرف ایک غلطی کی طرف متوجہ کروں گا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ محاضر نے اپنے لکچر میں قرآن کی آیت انی جاعل فی الارض خلیفۃ کا ذکر کیا ہے اور اس کی تشریح یہ کی ہے کہ قوم یخلف بعضھم بعضا۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ خلیفہ کا یہ مفہوم غریب مفہوم ہے۔ میں نے تفسیر کی جتنی کتابیں دیکھی ہیں ان میں سے کسی کتاب میں یہ معنی مذکور نہیں:

لم یرد ھذا المعنی فی ای کتاب من کتب التفسیر اطلعت علیہ

یہ اس بات کی ایک دلچسپ مثال ہے کہ اکثر لوگ اپنی بے خبری کو یقین کا قائم مقام بنالیتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ خلیفہ کا مذکورہ مفہوم واضح طور پر تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔

ترکی کے نمائندہ استاد اوغلو نے عربی زبان کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ اسلامی کانفرنسوں میں میں نے دیکھا ہے کہ عربی زبان کے بعد جو دوسری زبانیں استعمال ہوتی ہیں وہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں ہیں۔ میری تجویز ہے کہ اس صورت حال کو بدلا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مسلم نسلوں کو ترکی اور اردو زبانیں پڑھائی جائیں جو کروروں مسلمانوں کی زبانیں ہیں۔ اس طرح ترکی اور اردو دھیرے دھیرے عربی کے بعد استعمال ہونے والی زبانیں بن جائیں گی۔

بظاہر یہ ایک بہت اچھی تجویز معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ صرف ایک تمنا ہے جو عملاً ممکن نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مادری زبان کے بعد دوسری زبانیں جو آدمی سیکھتا ہے وہ ہمیشہ مادی عوامل کے تحت سیکھتا ہے۔ انگریزی یا فرانسیسی اسلامی کانفرنسوں کی سکنڈ لنگویج اس لیے بنی ہوئی ہے کہ لوگوں کے مادی مصالح انھیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان زبانوں کو سیکھیں۔ جب تک کوئی ایسا انقلاب نہ آئے جو ترکی اور اردو جیسی زبانوں کو وہی مقام دیدے جو انگریزی زبان کو یا فرانسیسی زبان کو عالمی سطح پر حاصل ہے، اس وقت تک اس قسم کی کسی تجویز کا واقعہ بننا ممکن نہیں۔

مفتی شام (حلب) نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں اپنے پچاس سال کے تجربات (بتجارب خمسین سنۃ) کی روشنی میں کہتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی تحریکوں کی ناکامی کی اصل وجہ اسلامی داعیوں کا عنف (شدت) ہے۔ انھوں نے ہر ملک میں غیر ضروری طور پر مسلم حکمرانوں سے ٹکراؤ کیا۔ اس کے نتیجہ میں اسلامی داعیوں اور مسلم حکمرانوں کے درمیان لامتناہی جنگ چھڑ گئی۔ اگر اسلامی داعیوں نے مسلم حکمرانوں سے ٹکراؤ کی پالیسی اختیار نہ کی ہوتی تو آج اسلامی دعوت کی تاریخ دوسری تاریخ ہوتی۔ یہی بات جمہوریہ یوگنڈا کے نائب صدر الحاج موسیٰ شکانگو نے دوسرے انداز سے کہی۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں اسلامی دعوت کو ترقی دینا ہے تو ہم کو کبھی بھی مذہب کے ساتھ سیاست کو نہیں ملانا چاہیے۔

دوسری مسلم کانفرنسوں کی طرح یہاں بھی میں نے کسی مقرر کی آواز میں درد کی جھلک نہیں پائی۔ اس میں میرے احساس کے مطابق صرف ایک استثنار تھا۔ اور وہ دکتور محمود ایوب (لبنان) کا تھا۔ وہ دونوں آنکھ سے محروم تھے اور سہارا دے کر اسٹیج پر لائے گیے تھے۔ اس نابینا مقرر کی آواز میں مجھے درد اور سوز محسوس ہوا مگر بینا مقررین میں سے کسی کی آواز میں میں نے درد اور سوز کی کیفیت نہیں پائی۔ یہ درد جو ایک شخص کے اندر حیاتیاتی صدمہ کے نتیجہ میں پیدا ہوا، کاش یہی درد امت کے رہنماؤں کے اندر امت پر گزرنے والے صدمہ کی بنا پر پیدا ہو جائے تو سارا نقشہ اپنے آپ بدل جائے۔

دکتور محمود ایوب (لبنان) نے عربی میں بولتے ہوئے ایک شخص کے سوال کا حوالہ

دیا جس نے انگریزی زبان میں اپنا سوال پیش کیا تھا، اور پھر اچانک وہ انگریزی میں بولنے لگے۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے لوگ ہیں جو بیک وقت کئی کئی زبانوں میں بول سکتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیسا عجیب وغریب دماغ دیا ہے۔ جس طرح ریڈیو میں ایک بٹن دبا کر آپ ایک زبان کی نشریات سنتے ہیں اور دوسرا بٹن دبائیں تو دوسری زبان کی نشریات آنے لگیں گی، اور تیسرا بٹن دبائیں تو تیسری زبان کی۔ یہی حال زیادہ عجیب تر شکل میں انسانی دماغ کا ہے۔ کیسا عظیم ہوگا وہ خالق جس نے ایسے انسانی دماغ کو بنایا۔

یہ سوچتے ہوئے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے کہا کہ خدایا، مجھے ان لوگوں میں لکھ لیجیے جنھوں نے آپ کی عظمت کا اعتراف کیا، اس وقت جب کہ انھوں نے اس کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا، اس وقت جب کہ وہ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور نہیں ہوئے تھے۔

ہر آدمی چیزوں کو اپنے اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال نائجیریا کی ایک مسلم خاتون (زینب) کی تقریر میں سامنے آئی۔ ان دنوں ٹیلی وزن پر عمر مختار کی مشہور فلم دکھائی گئی تھی۔ خاتون نے کہا کہ میں نے پچھلی رات کو ٹیلی وزن پر عمر مختار فلم دیکھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فلم نہایت شاندار ہے۔ مگر طویل فلم میں سارا کردار صرف مرد ادا کرتے ہیں۔ واحد موقع جب کہ اس فلم میں عورت کو دکھایا گیا ہے، وہ موقع وہ ہے جب کہ عمر مختار کی بیوی کو اطالویوں نے گھر سے نکال کر سولی پر چڑھا دیا۔

اس تاریخی فلم کا ایک حصہ راقم الحروف کے سامنے بھی گذرا تھا۔ خاتون کی بات بطور واقعہ درست ہے۔ تاہم میرے ذہن میں اس قسم کا خیال بھی نہیں آیا۔ مگر جب ایک آزادی پسند خاتون نے اس کو دیکھا تو اس کو پوری فلم میں سب سے زیادہ قابل لحاظ بات جو نظر آئی وہ یہ تھی کہ اس میں عورت کے کردار کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

فلم عمر مختار اور فلم گاندھی کا موضوع اس اعتبار سے مشترک ہے کہ دونوں ایک ایک ملک کی آزادی کی جدوجہد کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ مگر اس کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ "گاندھی" کے مقابلہ میں "عمر مختار" زیادہ عظیم ہے۔ اس کی وجہ فن کا فرق نہیں ہے۔ بلکہ خود کہانی کا فرق ہے۔ "گاندھی" ایک ایسے لیڈر کی کہانی کو مصور کرتی ہے جس نے "امن" کی طاقت سے ہندستان

کو آزاد کرایا۔ اس کے مقابلہ میں "عمر مختار" نے اطالویوں کا مقابلہ مسلح انداز سے کیا۔ گاندھی فلم میں اگر "پرامن مارچ" کے مناظر ہیں تو عمر مختار فلم میں دہشت اور خونخواری کے مناظر۔ یہی وہ فرق ہے جس نے "گاندھی" کے مقابلہ میں "عمر مختار" کو دیکھنے والوں کے لیے زیادہ پر شوکت بنا دیا ہے۔

آدمی خواہ بزدل ہو مگر وہ جنگ اور جہاد کی باتوں کو پسند کرتا ہے۔ "عمر مختار" میں اگرچہ فنی کمال بھی اپنے انتہائی درجہ پر ہے، تاہم اس میں اگر عمر مختار کی ماں یا ان کی بیوی کا وہ کردار دکھایا جاتا جب کہ انھوں نے گھر کو سنبھالا اور بچوں کی پرورش کی، تو اس قسم کے مناظر باعتبار حقیقت عظیم ہونے کے باوجود دیکھنے والوں کو عظیم نظر نہ آتے۔ مگر موجودہ شکل میں وہ مار دھاڑ کی ایک فلم ہے، اور اسی چیز نے اس کو عظیم بنا دیا ہے۔ جنگی مشینوں کی گڑگڑاہٹ گولوں کے دھماکے، آگ اور خون کے ہولناک مناظر، میدان جنگ کا پر ہول نقشہ، فتح و شکست کے جذباتی لمحات اس قسم کی چیزیں اس میں کمال درجہ میں موجود ہیں۔ اور یہی اس کی کامیابی کا اصل راز ہے۔

ایک عرب نوجوان جو برلن (جرمنی) سے آئے تھے، انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم بحیثیت مسلمان امن کو پسند کرتے ہیں۔ مگر ہم کسی کے آگے جھکنے کے لیے تیار نہیں:

اننا المسلمین نحب السلام ولکننا نرفض الاستسلام

بظاہر یہ ایک بڑی اچھی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ صرف ایک پرجوش کلمہ ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پرامن وہی شخص رہ سکتا ہے جو اپنے آپ کو رد عمل کی نفسیات سے بچائے۔ اس دنیا میں امن پسندی نام ہے بے امنی کے باوجود پرامن رہنے کا۔ مگر مذکورہ قسم کے پرجوش مقررین اس راز سے واقف نہیں۔

کانفرنس میں مختلف لوگوں نے اپنے اپنے ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت کے بارے میں کتابچے اور رپورٹیں تقسیم کیں۔ ان میں کافی معلومات اور تجربات درج تھے جن کی تفصیل سفرنامہ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

سرینام کے وفد نے تین صفحہ کی ایک رپورٹ تقسیم کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت

سرینام کی مجموعی آبادی میں بیس فی صد مسلمان ہیں۔ اور پورے ملک میں ایک سو سے زیادہ باقاعدہ مسجدیں موجود ہیں۔ رپورٹ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے :

> The immigration of Muslims in Surinam occurred in the 17th century when the African slaves were brought by the European slave traders to work in the fields. Many of these Africans were Muslims and when they arrived, they tried the utmost to keep their faith alive.

سرینام میں مسلمانوں کی مہاجرت ۱۷ ویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ جب کہ یورپ کے بردہ فروش افریقی غلاموں کو لے آئے تاکہ وہ یہاں کے کھیتوں میں کام کر سکیں۔ ان افریقیوں میں اکثر مسلمان تھے اور جب وہ یہاں آئے تو انھوں نے پوری کوشش کی کہ وہ اپنی دینی حیثیت کو باقی رکھ سکیں۔

یہ واقعہ جس کا ذکر یہاں سُرینام کے ذیل میں کیا گیا ہے، یہی موجودہ زمانہ میں تمام دنیا میں پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں جب مغربی قومیں ابھریں اور انھوں نے تمام دنیا کو زیر کر لیا تو وہ اپنے مقبوضہ ملکوں (ہندستان، افریقہ وغیرہ) سے لاکھوں انسانوں کو لے گیے تاکہ انھیں اپنے زیر قبضہ علاقوں میں بطور مزدور استعمال کر سکیں۔ اس طرح مسلمان اچانک ساری دنیا میں پھیل گیے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ساری دنیا میں آسٹریلیا سے لے کر باربیڈوز تک ہر جگہ مسلمانوں کی آبادیاں پائی جاتی ہیں۔

یہی واقعہ اس سے پہلے تاتاریوں کے زمانہ میں پیش آیا تھا۔ تاتاریوں نے فتح کے بعد کثیر تعداد میں مسلمان عورتوں اور مسلمان مردوں کو غلام بنایا۔ تاہم اس وقت لوگوں کے اندر اسلام زندہ تھا۔ یہ مسلمان مرد اور عورت جہاں پہونچے وہاں انھوں نے تاتاریوں کے درمیان خاموش تبلیغ شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو نسل کے اندر بیشتر تاتاری مسلمان ہو کر اسلام کے پاسبان بن گیے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں اگر دعوتی ذہن ہوتا تو وہی واقعہ دوبارہ نئی شکل میں پیش آتا جو تاتاریوں کے زمانے میں پیش آیا۔ جن مغربی قوموں کو اسلام دشمن قرار دے کر ہم ان کے خلاف بے معنی احتجاج میں مشغول ہیں، وہ قومیں آج اسلام کے دائرہ میں داخل ہو کر اسلام کی پاسبان بن چکی ہوتیں۔

۱۸ ستمبر کی شام کو ایک ہندستانی مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ لندن سے روانہ ہو کر یہاں پہونچے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ دہلی میں دوبارہ فساد ہو گیا ہے۔ اور اس فساد کا رخ مسلمانوں کی طرف ہے۔ اگرچہ بعد کی تحقیق نے بتایا کہ یہ خبر صحیح نہ تھی۔

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کا سارا غصہ ہمیشہ "فسادیوں" کے خلاف ہوتا ہے۔ مگر ذاتی طور پر میں ان فسادات کا ذمہ دار مسلمانوں کو سمجھتا ہوں۔ اس لیے میرے تمام احساسات کا رُخ صرف مسلمانوں کی طرف رہتا ہے۔ مجھے مسلمانوں کی حالت پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ حقائق کی دنیا میں حقائق سے بالکل بے پروا ہو کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

ان فسادات کی جڑ میرے نزدیک یہ ہے کہ مسلمانوں نے ملک کو تقسیم کرایا، مگر وہ تقسیم کے نتائج قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ملک کو "ہندو انڈیا" اور "مسلم انڈیا" میں تقسیم کرنے کا لازمی مطلب یہ تھا کہ مسلمان "ہندو انڈیا" میں اپنے لیے نمبر ۲ کی حیثیت قبول کرنے پر راضی ہیں۔ اگر مسلمانوں نے خود اپنے عمل کے اس نتیجہ کو ۱۹۴۷ کے بعد قبول کر لیا ہوتا تو حالات معمول پر آجاتے اور ملک کی تاریخ فرقہ وارانہ فساد کے بجائے فرقہ وارانہ تعمیر کی تاریخ ہوتی (واضح ہو کہ نمبر ۲ کی حیثیت کا مطلب مسلمانوں کا درجہ گرانا نہیں، بلکہ صرف حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرنا ہے)

مگر ملک کی جدید تاریخ کا یہ عجیب حادثہ ہے کہ پاکستان کے ایک کروڑ سے زیادہ ہندؤوں نے پاکستان میں اپنے لیے عین اسی حیثیت کو قبول کر لیا جو نئے حالات کا تقاضا تھا، حالاں کہ انھوں نے تقسیم کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ مگر ہندستان کے مسلمان ہندستان میں اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے، اگرچہ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے یک طرفہ طور پر تقسیم کی تحریک چلائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندستانی مسلمان تقسیم سے پہلے جن خود ساختہ مسائل سے دوچار تھے، تقسیم کے بعد بھی وہ انھیں خود ساختہ مسائل میں مبتلا ہیں۔ حقیقت واقعہ کا اعتراف اس دنیا میں آدمی کے لیے زندگی کے دروازے کھولتا ہے ــ ہندستانی مسلمان حقیقت واقعہ کے اعتراف کے لیے تیار نہیں، اس لیے زندگی کے دروازے بھی اب تک ان کے لیے نہیں کھلے۔

مسلمانوں نے اس ملک میں چالیس قیمتی سال کھو دیے ہیں۔ اگر وہ اپنے مزاج کو نہ بدلیں تو وہ اگلے چالیس سال بھی کھو دیں گے۔ موجودہ مزاج کے ساتھ مسلمانوں کے لیے اپنے مستقبل کی

کامیاب تعمیر ممکن نہیں ۔

بنگلہ دیش کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا : مسلم ممالک کا المیہ یہ ہے کہ اس وقت کسی بھی مسلم ملک میں کوئی طاقت ور قائد (ان کے الفاظ میں اسٹرانگ لیڈر) نہیں ۔ میں نے کہا کہ بنگلہ دیش کو تو شیخ مجیب الرحمٰن کی شکل میں ایک طاقت ور قائد حاصل تھا۔ پھر اس طاقتور قائد نے اپنے ملک کو کیا دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں. وہ طاقت ور قائد تھے مگر انھوں نے ملک کو برباد کیا ۔ میں نے کہا کہ اس سے معلوم ہوا کہ قومی تعمیر کے لیے صرف " طاقت ور قائد" کافی نہیں ۔ پھر میں نے کہا کہ آج اصل کمی قائدِ قوی کی نہیں، اصل کمی قائدِ حکیم کی ہے ۔ آج ہر مسلم ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جن کے پاس طاقت ہے، جن کے پاس وسائل ہیں ۔ مگر وہ چیز ان کے پاس نہیں جس کو دانش کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں دانش کی کمی نے مسلم ملکوں کو برباد کیا ہے نہ کہ طاقت کی کمی نے ۔

ایک بار کھانے کے وقت میری میز کے قریب چند باریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے ۔ ان کی اردو زبان اور موضوع گفت گو سے معلوم ہوا کہ وہ پاکستان سے آئے ہیں اور " دیوبندی مکتب فکر" سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک بزرگ نے پرجوش طور پر کہا کہ " ہندستان میں صرف ۱۷ دن کے اندر پچپن ہزار علمار شہید کر دیے گیے " میں نے پوچھا کہ حضرت، اسلام میں شہادت برائے شہادت ہے کہ شہادت کا کوئی مقصد ہے ۔ انھوں نے کہا کہ شہادت کا مقصد بالکل واضح ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیا ہے ۔ انھوں نے کہا : اعلار کلمۃ اللہ۔ میں نے کہا کہ دور اول میں ۵۵ سو سے بھی کم آدمیوں نے شہادت پائی اور اللہ کا کلمہ بلند ہو گیا۔ موجودہ زمانہ میں ۵۵ ہزار بزرگ شہید ہو گیے اور اب تک اللہ کا کلمہ بلند نہ ہو سکا ۔ اس پر وہ بگڑ گیے ۔ میں نے آگے کلام کو جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے اٹھ گیا ۔

پاکستان کی پوری آبادی ساڑھے نو کروڑ ہے۔ ان میں مہاجرین کی تعداد تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے۔ غیر مسلم ایک کرور اور کچھ لاکھ ہیں ۔ کراچی شہر کی آبادی ۷۰ لاکھ ہے۔ اس میں مہاجرین کی تعداد تقریباً ۴۰ لاکھ ہے ۔

ایک صاحب روانڈا (وسط افریقہ) سے آئے تھے ۔ انھوں نے بتایا کہ روانڈا میں مسلمان

تقریباً ۳ فی صد ہیں۔ اسلام وہاں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ہر روز کچھ نہ کچھ لوگ اسلام قبول کرتے ہیں۔ وہاں کی حکومت سیکولر ہے اور وہ مذہبی تبلیغ کی مکمل آزادی دیئے ہوئے ہے۔ البتہ اکثر افریقی ملکوں کی طرح وہاں بھی یہ مسئلہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی سماجی کام نہیں۔ وہاں کی مسیحی تنظیموں نے کثیر تعداد میں اسکول کالج اور اسپتال کھول رکھے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ نہریں نکالنے اور زراعت کو ترقی دینے میں عوام کی مدد کرتے ہیں۔ دوسری طرف مسلمان سماجی خدمات کے ان میدانوں میں بالکل صفر کے درجہ میں ہیں۔ مسلمانوں کی اس کمی کی وجہ سے ان کو عزت کا مرتبہ حاصل نہیں۔ ایک آدمی اگر کوئی کام نہ کرے تو وہ حقیر سمجھ لیا جاتا ہے:

اَلواحدُ اذا لَمْ یَعمَل یُحتَقَر

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو برطانیہ سے آئے تھے۔ وہ اصلاً ہندستانی ہیں اور برطانیہ میں ۲۰ سال سے کسی مسجد کے امام ہیں۔ انھوں نے کہا کہ برطانیہ کے مسلمان پہلے نہایت سکون کے ساتھ رہ رہے تھے۔ مگر جب سے وہاں علمارکرام پہونچے ہیں، مسلمانوں کے آپس کے دینی جھگڑے بہت بڑھ گیے ہیں۔ مسلمان گروہوں گروہوں میں بٹ گیے ہیں اور ہر گروہ دوسرے گروہ کی کاٹ میں لگا رہتا ہے اور یہ سب ہمارے علمار کرام کی دین ہے۔

انھوں نے اپنا قصہ بتایا کہ میری مسجد کے نمازیوں میں سے ایک پاکستانی نے میرے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ میں ہندستان کا ایجنٹ ہوں۔ وہ صاحب مسجد کمیٹی کے ممبر تھے۔ ایک بار انھوں نے کمیٹی کے اجلاس کا اعلان کر دیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس اجلاس میں میرے خلاف تجویز پاس کر کے مجھے مسجد کی امامت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے کمیٹی کے اجلاس کی براہ راست مخالفت نہیں کی۔ بس خاموشی کے ساتھ یہ کیا کہ کوشش کر کے اجلاس کی تاریخ آگے بڑھوادی تاکہ مجھ کو اجلاس سے پہلے ایک جمعہ مل جائے۔

کمیٹی کے ممبران میں پاکستانی افراد کی اکثریت تھی۔ جب کہ نمازیوں میں تقریباً ۵۰ فی صد ہندستانی تھے اور ۵۰ فی صد پاکستانی۔ جمعہ کے دن تمام لوگ جمع ہوئے تو میں نے مفصل تقریر کی اور اس تقریر میں ہندستانی مسلمانوں کی وہ قربانیاں بتائیں جو انھوں نے پاکستان کے قیام کے لیے کی ہیں اور آج بھی وہ اس کی قیمت دیئے چلے جا رہے ہیں۔ ان باتوں کا زبردست اثر ہوا اور

پوری فضا مذکورہ پاکستانی کے خلاف ہوگئی۔ نہ صرف یہ کہ میرے خلاف تجویز ختم ہوگئی بلکہ مذکورہ پاکستانی ممبر کو کمیٹی سے علٰحدہ کر دیا گیا۔

یہی حکمت مسائل کو حل کرنے کا واحد یقینی طریقہ ہے۔ مسئلہ خواہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو یا مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان، وہ حکمت ہی کے ذریعہ حل ہو سکتا ہے۔ غیر حکیمانہ طریقہ صرف مسئلہ کی شدت کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کو کم نہیں کرتا۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ زندگی کے اس راز کو لوگ صرف اپنے ذاتی معاملہ میں یاد رکھتے ہیں، وہ قومی معاملہ میں ہمیشہ اس کو بھول جاتے ہیں۔

جنوبی افریقہ کے ایک ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی۔ وہ جنوبی افریقہ کے شہری ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ جنوبی افریقہ کے بارہ میں اکثر ظلم وفساد کی خبریں دوسرے ملکوں کے اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ ان کو ہمارے وہ رشتہ دار پڑھتے ہیں جو یورپ اور امریکہ وغیرہ میں ہیں۔ وہ ہم کو لکھتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کے حالات اتنے خراب ہیں، وہاں جان ومال محفوظ نہیں، پھر آپ وہاں کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ جنوبی افریقہ کو چھوڑ کر ہمارے یہاں آجائیے۔ ہم ان کو جواب دیتے ہیں کہ جو کچھ اخباروں میں چھپتا ہے وہ اخباروں کی اپنی ایجاد ہے، ورنہ جنوبی افریقہ کے حالات ایسے نہیں۔ معمولی کھٹ پٹ ضرور ہوتی ہے تو معمولی کھٹ پٹ کہاں نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ظلم کے واقعات زیادہ تر ان لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جو حکمرانوں کے خلاف متشددانہ تحریک چلاتے ہیں، عام باشندوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

میں نے کہا کہ ٹھیک یہی ہندستان کا معاملہ بھی ہے۔ ہندستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ کہیں کوئی جھڑپ یا کھٹ پٹ ہوگئی تو باہر کے اخبار میں چھپتا ہے ——— "ہندستان میں فساد"۔ حالاں کہ جو واقعہ ہوتا ہے وہ بھی ہندستان کی لاکھوں بستیوں میں سے ایک بستی میں اور اکثر بستی کے ایک محلہ میں ہوتا ہے۔ اور اخبار والے اس کا عنوان بنادیتے ہیں "ہندستان میں فساد" اس کی وجہ سے لوگ غیر ضروری طور پر تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

واقعات کے مطالعہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک واقعہ کو اسی نوعیت کے دوسرے واقعات سے ملا کر دیکھا جائے۔ جو لوگ ہندستان میں مسلمانوں پر غیر مسلموں کے مظالم کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں

انھیں مسلم ملکوں میں مسلمانوں پر مسلمانوں کے مظالم کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ افریقہ کی کانفرنس میں سوڈان کے ایک اسلام پسند بزرگ نے جعفر نمیری کے مظالم بیان کیے اور اس کے لیے "شیطان" کا لفظ استعمال کیا۔ حالاں کہ وہاں ظالم اور مظلوم دونوں مسلمان ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ اور مسابقت کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک دوسرے کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ اس لیے یہاں شکایت اور احتجاج سے کوئی فائدہ نہیں۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ آدمی صورت حال کو سمجھے اور اس کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔

۲۱ ستمبر کی شام کو عربوں کی ایک مجلس کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ یہ تمام کے تمام عرب نوجوان تھے۔ میرے سوا وہاں کوئی ایک بھی اردو جاننے والا نہ تھا، اس لیے پوری تقریر عربی میں ہوئی اور تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی۔ ان لوگوں نے میری اس عربی تقریر کو دو کیسٹ پر ریکارڈ کیا۔

اس تقریر میں میں نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ ایمان ایک اکتشاف ہے۔ اسی اکتشاف سے وہ چیز ابھرتی ہے جس کو دعوت کہا جاتا ہے۔ عام مسلمانوں کے لیے تقلیدی ایمان بھی کافی ہو سکتا ہے مگر داعی وہی شخص بن سکتا ہے جس کو اکتشاف کے درجہ میں ایمان حاصل ہوا ہو۔

پھر میں نے موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کا ذکر کیا جو اسلامی انقلاب کے نام پر اٹھیں۔ میں نے مثالیں دے کر بتایا کہ یہ تمام تحریکیں ردعمل کی نفسیات کے تحت پیدا ہوئیں۔ ان تحریکوں کے قائدین نے دیکھا کہ غیر مسلم اقوام نے ان سے ان کی عظمت چھین لی ہے۔ اس احساس نے انھیں بھڑکایا اور وہ ان سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ حقیقی داعی وہ ہے جو احساس یافت پر اٹھے۔ مگر یہ لوگ احساس زیاں پر اٹھے۔ اس دنیا میں "زیاں" کو بھولنا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی آدمی کو "یافت" کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر ہمارے رہنما اس حوصلہ مندی کا ثبوت نہ دے سکے۔ اس لیے وہ احساس محرومی سے اوپر اٹھنے میں کامیاب بھی نہیں ہوئے۔

میری تقریر کا آخری خلاصہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم انقلاب برپا کیا جس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں۔ جب کہ موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین بے شمار قربانیوں کے باوجود کوئی انقلاب برپا نہ کر سکے۔ اس کا سبب در اصل وہ فرق ہے جو رسول اللہ اور ان مسلم مفکرین کے درمیان پایا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احساس یافت پر کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے

برعکس موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین احساس محرومی پر کھڑے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایمان ایک عظیم دریافت کے ہم معنی تھا۔ وہ ہر چیز سے زیادہ عظیم تھا۔ گویا کہ آپ لوگوں سے کہہ رہے تھے : اے لوگو، میرے پاس ایک بہت بڑی چیز ہے۔ میرے پاس آؤ تاکہ میں تم کو وہ چیز دوں۔ اس کے برعکس موجودہ مسلم مفکرین کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی بڑی چیز نہیں۔ گویا کہ وہ لوگوں سے کہہ رہے ہیں : اے لوگو، تم نے ہم سے تمام چیزیں چھین لی ہیں۔ تو تم چھینی ہوئی چیزوں کو ہمیں واپس کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت دینے والے کی تھی اور ہمارے رہنماؤں کی حیثیت مانگنے والوں کی۔ اس فرق کے بعد کیسے ممکن تھا کہ ان کے ذریعہ سے وہ چیز ظہور میں آئے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ظہور میں آئی :

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حقق ثورۃ عظیمۃ، لا نظیر لھا فی التاریخ الانسانی والمفکرون المسلمون المعاصرون عجزوا عن تحقیق ای ثورۃ ولو بعد بذلھم تضحیات عظیمۃ۔ والسبب یرجع الیٰ فرق جوھری بین عمل النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعمل ھؤلاء المفکرین۔ فالنبی قام عملہ علی احساس الوجدان، وھم قد قام عملھم علیٰ احساس الخسارۃ والفقدان۔ ان ایمان الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کان لہ کالکشاف عظیم، یفوق کل شیٔ۔ فکانہ کان فی دعوتہ یقول: ایھا الناس، عندی شیٔ عظیم۔ تعالوا اِلیّ فانا اعطیکم منہ۔ وھؤلاء المفکرون لیس عندھم ای شیٔ۔ وکانھم یقولون۔ ایھا الناس، انکم سلبتم منا کل شیٔ فردّوا علینا الاشیاء التی سلبتموھا منا۔ فالرسول صلی اللہ علیہ وسلم کان کالواھب او کالعاطی وھم کالسائلین۔ فکیف یتأتی لھم ان یحققوا ما حققہ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

واپسی میں عجیب قصہ پیش آیا۔ کراچی سے ۲۳ ستمبر کی شام کو دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ کراچی سے دہلی کا سفر ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ جہاز معمول کے مطابق ۱۰ ہزار میٹر کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ "کرسی کی پیٹی باندھ لیں" کی علامت روشن ہوئی۔ بظاہر اس کا مطلب یہ تھا کہ اب دہلی قریب آگیا ہے۔ مگر کچھ دیر کے بعد روشنیاں بجھ گئیں۔ اور جہاز بدستور اڑتا رہا، یہاں تک کہ پرواز کی حالت میں دو گھنٹے سے زیادہ گزر گیے۔ ہم اسی تشویش میں مبتلا تھے کہ جہاز کے

ذمہ داروں کی طرف سے اعلان ہوا کہ خراب موسم کی وجہ سے ہم دہلی کے ایر پورٹ پر نہ اتر سکیں گے، اور اب ہم دوبارہ کراچی واپس جا رہے ہیں۔

تقریباً تین گھنٹے فضا میں رہنے کے بعد جہاز دوبارہ کراچی کے ایر پورٹ پر اتر گیا۔ تمام مسافر لاونج میں بیٹھا دیئے گئے۔ کئی گھنٹے تک انتظار کی غیر یقینی حالت طاری رہی۔ اس کے بعد اعلان ہوا کہ جہاز دوبارہ دہلی کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ تمام مسافر دوبارہ جہاز پر سوار ہوئے۔ مقررہ وقت کے مطابق ہم ۵ بجے شام کو دہلی پہونچ جاتے۔ مگر اس افتاد کی وجہ سے ہم رات کو ۱۲ بجے دہلی پہونچے ــــــ جن ہوائی "حادثات" کا ذکر اس سے پہلے اخباروں میں پڑھا تھا وہ اس سفر میں کم از کم جزئی طور پر میرے ساتھ بھی پیش آ گیا۔

۲۳ ستمبر کو پی آئی اے کا جہاز جب درمیان سے واپس ہوا تو اس کو دوبارہ کراچی ایر پورٹ پر اترنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ کیوں کہ وہ خود اپنے ملک میں اپنے ایر پورٹ پر اتر رہا تھا۔ مگر اس سے پہلے ۱۴ ستمبر کو جب ہمارے جہاز کا ایک انجن فیل ہو گیا تھا اور پائلٹ مجبور ہو گیا تھا کہ وہ اس کو زمین پر اتارے تو اس نے فضا سے وائرلیس کے ذریعہ قریب کے کئی ہوائی اڈوں سے رابطہ قائم کیا۔ مگر ہر ہوائی اڈہ اس کو اترنے کی اجازت دینے سے انکار کرتا رہا۔

آخر میں اس نے عمان ایر پورٹ سے بات کی۔ اس نے بھی ابتداءً انکار کیا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک پائلٹ اور عمان ایر پورٹ کے ذمہ داروں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔ پائلٹ نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت جہاز پر ۲۰۰ مسافر ہیں۔ آخر میں کیسے ایسا کروں گا کہ ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دوں کہ وہ کسی کھڈ میں جا کر گر جائیں۔ اس گفتگو کے درمیان آدھ گھنٹہ تک جہاز عمان کے چاروں طرف اڑتا رہا۔ آخر کافی کہنے سننے کے بعد عمان ایر پورٹ نے اجازت دی۔ جب ہمارا جہاز ڈگمگاتے ہوئے عمان ایر پورٹ پر اترا تو وہاں مسلح پولیس پورے ایر پورٹ کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی۔

اس غیر معمولی سلوک کی وجہ فضائی قزاقی ہے۔ ایسی صورت حال میں ایر پورٹ والے پہلا شبہ یہ کرتے ہیں کہ فضائی قزاقوں نے جہاز کو اپنے قبضہ میں لے لیا ہے اور اس کو کسی

غیر متعلق ایرپورٹ پر اترنے کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔ جب فضائی قذافوں کو ایسا کرنا ہوتا ہے تو وہ جہاز کے پائلٹ کو ہدایت کر دیتے ہیں کہ تم ہمارا نام ہرگز نہ لو، بلکہ یہ کہو کہ انجن کی خرابی یا کسی ٹکنکل سبب سے ہم جہاز کو اتارنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایرپورٹ نے ہمارے پائلٹ کے بیان پر یقین نہیں کیا اور اس کو اترنے کی اجازت دینے میں دیر لگائی۔

یہاں بظاہر مجھ کو ہر طرح کا آرام حاصل تھا۔ مادی اعتبار سے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مگر میری روح ہر وقت تڑپتی رہتی تھی۔ اصل یہ ہے کہ دہلی میں اپنے روزمرہ کے کام کے ساتھ میں اتنا زیادہ وابستہ ہو گیا ہوں کہ اس سے باہر نکلتے ہی میرا سکون بالکل چھن جاتا ہے۔ میرا حال اس مچھلی کا سا ہو جاتا ہے جس کو پانی سے نکال کر خشکی میں ڈال دیا گیا ہو۔ چنانچہ بارہ دن کے اس سفر میں شاید ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا جب کہ میں نے اپنے اندر سکون و اطمینان محسوس کیا ہو۔ اس پوری مدت میں مسلسل میں شدید کرب میں مبتلا رہا۔ یہ کرب صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ میں ۲۴ ستمبر ۱۹۸۶ کو اپنے دہلی کے ماحول میں دوبارہ واپس آ گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے سب سے بڑی چیز نفسیاتی سکون ہے نہ کہ مادی راحت۔ اگر آدمی نفسیاتی بے چینی میں مبتلا ہو تو مادی راحت کے سامانوں کے انبار کے درمیان بھی وہ اس طرح تڑپے گا جیسے وہ آگ کے انگاروں کے اوپر ڈال دیا گیا ہے ـــــ نفسیاتی بے آرامی ہر مادی آرام کو بے معنی بنا دیتی ہے۔

تعمیرِ ملّت

مکان بنانے کا کام بنیاد سے شروع ہوتا ہے

اور

قوم بنانے کا کام شعور بنانے سے۔

ماہنامہ الرسالہ قوم کی تعمیر کا یہی بنیادی کام کر رہا ہے۔

وہ افرادِ قوم کا شعور بنانے میں مصروف ہے۔

اس مہم میں ساتھ دینا ایک تاریخ ساز مہم میں ساتھ دینا ہے۔

الرسالہ کو پڑھیے

الرسالہ کو پڑھائیے

اس وقت یہی سب سے بڑا کام ہے جس میں آپ کو لگنا چاہیے۔

یہی آج کی سب سے بڑی مہم ہے جس میں آپ کو ساتھ دینا چاہیے۔

قوم کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کیجئے

دین سے دور

حدیثوں اور آیتوں سے واضح طور پر ثابت ہے کہ مسلمانوں کے لیے نجات اور کامیابی کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ رسول اور اصحاب رسول کے طریقہ پر چلیں۔ رسول نے اپنے عمل سے جو سنت چھوڑی ہے اور آپ کے اصحاب نے جس طرح اس کو اپنی زندگیوں میں اختیار کیا ہے وہی تمام مسلمانوں کے لیے واحد نمونہ ہے جس کو انھیں اختیار کرنا ہے۔ اس طریقہ میں خود سے کوئی اضافہ کرنا سراسر بدعت ہے۔ اور بدعت اللہ کے نزدیک جرم ہے۔

سنت کے طریقہ کو چھوڑنے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ سنت کے کچھ جزئی اور بے ضرر پہلوؤں کو لے لیا جائے اور سنت کے زیادہ اہم پہلوؤں کو چھوڑ دیا جائے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ جزئی اور ظاہری پہلوؤں کو اختیار کرنے سے ان کی زندگی پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ جب کہ سنت کے اہم پہلو آدمی سے اس کی زندگی میں تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ اس کی زندگی کے اس پورے ڈھانچہ کو بدل دینا چاہتے ہیں جو اس نے اپنی خواہشات اور مفادات کے تحت قائم کر رکھا ہے۔

یہی صورت حال بہت بڑے پیمانہ پر یہودیوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ جس کی اصلاح کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام ان کی طرف بھیجے گئے۔ حضرت مسیح نے اپنی ایک تقریر (متی ۲۳: ۲۳ — ۲۸) میں ان کو ان سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی:

"اے ریا کار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو دہ یکی دیتے ہو۔ پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو، جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہوئے ہیں۔ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔

خبرنامہ اسلامی مرکز۔ ۳۰

۱۔ ۷ مارچ ۱۹۸۷ کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں علاقہ کے تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کا تعارف کرایا۔ یہ تقریر ٹیپ پر ریکارڈ کرلی گئی ہے۔

۲۔ ۱۲ مارچ ۱۹۸۷ کو صدر اسلامی مرکز نے نئی دہلی کے ایک اجتماع سے مختصر خطاب کیا۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ملا جلا اجتماع تھا۔ خطاب کا موضوع یہ تھا کہ قرآن کو کس طرح سمجھا جائے۔ اور اس کی صحیح تفسیر تک کس طرح پہونچا جائے۔

۳۔ ۱۵ مارچ ۱۹۸۷ کو اسلامک اویکننگ سنٹر (اوکھلا، نئی دہلی) میں صدر اسلامی مرکز نے طلبہ اور اساتذہ کے ایک اجتماع سے خطاب کیا۔ اس خطاب میں بتایا گیا کہ علم کی اہمیت اسلام میں کتنی زیادہ ہے۔ اس سلسلہ میں سیرت کے بعض واقعات کی تشریح کی گئی۔

۴۔ ۲۱۔ ۲۲ مارچ ۱۹۸۷ کو مراد آباد میں حلقۃ الرسالہ کی طرف سے اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کے پروگراموں میں شرکت کی۔ ملاقاتوں کے علاوہ دو پروگرام میں وہاں ان کی تقریر ہوئی۔ تقریر کا موضوع یہ تھا کہ موجودہ حالات میں اسلام کا احیاء کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اس سفر کے بعد مراد آباد میں باقاعدہ مرکز کی شاخ کا قیام عمل میں آگیا ہے۔

۵۔ ۲۲ مارچ ۱۹۸۷ کی شام کو ذاکر باغ (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا: مسلمانوں کے مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں۔ جناب شیخ عبد اللہ صاحب (آئی اے ایس) نے اس اجتماع کی صدارت کی اور جناب ڈاکٹر محسن عثمانی صاحب نے افتتاحی تقریر کی۔

۶۔ پاکستان کے انگریزی اخبار فرنٹیر پوسٹ (پشاور) نے اپنے شمارہ ۷ مارچ ۱۹۸۷ میں الرسالہ کا ایک مضمون شائع کیا ہے اور اس کا عنوان حسب ذیل الفاظ میں قائم کیا ہے:

A religious scholar's view

اس طرح الرسالہ کے مضامین کثرت سے اخبارات و رسائل میں نقل کیے جا رہے ہیں اور

بالواسطہ انداز میں اسلامی مرکز کے پیغام کو پھیلانے کا ذریعہ بن رہے ہیں ۔

۷۔ پچھلے دنوں ملک کے مختلف مقامات پر ہونے والے اجتماعی مواقع پر اسلامی مرکز کی مطبوعات کا اسٹال لگایا گیا۔ خدا کے فضل سے قابلِ لحاظ کامیابی حاصل ہوئی ۔ چند مقامات کے نام یہ ہیں :

بھوپال کے تبلیغی اجتماع میں	۲۰ — ۲۲ دسمبر ۱۹۸۶
اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن ، بنگلور	۲۶ — ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶
نیشنل بک فیئر ، تریوندرم	۱۰ — ۲۰ جنوری ۱۹۸۷
نیشنل بک فیئر ، کلکتہ	یکم — ۱۰ فروری ۱۹۸۷

ان مواقع پر کافی بڑی تعداد میں لوگ بک اسٹال پر آئے اور معلومات اور کتابیں حاصل کیں ۔ کلکتہ کے اسٹال پر آنے والوں میں مسٹر ایم جے اکبر (ڈیلی ٹیلی گراف) اور نوبل انعام یافتہ انگریز ولیم گولڈنگ (Dr William Golding) بھی تھے ۔ ان لوگوں کو انگریزی کتابیں ہدیۃً پیش کی گئیں ۔

۸۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ نہایت توجہ کے ساتھ الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہے اور اس سے دینی تاثر قبول کر رہا ہے ۔ اس سلسلہ میں ایک خط (۱۶ مارچ ۱۹۸۷) کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :

Since I became a regular subscriber of your esteemed monthly journal Al-Risala, I am studying it regularly and finding it very absorbing, thought-provoking, analytical and enlightening. Your effort is highly praiseworthy and deserves the support from every nook and corner of our society.

Syed Shafiuddin, E-64, Foch Square, New Delhi 110001

۹ علمی اداروں میں الرسالہ جس نظر سے دیکھا جا رہا ہے اس کا اندازہ خطوط سے ہوتا رہتا ہے ۔ یہاں ادارہ معارف اسلامی (منصورہ ، لاہور) کا خط مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۸۶ نقل کیا جاتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : آپ کی طرف سے ہمیں ماہنامہ "الرسالہ" تقریباً موصول ہوتا رہتا ہے اس میں عصر حاضر کے مسائل کو بڑی تفصیل اور حکمت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے ۔ اس لیے الرسالہ ہمارے علمی و تحقیقی کام میں بہت مفید ثابت ہوتا ہے ۔ لیکن اس سال کے پرچے

جو نہیں موصول ہو سکے، مہربانی فرماکر ارسال کر دیں اس میں ہمیں مارچ، جون، اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۸۶ ء کے پرچے موصول نہ ہو سکے۔ ہمیں سال کے آخر میں فائل کو مکمل کرکے اس کی جلد بندی کرانی ہوتی ہے۔ آپ مہربانی فرماکر تعاون فرمائیں۔ ہم بے حد ممنون ہوں گے۔

۱۰۔ مرکز کی نئی کتاب "خاتون اسلام" کے بارہ میں قارئین کی طرف سے نہایت اعلیٰ رائیں موصول ہو رہی ہیں۔ ایک صاحب بمبئی سے اپنے خط (۳۱ مارچ ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں: خاتونِ اسلام پڑھ رہا ہوں۔ میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ آپ کی یہ کتاب اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے۔ نہایت موثر اور مدلل۔ میرے خیال میں اس کی انگریزی زبان میں اشاعت بہت ضروری ہے (ندیم صدیقی)

۱۱۔ مرکز کی ڈاک میں برابر ایسے خطوط آرہے ہیں جن میں یہ درخواست شامل ہوتی ہے کہ انھیں مرکز کی کتابوں کو دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ مثلاً بنگلہ، ملیالم، پشتو، سندھی، وغیرہ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرکز کی دعوت خدا کے فضل سے نہایت تیزی کے ساتھ دوسرے لسانی علاقوں میں پھیل رہی ہے۔

۱۲۔ ایک صاحب مرکز کی مطبوعات اور الرسالہ کے بارہ میں خط ۱۶ مارچ میں تحریر کرتے ہیں:

> 'Some books are,' to quote Bacon, 'to be tasted, others to be swallowed, and some few to be chewed and digested.' Your magnum opus 'Muhammad: The Prophet of Revolution' and other thought-provoking publications belong to the last category. I relish to read regularly your prestigious periodical (Al-Risala) which is like a lodestar on the otherwise murky horizon of intellectual bankruptcy.
> *Tariq A. Shah, 35 New Colony, Sopore 193201*

۱۳۔ ایک صاحب نوادہ (بہار) سے اپنے خط میں لکھتے ہیں: الرسالہ کے واسطے سے آپ سے رابطہ قائم ہے اور تا زندگی قائم رہے گا، انشاء اللہ۔ ایک آدمی بہت ساری کتابیں مطالعہ کرے، مختلف زبانوں اور مختلف موضوعات پر کتابیں۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ اور ہو بھی تو چھان پھٹک کر کام کی باتیں اخذ کرنے کا سلیقہ جو خدا داد ہوتا ہے وہ بھی تو ہونا چاہیے۔ دین بھی سنورے اور زندگی بھی۔ الرسالہ اسی کا بہترین حل ہے (نذیر الحق)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۷ — جون ۱۹۸۷

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

تکبیرِ رب

قرآن میں مویشیوں کا اور قربانی کے اونٹوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ ان جانوروں کو خدا نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ اللہ کی ہدایت پر تم اس کی بڑائی کرو (کَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ، الحج ۳۷)

انسان بھیڑیئے اور ریچھ کو اپنا خدمت گار نہیں بنا سکتا۔ مگر بیل اور اونٹ سے وہ مختلف قسم کی خدمت لیتا ہے۔ یہ تسخیر کی بنا پر ممکن ہوا ہے۔ جن جانوروں کو مویشی کہا جاتا ہے، ان کے اندر جبلی طور پر یہ مزاج ہے کہ وہ انسان کے تابع بن جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مویشیوں سے کام لینا بھی اتنا ہی دشوار ہوتا جتنا وحشی جانوروں سے کام لینا دشوار ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی اللہ کے اس تخلیقی کرشمہ کو جانے اور اس پر شکر گزاری سے اس کا دل لبریز ہو جائے۔ اللہ کا ایک بندہ جب اللہ کے نام پر جانور کی قربانی کرتا ہے تو یہ گویا اس کے دل کی کیفیت کا ایک خارجی اظہار ہوتا ہے۔ وہ گویا عمل کی زبان میں کہتا ہے کہ خدایا، تو نے اگر ان حیوانات کو ایسا نہ بنایا ہوتا تو میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں ان کو اپنے لیے مسخر کر سکوں۔

یہی معاملہ موجودہ دنیا کی تمام چیزوں کا ہے۔ ہر چیز انسان کے لیے خدا کی نعمت ہے۔ ہر چیز اسی وجہ سے انسان کے لیے قابلِ استعمال ہے کہ وہ انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ ہر چیز کا تقاضا ہے کہ اس کو دیکھ کر انسان کے اندر خدا کی عظمت کا احساس جاگ اٹھے۔ اس کا سینہ خدا کی بڑائی کے جذبے سے سرشار ہو جائے۔ یہی تکبیرِ رب ہے۔ تکبیرِ رب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک نفسیاتی فعل ہے۔ اسی معنی میں ارشاد ہوا ہے کہ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (المدثر ۳) اور وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا (الاسراء ۱۱۱)

تکبیرِ رب دراصل معرفت کا ایک بھونچال ہے جو مومن کے اندرونی وجود میں برپا ہوتا ہے۔ یہ ایک شخصیت کا عرفانِ خداوندی سے پھٹ پڑنا ہے، اور اللہ اکبر کا کلمہ اسی پھٹ پڑنے کا ایک لفظی اظہار۔

تخلیقیت

موجودہ دنیا مختلف قسم کے اسباب اور احوال سے بھری ہوئی ہے۔ یہ اسباب او احوال ہم سے الگ اپنا وجود رکھتے ہیں اور آپ اپنے زور پر قائم ہیں۔ ہم ان سے ہم آہنگ کرکے اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں، ان کو نظر انداز کرکے منزلِ مقصود تک پہونچنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

اس صورت حال کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا یہ ہے کہ آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ پیش آمدہ حالات کے اعتبار سے پورے معاملہ پر از سرِ نو غور کر سکے۔ وہ مسئلہ کا نیا حل دریافت کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اسی معنی میں ایک فرانسیسی مفکر (Emile Chartier) نے کہا ہے کہ کوئی چیز اس سے زیادہ خطرناک نہیں کہ آدمی اپنے پاس صرف ایک ہی تصور رکھتا ہو:

Nothing is more dangerous than an idea
when it is the only one we have.

اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کے حل کے لیے ہماری ابتدائی تدبیر غیر موثر ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ ہم اپنی سابقہ سوچ کے دائرہ سے نکل کر کوئی نئی تدبیر اختیار کر سکیں۔ اسی صلاحیت کا نام تخلیقیت (Creativity) ہے۔ اور اسی تخلیقی صلاحیت میں آدمی کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس اصول کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر آپ دشمنوں سے لڑے۔ مگر غزوۂ احزاب کے موقع پر آپ نے اپنے اور دشمن کے درمیان خندق کی رکاوٹ قائم کر دی۔ غزوۂ احد میں آپ نے اپنے مخالفین سے باقاعدہ جنگ کی اور حدیبیہ کے موقع پر جنگ کیے بغیر واپس چلے آئے۔ غزوۂ حمراء الاسد میں آپ نے اعلان و اظہار کے ساتھ مارچ کیا اور فتح مکہ کے سفر میں مکمل خاموشی کا طریقہ اختیار فرمایا، وغیرہ۔

دوسرا موقع

ریڈرز ڈائجسٹ فروری ۱۹۸۷ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے، اس کا عنوان ہے :

Dare to Change Your Life

اپنی زندگی کو بدلنے کی جرأت کرو) اس مضمون میں کئی ایسے واقعات دیے گیے ہیں جن
میں ایک شخص کو ابتداءً ناکامی پیش آئی۔ وہ نقصانات اور مشکلات سے دوچار ہوا۔ مگر
اس نے حوصلہ نہیں کھویا۔ ایک موقع کو کھونے کے باوجود اس کی نظر دوسرے موقع پر لگی
رہی۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ ایک بار ناکام ہو کر اس نے دوسری بار کامیابی حاصل کرلی۔

مضمون کے آخر میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ زندگی دوسرے مواقع سے بھری ہوئی ہے۔ دوسرے موقع کو استعمال کرنے کے لیے جو کچھ درکار ہے وہ صرف یہ صلاحیت ہے کہ آدمی اس کو پہچانے اور حوصلہ مندانہ طور پر اس پر عمل کرے :

Life is full of second chances. All we need for a second chance is the ability to recognize it and the courage to act.

زندگی سکنڈ چانس (دوسرے موقع) کو استعمال کرنے کا نام ہے —— یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو فرد کے لیے بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی قوم کے لیے۔ پوری تاریخ اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ دور اول میں اسلام کو مکہ میں موقع نہ مل سکا۔ اس کے بعد اسلام نے مدینہ کے موقع کو استعمال کر کے اپنی تاریخ بنائی۔ مغربی قومیں صلیبی جنگوں میں اپنے لیے موقع نہ پا سکیں تو انھوں نے علمی مواقع کو استعمال کر کے دوبارہ کامیابی کا مقام حاصل کیا، وغیرہ۔

موجودہ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی پہلے موقع کو کھو دیتا ہے۔ کبھی اپنے ناقص تجربہ کی وجہ سے اور کبھی دوسروں کی سرکشی کی وجہ سے۔ مگر پہلے موقع کو کھونے کا مطلب ایک موقع کو کھونا ہے نہ کہ سارے مواقع کو کھونا۔ پہلا موقع کھونے کے بعد اگر آدمی مایوس نہ ہو تو جلد ہی وہ دوسرا موقع پا لے گا جس کو استعمال کر کے وہ دوبارہ اپنی منزل پر پہونچ جائے۔

الرسالہ جون ۱۹۸۷

دریافت

دریافت ایک انسانی کمال ہے۔ نئی چیز کی دریافت کسی آدمی کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں ایسے لوگوں کو خصوصی عزت اور احترام حاصل ہوا ہے جنھوں نے انسانی علم میں کسی نئی چیز کا اضافہ کیا ہو۔

دریافت کیا ہے اور کوئی شخص کس طرح ایک دریافت تک پہونچتا ہے، اس کے بارہ میں البرٹ زنٹ گیورگی (Albert Szent-Gyorgyi) کا ایک قول نہایت بامعنی ہے۔ اس کو طبیعیات میں ایک نئی چیز دریافت کرنے پر نوبیل انعام ملا تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ دریافت یہ ہے کہ آدمی اس چیز کو دیکھے جس کو ہر ایک نے دیکھا ہے مگر اس سے وہ ایک ایسے خیال تک پہونچ جائے جس کو کسی نے نہیں سوچا تھا:

Discovery consists of seeing what everybody has seen and thinking what nobody has thought.

دریافت کی اس تشریح کی ایک مشہور مثال نیوٹن کا واقعہ ہے۔ نیوٹن نے سیب کے درخت سے سیب کا ایک پھل نیچے گرتے ہوئے دیکھا۔ پھل کا درخت سے گرنا ایک انتہائی عام واقعہ ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے اور ہر شخص نے اس کو دیکھا ہے۔ مگر نیوٹن نے جب اس واقعہ کو گہری نظر سے دیکھا تو اس کو اسی معمولی واقعہ میں ایک غیر معمولی چیز مل گئی۔ یعنی کشش ثقل کے قوانین (Laws of gravity) ۔ وہ چیز جس کو ہر ایک نے دیکھا تھا اس میں اس نے وہ چیز پالی جو کسی نے نہیں پایا تھا۔

یہی دریافت تمام اعلیٰ کامیابیوں کا خزانہ ہے۔ وہی شخص بڑی ترقی تک پہونچتا ہے جو کوئی نئی چیز دریافت کرے۔ وہی قوم دوسروں کے مقابلہ میں برتر مقام حاصل کرتی ہے جو دوسروں کے مقابلہ میں کوئی نئی تدبیر ایجاد کر سکے۔ جو لوگ اس تخلیقی صلاحیت کا ثبوت نہ دیں وہ صرف پچھلی صف میں جگہ پاتے ہیں، وہ کبھی اگلی صف میں جگہ پانے والے نہیں بنتے۔

امکان ختم نہیں ہوتا

ایک امریکی نوجوان ڈیوٹ ویلس (DeWitt Wallace) نے ارادہ کیا کہ وہ ایک ماہانہ ڈائجسٹ نکالے۔ اپنے والد سے اس نے ابتدائی سرمایہ کے طور پر ۳۰۰ ڈالر مانگا۔ مگر والد نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ڈیوٹ پیسہ کو استعمال کرنا نہیں جانتا، وہ اسے ضائع کر دے گا۔ بمشکل اس نے اپنے بھائی سے کچھ رقم حاصل کی اور جنوری ۱۹۲۰ میں نمونہ کا شمارہ چھاپا جو چند سو نسخوں سے زیادہ نہ تھا۔

اب ڈیوٹ کے سامنے دوسرا مسئلہ تھا۔ اس نے اپنا میگزین نیویارک کے پبلشنگ اداروں کو دکھایا اور کہا کہ اس کو فروخت کرنے میں وہ اس کا تعاون کریں۔ مگر تمام اداروں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ میگزین بہت زیادہ سنجیدہ (Too serious) ہے اور اتنے زیادہ سنجیدہ پرچہ کے لیے مارکیٹ موجود نہیں۔

یہ بڑا نازک مسئلہ تھا۔ کیوں کہ اخبارات ورسائل پبلشنگ اداروں ہی کے ذریعہ عوام تک پہونچتے ہیں۔ اور پبلشنگ اداروں نے ڈیوٹ کو تعاون دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم ایک امکان بدستور ابھی ڈیوٹ کے لیے باقی تھا۔ وہ یہ کہ وہ خریداروں تک براہِ راست پہونچے۔ اس نے بہت سے پتے حاصل کر کے لوگوں کو براہ راست خطوط لکھے۔ اسی کے ساتھ اس نے اخبارات میں اشتہار شائع کیا۔ عام حالات میں ایک نئے اور غیر معروف میگزین کے لیے اس طرح خریدار حاصل کرنا بظاہر ناممکن تھا۔ مگر ڈیوٹ کی ایک تدبیر نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ اس نے اپنے خطوط اور اپنے اشتہارات میں جو باتیں لکھیں۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی:

The subscription could be cancelled and all money refunded if the reader wasn't satisfied (p. 163).

قاری اگر میگزین کو پڑھنے کے بعد اس سے مطمئن نہ ہو تو خریداری ختم کر دی جائے گی اور اس کی پوری رقم اسے واپس کر دی جائے گی۔

اس پیش کش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیوٹ کے پاس خریداری کی فرمائش اور منی آرڈر آنا شروع ہو گیے۔ پہلے ہی مرحلہ میں اس نے اتنی رقم حاصل کر لی جس سے دو ماہ کا شمارہ بہ آسانی چھاپا جا سکے۔

ڈیوٹ کا منصوبہ کامیاب رہا۔ کسی ایک شخص نے بھی اپنی خریداری ختم نہیں کی۔ کسی نے بھی رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس نے عام خریداروں تک پہونچنے کی کوشش کو تیز تر کر دیا۔ فروری ۱۹۲۲ میں اس کا میگزین پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ برابر بڑھتا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۸۷ میں وہ ۲۸ ملین سے زیادہ تعداد میں دنیا کی پندرہ زبانوں میں ۳۹ اڈیشن شائع کر رہا ہے۔ یہ وہی ماہانہ میگزین ہے جو آج ساری دنیا میں ریڈرز ڈائجسٹ (Reader's Digest) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اب وہ دنیا کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا میگزین بن چکا ہے۔ ۱۹۸۰ میں ڈیوٹ اور اس کی بیوی پچاس ہزار ملین ڈالر کے مالک تھے۔

ڈیوٹ نے اپنے میگزین کے لیے اس طرح خریدار فراہم کیے کہ اس نے اپنے میگزین کو خریداروں کے لیے "مفت" بنا دیا۔ ہر آدمی پیسہ ڈوب جانے کے اندیشہ کے بغیر اس کا خریدار بن سکتا تھا۔ تاہم خود اس تدبیر کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے ایک اور تدبیر ضروری تھی۔ اگر یہ دوسری تدبیر موجود نہ ہوتی تو صرف پہلی تدبیر اس کی ناکامی میں اضافہ کے سوا اسے کچھ اور دینے والی ثابت نہ ہوتی۔

یہ دوسری تدبیر وہی تھی جس کو اعلیٰ معیار کہا جاتا ہے۔ یعنی میگزین کو معیار کے اعتبار سے ایسا بنا دینا کہ پڑھنے کے بعد قاری کو وہ واقعۃً پڑھنے کی چیز نظر آئے۔ وہ اس کو دیکھنے کے بعد یہ سمجھے کہ اس کی خریداری کے لیے جو رقم اس نے بھیجی ہے وہ صحیح بھیجی ہے، اور اس کو اپنی خریداری جاری رکھنا چاہیے۔

اپنے میگزین میں یہ دوسری صفت پیدا کرنے کے لیے ڈیوٹ کو غیر معمولی محنت کرنی پڑی۔ اس کا ماہنامہ ایک ڈائجسٹ تھا۔ یعنی مختلف مطبوعہ مضامین کا انتخاب۔ ڈیوٹ یہ منتخب مضامین حاصل کرنے کے لیے روزانہ چالیس سے زیادہ میگزین پڑھتا تھا۔ کچھ خرید کر اور کچھ مختلف لائبریریوں میں جا کر۔ اس پُر مشقت عمل کے لیے ڈیوٹ کو طعن و طنز بھی سننے پڑتے

تھے۔ مثلاً بہت سے لوگ اس کو محض قینچی اڈیٹر (Scissors-and-paste editor) کہنے لگے۔
مگر ہر مخالف بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنا کام جاری رکھا۔

ڈیوٹ ویلس (۱۹۸۱-۱۸۸۹) کے سوانح نگار نے اس کی کامیابی کا راز ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

What made him supernormal was his intense, sustained curiosity, plus an unequalled capacity for work (p. 182).

جس چیز نے اس کو غیر معمولی بنایا وہ اس کا گہرا اور دائمی تجسس تھا، مزید یہ کہ وہ کام کرنے کی بے پناہ طاقت رکھتا تھا۔ ڈیوٹ ویلس کے ایک دوست نے اس کے بارہ میں کہا کہ جتنا وہ بولتا ہے اس سے بہت زیادہ وہ سنتا ہے:

He listens far more than he talks.

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں مواقع اور امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی فہرست کبھی ختم نہیں ہوتی۔ جب بھی ایک امکان ختم ہو تو آدمی کو فوراً دوسرے امکان کی تلاش میں لگ جانا چاہیے۔ آدمی اگر ایسا کرے تو وہ پائے گا کہ جہاں حالات نے بظاہر اس کی ناکامی کا فیصلہ کر دیا تھا، وہیں اس کے لیے ایک نیا شاندار تر امکان موجود تھا جس کو استعمال کر کے دوبارہ وہ اپنی کامیابی کی منزل تک پہونچ جائے۔

رازِ حیات

جاپان کے لوگ اپنے آپ کو سورج کی اولاد سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی نسل دوسری نسلوں سے برتر ہے۔ انھیں حق ہے کہ وہ دوسری قوموں پر بالاتری حاصل کریں۔ اس ذہن نے ان کے یہاں اس نعرے کی صورت اختیار کی کہ مشرقی ایشیا جاپان کے لیے :

East Asia for Japan

جاپانی قوم کا یہ ذہن اس کی قدیم تاریخ میں اس کو متشدد بنائے ہوئے تھا۔ خاص طور پر ۱۹۲۷ سے لے کر ۱۹۴۵ تک وہ اپنے اس خودساختہ حق کے لیے دوسری قوموں سے لڑتے رہے اس جنگ میں انھیں ابتداءً کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ مثلاً ۱۹۴۲ میں انھوں نے منیلا پر قبضہ کر لیا اسی طرح سنگاپور، ندرلینڈ اور رنگون ان کے قبضہ میں آگیا۔ مگر آخر کار انھیں زبردست شکست ہوئی۔

دوسری جنگ عظیم میں امریکہ اور جاپان ایک دوسرے کے حریف تھے۔ جاپان کے پاس سادہ بم تھے۔ امریکہ نے اس کے مقابلہ میں جوہری بم تیار کر لیا۔ اب دونوں کے درمیان طاقت کا توازن ٹوٹ گیا۔ جولائی ۱۹۴۵ میں امریکہ نے جاپان کے اوپر دو ایٹم بم گرائے۔ جاپان کی فوجی طاقت تہس نہس ہو گئی۔ امریکہ کو جیت ہوئی اور جاپان کے لیے اس کے سوا کوئی صورت باقی نہ رہی کہ وہ اپنے لیے اس حیثیت کو قبول کرلے جس کو ایک مبصر نے ذلت آمیز ہتھیار ڈالنے (Humiliating surrender) سے تعبیر کیا ہے (ٹائم ۱۳ اپریل ۱۹۸۷، صفحہ ۱۵)

اب جاپان نے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۵ کو شاہ جاپان ہیرو ہیٹو نے قوم کے نام ایک ریڈیائی پیغام نشر کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ہم نے طے کیا ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے عظیم امن کی بنیاد رکھیں۔ اور اس مقصد کے لیے ناقابل برداشت کو برداشت کریں اور اس چیز کو سہیں جو سہنے کے قابل نہیں :

We have resolved to pave the way for a grand peace for all the generations to come by enduring the unendurable and suffering what is unsufferable.

اس فیصلے کے مطابق جاپان نے ۲ ستمبر ۱۹۴۵ کو اپنی شکست کے کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ اس نے جاپان کے اوپر امریکہ کی بالا دستی تسلیم کر لی۔

جاپان کے لیے یہ فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ جاپانی قوم اب تک ذاتی برتری کے احساس پر کھڑی ہوئی تھی۔ اب اس کو حقیقت پسندی کے احساس پر کھڑا ہونا تھا۔ اب تک وہ بیرونی مخالف جذبات (Anti-foreign sentiments) میں جی رہی تھی اب اس کو خود احتسابی کے جذبات میں اپنے لیے زندگی کا راز دریافت کرنا تھا۔ اس وقت جاپان کی صورتِ حال یہ تھی کہ اس کی صنعتیں برباد ہو چکی تھیں۔ "جنگی مجرم" جنرل میکارتھر کو معاہدہ کے خلاف جاپان کے اوپر مسلط کر دیا گیا تھا۔ کوریا، برما، سنگاپور، تائیوان اور دوسرے بیرونی مقبوضات کے علاوہ خود اپنے ملک کے کئی علاقے اس نے کھو دیئے تھے مثلاً جزیرہ کرافوٹو، اوکی ناوا وغیرہ۔ ۱۹۴۶ میں "میکارتھر کانسٹی ٹیوشن" جاپان میں نافذ کیا گیا جو "بیرونی طاقت کی طرف سے ایک مفتوح قوم کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں" رکھنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

یہ سب چیزیں بلاشبہ ناقابل برداشت کو برداشت کرنے کے ہم معنی تھیں۔ چنانچہ جاپان کے بہت سے لوگ اس کو برداشت نہ کر سکے اور اس غم میں انھوں نے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ فوجی انتہاپسندوں نے اس بات کی کوشش کی کہ قوم کے نام شاہ جاپان کے ریڈیائی پیغام کو نشر نہ ہونے دیں، اور جب وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے تو متعدد قوم پرستوں اور فوجی افسروں نے بے عزتی کے احساس کے تحت خودکشی کر لی :

There were a number of suicides among the military officers and nationalists who felt themselves dishonoured (10/86).

جاپان نے حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے لیے نمبر ۲ کی حیثیت کو قبول کر لیا۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے دوسری حیثیت پر راضی ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ طاقتور فریق سے ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے اپنے لیے تعمیر نو کا وقفہ حاصل کرنا۔ اس پالیسی کے تحت جاپان نے یہ کیا کہ اس نے سیاسی اور معاشی اعتبار سے امریکہ کی بالا دستی کو تسلیم کر لیا۔

اور اپنی تمام توجہات سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں موڑ دیں ۔ یہ عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ تیس سال میں تاریخ بدل گئی۔ فوجی اعتبار سے زیردست جاپان نے اقتصادی اعتبار سے بالادست جاپان کی حیثیت حاصل کرلی۔ جاپان نے الکٹرانکس اور دوسرے شعبوں میں اتنی اعلیٰ درجہ کی مصنوعات تیار کیں کہ خود امریکہ کے لوگ اپنے ملک کی چیزیں چھوڑ کر جاپان کی چیزیں خریدنے لگے۔ کیوں کہ وہ کوالٹی میں امریکہ سے بہتر تھیں اور قیمت میں امریکہ سے کم۔ اس صورت حال نے امریکی مدبرین کو سخت پریشان کردیا ہے۔ امریکہ کے ایک سیاسی مدبر مسٹر پیٹی ولسن (Pete Wilson) نے کہا کہ جاپان کے الکٹرانک سامان ٹوکیو کے سوا ہر ایک کو برباد کررہے ہیں:

The Japanese semiconductor Godzilla
is now destroying everything but Tokyo.

دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان امریکہ کا مقروض ہوگیا تھا۔ اب خود امریکہ جاپان کا مقروض بننے لگا۔ ۱۹۸۶ میں امریکہ کا جو سامان جاپان میں آیا ان کی قیمت ۲۶ بلین ڈالر تھی۔ اس کے مقابلہ میں جاپان کا سامان جو امریکہ گیا ان کی قیمت ۸۵ بلین ڈالر ہے۔ اس طرح امریکہ اور جاپان کے درمیان تجارتی توازن ٹوٹ گیا۔ ۱۹۸۶ میں امریکہ کے مقابلہ میں جاپان کا ٹریڈ سرپلس ۸۵ بلین ڈالر سے زیادہ تک پہونچ گیا۔ امریکہ آج دنیا کا سب سے بڑا مقروض ملک ہے اور جاپان دنیا کا سب سے بڑا مہاجن ملک۔ (ٹائم ۱۳ اپریل، ۲۷ اپریل ۱۹۸۷)

اس صورت حال پر آج کل کثرت سے کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے جاپان نمبر ایک (JAPAN-Number One) یہ کتاب اس وقت امریکہ میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب بنی ہوئی ہے۔ ۱۹۴۵ میں جاپان نے امریکہ کے مقابلہ میں نمبر ۲ کی حیثیت منظور کرلی تھی۔ ۴۰ سال بعد خود امریکہ کو اعتراف کرنا پڑا کہ جاپان دوبارہ نمبر ایک کا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

جاپانیوں نے اپنے ہاتھ سے "جاپان نمبر ۲" کی کتاب لکھی، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ دوسرے لوگ ان کے بارہ میں ایسی کتاب لکھیں جس کا نام "جاپان نمبر ایک" ہو۔ یہی موجودہ دنیا کا قانون ہے۔ یہاں جو لوگ ہار مان لیں وہی جیتتے ہیں۔ یہاں جو لوگ پیچھے ہٹنے پر راضی

ہو جائیں۔ وہی دوبارہ اگلی صف میں جگہ پاتے ہیں۔ اس راز کو چودہ سو سال پہلے مسلمانوں نے "صلح حدیبیہ" کی صورت میں دریافت کیا تھا، موجودہ زمانہ میں جاپانیوں نے اسی کو اپنے حالات کے لحاظ سے اپنی زندگی میں دہرایا ہے۔

اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ اور مسابقت کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک دوڑ رہا ہے، یہاں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ یہی مقابلہ انسانی ترقیوں کا زینہ ہے۔ تاریخ کی تمام ترقیاں اسی مقابلہ آرائی کے بطن سے ظاہر ہوئی ہیں۔ امریکہ کی قیادتی کوشش کے ذریعہ انسان جوہری طاقت تک پہونچا۔ جاپان کے دوبارہ اٹھنے کی کوشش نے الکٹرانک دور پیدا کر دیا، وغیرہ۔

اس دوڑ یا مقابلہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بار بار ایک قوم دوسری قوم سے پچھڑ جاتی ہے۔ بار بار کوئی آگے بڑھ جاتا ہے اور کوئی پیچھے رہ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں پیچھے رہ جانے والا اگر شکایت اور احتجاج میں لگ جائے تو وہ صرف اپنا وقت ضائع کرے گا۔ اس کے لیے واحد راستہ صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ دوسرے اس سے آگے بڑھ گیے اور وہ دوسروں سے پیچھے رہ گیا۔

یہ اعتراف اس کی کوششوں کو صحیح رُخ پر لگا دے گا۔ وہ اس کو موقع دے گا کہ آگے بڑھنے والے سے بے فائدہ ٹکراؤ کیے بغیر وہ اپنی تعمیر ثانی کا کام شروع کر دے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ آئے جب کہ وہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر لے۔

اپنے پیچھے ہونے کا احساس آدمی کو دوبارہ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ پیچھے رہ جانے والا شخص اگر اپنے پیچھے ہونے کا اقرار نہ کرے تو وہ ہمیشہ پیچھے ہی پڑا رہے گا، دوبارہ آگے بڑھنا اس کے لیے مقدر نہیں۔

محرومی پر راضی ہونا

نماز مسلمانوں پر اول دن سے فرض تھی۔ مگر پانچ وقت کی قید کے ساتھ نماز معراج میں فرض کی گئی۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں باقاعدہ طور پر باجماعت نماز کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں یہ معمول تھا کہ جب نماز کا وقت آتا تو لوگ اپنے آپ مسجد میں آجاتے۔ مگر جماعت کے باقاعدہ نظام کے لیے ضروری تھا کہ اس کے اعلان کا انتظام کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارہ میں لوگوں سے مشورہ فرمایا۔ کسی نے کہا کہ ناقوس بجایا جائے، کسی نے کہا کہ اونچی جگہ پر آگ روشن کی جائے۔ اس طرح کے اور بھی بعض مشورے سامنے آئے مگر ان میں سے کسی کو آپ نے قبول نہیں فرمایا۔

اس کے بعد ایک صحابی کو اذان کے کلمات کی بشارت ہوئی۔ یہ عبداللہ بن زید بن ثعلبہ بن عبدربہ تھے۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک سبز پوش آدمی ہے۔ اس سے وہ اذان کے بارہ میں گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ آدمی ان کو بتاتا ہے کہ اس کی بہتر تدبیر یہ ہے کہ تم یہ الفاظ کہو۔ اس کے بعد اس آدمی نے اللہ اکبر سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ تک وہ تمام الفاظ بتائے جو اب نماز سے پہلے ہر مسجد سے بہ آواز بلند پکارے جاتے ہیں۔ مذکورہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اپنا پورا خواب بیان کیا۔ آپ نے اس کو پسند کیا اور فرمایا کہ بے شک یہ سچا خواب ہے، (اِنّھا لرؤیا حَقٌّ ان شاء اللّٰہ، سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۱۲۹)

قدرتی طور پر عبداللہ بن زید کی خواہش تھی کہ وہی موذن مقرر کیے جائیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بجائے حضرت بلال کو موذن مقرر فرمایا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ تم سے زیادہ بلند آواز ہیں (فانہ اندی صوتاً منک) عبداللہ بن زید یہ سوچ سکتے تھے کہ مجھے اذان کی بشارت ہوئی ہے، اس لیے میرا حق ہے کہ میں ہی اذان دینے والا ہوں۔ مگر اذان کا مقصد اعلان تھا اس لیے اونچی آواز والے شخص کو مقرر کیا گیا۔ عبداللہ بن زید نے اس محرومی کو گوارا کیا۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔ اس دنیا میں اسی گروہ کے لیے کامیابی کی راہیں کھلتی ہیں جس کے افراد اہل تر کے مقابلہ میں اپنے حق سے دست بردار ہوجائیں۔

غلط فہمی

ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری (۹۲۳ - ۸۳۹ ء) مشہور عالم ہیں۔ وہ ایران میں پیدا ہوئے۔ مختلف ممالک میں تحصیل علم کے بعد بغداد میں مقیم ہو گیے اور یہیں وفات پائی۔ ان کی کتابوں میں سے دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ تفسیر میں جامع البیان عن تاویل آی القرآن اور تاریخ میں تاریخ الامم والملوک۔ دولت سامانیہ کے شہزادہ منصور بن نوح نے ان کی وفات کے چالیس سال بعد ان کی تاریخ کی کتاب کا فارسی ترجمہ (۹۶۳ ء) تیار کرایا تھا۔

ابن جریر طبری مسلمہ طور پر ایک عظیم اسلامی عالم تھے۔ خطیب بغدادی (م ۴۶۳ ھ) نے لکھا ہے کہ اقوام و ملوک کی تاریخ پر ان کی مشہور کتاب ہے، اور تفسیر قرآن پر ایک کتاب ہے جس کے مثل کتاب ابھی تک کسی نے نہیں لکھی (ولہ الکتاب المشہور فی تاریخ الامم والملوک وکتاب فی التفسیر ولم یصنف احد مثلہ) مگر ۲۸ شوال ۳۱۰ ھ کو جب ابن جریر طبری کا بغداد میں انتقال ہوا تو حنبلی علماء کی شدید مخالفت کی وجہ سے ان کو مسلمانوں کے عام قبرستان میں جگہ نہیں ملی۔ انتقال کے اگلے روز وہ اپنے مکان ہی کے ایک حصہ میں دفن کر دیے گیے۔

امام محمد بن جریر طبری کا یہ انجام کیوں ہوا۔ اس کی وجہ ایک بدگمانی تھی جو بلا تحقیق ان کی طرف منسوب کر دی گئی اور بڑھتے بڑھتے اپنی آخری حد پر پہونچ گئی۔ اصل یہ ہے کہ اسی زمانہ میں ایران میں ایک اور صاحب تھے جن کا نام محمد بن جریر بن رستم ابو جعفر الطبری تھا۔ یہ شیعہ عالم تھے۔ شیعی مسلک کے مطابق ان کا کہنا تھا کہ وضو میں پاؤں کا دھونا ضروری نہیں ہے۔ صرف مسح بھی کافی ہے۔ نام کے جزئی اشتراک کی بنا پر کچھ لوگوں نے اس کو ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری کا مسلک سمجھ لیا، حالانکہ وہ محمد بن جریر بن رستم ابو جعفر الطبری کا مسلک تھا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر متشدد علماء (مثلاً ابو بکر محمد بن داؤد ظاہری) نے ان کو رافضی کہنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ امام ابن جریر طبری کا رفض اور شیعیت سے کوئی تعلق نہیں۔

شریعت یا مصلحت

قال علی رضی اللہ عنہ : ماترك الناس شیئاً من امر دینهم لاستصلاح دنیاهم الافتح اللہ علیهم ماهو اضرّ منه۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب بھی لوگ اپنی دنیا بنانے کے لیے اپنے دین کی کسی بات کو چھوڑیں گے تو اللہ ان پر ایسا دروازہ کھول دے گا جو اس سے بھی زیادہ نقصان والا ہو۔

حضرت علیؓ کے اس قول کا تعلق تمام معاملات سے ہے، خواہ وہ چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا معاملہ۔ خواہ اس کا تعلق انفرادی امور سے ہو یا قومی امور سے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جب کسی معاملہ میں قرآن وسنت کی ایک ہدایت موجود ہو تو وہ کسی اندیشہ کے بغیر اس کو پکڑ لیں۔ قرآن وسنت کی ہدایت سامنے آجانے کے بعد ہر دوسری مصلحت باطل ہے۔ خواہ وہ بظاہر کتنی ہی زیادہ اہم دکھائی دیتی ہو۔

مثلاً ہندستان میں جو فرقہ وارانہ جھگڑے ہیں ان میں واضح طور پر قرآن وسنت کی رہنمائی یہ ہے کہ ان سے اعراض کیا جائے اور اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہونے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ مگر قرآن وسنت کی یہ ثابت شدہ تعلیمات جب مسلمانوں کے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو وہ ایک خودساختہ مصلحت کی بنا پر ان کو اختیار نہیں کر پاتے۔ وہ مصلحت یہ ہے کہ اگر ہم جوابی عمل نہ کریں تو فریق ثانی دلیر ہو جائے گا اور پہلے سے زیادہ شرارتیں کرے گا۔

اس ملک کے مسلمان پچھلی نصف صدی سے اسی خودساختہ طریقہ پر عمل کر رہے ہیں۔ مگر نتیجہ بتاتا ہے کہ ان کے حق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مذکورہ الفاظ صادق آرہے ہیں۔ وہ مصلحتِ قومی کی خاطر دین کی تعلیم کو چھوڑتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ شدید تر فساد برپا ہوتا ہے جو ان کے قومی مفاد کو پہلے سے بھی زیادہ تباہ وبرباد کر دیتا ہے۔

خدا ورسول کو زیادہ بہتر طور پر یہ معلوم ہے کہ کون سا رویہ ہمارے لیے مفید ہے اور کون سا رویہ ہم کو نقصان پہونچانے والا ہے۔ ایسی حالت میں یہ خدا ورسول کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہے کہ خدا ورسول کی رہنمائی سامنے آنے کے بعد آدمی یہ سمجھے کہ کسی اور طریقہ کو اختیار کر کے وہ زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

انسان کدھر

نئی دہلی کے انگریزی اخبار انڈین اکسپریس (۲۸ جنوری ۱۹۸۷) کے صفحہ اوّل پر ایک باتصویر خبر شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک مجرم کی خودکشی کی خبر ہے۔ اس میں اوپر نیچے ایک آدمی کی تین تصویریں ہیں۔ اور اس کے نیچے یہ الفاظ درج ہیں :

ESCAPE THROUGH DEATH: The Pennsylvania State Treasurer, Mr R. Budd Dwyer, who was convicted by a federal court of conspiracy for bribery, points a pistol into his mouth (top), pulls the trigger (centre) and slumps on the floor (bottom) during a new conference in his office in Harrisburg, USA, before he could be sentenced last Thursday. (AP)

فرار بذریعہ موت ـــــ پنسلوانیا (امریکہ) کے سرکاری خزانچی، مسٹر آر بڈ ڈائرجن کو فیڈرل کورٹ نے رشوت کے لیے سازش کے معاملہ میں ملزم ٹھہرایا تھا، وہ اپنے منہ میں ایک پستول ڈالے ہوئے ہیں (اوپر کی تصویر) وہ پستول چلا دیتے ہیں (بیچ کی تصویر) اور پھر وہ فرش پر گر پڑتے ہیں (نیچے کی تصویر)۔ یہ واقعہ ہیرسبرگ (امریکہ) میں ان کے آفس کے اندر ایک اخباری کانفرنس کے دوران اس سے پہلے پیش آیا جب کہ وہ ۲۲ جنوری کو سزا دیئے جانے والے تھے۔

اخبار نے اس خبر پر "موت کے ذریعہ فرار" کی سرخی قائم کی ہے۔ لیکن زندگی کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو اس کی زیادہ صحیح سرخی یہ ہوگی : چھوٹی سزا سے بڑی سزا کی طرف فرار۔

موت زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف جانے کا دروازہ ہے۔ یہ امتحان کے دور سے نکل کر انجام کے دور میں داخل ہونا ہے۔ کوئی انسان خودکشی کرکے اپنی امتحانی مدت کو کم کرسکتا ہے۔ مگر یہ اس کے بس میں نہیں کہ وہ انجام کی دنیا میں داخل ہونے سے اپنے آپ کو بچالے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جانے تو اس کے عمل کا رُخ کچھ سے کچھ ہوجائے گا۔ وہ آزاد زندگی کو چھوڑ کر پابند زندگی گزارے گا۔ وہ خودکشی کے بجائے خود احتسابی کا طریقہ اپنائے گا۔ وہ انسان کی پکڑ سے زیادہ خدا کی پکڑ سے ڈرنے لگے گا۔

بڑا اندیشہ

ڈاکٹر ڈینس بریو (Dennis Breo) نے ان طبی ماہرین سے ملاقاتیں کیں اور ان کا انٹرویو لیا جو مشہور شخصیتوں کے معالج رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام ہے غیر معمولی احتیاط (Extraordinary Care)۔ اس کتاب میں مصنف نے بڑے عجیب انکشافات کیے ہیں۔

انھوں نے لکھا ہے کہ مشہور شخصیتیں اکثر ناممکن مریض (Impossible patients) ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً ہٹلر کو ایک جلدی مرض تھا مگر اس نے اس بات کو اپنے لیے فروتر سمجھا کہ ڈاکٹر کے سامنے وہ اپنا کپڑا اتارے۔ چنانچہ صحیح طور پر اس کا علاج نہ ہو سکا۔ مشہور امریکی دولت مند ہوورڈ ہیوز (Howard Hughes) کا دانت خراب تھا مگر اس نے کبھی ڈاکٹر کے سامنے اپنا منھ نہیں کھولا۔ اس نے اس کو پسند کیا کہ وہ شراب پی کر اپنی تکلیف بھلاتا رہے۔ وغیرہ

شاہ ایران کے بارہ میں مصنف نے بتایا ہے کہ وہ فساد خون کے مریض تھے۔ مگر انھوں نے ڈاکٹروں سے اس کا علاج کرانے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ چیز انھیں سیاسی طور پر کمزور کر دے گی:

The Shah of Iran refused to be treated for his leukemia because he felt it would weaken him politically.
The Times of India, March 19, 1987, p. 7

شاہ ایران نے فساد خون کو اپنی حکومت کے لیے خطرہ سمجھا۔ حالانکہ بعد کے واقعات نے بتایا کہ فساد سیاست ان کی حکومت کے لیے زیادہ بڑا خطرہ تھا۔ ان کے اقتدار کو جس چیز نے ختم کیا وہ فساد خون کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ فساد سیاست کا مسئلہ تھا۔ وہ بڑے خطرے سے غافل رہے، اور اپنی ساری توجہ چھوٹے خطروں میں لگا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عین اس وقت ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا جب کہ اپنے نزدیک وہ اس کو بچانے کا پورا اہتمام کر چکے تھے۔

چھوٹے اندیشوں کی فکر کرنا اور بڑے اندیشوں سے غافل رہنا، یہی اکثر انسانوں کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے، خواہ وہ مشہور لوگ ہوں یا غیر مشہور لوگ۔

اعمال کے نتائج

ایک حدیث قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمانہ کو برا نہ کہو۔ زمانہ تو میں ہوں۔ سارا معاملہ میرے ہاتھ میں ہے اور میں ہی رات اور دن کو الٹتا پلٹتا رہتا ہوں (لَاتَسُبُّوا الدَّهرَ وَأنَا الدَّهرُ بِيَدِيَ الأمرُ أُقَلِّبُ اللَّيلَ وَالنَّهارَ) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ خدا ہی کے قانون کے مطابق حالات پیدا ہوتے ہیں اور خدا ہی کے حکم کے مطابق زمانہ گردش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں زمانہ یا حالات کو برا کہنا خود حکمِ خداوندی کو برا کہنا ہے۔ ایسا کہنا بے فائدہ ہے اور اسی کے ساتھ سرکشی بھی۔

نادرشاہ ایرانی نہایت ظالم بادشاہ تھا۔ اس نے ۱۷۳۹ میں دہلی پر حملہ کیا۔ دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے اپنی فوج کو حکم دیدیا کہ جو بھی ملے اس کو قتل کر دو۔ اس قتل عام میں ۳۰۰۰۰ لوگ مارے گیے۔ اس کے بعد اس نے شہر کو لوٹنے کا حکم دیا۔ ۲۶ مئی ۱۷۳۹ کو جب وہ دہلی سے واپس ہوا تو اس کے ساتھ لوٹ کا جو مال تھا اس کی مقدار تیس کرور روپے تھی۔ سونے، چاندی اور جواہرات اس کے علاوہ تھے۔ شاہ جہاں کا بنوایا ہوا تخت طاؤس بھی اسی موقع پر وہ اپنے ساتھ ایران لے گیا۔ (۹/۳۸۵)

کہا جاتا ہے کہ دہلی والوں پر جب یہ مصیبت اور تباہی آئی تو کچھ لوگ مرزا مظہر جان جاناں کے پاس گیے اور کہا کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ ہم کو نادر شاہ کے اس عذاب سے نجات دے۔ مرزا صاحب نے جواب دیا: شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

کسی قوم میں جب اخلاقی بگاڑ آتا ہے تو اس کی عملی طاقت بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر اختلافات ابھرتے ہیں جو اس کی اجتماعی قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ اس کے اندر یہ مزاج پیدا ہوتا ہے کہ وہ انفرادی مفاد پر اجتماعی مفاد کو قربان کر دے۔ اپنی ذات سے بلند مقاصد کے لیے قربانیاں دینے کا حوصلہ اس کے اندر باقی نہیں رہتا۔ اس کے افراد بے اصول انسانوں کی ایک بھیڑ بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ سچائی کے آگے جھکنے کے بجائے طاقت کے آگے جھکنے والے بن جاتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں کسی قوم کے لیے اسی طرح مہلک ہیں جس طرح لکڑی کے لیے گھن۔ جس لکڑی کو گھن لگ جائے وہ کھڑی نہیں رہ سکتی، اسی طرح جس قوم کے اندر یہ کمزوریاں پیدا ہو جائیں وہ تباہی اور بربادی سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

فرقہ واریت کا مسئلہ

فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل اتنا ہی آسان ہے جتنا خاندانی مسئلہ کا حل آسان ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر خاندان یک جہتی کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔ اسی طرح مختلف فرقے بھی یک جہتی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ خاندان کے مختلف افراد جس اصول کے تحت باہم مل کر رہتے ہیں۔ اسی طرح ملک کے مختلف فرقے بھی باہم مل کر رہنا سیکھ جائیں۔ جو اصول آج ہم خاندان کی اجتماعی زندگی میں عملاً رائج ہے اسی اصول کو خاندان سے باہر کی اجتماعی زندگی میں بھی رائج کر دیا جائے۔ یہی کامیابی کا واحد راستہ ہے، خاندان کے اندر بھی اور خاندان کے باہر بھی۔

فرقہ وارانہ مسئلہ بڑے پیمانہ پر عین اسی چیز کا نام ہے جس کو چھوٹے پیمانہ پر خاندانی مسئلہ کہا جاتا ہے۔ خاندانی مسائل مختلف رشتہ داروں کے درمیان پیدا ہوتے ہیں اور فرقہ وارانہ مسائل مختلف فرقوں کے درمیان۔ گھر ایک چھوٹا خاندان ہے اور ملک اس کے مقابلہ میں بڑا خاندان۔ ایک اور دوسرے میں جو فرق ہے وہ صرف ڈگری کا فرق ہے ورنہ نوعیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ خاندان کے اندر مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ایک رشتہ دار اور دوسرے رشتہ دار کے درمیان ناخوش گواریاں ظہور میں آتی ہیں۔ ایک کو دوسرے سے قولی یا عملی تکلیف پہونچتی ہے۔ اس کے باوجود کوئی چیز ہے جو خاندان کے مختلف افراد کو باہم جوڑے رکھتی ہے اور ان کو منتشر ہونے سے بچاتی ہے۔ خاندانی اتحاد اور یک جہتی کا جو راز ہے وہی قومی اتحاد اور یک جہتی کا راز بھی ہے۔ ہر شخص کو اپنے خاندان کی سطح پر جو تجربہ پیش آرہا ہے اسی تجربہ کے بہترین سبق کو ملکی افراد کے معاملہ میں استعمال کرے اور پھر کبھی فساد نہیں ہوگا۔

ہر عقل مند آدمی جانتا ہے کہ خاندانی مسائل کا سادہ حل یہ ہے کہ خاندان کے اندر ایک دوسرے کا لحاظ کرنے کی فضا پائی جائے۔ جب کوئی مسئلہ پیش آئے تو آدمی مشتعل نہ ہو بلکہ اس پر ٹھنڈے طریقہ سے غور کرے۔ وہ مسئلہ کو الجھانے کے بجائے سلجھانا چاہے۔ وہ مسئلہ کو تعلقات کا خاتمہ نہ سمجھے بلکہ درمیانی مدت کا ایک وقتی واقعہ سمجھ کر اس سے گزر جائے۔

یہ ذہن خاندان کے افراد کے اندر برداشت کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ اور برداشت تمام اختلافات کا واحد یقینی حل ہے۔ ایک دانش مند باپ جو ایک خاندان کا سربراہ ہو، وہ اپنے گھر والوں کو ہمیشہ یہ سبق دیتا ہے کہ تم لوگ ایک دوسرے کا احترام کرو۔ تم ایک دوسرے کے کام آنے کی کوشش کرو۔ ایک آدمی صرف اپنے حقوق کو یاد نہ رکھے بلکہ وہ اپنے فرائض کو بھی پوری طرح ادا کرنے کی کوشش کرے۔ خاندان کے کسی فرد سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو دوسرے لوگ اسے سنبھالیں اور اس سے درگذر کریں۔

یہی خاندانی یک جہتی کا راز ہے اور یہی قومی یک جہتی کا راز بھی۔ تمام فرقہ وارانہ جھگڑے صرف اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگوں نے اپنے خاندان کی سطح پر زندگی کا جو راز سیکھا تھا اس کو انھوں نے فرقہ وارانہ معاملہ میں استعمال نہیں کیا۔

فرقہ وارانہ جھگڑوں کی واحد وجہ یہ ہے کہ لوگ گھر کے معاملات میں جتنے سنجیدہ ہیں، وہ گھر کے باہر کے معاملات میں اتنے سنجیدہ نہیں۔ گھر کے اندر ہر روز ناموافق باتیں پیش آتی ہیں اور ہر آدمی ان کو برداشت کرتا ہے، صرف اس لیے کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کا گھر اجڑ جائے گا۔ مگر اسی قسم کا ایک ناخوش گوار معاملہ گھر کے باہر پیش آجائے تو لوگ فوراً بگڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فرقہ وارانہ مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر سے اس دو عملی کو ختم کر دیا جائے۔

مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ایک صاحب تھے۔ وہ اپنے رشتہ داروں کو ہمیشہ ایک شعر سنایا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بس یہ ایک شعر پکڑ لو اور اس کے بعد تمہارے تمام گھریلو مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ وہ شعر یہ تھا :

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا　　کہ جو تم سے کوئی کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

اس شعر میں ایک حدیث کے مفہوم کو منظوم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور بلاشبہ یہ کامیاب اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا اصول ہے۔ اگر لوگ اس ایک ہدایت کو پکڑ لیں تو ان کے تمام مسائل حل ہو جائیں، خواہ وہ گھر کے اندر کے مسائل ہوں یا گھر کے باہر کے مسائل۔

مسٹر الف اور مسٹر ب دونوں ایک محلہ میں رہتے تھے۔ مسٹر الف کے لڑکے نے مسٹر ب کے لڑکے کے ساتھ ایک نازیبا حرکت کی اور اس کو غصہ دلا دیا۔ اس کے جواب میں مسٹر ب کے لڑکے

نے مسٹر الف کے لڑکے کو مارا۔ اب مسٹر الف باہر آئے اور مسٹر ب کے گھر والوں کو انسانیت کے ساتھ رہنے کی تلقین شروع کر دی۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو کچھ نہیں کہا۔ پوری ذمہ داری مسٹر ب کے لڑکے پر ڈالتے ہوئے یک طرفہ طور پر مسٹر ب کو انسانیت کے ساتھ رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

مسٹر الف کے وعظ کو اگر پس منظر سے الگ کر کے دیکھا جائے تو وہ ایک درست بات معلوم ہوگی۔ لیکن اگر اس کو پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو وہ سراسر ایک غلط بات ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اپنے لڑکے کو کچھ نہ کہنا اس کی نازیبا حرکتوں پر اس کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ یہ دوسرے کے لڑکے کے لیے اگر پیام انسانیت ہے تو اپنے لڑکے کے لیے پیام شرارت۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اکثر لوگ معاملات کو اپنے اور غیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اپنے آدمی کی غلطی ہو تو اس کو گھٹاتے ہیں، اور اپنے سے باہر کا آدمی غلطی کر دے تو اس کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ بس یہی دو عملی سارے فساد کی جڑ ہے۔ اگر لوگوں کے اندر یہ مزاج آجائے کہ وہ معاملات کو انصاف کی نظر سے دیکھیں۔ وہ اپنوں کے معاملہ میں نرمی کا جو طریقہ اختیار کرتے ہیں، وہی نرم طریقہ غیروں کے معاملہ میں بھی اختیار کریں تو کبھی کوئی جھگڑا نہ ہو۔ اس کے بعد تمام شر و فساد اپنے آپ ختم ہو جائے۔

حال میں میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو تیس سال سے تجارت کرتے ہیں۔ اور آجکل جدہ میں ہیں۔ وہ اپنی تجارت میں نہایت کامیاب ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے زندگی کا بہت تجربہ اٹھایا ہے اور بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے۔ یہ بتائیے کہ لوگوں کے درمیان کامیاب زندگی گزارنے کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا راز وہی ہے جس کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔ یعنی ناموافق باتوں سے ٹکرانے کے بجائے ان کو نظر انداز کرنا۔ انھوں نے کہا کہ میں ہمیشہ ٹکراؤ کے موقع پر یک طرفہ طور پر پیچھے ہٹنے کے لیے تیار رہتا ہوں۔ اس لیے میرا راستہ کبھی کھوٹا نہیں ہوتا۔ میرے لیے کوئی رکاوٹ رکاوٹ ثابت نہیں ہوتی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے بہت سے واقعات بتائے۔

مثلاً انھوں نے کہا کہ ایک شخص کسی بات پر مجھ سے بگڑ گیا۔ اگلے دن وہ میرے پاس آیا اور مجھ کو بری طرح گالیاں دینے لگا۔ اس نے مجھے زبردست دھمکیاں دیں۔ میں خاموش سنتا رہا۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ تم کو جو کرنا ہو کرو۔ مگر جان لو کہ میرے پاس بھی ایک حربہ ہے۔ اس نے

غصہ کے ساتھ پوچھا کہ وہ کیا حربہ ہے ۔ میں نے کہا کہ تم جتنا زیادہ مجھ گالیاں دوگے میں اتنا ہی زیادہ تم کو دعائیں دوں گا۔ تم جتنا زیادہ مجھ کو دباؤگے میں اتنا ہی زیادہ جھکتا چلاؤں گا۔ میری یہ بات سن کر اس کا سارا جوش ختم ہوگیا۔ وہ چپ چاپ واپس چلاگیا اور پھر کبھی میرے خلاف کوئی بات نہیں کی ۔

انھوں نے مزید کہا کہ اس پالیسی کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہے کہ میں غیر ضروری نقصانات سے بچ جاتا ہوں ۔ اس کا مزید فائدہ یہ ہے کہ میرے اندر بے پناہ جرأت آگئی ہے ۔ انھوں نے کہا کہ دوسروں سے نفرت آدمی کو بزدل بناتی ہے ۔ اور دوسروں سے محبت آدمی کو بہادر بنادیتی ہے۔ اور بلاشبہ یہ نہایت سچی بات ہے ۔

ہندستان کے حالات میں فرقہ وارانہ مسئلہ کی سب سے بڑی نفسیاتی وجہ شک وشبہہ ہے۔ مختلف تاریخی اسباب سے یہاں ایک دوسرے کے خلاف غیر ضروری قسم کے شبہات کی فضا پیدا ہوگئی ہے ۔ ان شبہات کو پھاڑ کر باہر آجائیے اور پھر تمام فرقہ وارانہ مسائل آپ کو فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے نظر آئیں گے ۔

ایک مرتبہ میں ہوائی جہاز سے یورپ کے ایک مقام کا سفر کر رہا تھا۔ ہوائی اڈہ پر پہونچا تو اس قدر کہر چھایا ہوا تھا کہ سورج دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کہر کی حالت میں ہمارا جہاز اوپر بلند ہوا۔ کچھ دیر تک تو چاروں طرف اندھیرے کی وہی کیفیت رہی جو ہوائی اڈہ پر نظر آرہی تھی ۔ مگر جب جہاز اپنی پوری بلندی پر پہونچ گیا تو میں نے جہاز کی کھڑکی سے دیکھا کہ سورج کی روشنی پورے آب وتاب کے ساتھ چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ شبہات کا ہے۔ ہم اکثر شبہات کے کہر میں گھر کر سوچتے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ شبہات کا دائرہ ایک مصنوعی اور محدود دائرہ ہے ۔ اگر ہم تھوڑی سی کوشش کرکے اس دائرہ کے باہر آجائیں تو ہر طرف ہم کو یقین اور اطمینان کا سورج چمکتا ہوا نظر آنے لگے گا ۔

مجھے ایک شہر کا حال معلوم ہے۔ وہاں ہر سال ایک فرقہ کا جلوس نکلتا ہے جو دوسرے فرقہ کی عبادت گاہ سے گزرتا ہے ۔ عبادت گاہ کے پاس پہونچ کر جلوس چھ گھنٹہ اور آٹھ گھنٹہ تک رکا رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبادت گاہ کے لوگ روک ٹوک کرتے اور یہ کہتے کہ جلوس

کو دوسرے راستے سے لے جاؤ۔ اس طرح بات بڑھتی اور ضد کی فضا پیدا ہو جاتی، یہاں تک کہ فساد ہو جاتا۔ پچھلے سال عبادت گاہ کے لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ جلوس کے خلاف کوئی روک ٹوک نہ کریں گے۔ چنانچہ جلوس حسب سابق آیا تو وہاں دوسرے فرقہ کا کوئی آدمی اسے روکنے کے لیے موجود نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس صرف آدھ گھنٹہ میں گزر گیا اور کسی قسم کا کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ ضد کے جواب میں ہمیشہ ضد پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ ضد نہ کریں تو دوسرے کی ضد اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

اسی طرح میں ایک شہر کے بارے میں جانتا ہوں جہاں دو مسجدیں ہیں۔ اور دونوں بہت پہلے سے آثار قدیمہ کے قبضہ میں تھیں۔ ان میں سے ایک مسجد بہت چھوٹی مسجد ہے اور دوسری مسجد اس کے مقابلہ میں دس گنا زیادہ بڑی ہے۔ بڑی مسجد پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا جب کہ چھوٹی مسجد پر ابھی تک جھگڑا چل رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی مسجد کو کچھ موقع پرست لیڈروں نے جلسہ جلوس کا مسئلہ بنا دیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ دونوں فرقوں کے لیے ساکھ کا مسئلہ بن گیا اور اس کی بازیابی کی راہ میں سیاسی نزاکتیں پیدا ہو گئیں۔

اس کے برعکس بڑی مسجد کا معاملہ لیڈروں تک نہیں پہونچا۔ وہ مقامی طور پر غیر معروف مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا جنھوں نے اس کی بازیابی کے لیے انفرادی سطح پر کوششیں کیں۔ یہ کوشش چونکہ غیر سیاسی انداز میں تھی، اس میں انھیں دوسرے فرقہ کا تعاون بھی حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ مسجد اور اس سے ملحق وسیع زمین مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی۔ میں نے خود جا کر اس مسجد اور اس کے علاقہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہاں اب مسجد اور مدرسہ قائم ہے۔ بجلی اور ٹیلی فون بھی لگ گیے ہیں۔ لوگ سکون کے ساتھ دینی اور تعلیمی کام میں مشغول ہیں۔

اختلافی معاملہ کو جلسہ جلوس کا مسئلہ بنانا اس کی نزاکت کو بڑھاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر خاموشی کے ساتھ اس کے حل کی تدبیریں کی جائیں تو مسئلہ کے حل کی راہیں نکل آتی ہیں۔

اسی طرح مجھے ایک قصبہ کے بارے میں معلوم ہے۔ وہاں مسلمان ایک مسجد اور مدرسہ بنا رہے تھے۔ بنیاد کھودی جانے لگی تو دوسرے فرقہ کے کچھ لوگ آئے اور انھوں نے کہا کہ ہم یہاں سے دیوار نہیں اٹھنے دیں گے۔ آپ دو گز پیچھے لے جا کر اپنی دیوار اٹھائیے۔ مدرسہ کے ذمہ دار فوراً راضی

ہوگیے اور کام کو روک دیا۔ اگلے دن اس فرقہ کے بڑے لوگ ان کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے بعض نادانوں نے آپ کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالی تھی۔ ہم نے انھیں سمجھادیا ہے۔ آپ پہلے جہاں دیوار اٹھا رہے تھے دوبارہ وہیں سے اپنی دیوار اٹھائیے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر مسئلہ نادانی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کو دانش مندی کے ذریعہ ختم کیا جاسکتا ہے۔ یہی معاملہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا بھی ہے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کے پیچھے ہمیشہ کچھ نادانوں کی نادانیاں شامل رہتی ہیں۔ اگر دوسرے لوگ آگے بڑھ کر دانش مندی کا طریقہ اختیار کریں تو یقینی طور پر ہر جھگڑا اپنے آغاز ہی میں ختم ہو جائے گا۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو، بمبئی سے ۱۲ اپریل ۱۹۸۷ کو نشر کی گئی۔

اسلام دور جدید میں

امیر شکیب ارسلان (۱۹۴۶ - ۱۸۶۹) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے : لماذا تأخر المسلمون وتقدم غیرھم (مسلمان کیوں پیچھے ہوگئے اور ان کے سوا دوسرے کیوں آگے ہوگئے) یہ کتاب ۵۰ سال پہلے چھپی تھی۔ حال میں میں نے ایک عربی مجلہ رابطۃ العالم الاسلامی (اپریل ۱۹۸۵) میں ایک مضمون پڑھا۔ اس مضمون کا عنوان دوبارہ حسب ذیل الفاظ میں قائم کیا گیا تھا :

لماذا تأخرنا وتقدم غیرنا

اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان پچھلی نصف صدی سے ایک ہی سوال سے دوچار ہیں۔ اور وہ یہ سوال ہے کہ ہم جدید دور میں دوسری قوموں سے پیچھے کیوں ہوگئے، اور دوسری قومیں ہم سے آگے کیوں نکل گئیں۔ مزید عجیب بات یہ ہے کہ اسی نصف صدی کے اندر جاپان ایٹمی بربادی کے کھنڈر سے ابھرا اور ترقی کی انتہا پر پہونچ گیا۔ چنانچہ حال میں امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے جاپان نمبر ایک (JAPAN: Number One)

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا یہ انجام کسی موہوم سبب کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ معلوم خدائی قانون کی بنا پر ہے۔ اس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ جو گروہ اپنے آپ کو نفع بخش ثابت کرے اس کو دنیا میں ترقی اور استحکام نصیب ہو، اور جو گروہ نفع بخشی کی صلاحیت کھو دے اس کو ہمیشہ کے لیے پیچھے دھکیل دیا جائے۔ قدیم زمانہ کے مسلمان اہل عالم کے لیے نفع بخش بنے ہوئے تھے اس لیے قدیم زمانہ میں انھیں عظمت حاصل ہوئی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان بے نفع ہوگئے۔ اس لیے موجودہ زمانہ میں انھیں کوئی عظمت حاصل نہ ہوسکی۔

عروج و زوال کا یہ اصول قرآن کی حسب ذیل آیت میں واضح طور پر موجود ہے :

انزل من السماء ماءً فسالت اودية بقدرها فاحتمل السيل زبدا رابيًا ومما يوقدون عليه في النار ابتغاء حلية او متاع زبدٌ مثله . كذلك يضرب الله الحق و الباطل فاما الزبد فيذهب جفاءً واما ما ينفع الناس فيمكث في الارض كذلك يضرب الله الامثال ۔

(الرعد ۱۷)

اللہ نے آسمان سے پانی اتارا ۔ پھر نالے اپنی مقدار کے موافق بہہ نکلے ۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھالیا ۔ اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی ابھر آتا ہے جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لیے آگ میں پگھلاتے ہیں ۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے ۔ پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز لوگوں کو نفع پہونچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے اللہ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے ۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون کیا ہے ۔ وہ قانون یہ ہے کہ جو گروہ اپنے آپ کو نفع بخش ثابت کرے اس کو دنیا میں بقا اور استحکام ملے ۔ اور جو گروہ اپنی نفع بخشی کھو دے وہ یہاں بے قیمت ہو کر رہ جائے ۔

اس عالمی قانون کو ایک طرف کتاب الٰہی میں لفظی طور پر بیان کیا گیا ہے ۔ دوسری طرف مادی دنیا میں اس کا عملی مظاہرہ کیا جارہا ہے ۔ سورہ رعد کی مذکورہ آیت میں اس نوعیت کی دو مثالیں دی گئی ہیں ۔ ایک مثال بارش کی ہے ۔ بارش ہوتی ہے اور اس سے نالے بھرتے ہیں تو جھاگ اوپر دکھائی دینے لگتا ہے ۔ مگر جلد ہی ایسا ہوتا ہے کہ جھاگ تو ہوا میں اڑ جاتا ہے اور جو چیز اس میں نفع بخش ہے وہ باقی رہتی ہے ، یعنی پانی ۔

دوسری مثال دھات کی ہے ۔ دھات کو تپانے کے لیے جب کٹھالی میں پگھلاتے ہیں تو اس میں ابتداءً اس کا میل کچیل اوپر دکھائی دینے لگتا ہے ۔ مگر بہت جلد یہ وقتی منظر ختم ہو جاتا ہے اور جو اصل قیمتی دھات ہے وہ اپنی جگہ باقی رہ جاتی ہے ۔

دور اوّل کی مثال

دور قدیم میں اسلام کو غیر معمولی عظمت ملی ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ تقریباً ایک ہزار سال تک اسلام کو آباد دنیا کے قائد کی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ اسلام

کو یہ عظیم حیثیت اتفاقاً نہیں ملی اور نہ مطالبات کے ذریعہ اس کو یہ حیثیت حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ قدرت کا وہی ابدی قانون تھا جس کا اوپر ذکر ہوا۔ یعنی نفع بخشی اور فیض رسانی۔

دنیا کو اسلام سے جو کچھ ملا، اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اسلام نے دنیا کو توہمات (Superstitions) کے دور سے نکالا اور اس کو پہلی بار سائنس کے دور میں داخل کیا۔

آج کی دنیا جس چیز کو اپنے لیے سب سے بڑی نعمت سمجھتی ہے وہ سائنس ہے۔ اور تمام محققین اور منصف مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ یہ دراصل اسلام ہے جس نے سائنس کے دور کو پیدا کیا۔ یہاں ہم صرف ایک مغربی مصنف مسٹر بریفالٹ کا قول نقل کریں گے۔ وہ اس موضوع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ یورپی ترقی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں جس میں اسلامی تہذیب کی فعال اثر انگیزی دیکھی نہ جا سکتی ہو۔ مگر وہ سب سے زیادہ واضح اس قوت کی پیدائش میں ہے جو جدید دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ یعنی طبیعی سائنس اور سائنسی اسپرٹ۔ ہماری سائنس پر عربوں کا قرض انقلابی نظریات کی دریافت کی حد تک نہیں ہے۔ سائنس اس سے کہیں زیادہ عرب تہذیب کی احسان مند ہے، وہ خود اپنے وجود کے لیے اس کی مرہون منت ہے:

For although there is not a single aspect of European growth in which the decisive influence of Islamic culture is not traceable, nowhere is it so clear and momentous as in the genesis of that power which constitutes the permanent distinctive force of the modern world, and the supreme source of its victory—natural science and the scientific spirit. The debt of our science to that of the Arabs does not consist in startling discoveries of revolutionary theories; science owes a great deal more to Arab culture, it owes its existence.
Briffault, *Making of Humanity*, p. 190

یہ ایک معلوم تاریخی حقیقت ہے کہ قدیم زمانہ میں تمام دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ تمام قومیں بے شمار دیوتاؤں کو پوجتی تھیں۔ ہندستانی روایات کے مطابق ان کی تعداد ۳۳ کروڑ تک پہونچ گئی تھی انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں تعدد آلہہ کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ مذاہب میں عمومی طور پر یہ بات پائی گئی ہے کہ فطرت کی طاقتوں اور فطرت کے مظاہر کو خدا مان لیا جاتا ہے۔ نہایت آسانی کے ساتھ ان کو تین قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے ــــــ آسمانی، فضائی اور زمینی۔ یہی تقسیم بجائے خود ہند آریائی مذہب میں تسلیم کی گئی ہے۔ چنانچہ سورج ان کے یہاں آسمانی خدا ہے۔ اِندر فضائی خدا ہے جو

طوفان بارش اور جنگ لانے والا ہے۔ اگنی (آگ دیوتا) زمینی واقعات کا سبب ہے :

> A widespread phenomenon in religions is the identification of natural forces and objects as divinities. It is convenient to classify them as celestial, atmospheric, and earthly. This classification itself is explicitly recognized in Indo-Aryan religion: Surya, the sun god, is celestial; Indra, associated with storms, rain, and battles, is atmospheric; and Agni, the fire god, operates primarily at the earthly level (14/785).

اسلام سے پہلے انسان کا حال یہ تھا کہ وہ ہر چیز کو پوجتا تھا۔ وہ سورج اور چاند سے لے کر دریا اور پہاڑ تک ہر چیز کے آگے جھکتا تھا۔ درختوں میں اس نے درخت خدا (Plant deities) اور جانوروں میں اس نے جانور خدا (Animal deities) بنا رکھے تھے۔ دنیا کی تمام چیزیں معبود بنی ہوئی تھیں۔ اور انسان ان کا عبادت گزار۔ اس طرح انسان نے اپنی عظمت کھو دی تھی۔ اسلام کے ذریعہ تاریخ میں جو انقلاب آیا اس نے پہلی بار انسان کو اس کی عظمت عطا کی۔

شرک (بالفاظ دیگر مظاہر فطرت کی پرستش) کا رواج قدیم زمانہ میں سائنسی ترقیوں میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ انسان فطرت کے مظاہر کو معبود سمجھ کر انھیں تقدس کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس لیے اس کے اندر یہ جذبہ ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان مظاہر کی تحقیق کرے اور ان کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے۔ فطرت کے مظاہر جب پرستش کا موضوع بنے ہوئے ہوں تو اسی وقت وہ تحقیق کا موضوع نہیں بن سکتے۔ یہ بنیادی سبب تھا جو طبیعی سائنس کا دور شروع ہونے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اسلام نے تاریخ میں پہلی بار اس سبب کو ختم کیا۔ اس لیے اسلام کے بعد تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ طبیعی سائنس کا دور شروع ہوا اور بالآخر اس حد کو پہونچا جس حد کو وہ آج پہونچا ہے۔

آرنلڈ ٹوائن بی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ دراصل توحید (Monotheism) کا عقیدہ ہے جس نے جدید سائنس اور صنعتی دور کو پیدا کیا۔ کیوں کہ توحید کے انقلاب سے پہلے دنیا میں عملی طور پر شرک کا غلبہ تھا۔ شرک کے عقیدہ کے تحت آدمی فطرت (Nature) کو پوجنے کی چیز سمجھے ہوئے تھا۔ پھر وہ اس کو تحقیق و تسخیر کی چیز کیسے سمجھتا۔ جب کہ فطرت کو تحقیق اور تسخیر کی چیز سمجھنے کے بعد ہی اس علم کا آغاز ہوتا ہے جس کو طبیعی سائنس کہتے ہیں۔

قرآن میں مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ زمین و آسمان کی نشانیوں (مظاہر فطرت) پر غور کرو ۔ قرآن میں اس قسم کی سات سو آیتیں شمار کی گئی ہیں جن میں مظاہر فطرت پر غور کرنے کی تلقین کی گئی ہے ۔ اگر بالواسطہ آیتوں کو بھی شامل کیا جائے تو ان کی تعداد ایک ہزار تک پہونچ جائے گی ۔ یہ معلوم انسانی تاریخ میں بالکل نئی آواز تھی ۔ کیوں کہ اس سے پہلے انسان صرف یہ جانتا تھا کہ وہ مظاہر فطرت کو پوجے ۔ ایک ایسی دنیا جس میں ہزاروں برس سے انسان صرف یہ جانتا تھا کہ مظاہر فطرت پوجنے کی چیز ہیں، مقابل قرآن نے یہ آواز بلند کی کہ مظاہر فطرت اس لیے ہیں کہ ان پر غور کیا جائے اور ان میں چھپی ہوئی حکمتوں کو دریافت کیا جائے ۔

اسلام کا یہ پیغام صرف پیغام نہ رہا بلکہ سو سال کے اندر ہی وہ ایک عالمی انقلاب بن گیا اس نے اولاً عرب کے دل و دماغ کو فتح کیا ۔ پھر وہ ایشیا اور افریقہ اور یورپ تک پہونچ گیا ۔ اس نے عرب کے بت خانے ختم کر دیئے ۔ ایرانی اور رومی شہنشاہیتیں اس زمانہ میں شرک کی سب سے بڑی سرپرست تھیں ۔ دونوں کو اسلام نے مغلوب کر لیا اور توحید کا غلبہ تقریباً پوری آباد دنیا میں قائم کر دیا ۔

اسلام کی اس نفع بخشی کو تمام منصف مزاج مورخین نے تسلیم کیا ہے ۔ یہاں ہم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا ایک پیراگراف نقل کرتے ہیں :

> Islamic culture is the most relevant to European science. There was active cultural contact between Arabic-speaking lands and Latin Europe. Conquests by the Prophet's followers began in the 7th century, and, by the 10th, Arabic was the literate language of nations stretching from Persia to Spain. Arabic conquerors generally brought peace and prosperity to the countries they settled (16/368).

اسلامی تہذیب کا تعلق یورپی سائنس سے بہت زیادہ ہے ۔ عربی زبان بولنے والے علاقوں اور لاتینی یورپ کے درمیان نہایت گہرا ربط قائم تھا ۔ پیغمبر کے پیروؤں کی فتوحات ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوئیں ۔ اور دسویں صدی تک یہ حال ہو گیا کہ عربی زبان ایران سے لے کر اسپین تک کی تمام قوموں کی علمی زبان بن گئی ۔ عرب فاتحین جہاں گئے وہاں عام طور پر وہ امن اور خوش حالی لے گئے ۔

قرآن کے ذریعہ عالمی سطح پر جو فکری انقلاب آیا اس نے تاریخ میں پہلی بار نئی قسم کی سرگرمیاں

شروع کر دیں۔ انسان نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جو پوجنے کی چیز نہیں بلکہ برتنے کی چیز تھی۔ جس کا وہ تابع نہ تھا بلکہ وہ اس کے لیے مسخر کی گئی تھی کہ وہ اس کو اپنا تابع بنائے۔ چنانچہ اسلام کے عظیم الشان اعتقادی انقلاب کے ساتھ ایک عظیم الشان علمی اور ذہنی انقلاب بھی شروع ہو گیا۔ اسلام کے ماننے والوں نے جب ایک قادر مطلق خدا کو پایا تو اسی کے ساتھ انھوں نے دوسری تمام چیزوں کو بھی پالیا۔ انھوں نے ہر میدان میں ترقیاں شروع کر دیں۔ ان سے دنیا کو وہ چیزیں ملنے لگیں جو ابھی تک اس کو نہیں ملی تھیں۔ چنانچہ اس دور میں پیدا ہونے والی جتنی بھی قابل ذکر ترقیاں ہیں ان کا مطالعہ کیجیے تو ہر ترقی کے پیچھے کسی نہ کسی مسلمان کا ہاتھ کام کرتا نظر آئے گا۔

چند تاریخی حوالے

توحید اس دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ توحید کو اختیار کرنے کی وجہ سے دور اول کے مسلمانوں کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ دنیا والوں کے درمیان ایک ایسی برادری بن کر ابھریں جن کا ہر طرف استقبال کیا جائے اور جن کے ذریعہ سے دنیا والوں کو ہر قسم کا نفع حاصل ہو۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں چند مثالیں درج کریں گے۔

۱۔ اسلامی انقلاب کے بعد کئی سو سال ایسے گزرے ہیں جب مسلمان ساری دنیا میں علم طب کے امام تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگ مسلم اطبا سے رجوع کرتے تھے اور طب میں مسلمانوں کی تصنیفات ہر جگہ فن طب کا ماخذ بنی ہوئی تھیں۔ یورپ کا سب سے پہلا میڈیکل کالج سلرنو (اٹلی) میں قائم ہوا۔ یہ میڈیکل کالج گیارھویں صدی عیسوی میں قائم ہوا تھا۔ اس کا نصاب بڑی حد تک ان طبی کتابوں پر مشتمل تھا جو عربی زبان سے لاتینی زبان میں ترجمہ کی گئی تھیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اس کے تذکرہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ یورپ میں بارھویں صدی نے عربی سے لاتینی میں کتابوں کے ترجمہ کا ایک ہیروانہ پروگرام دیکھا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ یورپ کا ابتدائی طبی اسکول جو سلرنو میں قائم ہوا اور دوسرا جو مانٹ پیلیر میں قائم ہوا۔ دونوں عربی اور یہودی ماخذوں سے بہت قریب تھے:

The 12th century saw a heroic program of translation of works from Arabic to Latin. It is significant that the earliest medical school in Europe was at Salerno and that it was later rivalled by Montpellier, also close to Arabic and Jewish sources (16/368).

پروفیسر ہٹی نے اس سلسلہ میں مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الزہراوی کی کتاب (التصریف لمن عجز عن التالیف) کا سرجری سے متعلق حصہ گیرارڈ آف کریمونا نے عربی سے لاتینی میں ترجمہ کیا۔ یورپ میں اس کے مختلف اڈیشن چھپے۔ وینس میں ۱۴۹۷ میں، بیسل میں ۱۵۴۱ میں، آکسفورڈ میں ۱۷۷۸ میں۔ یہ ترجمہ صدیوں تک سالرنو اور مانٹ پیلیر اور دوسرے یورپی طبی اداروں میں نصاب تعلیم کا جزء بنا رہا:

The surgical part (of Al-Zahrawi) was translated into Latin by Gerard of Cremona and various editions were published at Venice in 1497, at Basel in 1541 and at Oxford in 1778. It held its place for centuries as the manual of surgery in Salerno, Montpellier and other early schools of medicine.
P.K. Hitti, *History of the Arabs*, 1979, p. 577

آج آپ جدید طرز کے کسی اسپتال یا کسی میڈیکل کالج میں داخل ہوں تو وہاں کی ہر چیز آپ کو مغربی تہذیب کا عطیہ نظر آئے گی۔ مگر چند سو سال پہلے یہ حال تھا کہ آپ وقت کے کسی معیاری اسپتال یا کسی میڈیکل کالج میں داخل ہوں تو وہاں کی ہر چیز اسلامی تہذیب کا عطیہ نظر آتی تھی۔ یہ ہے وہ بنیادی فرق جو مسلمانوں کے ماضی اور ان کے حال میں پیدا ہو گیا ہے۔

۲۔ جغرافیہ ایک بے حد اہم سائنس ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے بے شمار شعبوں سے ہے۔ دور اول کے مسلمانوں نے اس فن میں بھی کمال پیدا کیا۔ مثال کے طور پر الادریسی اپنے زمانہ میں دنیا کا سب سے بڑا جغرافی عالم تھا۔ پروفیسر فلپ ہٹی نے اس کی بابت حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

The most distinguished geographer of the Middle Ages.

یعنی قرون وسطیٰ کا سب سے زیادہ ممتاز جغرافیہ داں۔ الادریسی کے زمانہ میں راجر دوم سسلی کا بادشاہ تھا۔ اس کو ایک جغرافی نقشہ کی ضرورت ہوئی تو اس کو یہ نقشہ جس نے بنا کر دیا وہ یہی الادریسی تھا۔ فلپ ہٹی نے مزید لکھا ہے:

The most brilliant geographical author and cartographer of the twelfth century, indeed of all medieval time, was al-Idrisi, a descendant of a royal Spanish Arab family who got his education in Spain.
P.K. Hitti, *History of the Arabs*, 1979, p. 568

بارھویں صدی عیسوی کا سب سے زیادہ باکمال جغرافی مصنف اور نقشہ نویس، بلکہ پورے قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا جغرافی عالم بلاشبہ الادریسی تھا۔ وہ اسپین کے ایک اعلیٰ عرب خاندان میں پیدا ہوا، اور اس کی تعلیم اسپین میں ہوئی۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ الادریسی نے ۱۱۵۴ء میں سسلی کے مسیحی حکمراں (راجر دوم) کے لیے ایک عالمی نقشہ بنایا۔ اس میں ایشیائی علاقوں کی زیادہ بہتر معلومات دی گئی تھیں جو اس وقت تک ابھی انسان کو حاصل نہ ہوئی تھیں:

Al-Idrisi constructed a world map in AD 1154 for the Christian king Roger of Sicily, showing better information on Asian areas than had been available theretofore (11/472).

موجودہ زمانہ میں مسلم ملکوں میں مغرب کے ماہرین (Experts) بھرے ہوئے ہیں۔ مگر ایک وقت تھا جب کہ مسلمان ہر شعبہ کے ماہرین دنیا کو فراہم کر رہے تھے۔ آج مسلمان دنیا والوں سے لے رہے ہیں، مگر چند سو سال پہلے یہ حال تھا کہ مسلمان دنیا کو دینے والے بنے ہوئے تھے۔ کیسا عجیب فرق ہے ماضی میں اور حال میں۔

۳۔ آج مسلم ملکوں کے نوٹ اور سکے مغربی ممالک تیار کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی مسلم ملک خود اپنا سکہ یا نوٹ تیار کرتا ہے تو اس کے لیے بھی وہ مغربی ٹکنالوجی کا مرہون منت ہے۔ مگر ایک وقت تھا کہ یہ مقام خود مسلمانوں کو عالمی سطح پر حاصل تھا۔

پروفیسر ایچ۔ ڈبلیو۔ سی۔ ڈیوس (H.W.C. Davis) نے اپنی کتاب قرون وسطیٰ کا انگلستان (Medieval England) میں انگلستان کے ایک قدیم سنہرے سکہ کی تصویر اس کے دونوں رخ سے چھاپی ہے۔ یہ سکہ برٹش میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ تصویر میں واضح طور پر نظر آرہا ہے کہ سکہ کے ایک طرف عربی رسم الخط میں کلمہ شہادت لکھا ہوا ہے اور دوسری طرف اس وقت کے انگلستان کے بادشاہ اوفا ریکس (Offa Rex) کا نام کندہ ہے۔ اسی کے ساتھ سکہ پر بغداد کے مسلمان سکہ گر کا نام بھی درج ہے۔ سکہ کی تصویر کے نیچے پروفیسر ڈیوس نے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

Anglo-Saxon gold coin imitating an Arab Dinar of the year 774.

یعنی قدیم انگلستان کا سونے کا سکہ جو ۷۷۴ میں ڈھالا گیا اور جس میں ایک عرب دینار کی نقل کی

کی گئی ہے۔ یہ ایک تاریخی شہادت ہے جو بتاتی ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان صنعتی ترقی کے اس مقام پر تھے کہ انگلستان کے نامور بادشاہ اوفارکس (وفات ۷۹۶ء) کو ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ وہ اپنے ملک کا سکہ ڈھالنے کے لیے بغداد سے مسلم ماہرین کو بلائے۔ اس وقت انگلستان میں جو سکہ ڈھالا گیا وہ مسلم ممالک کے سکہ (دینار) کی نقل تھا۔ حتیٰ کہ مسلم سکوں کی طرح اس پر کلمہ شہادت بھی عربی رسم الخط میں لکھا ہوا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہزار برس پہلے کے دور میں اسلامی تہذیب ساری دنیا میں کس قدر غالب حیثیت رکھتی تھی۔

۴۔ واسکوڈی گاما (۱۵۲۴ — ۱۴۶۹) ایک پرتگالی ملاح تھا۔ اس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے ۱۴۹۷ میں ہندستان اور یورپ کے درمیان سمندری راستہ دریافت کیا جو کیپ آف گڈ ہوپ ہو کر جاتا تھا۔ مگر یہ عظیم کامیابی اس کو ایک عرب ملاح احمد بن ماجد کے ذریعہ حاصل ہوئی اس کی بابت انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

Vasco da Gama's Arab pilot, Ahmad ibn Majid (7/862).

یعنی واسکوڈی گاما کا عرب جہازراں احمد بن ماجد۔ برٹانیکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ واسکوڈی گاما جب پرتگال سے چل کر افریقہ پہونچا تو وہاں موزنبیق کے سلطان نے واسکوڈی گاما کو دو مسلم ملاح دیئے ان میں سے ایک اس وقت بھاگ گیا جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ پرتگالی مسیحی مذہب کے ہیں:

The Sultan of Mozambique supplied daGama two (Muslim) pilots, one of whom deserted when he discovered that the Portuguese were Christians (7/861).

جس جہازراں نے واسکوڈی گاما کا ساتھ دیا اس کا نام احمد بن ماجد تھا۔ وہ نہایت ماہر تھا اور سمندری جہازرانی سے اتنی واقفیت رکھتا تھا کہ اس پر اس نے ایک اہم کتاب لکھی تھی جو مذکورہ سفر کے وقت اس کے ساتھ تھی۔

پروفیسر فلپ ہٹی نے لکھا ہے کہ بحری جہازرانی کے موضوع پر ایک خصوصی کتاب احمد بن ماجد کی ہے جس میں بحری جہازرانی کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۴۹۸ میں یہی احمد بن ماجد تھا جس نے افریقہ سے ہندستان تک واسکوڈی گاما کی رہنمائی کی:

An exceptional work of major importance is a compendium of theoretical and practical navigation by Ahmad ibn Majid of Najdi ancestry, who, it is claimed, in 1498 piloted Vasco da Gama from Africa to India.
P.K. Hitti, *History of the Arabs*, 1979, p. 689

۵ ۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں جو دریافتیں ہوئیں ان میں سے ایک وہ دریافت ہے جس کو نئی دنیا (امریکہ) کی دریافت کہا جاتا ہے ۔ یہ عظیم دریافت عام طور پر کرسٹوفر کولمبس (۱۴۵۱–۱۵۰۶) کے نام کے ساتھ موسوم ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ اٹلی کا کولمبس ہی وہ شخص ہے جس نے اس مہم کی رہنمائی کی ۔ مگر اس کو یہ تصور دینے والے مسلمان تھے کہ وہ اٹلانٹک سمندر میں اپنی کشتی اس امید میں داخل کرے کہ اس ناپیدا کنار سمندر کے دوسری طرف اس کو خشکی ملے گی جہاں وہ اتر سکے ۔

پروفیسر ہٹی نے لکھا ہے کہ عربوں نے زمین کے گول ہونے کے قدیم نظریہ کو زندہ رکھا جس کے بغیر نئی دنیا کی دریافت ممکن نہ ہوتی ۔ اس نظریہ کا ایک مبلغ ابو عبیدہ مسلم البلنسی تھا جس نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی ۔ اس کا زمانہ دسویں صدی عیسوی کا نصف اول ہے ۔ زمین کے گول ہونے کا نظریہ عربی سے لاتینی میں ترجمہ ہو کر ۱۴۱۰ء میں یورپ میں شائع ہوا ۔ اس کو پڑھ کر کولمبس نے اس نظریہ سے واقفیت حاصل کی ۔ اس سے اس نے سمجھا کہ زمین ایک ناشپاتی کی مانند ہے اور یہ کہ زمین کے مغربی نصف کرہ میں بھی ایسا ہی ابھار موجود ہے جیسا کہ اس کے مشرقی نصف کرہ میں نظر آتا ہے ۔

پروفیسر ہٹی کے الفاظ یہ ہیں :

They (Arab) kept alive the ancient doctrine of the sphericity of the earth, without which the discovery of the New World would not have been possible. An exponent of this doctrine was abu Ubaydah Muslim al-Balansi (of Valencia), who flourished in the first half of the tenth century. They perpetuated the Hindu idea that the known hemisphere of the world had a centre or "world cupola" or "summit" situated at an equal distance from the four cardinal points. This *arīn* theory found its way into a Latin work published in 1410. From this Columbus acquired the doctrine which made him believe that the earth was shaped in the form of a pear and that on the western hemisphere opposite the *arīn* was a corresponding elevated centre.
Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, The Macmillan Press Ltd., London, Tenth Edition 1979, p. 570

ہمیں کیا کرنا ہے

اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ماضی میں بلاشبہ مسلمانوں نے بہت بڑی بڑی سائنسی خدمات انجام دی تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمان سائنس اور صنعت کے میدان میں تمام قوموں سے پیچھے ہو گیے ہیں۔ آج وہ اس حیثیت میں نہیں ہیں کہ خالص سائنسی اور صنعتی اعتبار سے اہلِ دنیا کے لیے نفع بخش بن سکیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ابھی تک صنعتی دور (Industrial age) میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ جب کہ بقیہ دنیا، الون ٹافلر کے الفاظ میں، مافوق صنعتی دور (Super-industrial age) میں داخل ہو گئی ہے۔

Alvin Toffler, *Future Shock*, New York, 1971

مگر امت مسلمہ محفوظ آسمانی کتاب کی حامل ہے۔ اس نسبت سے وہ خود بھی ایک محفوظ امت ہے۔ اس محفوظیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جہاں مواقع بظاہر ختم ہو جائیں وہاں بھی اس کے لیے ایک موقع موجود رہتا ہے۔ خدا نے انسانیت کے لیے عام طور پر اور امت مسلمہ کے لیے خاص طور پر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر ڈس ایڈوانٹج کے ساتھ اس کے لیے ایک ایڈوانٹج ہمیشہ موجود رہے۔ یہی وہ ابدی حقیقت ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

فان مع العسر یسرا۔ ان مع العسر یسرا (الانشراح) پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت موجودہ زمانہ میں پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ سائنس اپنی ترقیوں کی انتہا پر پہونچ کر ایک ایسے سنگین مسئلہ سے دوچار ہے جس کا خود اس کے پاس کوئی حل نہیں۔ نہ سائنسی طبقہ سے باہر کوئی گروہ ایسا موجود ہے جو اس مسئلے کا حل اسے دے سکے۔ یہ صرف مسلمان ہیں جو محفوظ آسمانی کتاب کے حامل ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں ہیں کہ سائنسی طبقہ کو نیز پوری انسانیت کو اس مسئلہ کے حل کا تحفہ پیش کر سکیں۔

اس معاملہ کی نوعیت سمجھنے کے لیے یہاں میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا ایک پیراگراف نقل کروں گا۔ اس کے تاریخ سائنس (History of Science) کے مقالہ نگار نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

Untill recently, the history of science was a story of success. The triumphs of science represented a cumulative process of increasing knowledge and a sequence of victories over ignorance and superstition; and from science flowed a stream of inventions for the improvement of human life. The recent realization of deep moral problems within science, of external forces and constraints on its development, and of dangers in uncontrolled technological change has challenged historians to a critical reassessment of this earlier simple faith (16/366).

ابھی حال تک سائنس کی تاریخ کامیابیوں کی کہانی تھی۔ سائنس کی فتوحات میں یہ شمار ہوتا تھا کہ اس نے انسانی معلومات میں اضافہ کیا ہے اور جہالت اور توہم پرستی پر فتح حاصل کی ہے۔ سائنس سے ایجادات کا ایک سیلاب نکلا ہے جس نے انسانی زندگی کو بہتر بنایا ہے۔ مگر حال میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ سائنس گہرے اخلاقی سوالات سے دوچار ہے۔ بے قید ٹکنالوجی کے خطرات کی وجہ سے اس کی ترقی پر روک لگانے کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ یہ صورت حال مورخین کو چیلنج کر رہی ہے کہ وہ ان خیالات کا دوبارہ تنقیدی جائزہ لیں جو ابتدا میں سادہ طور پر قائم کر لیے گئے تھے۔

جدید دنیا کا یہی وہ خلا ہے جہاں مسلمان اپنے نفع بخش ہونے کا ثبوت دے سکتے ہیں، اور اس طرح دوبارہ اپنے لیے سرفرازی کا وہ مقام حاصل کر سکتے ہیں جو انھوں نے دنیا میں کھو دیا ہے۔

سائنس کی ابتدائی فتوحات نے بہت سے لوگوں کو اتنا زیادہ متاثر کیا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب ہمیں سائنس کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ سائنس ہماری تمام ضرورتوں کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلہ میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ جولین ہکسلے (۱۹۷۵ - ۱۸۸۷) نے اس نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام تھا ــــــ انسان تنہا کھڑا ہوتا ہے:

Man Stands Alone

اس کے جواب میں کریسی مارلین (۱۹۴۶ - ۱۸۸۴) نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام بامعنی طور پر یہ تھا ــــــ انسان تنہا کھڑا نہیں ہو سکتا:

Man Does Not Stand Alone

بیسویں صدی کے نصف اول تک انسان کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کی سائنس اس کے لیے کافی

ہے۔ مگر اسی صدی کے نصف ثانی میں انسان کو اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑا۔ اس سے پہلے جو بات کریسی مارلین جیسے چند مستثنیٰ افراد کہتے تھے، اب وہ عام طور پر لوگوں کی زبانوں سے کہی جارہی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مذکورہ اقتباس میں کیا گیا ہے۔

جدید انسان کی ذہنی حالت کیا ہے، اس کا ایک نمونہ لارڈ برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰-۱۸۷۲) ہے۔ وہ انگلینڈ کے ایک دولت مند خاندان میں پیدا ہوا۔ اس نے اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی۔ اس کو نوبل انعام ملا جو آج کی دنیا میں سب سے بڑا علمی اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ اس نے مذہب کو چھوڑ دیا اور مادی سائنس میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر بھرپور عمر گزارنے کے باوجود اس کو وہ چیز نہیں ملی جس کو سکون کہا جاتا ہے۔ برٹرینڈ رسل کی طویل خود نوشت سوانح عمری کے آخر میں ہم اس کے ہاتھ سے یہ الفاظ لکھے ہوئے پاتے ہیں:

The inner failure has made my mental life a perpetual battle (p. 727).

اندرونی ناکامی نے میری ذہنی زندگی کو ایک مستقل جنگ میں مبتلا رکھا۔

گلیلیو اور سائنس

آپ سائنس کی تاریخ کی کسی کتاب میں گلیلیو (۱۶۴۲-۱۵۶۴) کا باب کھول کر دیکھیں تو وہاں آپ کو اس قسم کے الفاظ لکھے ہوئے ملیں گے:

His use of observation, experiment and mathematics helped lay foundation of modern science.

گلیلیو نے مشاہدہ اور تجربہ اور ریاضی کو جس طرح استعمال کیا اس نے جدید سائنس کی بنیاد رکھنے میں مدد دی۔

گلیلیو کا خاص کارنامہ کیا ہے۔ گلیلیو کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے چیزوں کی ابتدائی صفات کو، جو ابعاد (Dimensions) اور وزن (Weight) پر مشتمل ہیں اور جن کی آسانی سے پیمائش کی جا سکتی ہے، ان کو ان ثانوی صفات سے الگ کر دیا جو شکل، رنگ اور بو وغیرہ

تعلق رکھتی ہیں اور جن کی پیمائش نہیں کی جا سکتی۔ ایک لفظ میں یہ کہ اس نے کمیت کو کیفیت سے جدا کر دیا۔
گلیلیو کے اس فعل نے اس بات کو ممکن بنا دیا کہ آدمی میٹر کو استعمال کر سکے۔ بغیر اس کے کہ اس نے مادہ کے بارہ میں ضروری معلومات حاصل کی ہوں۔ اس طرح فطرت کو کام میں لانے کا دروازہ کھل گیا۔ ٹکنالوجی کو ترقی ہوئی اور بے شمار نئی نئی چیزیں بننے لگیں جو انسان کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔ مگر زیادہ مدت نہیں گزری کہ انسان کا عدم اطمینان ظاہر ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں سائنس داں یا انجینئر کا معاملہ اس جاہل بڑھئی سے کچھ بھی مختلف نہیں جو لکڑی کو کاٹ کر فرنیچر بناتا ہے، اگرچہ وہ لکڑی کی کیمسٹری کے بارہ میں کچھ نہیں جانتا۔

بعد کی تحقیقات نے بتایا کہ گلیلیو نے چیزوں کے جس ظاہری پہلو کو الگ کر کے اس کو سائنس کے مطالعہ کا موضوع بنایا تھا، اس کے بارہ میں بھی انسان کی معلومات حد درجہ ناقص ہیں۔ انسان نہ صرف پھول کی "خوشبو" سے بے خبر ہے بلکہ پھول کی "کیمسٹری" بھی بہت کم اس کے علم میں آتی ہے۔ ایک چیز جس کو متمدن دنیا کا انسان تین سو سال تک علم سمجھتا رہا وہ بھی آخر کار بے علمی ثابت ہوا۔ برٹرینڈ رسل نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے:

As is natural when one is trying to ignore a profound cause of unhappiness, I found impersonal reasons for gloom. I had been very full of personal misery in the early years of the century, but at that time I had a more or less Platonic philosophy which enabled me to see beauty in the extra-human universe. Mathematics and the stars consoled me when the human world seemed empty of comfort. But changes in my philosophy have robbed me of such consolations. Solipsism oppressed me, particularly after studying such interpretations of physics as that of Eddington. It seemed that what we had thought of as laws of nature were only linguistic conventions, and that physics was not really concerned with an external world. I do not mean that I quite believed this, but that it became a haunting nightmare, increasingly invading my imagination.
Bertrand Russell, *Autobiography*, Unwin Paperbacks, London, 1978, pp. 392-93

میں نے اپنی اداسی کے کچھ غیر شخصی اسباب پا لیے جیسا کہ عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب کہ آدمی ناخوشی کے ایک گہرے سبب کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں میں ذاتی پریشانیوں میں بہت زیادہ مبتلا رہا ہوں۔ مگر اس وقت میں کم و بیش افلاطونی

الرسالہ ۱۹۸۶

فلسفہ کا قائل تھا جس نے مجھے اس قابل بنائے رکھا کہ میں خارجی دنیا میں حسن کو دیکھ سکوں۔ ریاضیات اور ستاروں نے مجھے اس وقت تسکین دی جب کہ انسانی دنیا آسائش سے خالی نظر آتی تھی۔ مگر میرے فلسفہ میں تبدیلی نے اس قسم کی تسکین کو مجھ سے چھین لیا۔ خودی نے مجھ کو بالکل معطل کر دیا خاص طور پر اس وقت جب کہ میں نے طبیعیات کی ان تشریحوں کو پڑھا جو اڈنگٹن جیسے لوگوں نے کی ہیں۔ مجھ کو نظر آیا کہ جس چیز کو ہم نے فطرت کے قوانین سمجھا تھا وہ محض الفاظ کا معاملہ تھا۔ اور طبیعیات حقیقتہً کسی خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کو پوری طرح مانتا ہوں۔ مگر یہ میرے لیے ایک کابوس بن گیا جو میرا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ میرے تخیلات پر برابر حملہ کر رہا تھا۔

روحانی تسکین

جو سائنس خارجی دنیا کا علم دینے سے عاجز تھی وہ اس باطنی دنیا کا علم کیا دیتی جس کے بارہ میں اس نے گلیلیو ہی کے زمانہ میں عملی طور پر اپنی نارسائی کا اعلان کر دیا تھا۔ سائنس آدمی کو وہ جھوٹا اطمینان بھی نہ دے سکی جو مادی سطح پر بظاہر ایک انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ اور ذہنی اور روحانی سطح کا اطمینان تو نہ اس کے بس میں تھا اور نہ کبھی اس نے اس کو دینے کا دعویٰ کیا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب (سن لو کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے) یہی بات بائبل میں ان لفظوں میں آئی ہے: انسان صرف روٹی ہی سے جیتا نہیں رہتا بلکہ ہر بات سے جو خداوند کے منہ سے نکلتی ہے وہ جیتا رہتا ہے (استثنا ۸ : ۳) حضرت مسیح نے اسی بات کو ان لفظوں میں فرمایا: لکھا ہے کہ آدمی صرف روٹی ہی سے جیتا نہ رہے گا بلکہ ہر بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے (متی ۴ : ۴)

انسان اپنے ساتھ ایک مخصوص نفسیات رکھتا ہے۔ اس نفسیات سے وہ اپنے آپ کو جدا نہیں کر سکتا۔ یہ نفسیات ایک برتر تسکین کی طالب ہے۔ انسان کو مادی ساز و سامان کے ساتھ ایک عقیدہ اور ایک اصولِ حیات بھی درکار ہے۔ سائنس نے انسان کو جو کچھ دیا وہ اپنی آخری صورت میں بھی صرف مادی ساز و سامان تھا۔ سائنس انسان کو ایک قابل اعتماد عقیدہ نہ دے سکی۔

یہی وہ کمی ہے جس نے جدید دنیا کے بے شمار لوگوں کو غیر مطمئن کر رکھا ہے۔ باہر سے دیکھنے والوں کو ان کی زندگیاں پُر رونق نظر آتی ہیں۔ مگر اندر سے ان کی روح بالکل ویران ہو چکی ہے۔

اقدار کا مسئلہ

یہ مسئلہ جس سے آج کا انسان دوچار ہے، فلسفیانہ لفظ میں اس کو اقدار کا مسئلہ (Problem of values) کہا جا سکتا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ انسان ایک دہری مشکل سے دوچار ہے۔ وہ جانتا ہے مگر نہیں جانتا۔ معلومات کے ڈھیر کے درمیان وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کم سے کم اس پوزیشن میں ہوتا جا رہا ہے کہ یہ فیصلہ کر سکے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی چیز کو اچھا اور کسی چیز کو بُرا سمجھے۔ وہ اس تمیز کو کسی بھی طرح اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ مگر جب اپنی عقل یا اپنے علم کے ذریعہ وہ اس کو متعین کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کو متعین نہیں کر پاتا۔

جوزف وڈ کرچ نے اپنی کتاب " دور جدید کا مزاج " میں اس مسئلہ پر عقلی بحث کی ہے اس کا کہنا ہے کہ انسان اگرچہ باعتبار فطرت یہ یقین کرنے کی طرف مائل ہے کہ زندگی کا ایک مقصد ہے اور اچھائی اور برائی کا ایک معیار ہے۔ مگر سائنس اس کا کوئی حتمی جواب نہیں دیتی۔ سائنس کی ترقی اس کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کرتی جا رہی ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں اقدار اپنا کوئی موضوعی مقام (Objective status) نہیں رکھتیں۔ انسان اخلاقی معیاروں کی ضرورت محسوس کرتا ہے جس کے مطابق وہ زندگی گزارے۔ وہ وجدانی طور پر اس کی مستقل تلاش میں ہے۔ مگر سائنس کی دریافت کردہ دنیا میں خیر و شر کے تصورات کی کوئی جگہ نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک اخلاقی جانور ہے جو ایک ایسی کائنات میں ہے جہاں اخلاقی عنصر کا کوئی وجود نہیں :

Man is an ethical animal in a universe which contains no ethical element.
Joseph Wood Krutch,*The Modern Temper*, New York, 1929, p. 16

انسان چیزوں کی حقیقت کو جاننا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف چیزوں کے ڈھانچہ کا

علم دیتی ہے۔ انسان دنیا کے آغاز و انجام کو جاننا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف درمیانی مرحلہ کے بارہ میں کچھ باتیں بتاتی ہے۔ انسان چیزوں کی معنویت کو دریافت کرنا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف اس کی ظاہری ہیئت کا پتہ دیتی ہے۔ انسان پھول کی مہک کو سمجھنا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف پھول کی کیمسٹری سے آگاہ کرتی ہے۔ انسان ذہن اور روح کی گہرائی میں اترنا چاہتا ہے مگر سائنس صرف جسم کے مادی اجزاء کا تجزیہ اس کے سامنے پیش کرتی ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ انسان " خالق " کے بارہ میں جاننا چاہتا ہے اور سائنس اس کو صرف " مخلوق " کے بارہ میں بتا کر خاموش ہو جاتی ہے۔

یہی بات ہے جس کو ایک مغربی مفکر نے حسرت کے ساتھ اس فقرہ میں بیان کیا ہے —— جو اہم ہے وہ ناقابل دریافت ہے، اور جو قابل دریافت ہے وہ اہم نہیں :

The important is unknowable, and the knowable is unimportant.

اعلیٰ ذریعہ علم

یہی بے اطمینانی جدید دور کے تمام باشعور انسانوں کا پیچھا کیے ہوئے ہے۔ ان کی اکثریت اگرچہ مذہب کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے مگر انھوں نے یہ بات مان لی ہے کہ جس سائنسی ترقی کو انھوں نے انسانیت کے مسئلہ کا حل سمجھ لیا تھا وہ انسانیت کے مسئلہ کا حل نہ تھا۔ برٹرینڈ رسل نے مغربی فکر و فلسفہ پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں ہم اس کے اعتراف کے حسب ذیل کلمات پاتے ہیں :

> (Western philosophers) confess frankly that the human intellect is unable to find conclusive answers to many questions of profound importance to mankind, but they refuse to believe that there is some 'higher' way of knowledge, by which we can discover truths hidden from science and the intellect.
> **Bertrand Russell, *A History of Western Philosophy*, 1979, p. 789**

مغربی فلسفی کھلے طور پر اقرار کرتے ہیں کہ انسانی عقل کے بس سے باہر ہے کہ وہ ان بہت سے سوالات کا قطعی جواب پا سکے جو انسانیت کے لیے بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر وہ اس کو ماننے سے

انکار کرتے ہیں کہ سائنس کے علاوہ علم کا کوئی اور بلند تر طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے ہم ان سچائیوں کو دریافت کریں جو سائنس اور عقل کی دسترس میں نہیں آتیں ۔

آج کے انسان کو یہی بتانا اس کو سب سے بڑی چیز دینا ہے کہ ہاں ، یہاں ایک ایسا بلند تر طریقہ موجود ہے جس کے ذریعہ نامعلوم کو معلوم کیا جا سکے ۔ اور وہ الہام خداوندی ہے ۔ اور یہ الہام خداوندی جہاں اپنی محفوظ شکل میں موجود ہے وہ قرآن ہے ۔

قرآن پوری طرح اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے اور تقریباً ڈیڑھ ہزار برس سے مسلسل اپنی صداقت کو ثابت کر رہا ہے ، اس موضوع پر راقم الحروف نے اپنی کتاب "عظمت قرآن" اور دوسری کتابوں میں گفتگو کی ہے ۔ اس کی تفصیل ان کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے ۔

داخلی شہادت

اخلاقی یا مذہبی احساس انسان کے اندر بے حد طاقت ور ہے ۔ ماضی سے لے کر حال تک کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ احساس کسی طرح انسان کے اندر سے ختم نہیں ہوتا ۔ مزید یہ کہ یہ خالص انسانی خصوصیت ہے ۔ کسی بھی نوع کے جانور میں اب تک اخلاقی یا مذہبی شعور کا ہونا ثابت نہ کیا جا سکا ۔

الفرڈ رسل ویلس (۱۹۱۳ ـ ۱۸۲۲) مشہور ارتقا پسند عالم ہے ۔ تاہم وہ ڈاروِن کی طرح اس کا قائل نہ تھا کہ ذہن انسانی کی اعلیٰ اور نادر خصوصیات محض انتخاب طبیعی (Natural Selection) کا نتیجہ ہو سکتی ہیں ۔

اسی طرح اس نے لکھا ہے کہ افادیت کا مفروضہ جو کہ در اصل ذہن پر انتخاب طبیعی کے نظریہ کا انطباق ہے ، وہ انسان کے اندر اخلاقی شعور کی پیدائش کی تشریح کے لیے ناکافی معلوم ہوتا ہے ۔ اخلاقی شعور کو اس دنیا میں بے حد مشکلات کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے ۔ طرح طرح کے استثنائی حالات پیش آتے ہیں ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اخلاقی شعور کے تحت عمل کرنے والا موت سے دوچار ہوتا ہے یا برباد ہو کر رہ جاتا ہے ۔ ہم کیوں کر یقین کر سکتے ہیں کہ افادیت کا لحاظ ایک شخص کے اندر ایک اعلیٰ نیکی کے لیے اتنا پر اسرار تقدس پیدا کر سکتا ہے ۔ کیا افادیت آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کر سکتی ہے کہ وہ سچائی کو بذات خود مقصود و مطلوب سمجھے اور نتائج کا لحاظ کیے بغیر اس پر عمل کرے :

The utilitarian hypothesis, which is the theory of natural selection applied to mind, seems inadequate to account for the development of the moral sense. Such being the difficulties with which virtue (or the moral sense) has had to struggle, with so many exceptions to its practice, with so many instances in which it brought ruin or death to its too ardent devotee, how can we believe that considerations of utility could ever invest it with the mysterious sanctity of the highest virtue — could ever induce men to value truth for its own sake, and practice it regardless of consequences.

" ذہین کائنات " نامی کتاب کا مصنف فریڈ ہائل اپنے قیمتی مطالعہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے کہ اگر زمین کو کسی مزید اہمیت کا حامل بننا ہے ، اور انسان کو کائناتی اسکیم میں کوئی جگہ پانی ہے تو ضرورت ہوگی کہ ہم افادیت کے نظریہ کو مکمل طور پر ترک کر دیں۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ قدیم طرز کے مذہبی نظریات کی طرف واپسی کچھ مفید نہ ہوگی ، مگر ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ ایسا کیوں ہے کہ ویلس کے تشریح کے مطابق پر اسرار تقدس ہمارے اندر موجود رہتا ہے اور فردوسی دنیا کی طرف ہمیں اشارہ کرتا ہے کہ کیا ہم اس کی پیروی کریں گے :

If the Earth is to emerge as a place of added consequence, with man of some relevance in the cosmic scheme, we shall need to dispense entirely with the philosophy of opportunism. While it would be no advantage I believe to return to older religious concepts, we shall need to understand why it is that the mysterious sanctity described by Wallace persists within us, beckoning us to the Elysian fields, if only we will follow.
Fred Hoyle, *The Intelligent Universe*, Michael Joseph, London, 1983, p. 251

حقیقت یہ ہے کہ مذہب انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ وہ مذہب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج کا انسان بھی اتنا ہی زیادہ مذہب کا ضرورت مند ہے جتنا قدیم زمانہ کا انسان تھا۔ مزید یہ کہ سائنس کی طرف سے مایوسی نے اس کو مزید شدت کے ساتھ مذہب کا مشتاق بنا دیا ہے۔ مگر جدید انسان کی مشکل یہ ہے کہ وہ مذہب کے نام سے جس چیز کو جانتا ہے وہ صرف بگڑے ہوئے مذاہب ہیں۔ اور بگڑے ہوئے مذاہب کے ساتھ انسانی فطرت کو مطابقت نہیں۔ جدید انسان جب اندرونی تقاضے سے مجبور ہو کر مذہب کے بارہ میں سوچتا ہے تو اسی بگڑے ہوئے مذہب کی تصویر اس کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ مذہب سے قریب ہو کر دوبارہ مذہب

سے دور ہو جاتا ہے۔

اسلام ایک محفوظ مذہب ہے۔ وہ ان خرابیوں سے یکسر پاک ہے جو انسانی ملاوٹ کے نتیجہ میں دوسرے مذہبوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔ انسان کی فطرت جس مذہب کو تلاش کر رہی ہے وہ حقیقتہً اسلام ہی ہے۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اسلام کو اپنے خودساختہ جھگڑوں کا عنوان بنائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش ہی نہیں کیا، اور اگر پیش کیا تو بگڑی ہوئی خودساختہ صورت میں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو اسلام اور دوسرے مذہبوں میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اسلام کو اگر اس کی اصل صورت میں آج کے انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے تو وہ یقیناً اس کو اپنی طلب کا جواب پائے گا اور اس کی طرف دوڑ پڑے گا۔

مسلمان سائنس کے میدان میں دوسروں سے پچھڑ گئے ہیں مگر عقیدہ (نظریۂ حیات) کے معاملہ میں وہ آج بھی دوسروں سے آگے ہیں۔ وہ جدید دنیا کو وہ چیز دے سکتے ہیں جس کی آج اسے سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے آیا ہوا سچا دین، وہ دین جس کے اوپر آدمی اپنے لیے ایک پر اعتماد زندگی کی تعمیر کر سکے۔ یہ مقام آج مسلمانوں کے لیے خالی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ اہل عالم کے لیے نفع بخش بن سکتے ہیں۔ اور دوبارہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر سکتے ہیں کہ قدرت کا یہ قانون ان کے حق میں پورا ہو ——— واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۔ ۳۱
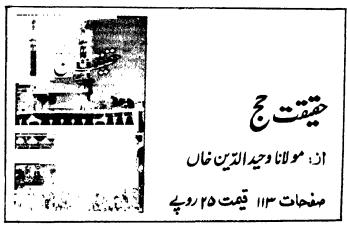
۱۔ ۷ اپریل ۱۹۸۷ کو ایران کے دو شخص عالم مرکز میں آئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ اسلامی مرکز کا لٹریچر ایران پہونچ چکا ہے اور پسند کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے "مذہب اور جدید چیلنج" کا ترجمہ فارسی زبان میں شائع کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ انھیں اس کی اجازت دیدی گئی ہے۔

۲۔ اسلامک کونسل آف انڈیا کی طرف سے ۱۷ ۔ ۱۹ اپریل ۱۹۸۷ کو دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس ہوئی۔ کونسل کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ ۱۸ اپریل اور ۱۹ اپریل کے اجلاس میں ان کی دو تقریریں ہوئیں۔ ۱۸ اپریل کے اجلاس میں انھیں اجلاس کا صدر مقرر کیا گیا۔

۳۔ ۲۲ اپریل ۱۹۸۷ کو نئی دہلی میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں ہندو اور مسلم دونوں طبقہ کے لوگ شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کا عنوان تھا: سماجی جھگڑے اور ان کا اسلامی حل۔

۴۔ ایک صاحب کشمیر سے لکھتے ہیں کہ میں الرسالہ کا مستقل قاری ہوں۔ الرسالہ کا مطالعہ میری روحانی غذا سے کم نہیں۔ الرسالہ دین اسلام کی بے آمیز دعوت کو فطرت کے ترازو میں تول کر عام کر رہا ہے۔ میرے والد صاحب حال میں انتقال کر گئے۔ کمزوری کی وجہ سے آنکھوں میں مطالعہ کرنے کی طاقت بھی نہ رہی تھی، پھر بھی وہ الرسالہ کا مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ اور جب آنکھیں تھک جاتیں تو مجھ سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ وہ ہمیشہ کہتے رہتے تھے کہ میری عمر ۹۵ سال ہے لیکن آج تک کبھی بھی میری نظروں سے الرسالہ جیسا رسالہ نہیں گزرا۔ (۱۲ فروری ۱۹۸۷)

۵۔ الرسالہ اور اسلامی مرکز کی مطبوعات کا جن مختلف صورتوں سے اعتراف کیا جا رہا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کثیر اشخاص اس کے مضامین کو اپنی تقریروں اور تحریروں میں بلا اعلان استعمال کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کراچی سے ایک کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ حال میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ایسی بہت سی عبارتیں شامل ہیں جو اسلامی مرکز کی کتاب سے ماخوذ ہیں، اگرچہ کہیں بھی ان کا حوالہ نہیں دیا گیا

ہے۔ عام زبان میں اس کو سرقہ کہتے ہیں مگر ہمارے نزدیک وہ اسلامی مرکز کی علمی و ...
اہمیت کا بالواسطہ اعتراف ہے۔

...علوم ہوا ہے کہ بعض لوگوں نے شادی کے موقع پر تحفہ کے لیے اسلامی مرکز کی کتابوں کا انتخا...
کیا۔ مثلاً انھوں نے دولہا کو "رازِ حیات" اور دلھن کو "خاتونِ اسلام" تحفہ میں دی۔
ایک مفید طریقہ ہے۔ ضرورت ہے کہ بڑے پیانہ پر اس کو اختیار کیا جائے۔

۷۔ الرسالہ انگریزی خدا کے فضل سے دن بدن وسیع تر حلقہ میں پھیلتا جا رہا ہے۔ بہت ...
لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ اسلام کے وسیع تر تعارف کا بہترین ذریعہ ہے۔ چنانچ...
اس کو اپنے ہندو اور عیسائی دوستوں کے نام جاری کروا رہے ہیں۔ اس طرح کی مثا...
تقریباً روزانہ سامنے آرہی ہیں۔ اس طریقہ کی ہر ایک کو تقلید کرنا چاہیے۔

۸۔ ایک صاحب چھنڈواڑہ سے لکھتے ہیں "خاتونِ اسلام کو پڑھا۔ واقعی اللہ نے بہت بڑا ک...
آپ سے لیا ہے۔ نئی نسل کی لڑکیوں کے لیے یہ بہترین کتاب ہے۔ بندہ کا سفر امسال انڈ...
کا ہوا۔ ملیشیا میں تو آپ کا لٹریچر الحمد للہ پہونچ رہا ہے۔ مگر شاید انڈونیشیا خالی ہے...
خاتونِ اسلام کے انگلش اڈیشن کو وہاں عام کرنا ضروری ہے۔ تبلیغی سفر میں خاص ...
سے بیرونِ ملک آپ کے لٹریچر سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اللہ پاک جزائے خیر عطا فرما...
(۴ شعبان ۱۴۰۷ھ)

۹۔ غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو سیرت النبی کا جلسہ ہوا۔ اس موق...
صدر اسلامی مرکز نے تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا "سیرت کا اخلاقی پہلو" حاضرین...
مسلمانوں کے ساتھ ہندو صاحبان بھی موجود تھے۔ لوگوں نے تقریر کو غیر معمولی طور پر پسن...
پروگرام کے ناظم صاحب کی طرف سے بعد کو شکریہ کا جو خط آیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں: "...
نہایت معلوماتی اور فکر انگیز تھی۔ بعد میں بہت سے حضرات نے جو مجھ سے ملے، تقریر کا...
اور آپ کو دوبارہ سننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میرے تمام ساتھی انتہائی مسرور و مم...
ہیں اور آپ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک اور محفل آراستہ ک...
جس کے لیے ایک بار پھر آپ کو زحمت دیں گے۔

۱۰۔ ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں بعض فرقہ وارانہ مسائل پر غور وفکر کے لیے ایک خصوصی میٹنگ تھی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذمہ دار افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو بھی مسلم سائڈ کی طرف سے شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس دعوت کے تحت وہ اس میٹنگ میں شریک ہوئے اور زیر بحث موضوع پر اسلامی نقطہ نظر کا اظہار کیا۔

۱۱۔ صدر اسلامی مرکز نے ۸ اپریل ۱۹۸۷ کو ایک پروگرام کے تحت اورنگ آباد اور جامیز اور جلگاؤں کا سفر کیا۔ اس کی مفصل روداد انشاء اللہ آئندہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۱۲۔ گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ۱۸ اپریل ۱۹۸۷ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے قرآن کا درس دیا۔ اس درس کا ٹیپ مرکز میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔

۱۳۔ شیخ سلیم احمد صاحب (نئی دہلی) اپنے خط مورخہ ۴ مئی ۱۹۸۷ میں لکھتے ہیں: آپ کی تصنیف "خاتونِ اسلام" پڑھی۔ ایک ہی نشست میں پوری کتاب ختم کر ڈالی۔ بہت پسند آئی۔ اس موضوع پر یہ کتاب حرفِ آخر ہے۔ ماہ مئی ۱۹۸۷ کے الرسالہ میں ایک سفر کے ذیل میں ہندستانی مسلمانوں کے تعلق سے جو باتیں (صفحہ ۳۵) پر آپ نے لکھی ہیں وہ بہت جرأت مندانہ ہیں۔ آج کے حالات میں اس طرح کی باتیں لکھنا اور کہنا بہت ضروری ہے۔ دراصل یہی باتیں آپ کو خط لکھنے کا محرک بنیں۔ بہت بہت مبارکباد۔

۱۴۔ ایک صاحب کشمیر سے اپنے خط (۲۷ اپریل ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں: پچھلے سال میرے ایک ہندو دوست نے فروری ۱۹۸۶ کا ایک الرسالہ مجھے دیا۔ پڑھ کر اس قدر حیرانی ہوئی کہ آج سے قبل میں کہاں تھا۔ مجھے یہ رسالہ پڑھنے کو کیوں نہ ملا۔ اس کو بار بار پڑھنے کا جی چاہتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ آج سے پہلے جتنے بھی شمارے شائع ہوئے سب کا سب پڑھ ڈالوں۔

۱۵۔ مذہب اور جدید چیلنج کا انگریزی ترجمہ God Arises کے نام سے زیر طبع ہے۔ اس میں اصل کے مقابلہ میں کافی اضافہ کر کے اس کو وقت کے مطابق بنا دیا گیا ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئولہ نے شری اوم انٹرپرائزز - پرائیویٹ لمیٹڈ - نئی دلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۸ جولائی ۱۹۸۷

فہرست

ماہنامہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون: 611128 697333

کتنا فرق

مکی دور کا واقعہ ہے۔ قریش کے مشرک سردار ولید بن مغیرہ کے پاس جمع ہوئے۔ انھوں نے مشورہ کیا کہ ہم محمدؐ کے بارے میں لوگوں سے کیا کہیں۔

کسی مشرک نے کہا کہ ہم یہ کہیں کہ وہ کاہن ہیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ خدا کی قسم وہ کاہن نہیں۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ ان کے یہاں نہ کاہنوں کا گنگنانا ہے اور نہ کاہنوں کی قافیہ پیمائی ہے۔ کسی نے کہا کہ ہم ان کو دیوانہ بتائیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ خدا کی قسم وہ دیوانہ نہیں۔ ہم نے دیوانوں کو دیکھا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ دیوانے کیسے ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ ہم ان کو شاعر کہیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم شعر کی تمام قسمیں رجز، ہزج، قریض، مقبوض، مبسوط سے واقف ہیں۔ ان کا کلام شعر بھی نہیں۔ کسی نے کہا کہ ہم ان کو جادوگر بتائیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ وہ جادوگر بھی نہیں ہیں۔ ہم نے جادو کو اور جادوگروں کو دیکھا ہے۔ ان کے یہاں نہ جادوگروں کی طرح پھونکنا ہے نہ ان کی طرح گرہیں لگانا۔

لوگوں نے کہا پھر اے ابو عبد شمس، آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کہیں۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ خدا کی قسم یہ بات نہیں۔ اور ان میں سے جو بات بھی تم کہوگے تو ضرور ان کا جھوٹ ہونا ظاہر ہو جائے گا (وما انتم بقائلین من ہذا شیئاً الا عرف انہ باطل، سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۸۴)

عرب کے مشرک سردار یہ جانتے تھے کہ وہ اپنے حریف (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف کچھ کہیں تو لوگ اسی وقت اس کو مانیں گے جب کہ وہ مطابق واقعہ ہو۔ اگر ان کی بات واقعہ کے خلاف ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف اور دشمنی کے باوجود کوئی اس کو نہیں مانے گا۔ یہ عرب کے مشرکین کا کردار تھا۔ آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے بڑے اگر کسی کے خلاف ایک بات کہہ دیں تو ان کے حلقہ کے لوگ فوراً اس کو مان کر دہرانے لگتے ہیں خواہ وہ بات نہ واقعہ کے مطابق ہو اور نہ کہنے والے نے اس کی نقلی یا عقلی دلیل پیش کی ہو۔

اختلاف کے باوجود

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تیسرے خلیفہ راشد تھے۔ آخر عمر میں بعض جھوٹی خبروں کی بنا پر مصر کے ایک ہزار سے زیادہ آدمی مدینہ آئے۔ انھوں نے مدینہ پہونچ کر کافی شور و غل کیا اور آخر کار حضرت عثمان کے مکان کو گھیر لیا۔ اگرچہ حضرت عثمان کے خلاف ان کا الزام سراسر بے بنیاد تھا، مگر یہ مسلمان آپ سے اتنا برہم ہوئے کہ آپ کا گھر سے نکلنا اور گھر میں پانی جانا بند کر دیا۔ یہاں تک کہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ ھ کو حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ بوقت وفات آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔

حضرت عثمان کا محاصرہ تقریباً ۴۰ دن تک جاری رہا تھا۔ بلوائیوں نے جب حضرت عثمان کو گھیر لیا اور مکان سے نکلنے پر پابندی لگا دی تو آپ کے لیے مسجد جانا ممکن نہ رہا۔ خلیفہ کی حیثیت سے نمازوں کی امامت آپ ہی فرماتے تھے۔ جب آپ کا مسجد جانا بند ہو گیا تو بلوائیوں کا سردار غافقی بن حرب عکی امام بن گیا۔ اس نے مدینہ کی مسجد میں نمازوں کی امامت شروع کر دی۔

یہ مدینہ کے مسلمانوں کے لیے بڑی سخت آزمائش کی بات تھی۔ ایک طرف وہ اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں، دوسری طرف وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک شخص جو کھلا ہوا مفسد اور غلط کار ہے، وہی مسجد کا امام بنا ہوا ہے۔ اس نازک حالت میں ایک شخص حضرت عثمان سے ملا اور ان سے پوچھا کہ ایسی حالت میں ہم کیا کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں یہ ہدایت فرمائی کہ تم لوگ اس کے پیچھے نماز ادا کرو۔ آپ نے فرمایا:

اذا ھُم احسنوا فاحسن معھم وان ھم اساؤا فاجتنب اساءتھم

جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں تو اس میں ان کا ساتھ دو اور جب وہ لوگ کوئی برا کام کریں تو ان کی برائی سے دور رہو۔

خلیفہ راشد کے اس واقعہ میں عظیم الشان نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص سے ہمیں خواہ کتنی ہی زیادہ شکایت ہو، اس کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے ہمیں ہمیشہ انصاف پر قائم رہنا چاہیے۔ ہمیں اپنے اختلاف کو حد کے اندر رکھنا چاہیے نہ یہ کہ اختلاف پیدا ہونے کے بعد ہم حد کے باہر نکل جائیں۔

ایک اقتباس

میں نے چند سال ہوئے اندور میں ٹیگور ہال میں پیامِ انسانیت پر تقریر کی۔ اس موقع پر آر ایس ایس کے لوگ اور دوسری جماعتوں کے لوگ موجود تھے۔ اگلے دن ایک وفد میری قیام گاہ پر آیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس میں آر ایس ایس کے لیڈر اور اس کے ذمہ دار ہیں۔ اور مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ "کل آپ کی تقریر سن کر ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ آپ کو اس ملک کی ہم سے زیادہ فکر ہے۔" میں اس تاثر اور شہادت کو اپنے ہی لیے نہیں پوری ملتِ اسلامیہ کے لیے ایک بڑا اعتراف اور قابلِ فخر نہیں تو قابلِ شکر سند سمجھتا ہوں۔ ضرورت ہے کہ آپ کی ہر بات سے اس کا اظہار ہو اور یہاں کے شہری یہ سمجھیں کہ آپ کو اس ملک کی اُن سے زیادہ فکر ہے۔ آپ کو دولت سے زیادہ ملک عزیز ہے۔ آپ کو یہ معاشرہ عزیز ہے۔ لوگوں کا عزت کے ساتھ، سکون کے ساتھ، امن و امان کے ساتھ رہنا آپ کو دولت کمانے سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جو مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ لوگوں میں بھی یہ بات نہیں رہی۔ وہ بے تکلف اپنی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے اس سطح پر آجاتے ہیں، اور وہ کام کر لیتے ہیں جس سے ملک خطرہ میں پڑجاتا ہے۔ معاشرہ بری طرح زوال کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ اور پوری پوری کمیونٹی بلکہ ملک کی اس عظیم آبادی میں اس صورتِ حال سے حقیقی طور پر مضطرب و بے چین ہونے والا، اور اپنی کمیونٹی، پارٹی فرقہ اور جماعت کی ملامت و تنقید یا مدح و تعریف سے بے پروا و بے نیاز ہو کر تنقید و احتساب کا فرض ادا کرنے والا اور خطرہ کا بگل بجانے والا دور دور نظر نہیں آتا۔

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

کھونے کے بعد بھی

اے پی (لندن) کی فراہم کردہ ایک خبر حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوئی ہے ——
مسٹر اسٹینلی جاکی ہنگری میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک سیاہ پوش راہب، عیسائی عالم اور فزکس کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دس سال تک آواز سے محرومی ان کے لیے ان کی سائنس اور مذہب سے متعلق تحریروں پر دو لاکھ ۲۰ ہزار ڈالر جیتنے کا ذریعہ بن گئی۔ ۱۹۵۳ میں میرے گلے پر سرجری کے ایک حادثہ نے مجھے وقت دیا کہ میں لکھوں اور میں سوچوں۔ اور ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ بہت سے انتہائی مقبول کتابوں کے مصنف ایسے ہیں جو بالکل نہیں سوچتے، انھوں نے کہا۔ مسٹر جاکی جنھوں نے مذہب میں ترقی پر ٹمپلٹن انعام حاصل کیا ہے، یقین رکھتے ہیں کہ عیسائیت نے وہ ذہنی فضا پیدا کی جس نے سائنس کو ترقی کا موقع دیا۔ وہ اس خیال کے سخت ناقد ہیں کہ سائنس اور خدا ایک دوسرے سے غیر متعلق چیزیں ہیں:

Mr Stanley L. Jali, a Hungarian-born Benedictine monk, theologian and physics professor, says losing his voice for ten years helped him win a $ 220,000 prize for his writings on science and faith. "A surgical mishap on my throat in 1953 gave me time to write and to think, and that's not always the case. Many writers of best-sellers don't think at all," the scholar said. Mr Jaki, who won the Templeton prize for progress in religion, holds that Christianity created the intellectual climate which allowed science to flourish. He is a stern critic of the view that science and God are unrelated.
The Times of India, (New Delhi, May 14, 1987

مسٹر جاکی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا کہ غلط آپریشن کی وجہ سے ان کی بولنے کی صلاحیت ختم ہوگئی۔ مگر ان کے سوچنے اور پڑھنے کی صلاحیت بدستور باقی تھی۔ انھوں نے اس بچی ہوئی صلاحیت کو بھرپور طور پر استعمال کیا۔ دس سال کی خاموش محنت سے انھوں نے ایک ایسی کتاب لکھی جس کا انعام سوا دو لاکھ ڈالر تھا۔ حادثہ کے بعد جو لوگ کھوئی ہوئی چیز کا غم کریں وہ صرف اپنی بربادی میں اضافہ کرتے ہیں۔ جو لوگ حادثہ پیش آنے کے بعد بچی ہوئی چیز پر اپنی ساری توجہ لگا دیں وہ از سر نو کامیابی کی منزل پر پہونچ جاتے ہیں۔

الرسالہ جولائی ۱۹۸۷

اعتراف

سید مشتاق علی کرکٹ کے انتہائی مشہور کھلاڑی ہیں۔ مسٹر شرد ورما نے ان سے انٹرویو لیا جو ہندستان ٹائمس (۱۵ مئی ۱۹۸۷) میں شائع ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہماری کرکٹ کی تاریخ میں بہت کم افراد نے وہ غیر معمولی مقام حاصل کیا ہے جو سید مشتاق علی نے حاصل کیا۔ تقریباً بیس سال تک وہ کرکٹ کے ہیرو بنے رہے۔ ان کے متعلق سر کارڈوس (Sir Neville Cardus) نے کہا تھا کہ مشتاق گویا کہ ایک بازیگر ہے جو کامیابی حاصل کرنے کے لیے ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ اسی طرح کیتھ ملر (Keith Miller) نے کہا کہ وہ ہمارے وقت کے ناقابل یقین حد تک اچھے کھلاڑی ہیں۔

سید مشتاق علی کی شہرت ۱۹۳۰ میں شروع ہوئی جب کہ ان کی عمر صرف ۱۶ سال تھی۔ وہ اگرچہ کم کھیلتے تھے۔ مگر جب کھیلتے تھے تو ان کا کھیل سب سے زیادہ ممتاز ہوتا تھا۔ ۴۶-۱۹۴۵ میں کلکتہ میں آسٹریلیا کی ٹیم اور ہندستان کی ٹیم کا مقابلہ تھا۔ سید مشتاق علی کو ہندستان کی ٹیم سے خارج کر دیا گیا۔ اس پر کلکتہ میں زبردست مظاہرے ہوئے اور ہر طرف یہ نعرہ گونج اٹھا :

No Mushtaq, No Test

آخر کار منتظمین نے سید مشتاق علی کو ٹیم میں شامل کیا۔ اب سید مشتاق علی کی عمر ۷۲ سال ہو چکی ہے۔ مسٹر شرد ورما سے اپنے حالات بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ایک بار انگلینڈ میں ہندستانی اور انگریزی ٹیم کا مقابلہ تھا۔ انگریزی ٹیم کے کپتان ویلی ہمنڈ (Wally Hammond) تھے۔ سید مشتاق علی نے رن بنانے شروع کیے۔ یہاں تک کہ وہ نوّے سے آگے بڑھ گیے۔ ویلی ہمنڈ اگرچہ مخالف ٹیم کے کپتان تھے، وہ اپنے جذبہ اعتراف کو روک نہ سکے۔ انھوں نے تیزی سے آکر مشتاق علی کا کندھا تھپتھپایا اور کہا کہ جمے رہو، میرے بیٹے جمے رہو، اپنا سو پورا کرو :

Steady, my boy, steady, get your hundred first.

مردہ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت بے اعترافی ہے اور زندہ انسان کی سب سے بڑی خصوصیت اعتراف۔ زندہ انسان کے سامنے ایک حقیقت آئے یا وہ ایک خوبی کا مشاہدہ کرے تو وہ اس کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا، خواہ یہ اعتراف اپنی ہار ماننے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

الرسالہ جولائی ۱۹۸۷

ابتدائی عمل

کپڑے کی صنعت سے جو بے شمار کام متعلق ہیں ان میں سے ایک اہم کام کپڑے کی رنگائی ہے۔ مثلاً بہت سی ساڑیاں ابتداءً کپاس کے سادہ رنگ میں تیار کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ان پر رنگ چڑھاکر ان کو جاذب بنایا جاتا ہے۔ رنگائی کا یہ کام اس طرح نہیں ہوتا کہ بنی ہوئی ساڑی کو لے کر رنگ کے حوض میں ڈال دیا۔ اگر ایسا کیا جائے تو کبھی اچھا رنگ نہیں آئے گا۔ رنگائی کرنے سے پہلے سادہ ساڑی کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ تیاری کے اس عمل کی تکمیل کے بعد ہی کپڑا اس قابل ہوتا ہے کہ اس کو رنگائی کے آخری مرحلہ میں داخل کیا جائے۔

اس پیشگی عمل کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً کپڑے کو نرم کرنا، داغ دھبہ مٹانا، اس کو سفید بنانا۔ اس سے کپڑے کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ رنگ کو زیادہ سے زیادہ جذب کرسکے۔ ان پیشگی تیاریوں کا بعد کی رنگائی اور چھپائی سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ یہ معلوم کیا گیا ہے کہ رنگے ہوئے کپڑوں کی ۷۰ فی صد خرابیوں کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ابتدائی کپڑے کو ناقص طور پر تیار کیا گیا تھا:

These pretreatments have a major role on subsequent dyeing, printing and finishing of cotton fabrics. In fact, it has been reported that 70% of all the defects occurring on dyed-finished fabrics could be attributed to the imperfect preparation of the base fabrics.
Monthly COLOURAGE, December 1, 1983

کپاس اور کپڑے کا یہ مزاج براہ راست خداوند عالم کا پیدا کیا ہوا ہے۔ یہ ایک عالمی قانون ہے جس سے موافقت کرکے انسان اپنی پسند کے کپڑے تیار کرتا ہے۔ اس طرح گویا خدا نے ایک نشانی قائم کردی ہے جو بتارہی ہے کہ زندگی کی تعمیر کے لیے ہمیں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ زندگی کی تعمیر میں بھی ضروری ہے کہ پہلے تیاری کے مراحل طے کیے جائیں۔ تیاری کی شرطیں پوری کرنے کے بعد ہی وہ وقت آتا ہے جب کہ اگلے مرحلہ کی طرف پیش قدمی کی جائے اور وہ کامیابی حاصل کی جائے جو مطلوب ہے۔ ابتدائی مراحل طے کیے بغیر کبھی آخری منزل نہیں آتی۔

سیاسی خواب

پنڈت جواہر لال نہرو کی مشہور کتاب ہے جس کا نام ہے ہندستان کی دریافت (The Discovery of India) یہ کتاب انھوں نے ۱۹۴۴ میں قلعہ احمد نگر کی اسیری کے زمانہ میں لکھی تھی۔ کتاب کو اشاعت کے لیے دیتے ہوئے اس کی آخری سطریں انھوں نے ۲۹ دسمبر ۱۹۴۵ کو الٰہ آباد میں لکھی تھیں جو کتاب کے خاتمہ پر شامل ہیں۔ اس تحریر کا آخری پیراگراف یہ تھا :

> We are on the eve of general elections in India and these elections absorb attention. But the elections will be over soon — and then? The coming year is likely to be one of storm and trouble, of conflict and turmoil. There is going to be no peace in India or elsewhere except on the basis of freedom (p. 568).

ہم ہندستان کے عام انتخابات کے عین قریب ہیں۔ اس الکشن نے توجہات کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ مگر الکشن جلد ہی ختم ہو جائیں گے —— پھر اس کے بعد۔ آنے والا سال کش مکش اور اضطراب کے طوفانوں کا سال ہوگا۔ ہندستان یا دوسرے مقامات پر امن صرف آزادی ہی کی بنیاد پر آسکتا ہے۔

ان سطروں کو لکھنے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہندستان نے آزادی حاصل کر لی۔ اور خود نہرو کو اپنی آخر عمر تک بلا شرکت ملک پر حکومت کرنے کا موقع ملا۔ ان کے بعد بھی ان کے قریب ترین تربیت یافتہ افراد ملک کے اقتدار پر قابض رہے۔ مگر وہ چیز جس کو امن کہا جاتا ہے وہ آج اس سے بھی زیادہ دور ہے جتنا وہ دسمبر ۱۹۴۵ میں نظر آتا تھا۔ ہندستان کو آزادی مل گئی مگر اس کو امن حاصل نہ ہو سکا۔

پُرجوش لیڈر اکثر سیاسی تبدیلی کو حالات کی تبدیلی کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ سیاسی تبدیلی صرف حکومتی افراد کی تبدیلی ہے۔ اس کا حقیقی حالات کی تبدیلی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ سیاسی انقلاب صرف اس وقت مفید ہوتا ہے جب کہ اس سے پہلے اخلاقی انقلاب لایا جا چکا ہو۔ افراد کے اندر اخلاقی انقلاب لائے بغیر سیاسی انقلاب کے کوئی معنی نہیں۔

عظمتِ انسانی

اسلام کی تاریخ، ایک اعتبار سے، انسانی عظمت کی تاریخ ہے۔ اسلام نے ان اوصاف کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کی ہیں جن کو انسانی اوصاف کہا جاتا ہے۔ یہاں ہم اس بات کی وضاحت کے لیے چند مثالیں نقل کریں گے۔

اعتماد و توکل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تبلیغ کے تقریباً بارہ سال اسی شہر میں گزارے۔ اس زمانہ میں مکہ پر مشرکوں کا غلبہ تھا۔ انھوں نے آپ کو سخت تکلیفیں پہونچائیں۔ یہاں تک کہ آپ کو مار ڈالنے کے درپے ہوگئے۔ جب یہ نوبت آگئی تو آپ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔

اس وقت حالات اتنے سخت تھے کہ مکہ سے نکل کر سیدھے مدینہ جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے آپ جب مکہ چھوڑ کر نکلے تو ابتداءً تین دن تک غار ثور میں مقیم رہے جو ایک دشوار گزار پہاڑ کے اوپر ایک تنگ مقام پر واقع تھا۔ تاہم آپ کے دشمن آپ کو تلاش کرتے ہوئے وہاں بھی پہونچ گئے۔ آپ اپنے رفیق حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ غار میں تھے اور آپ کے دشمن تلواریں لیے ہوئے غار سے اتنے قریب کھڑے ہوئے تھے کہ آپ ان کے قدموں کو دیکھ سکتے تھے۔ تمام ظاہری قرائن کے مطابق ہلاکت آپ کے بالکل قریب پہونچ چکی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق کو یہ صورت حال دیکھ کر سخت تشویش ہوئی۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وہ تو یہاں بھی آگیے۔ آپ نے نہایت سکون کے ساتھ جواب دیا: یا ابا بکر ماظنك باثنین اللّٰہ ثالثھما (اے ابوبکر تمہارا ان دو کے بارے میں کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہو)

یہ فقرہ بلاشبہ توکل و اعتماد کا انتہائی کامل نمونہ ہے۔ اس واقعہ میں انسان توکل کے اس آخری مقام پر نظر آتا ہے جس کے آگے اس اعلیٰ انسانی صفت کا کوئی درجہ نہیں۔

معبود کی یکتائی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں مدینہ میں ہوئی۔ اس وقت لوگوں کے اوپر عجیب دیوانگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ بہت سے لوگوں کو یہ یقین ہی نہ آتا تھا کہ آپ کا انتقال ہوسکتا

ہے یا انتقال ہوگیا ہے۔ حضرت عمر فاروق اس معاملہ میں سب سے آگے تھے۔ وہ مدینہ کی مسجد نبوی میں تلوار لے کر کھڑے ہوگیے اور کہنے لگے کہ جو شخص کہے گا کہ رسول اللہ کی وفات ہوگئی ہے میں اس کی تلوار سے اس کی گردن مار دوں گا۔

مسجد نبوی میں زبردست خلفشار جاری تھا۔ لوگ سخت مبہوت نظر آرہے تھے۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق وہاں آئے۔ انھوں نے صورت حال کا جائزہ لیا اور اس کے بعد مسجد کے ایک طرف تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوگیے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے یہ تاریخی جملہ کہا: من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن کان یعبد اللّٰہ فان اللّٰہ حی لا یموت (جو شخص محمد کی عبادت کرتا تھا تو محمد کا انتقال ہوگیا اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے۔ اس پر کبھی موت آنے والی نہیں)

اس واقعہ میں انسان معرفت الٰہی کے آخری درجہ پر نظر آتا ہے۔ انسان انسان ہے اور خدا خدا ہے۔ اس حقیقت کو جاننا ہی اصل علم ہے۔ اور یہ واقعہ اس اصل علم کی آخری شاندار مثال ہے۔

حق کے آگے ڈھ پڑنا

اوپر جو واقعہ نقل کیا گیا اس موقع پر حضرت عمر فاروق کا کردار ابتداءً بے حد انتہا پسندانہ تھا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ پیغمبر اسلام کا جسم بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔ مگر انھیں یقین نہیں آیا کہ یہ آپ کی وفات کا واقعہ ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ ایک قسم کی روحانی معراج کا واقعہ ہے آپ اپنے رب کے پاس گیے ہیں اور جلد ہی دوبارہ زمین پر واپس آئیں گے۔

وہ اس معاملہ میں کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے حتی کہ حضرت ابوبکر صدیق کی بھی نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے مسجد نبوی میں داخل ہوکر ان کو چپ ہونے کے لیے کہا۔ مگر وہ چپ ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ان کا ہاتھ تلوار کے دستہ پر تھا اور ان کی زبان بے تکان بولے چلی جارہی تھی۔ لمحہ تھا جب کہ حضرت ابوبکر صدیق مسجد نبوی میں تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے حضرت عمر فاروق کی آواز پر اپنی آواز کو تیز کرتے ہوئے اپنی تقریر شروع کردی۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق تقریر کرتے ہوئے اس آیت تک پہونچے: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افا مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن ینقلب علیٰ عقبیہ فلن یضرّ اللّٰہ شیئاً وسیجز

اللہ الشاکرین۔ (محمد تو صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر وہ مرجائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو شخص الٹے پاؤں پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو ضرور بدلہ دے گا۔

قرآن کی اس آیت کا سننا تھا کہ فوراً حضرت عمر فاروق ٹھنڈے ہو گئے۔ بعد کے زمانہ میں انھوں نے اپنا اس وقت کا حال بتاتے ہوئے کہا: وقعتُ علی الارض وما تحملنی رجلای (میں زمین پر گر پڑا، میرے پاؤں میرا بوجھ نہ سنبھال سکے)

اس واقعہ میں انسان عبدیت کے آخری مقام پر نظر آتا ہے۔ عبدیت یہ ہے کہ انسان خدا کے آگے ڈھ پڑے۔ حضرت عمر فاروق یہی انسان ثابت ہوئے۔ وہ خدا کا کلام سن کر بالکل لفظی طور پر زمین پر گر پڑے۔ اپنی رائے کو انھوں نے اپنے دماغ سے اس طرح نکال دیا جیسے کہ وہ ان کے دماغ میں کبھی تھی ہی نہیں۔

حقیقت پسندی

حضرت حسن حضرت علی کی شہادت کے بعد خلیفہ مقرر ہوئے۔ وہ اسلامی تاریخ کے پانچویں خلیفہ تھے۔ انھیں تمام شرعی اور اخلاقی اصولوں کے مطابق خلافت پر قائم رہنے کا حق حاصل تھا۔ مگر جب انھیں خلافت ملی تو صورت حال یہ تھی کہ حضرت امیر معاویہ جو اس وقت شام کے حاکم تھے، انھوں نے خلافت سے باقاعدہ بغاوت کر دی۔ خونِ عثمان کا بدلہ لینے کے نام پر انھوں نے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ کر لیا۔

حضرت حسن بن علی نے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ چالیس ہزار کی فوج ان کے ساتھ ہے اسی طرح حضرت امیر معاویہ کے ساتھ بھی تقریباً اتنے ہی آدمی تھے۔ یہ دونوں فوجیں جوش وجذبہ سے بھری ہوئی تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف لڑنے کے لیے بے قرار تھیں۔ مگر حضرت حسن نے سوچا کہ یہ دونوں کے دونوں مسلمان ہیں۔ جنگ کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان آپس میں لڑیں۔ وہ قیمتی افراد جو اسلام کے جھنڈے کے نیچے اس لیے جمع ہوئے تھے کہ وہ دنیا سے شرک کا خاتمہ کریں وہ خود اپنے آپ کو اور اسی کے ساتھ اسلامی تاریخ کو ختم کر ڈالیں گے۔

حضرت حسن کی حیثیت جائز خلیفۂ اسلام کی تھی۔ جب کہ امیر معاویہ کی حیثیت یقینی طور پر

باعث کی تھی مگر حضرت حسن نے بجا طور پر یہ اندازہ لگایا کہ حضرت امیر معاویہ کسی قیمت پر جھکنے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ وہ ہر حال میں لڑائی کو جاری رکھیں گے خواہ اس کا نتیجہ مسلم سپاہیوں کی عام بربادی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حضرت حسن نے خود اپنے آپ کو جھکانے پر راضی کر لیا۔ مسلمانوں کو باہمی قتل و خون سے بچانے کے لیے انھوں نے یک طرفہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔

یہ حقیقت پسندی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ یہاں انسان حقیقت پسندی کی اعلیٰ ترین سطح پر آتا ہے، وہ سطح جہاں انسان اپنے آپ کو حذف کر کے سوچ سکتا ہے۔ حضرت حسن نے اپنے آپ کو حذف کر کے سوچا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو راضی کر سکے جس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

احترام انسانیت

خلیفۂ ثانی عمر فاروقؓ کے زمانہ میں حضرت عمرو بن العاص مصر کے گورنر تھے۔ انھوں نے ایک بار گھوڑوں کی دوڑ کرائی۔ اس دوڑ میں گورنر کے بیٹے کا گھوڑا بھی شریک تھا۔ مگر جب دوڑ ہوئی تو ایک مصری (غیر مسلم) کا گھوڑا آگے بڑھ گیا۔ مصری نے فتح کے جوش میں کوئی ایسا جملہ کہا جو گورنر کے صاحبزادے (محمد بن عمرو بن العاص) کو برا معلوم ہوا اور انھوں نے مذکورہ مصری کو کوڑے سے مار دیا۔ مارتے ہوئے ان کی زبان سے نکلا: خذها وانا ابن الاکرمین (یہ لو، اور میں شریفوں کی اولاد ہوں)

حضرت انس بن مالک اس قصہ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مصری (غیر مسلم) مصر سے چل کر مدینہ پہونچا اور خلیفہ ثانی عمر فاروق سے شکایت کی کہ گورنر کے لڑکے نے اس طرح اس کو کوڑے سے مارا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرو۔ اور فوراً اپنے ایک خاص آدمی کو مصر بھیجا کہ عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے محمد بن عمرو جس حال میں ہوں اسی حال میں ان کو لے کر مدینہ آؤ۔ چنانچہ وہ لوگ لائے گیے۔ وہ مدینہ پہونچے تو حضرت عمر نے فرمایا: این المصری، دونك الدرة فاضرب بها ابن الاکرمین (مصری کہاں ہے۔ یہ کوڑا لو اور اس سے شریف زادہ کو مارو)

اس کے بعد مصری نے کوڑا لیا اور گورنر مصر کے سامنے ان کے صاحبزادہ کو مارنا شروع کیا۔ وہ مارتا رہا، یہاں تک کہ ان کو زخمی کر دیا۔ حضرت عمر درمیان میں کہتے جاتے تھے کہ شریف زادہ کو مارو۔ جب وہ خوب مار چکا تو حضرت عمر فاروق نے کہا کہ ان کے والد عمرو بن العاص کے سر پر بھی مارو

کیوں کہ خدا کی قسم ان کے بیٹے نے صرف اپنے باپ کی بڑائی کے زور پر تم کو مارا تھا۔ (فواللہ ماضربك ابنہ الا بفضل سلطانہ)

مصری نے کہا کہ اے امیر المومنین، جس نے مجھ کو مارا تھا اس کو میں نے مار لیا۔ اس سے زیادہ کی مجھے حاجت نہیں۔ حضرت عمر نے کہا: خدا کی قسم اگر تم ان کو بھی مارتے تو ہم تمہارے اور ان کے درمیان حائل نہ ہوتے، یہاں تک کہ تم خود ہی ان کو چھوڑ دو۔ پھر آپ نے عمرو بن العاص سے مخاطب ہو کر فرمایا: یا عمرو، متی تعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا (اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، حالاں کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا)

یہ واقعہ انسانی احترام اور انسانی برابری کی آخری اعلیٰ مثال ہے۔ اس واقعہ نے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ہر قسم کے فرق کو عملاً ختم کر دیا۔ اس نے انسانی عدل و انصاف کی ایسی نظیر قائم کر دی جس کے آگے انسانی عدل و انصاف کا کوئی اور درجہ نہیں۔

بے غرضی

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں قحط پڑا اور لوگ سخت پریشان ہو گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ نہ گھبراؤ۔ اللہ جلد ہی تمہارے لئے کشادگی کی صورت پیدا کر دے گا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ شام سے آیا، اس میں ایک ہزار اونٹ تھے اور سب کے سب گیہوں اور کھانے کی چیزوں سے لدے ہوئے تھے۔ یہ خبر مدینہ میں پھیلی تو شہر کے تاجر عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے۔ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آئے۔ ان کے پاس ایک چادر تھی جس کو وہ اپنے کندھے پر اس طرح ڈالے ہوئے تھے کہ اس کا ایک سرا سامنے کی طرف لٹک رہا تھا اور دوسرا سرا پیچھے کی طرف۔

عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم لوگ کیوں آئے ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ تاجروں نے کہا: ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ آپ کے پاس ایک ہزار اونٹ گیہوں اور غذائی سامان آیا ہے۔ ہم ان کو خریدنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمارے ہاتھ یہ غذائی سامان بیچ دیں تاکہ ہم اس کو مدینہ کے ضرورت مندوں تک پہنچا سکیں۔

عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اندر آؤ اور گھر میں بیٹھ کر بات کرو۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ غذائی اشیاء کے ایک ہزار ڈھیر گھر کے اندر پڑے ہوئے ہیں۔

اب بات چیت شروع ہوئی۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: میری شام کی خریداری پر تم مجھ کو کتنا زیادہ

نفع دوگے۔ انھوں نے کہا: دس درہم پر بارہ درہم۔عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھ کو اس سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا: دس درہم پر چودہ درہم۔ حضرت عثمان نے کہا مجھ کو اس سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا اچھا دس درہم پر پندرہ درہم۔ حضرت عثمان نے کہا کہ مجھ کو اس سے بھی زیادہ مل رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کون آپ کو اس سے زیادہ دے رہا ہے۔ جب کہ مدینہ کے جتنے تاجر ہیں سب یہاں جمع ہیں۔ حضرت عثمان نے کہا کہ مجھ کو ہر ایک درہم کے بدلے دس درہم مل رہا ہے۔ پھر کیا تم اس سے زیادہ دے سکتے ہو۔ انھوں نے کہا نہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ اللہ نے اپنی کتاب پاک میں فرمایا ہے کہ جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لئے اس کا دس گنا بدلہ ہے (انعام ۱۶۰) تو اے مدینہ کے تاجرو! گواہ رہو کہ میں نے یہ تمام غذائی سامان اللہ کے لئے شہر کے ضرورت مندوں پر صدقہ کر دیا (العبقریات الاسلامیہ صفحہ ۵۰۲)

یہ واقعہ خدا کے وعدہ پر یقین کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ خدا پر ایمان آدمی کے اندر اسی قسم کا یقین و اعتماد پیدا کرتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر اس قسم کا یقین و اعتماد پیدا ہو جائے وہ اغراض و مصالح سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اس کے حوصلے اتنا زیادہ بلند ہو جاتے ہیں کہ اس کے بعد بڑی سے بڑی قربانی بھی اس کے لیے مشکل چیز نہیں رہتی۔

عدل وانصاف

حضرت عمر بن عبد العزیز (۱۰۱ - ۶۲ ھ) پانچویں خلیفہ راشد ہیں۔ آپ کے خادم ابوامیہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز آپ کی اہلیہ سے کہا کہ مسور کی دال کھاتے کھاتے میرا برا حال ہو گیا ہے۔ خاتون نے جواب دیا: تمھارے خلیفہ کا بھی روز کا کھانا یہی ہے۔ آپ سے پہلے خلیفہ کی حفاظت کے لئے ایک سو سپاہی مقرر تھے، جب آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے سب کو دوسرے سرکاری کاموں میں لگا دیا اور فرمایا: میری حفاظت کے لئے قضاو قدر ہی کافی ہے۔ یہ اس شخص کا حال تھا جس کی سلطنت کے حدود سندھ سے لے کر فرانس تک پھیلے ہوئے تھے۔

آپ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ سمرقند کے باشندوں کا ایک وفد آیا۔ اس نے ایک فوجی سردار قتیبہ بن مسلم باہلی کے بارے میں یہ شکایت کی کہ اسلامی قاعدہ کے مطابق انھوں نے ہم کو پیشگی تنبیہ نہیں کی اور ہمارے شہر میں اچانک اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ لہذا ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔ سمرقند کی فتح حضرت عمر بن عبد العزیز سے پہلے ہوئی تھی۔ اور اب اس پر سات سال گزر چکے تھے۔ مگر آپ نے انصاف کے

تقاضے کو پورا کرنا ضروری سمجھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے عراق کے حاکم کو لکھا کہ سمرقند کے لوگوں کے مقدمہ کی سماعت کے لئے ایک خصوصی قاضی مقرر کریں۔ عراق کے حاکم نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جمیع بن حاضر الباہلی کو اس کا قاضی مقرر کیا۔ ان کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ دونوں فریق نے آزادانہ طور پر اپنے اپنے دلائل پیش کئے۔ آخر میں قاضی نے سمرقند والوں کی شکایت کو درست قرار دیتے ہوئے فیصلہ سنایا کہ ——

مسلمانوں کی فوج سمرقند کو چھوڑ کر باہر آجائے اور اہل سمرقند کو ان کا قلعہ اور تمام دوسری چیزیں واپس کر دی جائیں۔ اس کے بعد اسلامی قاعدہ کے مطابق مسلمانوں کا فوجی سردار ان کے سامنے ضروری شرطیں پیش کرے۔ اگر وہ تمام شرطوں کو ماننے سے انکار کر دیں تو پھر اس کے بعد ان سے جنگ کی جائے۔

اسلامی فوج اس وقت فاتحانہ حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے چین جیسے ملک کے بادشاہوں کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر جب قاضی نے اپنا فیصلہ سنایا تو اسلامی فوج کے سردار نے کسی بحث کے بغیر اس کو مان لیا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ پوری فوج سمرقند چھوڑ کر نکل آئے۔ تاہم اس پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی۔ سمرقند کے لوگوں نے جب دیکھا کہ مسلمان اس قدر با اصول اور انصاف پسند ہیں تو وہ حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے انھوں نے کبھی ایسے بے لاگ انصاف کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلم فوج کا آنا ان کے لئے رحمت کا آنا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مرضی اور خوشی سے مسلم حکومت کو قبول کر لیا۔ وہ کہہ اٹھے: خوش آمدید، ہم آپ کے مطیع و فرماں بردار ہیں (مرحبا سمعنا و اطعنا، فتوح البلدان للبلاذری)

یہ واقعہ عدل و انصاف کا جو نمونہ پیش کر رہا ہے۔ اس کی مثال ساری تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ اس واقعہ میں عدل و انصاف کا اصول اپنے آخری اعلیٰ مقام پر نظر آتا ہے۔ عدل بلاشبہ انسانی زندگی کی بلند ترین قدر ہے، اور یہ واقعہ اس قدر کے اعتراف کی بلند ترین عملی مثال۔

دورِ جدید کی تحریکیں

موجودہ زمانہ میں مختلف مسلم ملکوں میں بہت سی بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں جو اپنے دعوے کے مطابق تجدید کی تحریکیں تھیں۔ مزید یہ کہ ان تحریکوں کو بہت بڑی مقدار میں ساتھ دینے والے افراد بھی ملے اور مادی وسائل بھی، حتی کہ اس سے بھی زیادہ جتنا قدیم زمانہ میں پیغمبروں کو ملے تھے۔ اس کے باوجود یہ تحریکیں عملی طور پر سراسر بے نتیجہ رہیں۔ وہ اُس منزل پر پہونچنے میں ناکام رہیں جس کو انھوں نے اپنا نشانہ بنایا تھا۔

ان تحریکوں کے معتقدین نے بطور خود اگرچہ بہت بڑے بڑے الفاظ بول لئے ہیں جو وہ اپنی تحریک یا اپنی شخصیتوں کے بارہ میں بول سکیں۔ مگر یہ محض الفاظ ہیں، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مثلاً سید ابوالاعلیٰ مودودی کے معتقدین موجودہ عہد کو "سید مودودی کا عہد" کہتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت لفظی بازیگری سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ میں نے ان حضرات سے کئی بار پوچھا کہ جس چیز کو آپ سید مودودی کا عہد کہتے ہیں وہ کہاں ہے تاکہ میں بھی وہاں جاکر اسے دیکھوں۔ کیا وہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اپنے مکان میں ہے۔ کیا وہ اس شہر میں یا اس ملک میں ہے جہاں وہ رہتے تھے۔ کیا وہ اس جماعت میں ہے جس کو انھوں نے قائم کیا اور چلایا۔ اس کا جواب ان حضرات کے پاس کچھ نہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے اُس محبوب تخیل (سید مودودی کا عہد) کو بدستور لکھے اور چھاپے چلے جارہے ہیں ــــــ یہ مردہ قوم کی مخصوص علامت ہے کہ جس چیز کو وہ حقیقت میں نہ پائے اس کو وہ الفاظ میں پاکر کامیابی کا جشن مناتی ہے۔

موجودہ زمانہ کی تجدیدی تحریکوں کی ناکامی کی وجہ کیا تھی، اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ یہ تحریکیں تجدیدی تحریکیں تھیں ہی نہیں۔ تجدید دین، ابدیت کی بنیاد پر اٹھنے کا نام ہے، جب کہ ان مسلم مفکرین کے پاس آخری سرمایہ صرف یہ تھا کہ وہ وقتی مسائل سے متاثر ہوکر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تحریکیں دراصل ردعمل کی تحریکیں تھیں جن کو خوش خیال مفکرین نے بطور خود تجدیدی تحریک کا نام دے دیا۔

یہاں ہم اس سلسلہ میں صرف ایک مثال دیں گے۔ اسی مثال پر دوسرے مسلم مفکرین کو

قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہ مثال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"مارچ ۱۹۳۸ میں جب میں دہلی گیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سیاسی حالات کے تغیر سے مسلمانوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس قدر بھی طاقت خدا نے مجھے دی ہے اس کو اسی انقلاب کے مقابلہ میں صرف کروں۔ چنانچہ میں نے دہلی سے حیدر آباد پہونچتے ہی اس نئی مہم کی ابتدا ترجمان القرآن کے مضامین (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش) سے کر دی۔ آج کل میرے خیالات میں ایک ہلچل برپا ہے جس نے مجھے پرسکون تفکر کے قابل نہیں رکھا۔ دہلی سے ایک آگ اپنے سینہ میں لایا ہوں اور ہر لمحہ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اب کیا کروں۔ جو طوفان ہمارے سر پر آگیا ہے کیا وہ ہمیں اتنی فرصت دینے کے لیے تیار ہے کہ ہم اس طرح اطمینان سے بیٹھے ہوئے اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو از سر نو تیار کریں۔ ایک طرف ایک منظم طاقت ہے جو نیشنلزم اور ڈیماکریسی کے مجموعہ کو پراونشل اٹانومی کے زبردست وسائل سے ہندستان جدید کی تعمیر اس نقشہ پر شروع کر چکی ہے جس میں مسلمان قوم کے لیے بحیثیت مسلمان ہونے کے کوئی جگہ نہیں۔ دوسری طرف مسلمان ایک ریوڑ کی طرح ہندستان کے طول و عرض میں بھٹک رہے ہیں" (ملخصاً) حکمت قرآن (لاہور) ستمبر اکتوبر ۱۹۸۴

یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات واضح طور پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی حقیقۃً "واقعات انسانی" سے متاثر ہو کر اٹھے نہ کہ "واقعات خداوندی" سے متاثر ہو کر۔ اور یہ اسی کا نام ردعمل کی نفسیات کے تحت اٹھنا ہے۔ یہی معاملہ موجودہ زمانہ میں تمام مسلم رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم تحریکیں اٹھیں ان کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ ان کی پہلی قسم وہ ہے جو انیسویں صدی کے نصف ثانی میں ظاہر ہوئی۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو بیسویں صدی کے نصف اول میں پیدا ہوئی اور پھیلی۔

موجودہ زمانہ میں مغربی قومیں جدید قوتوں سے مسلح ہو کر ابھریں اور انھوں نے پوری دنیا کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر مغلوب کر لیا۔ اس کی زد سب سے زیادہ مسلمانوں پر

پڑی۔ کیوں کہ مسلمان ہی اس وقت سب سے بڑی عالمی قوت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس عمل کا انتہا انیسویں صدی میں ہوئی۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ ہر مسلم ملک میں ایسے لوگ ابھرے جو ماضی کی عظمت کو دوبارہ واپس لانے کا پیغام دیتے تھے۔

سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷-۱۸۳۸) اور محمد علی جوہر (۱۹۳۱-۱۸۷۸) کو اس دور کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کی زندگی کے حالات پڑھیے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز جس نے انھیں ابھارا اور عمل کے میدان میں کھڑا کیا وہ مغربی قوموں کا اسلامی ممالک پر غلبہ تھا۔ ان قوموں نے نہ صرف مسلم ملکوں کو سیاسی طور پر مغلوب کیا تھا بلکہ اسلامی آثار اور اسلامی امتیازات کو مٹانے کی ایک مسلسل مہم جاری کر دی تھی، اس صورتِ حال نے سید جمال الدین افغانی اور محمد علی جوہر جیسے لوگوں کو تڑپایا اور وہ مغربی قوموں سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو گیے۔ باعتبار محرک وہ جوابی ذہن کے تحت ابھرے تھے نہ کہ مثبت ذہن کے تحت۔

دوسرے مرحلہ کی تحریکیں وہ ہیں جن کی نمائندگی سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹-۱۹۰۳) اور سید قطب شہید (۱۹۶۶-۱۹۰۶) جیسے لوگوں نے کی۔ اس دوسرے مرحلہ کے افراد کے حالات زندگی کو پڑھیے تو دوبارہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی سیاسی اور تہذیبی المیہ سے متاثر ہو کر ابھرے جس سے متاثر ہو کر پہلے مرحلہ کے لوگ ابھرے تھے۔ دونوں ہی یقینی طور پر ردعمل کی پیداوار تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے مرحلہ کے افراد نے اپنے ردعمل کو سادہ طور پر صرف ردعمل کے انداز میں پیش کیا اور دوسرے مرحلہ کے افراد نے اپنے ردعمل کے ساتھ وہ معاملہ کیا جس کو انگریزی میں "فیلوسوفائز" کرنا کہتے ہیں۔ یعنی انھوں نے اپنے ردعمل کو فکر اور فلسفہ بنا کر پیش کیا۔ انھوں نے اس کو ایک مستقل تعبیر کی حیثیت دے دی۔ پہلے مرحلہ کے لوگوں کا عمل اگر سیاسی دفاع تھا تو دوسرے مرحلہ کے افراد کا عمل سیاسی تعبیر۔

ردعمل کی نفسیات کے تحت اٹھنے والے آدمی کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہمیشہ پیشِ نظر مسئلہ کو دیکھتا ہے نہ کہ اصل حقیقتِ واقعہ کو۔ اس کی نظر وقتی صورت حال پر ہوتی ہے نہ کہ ابدی صورت حال پر۔ یہی موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا۔ ان کی ردعمل کی نفسیات نے ان سے مثبت طرز فکر کو چھین لیا۔ ان کی پوری سوچ منفی سوچ بن گئی۔ جس کا نتیجہ

ہوا کہ ان کی تفکیر بھی صراط مستقیم سے ہٹ گئی اور ان کی عملی منصوبہ بندی بھی۔ یہاں ہم اس معاملہ کے چند پہلوؤں کا ذکر کریں گے۔

۱۔ ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب ۔ (متفق علیہ)	آگاہ، جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے ۔ وہ درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے۔ وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔ آگاہ، اور وہ قلب ہے ۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اصلاحی عمل کا مقام آغاز کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقامِ آغاز انسان کا دل ہے۔ قلب (یا ذہن) کی اصلاح سے اعمال کی اصلاح ہوتی ہے۔ جب بھی لوگوں کے اندر عمل کی کمی نظر آئے تو اس قول رسول کے مطابق ہمیں پیشگی طور پر یہ یقین کرنا چاہیے کہ اس کا سبب انسان کے قلب میں ہوگا۔ عمل کا بگاڑ قلب کے بگاڑ کا نتیجہ ہے اور عمل کی اصلاح قلب کی اصلاح کا نتیجہ ۔

یہ نکتہ مخصوص نفسیات کی بنا پر ہمارے رہنماؤں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ اس راز کو سمجھنے میں ناکام رہے جو قرآن وحدیث میں اور رسول اللہؐ کی سیرت میں واضح طور پر موجود تھا۔ چنانچہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اپنے تجدیدی کام کا آغاز تجدید نظام سے کیا۔ حالاں کہ تجدیدی کام کا صحیح آغاز یہ تھا کہ اس کو تجدید روح سے شروع کیا جاتا۔

دورِ زوال میں ہمیشہ قوموں سے جو چیز غائب ہوتی ہے وہ اسلامی روح ہے۔ اس لیے اسلامی روح کو ازسرِ نو زندہ کرنا ہی تجدید دین کا پہلا کام ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے ذہن پر چوں کہ سیاسی نظام کے ٹوٹنے کا غم سمایا ہوا تھا اس لیے اپنی نفسیات کے نقاضے کے تحت انھوں نے یہ سمجھا کہ اس وقت کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کو دوبارہ بحال کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ساری کوششیں تجدید نظام کے محاذ پر وقف کر دیں۔ مگر یہ ایسا ہی تھا جیسے ایک ٹوٹے ہوئے گھر کو دوبارہ بنانے کے لیے یہ کیا جائے کہ اس کو بنیادوں اور دیواروں کے بغیر چھت کی طرف سے کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے کہ

ایسی چھت کبھی کھڑی نہیں ہوتی اور نہ ایسا امکان کبھی وجود میں آتا۔ چنانچہ بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان رہناؤں کا تجدید نظام کا منصوبہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

یہ مسلم رہنما اپنے ردعمل کی نفسیات کی بنا پر یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ "نظام اسلام" ہمیشہ روح اسلام کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں نظام اسلام کی بربادی اسی لیے ہوئی کہ مسلمانوں میں روح اسلام کمزور ہو گئی تھی۔ یہ رہنما اگر ردعمل کی نفسیات کا شکار نہ ہوتے تو ان کے لیے اس حقیقت کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ اور اگر وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے تو وہ اپنے کام کا آغاز تجدید روح سے کرتے نہ کہ تجدید نظام سے، جس کا موجودہ اسباب کی دنیا میں کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں تھا اور نہ اس کا کوئی نتیجہ نکلا۔

۲۔ قرآن میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم پھر جاؤ تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لائے گا جو تمہارے جیسے نہ ہوں گے۔ (فان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم) اس آیت میں اس بات کا اشارہ ہے کہ مسلمانوں پر جب زوال طاری ہو تو ان کو دوبارہ زندہ اور فعال بنانے کی ایک ضروری تدبیر یہ ہے کہ ان کے اندر نئی قومیں داخل کی جائیں۔ گویا ان کے لیے وہ چیز فراہم کی جائے جس کو آج کل کی زبان میں نیا خون (New blood) کہا جاتا ہے۔

یہ قدرت کا ایک عالم گیر قانون ہے کہ ہر چیز پر تنزل طاری ہوتا ہے۔ ہر چیز ایک مدت گزرنے کے بعد اپنی ابتدائی قوت کھو دیتی ہے۔ یہی معاملہ قوموں کا ہے۔ قوموں پر بھی آخر کار زوال آتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا معاملہ بھی یہی تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان حقیقتہً ایک زوال یافتہ قوم تھے۔ وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ تنہا اپنی قوت سے اسلام کے حامل بن سکیں۔ ایسی حالت میں کرنے کا کام یہ تھا کہ مسلمانوں کی داخلی اصلاح کرتے ہوئے یکساں قوت کے ساتھ غیر مسلم اقوام میں اسلام کی دعوت پہونچائی جائے تاکہ ان کے اندر سے اسلام کی حمایت کے لیے نیا خون مل سکے۔

مگر یہاں دوبارہ مسلم رہنماؤں کی ردعمل کی نفسیات حائل ہو گئیں۔ وہ غیر مسلم اقوام کو ظالم قرار دے کر ان کے خلاف شدید نفرت میں مبتلا تھے۔ دعوتی عمل کی لازمی شرط مدعو کے حق میں محبت ہے مگر مسلمانوں کی ردعمل کی نفسیات نے ان کے لیے مدعو کو نفرت اور حقارت کا

موضوع بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ساری دلچسپیاں صرف مسلمانوں کی اصلاح کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے دور زوال کو پہونچ کر بالکل بے جان ہو چکے تھے مگر مسلم رہنماؤں کی خوش فہمی نے انھیں برعکس طور پر یہ دکھایا کہ :

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے   ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مسلمانوں کے بارہ میں اس اندازہ کی غلطی اس واقعہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ پچھلے سو برس کے اندر بے شمار اعاظم واکابر (بشمول اقبال) اس "مٹی" کو نم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے اس کو صرف "ذرا سا نم" نہیں کیا بلکہ اس کو جل تھل کر دیا۔ مگر مسلمانوں کے اندر سے وہ جاندار گروہ نہ ابھر سکا جو جدید تاریخ میں اسلام کو اس کا واقعی مقام دلانے والا بن سکے۔ حتیٰ کہ خود اقبال کو آخر میں یہ کہنا پڑا :

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں   ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

دورِ جدید کے مسلم رہنما اگر ردعمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہوتے تو یقیناً وہ اس راز کو سمجھ لیتے کہ موجودہ زمانہ میں تجدید دین اور احیاء اسلام کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کو غیر مسلم اقوام تک پہونچایا جائے تاکہ ان کی صفوں سے ایسے افراد حاصل ہوں جو نو مسلمانہ جوش کے ساتھ اسلام کی نمائندگی کر سکیں۔ مگر غیر مسلم اقوام میں دعوتی کام کرنے کے لیے ان کے حق میں محبت اور خیرخواہی کا جذبہ درکار تھا اور ہمارے رہنما ردعمل کی نفسیات کے نتیجہ میں پہلے ہی اس کو کھو چکے تھے۔ پھر وہ غیر مسلم اقوام کے درمیان خدا کے دین رحمت کے داعی بن کر اٹھتے تو کیسے اٹھتے۔

۳۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھیجے، سب ان کی قوموں کی زبان میں بھیجے (وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ) اس آیت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ دعوتی کام کی لازمی شرط یہ ہے کہ وہ مدعو کی اپنی زبان اور اس کے قابل فہم اسلوب میں ہو۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جس طرح دوسری چیزوں میں انقلاب آیا ہے اسی طرح زبان وادب میں بھی زبردست انقلاب آیا ہے۔ سائنس کے زیر اثر موجودہ زمانہ میں بالکل ایک نیا انداز بیان وجود میں آیا ہے۔ آج کا انسان اسی بات

کو اہمیت دیتا ہے جو جدید سائنسی اسلوب میں ڈھال کر اس کے سامنے پیش کی جائے۔ اور جو چیز سائنسی اسلوب میں ڈھلی ہوئی نہ ہو وہ جدید انسان کو اپیل نہیں کرتی، وہ اس کے دل و دماغ میں اپنی جگہ نہیں بناتی۔

اس صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ موجودہ زمانہ میں جدید اسلامی لٹریچر تیار کیا جائے۔ جو وقت کے علمی اور ادبی اسلوب کے مطابق ہو۔ اس کی اہمیت غیر مسلم قوموں کے لیے بھی تھی اور خود مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے بھی۔ مگر یہاں دوبارہ مسلمانوں کی ردعمل کی نفسیات رکاوٹ بن گئی۔ جدید علمی انداز یا نیا ادبی اسلوب پیدا کرنے والی قومیں عین وہی تھیں جن سے ہمارے مسلم رہنما نفرت میں مبتلا تھے۔ اور جن کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ان کی اس نفسیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توجہ اور دل جمعی کے ساتھ جدید اسلوب کو سمجھنے کی کوشش نہ کر سکے۔ نتیجۃً وہ جدید اسلوب میں اسلامی لٹریچر پیش کرنے میں بھی ناکام رہے۔

دورِ جدید میں اسلام کے احیاء اور تجدید کے کام کی یہ ایک بنیادی ضرورت تھی۔ مگر کتابوں کے ان گنت انبار کے باوجود یہ ضرورت ابھی تک غیر تکمیل شدہ حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ لوگوں کے اندر اس کا شعور تک موجود نہیں۔ میری ملاقات ایک مشہور حلقہ کے ایک صاحب سے ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلمان ابھی تک یہ نہ کر سکے کہ وہ وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی لٹریچر تیار کریں۔ انھوں نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ فلاں عظیم شخصیت نے یہ کام انجام دیدیا ہے۔ ان کی کتابیں وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کر رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ مذکورہ شخصیت سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ان سے چند سطروں میں صرف یہ لکھوا کر بھیج دیجئے کہ "وقت کا فکری مستویٰ" کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے۔ مگر آج تک ان کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

میں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے دور میں مسلمانوں کا دینی طبقہ کوئی ایک بھی ایسی قابل ذکر کتاب وجود میں نہ لا سکا جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو۔ شخصیتوں سے عقیدت رکھنے والے کسی خوش فہم دماغ میں ایسی کتابوں کا وجود ہو سکتا

ہے، مگر حقیقی دنیا میں ایسے لٹریچر کا وجود نہیں۔ اور اگر بالفرض کسی صاحب کو اصرار ہو کہ ایسی کتابیں موجود ہیں تو میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ ایسی صرف ایک کتاب راقم الحروف کے پتہ پر روانہ فرمائیں۔ اس کے بعد انشاء اللہ میں بتاؤں گا کہ اس کی حقیقت جدید اسلوب اور سائنٹفک طرز تحریر کے اعتبار سے کیا ہے، بشرطیکہ یہ کتاب کسی ذمہ دار شخص کی طرف سے ان کی اپنی تحریر کے ساتھ بھیجی گئی ہو۔

۱۹۸۰ میں میری ملاقات امریکہ کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص مسٹر اسٹیو اسکلر (Steve Sklar) سے ہوئی۔ وہ فلوریڈا کے ایک عیسائی خاندان میں ۱۹۴۷ میں پیدا ہوئے ان کو تقابلی مطالعہ کا شوق ہوا، اور انھوں نے تمام بڑے بڑے مذاہب سے متعلق کتابیں پڑھ ڈالیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میں نے ان مسلم مصنفوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھے ہیں جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بڑے مفکر سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یہ کتابیں میرے نزدیک بالکل کوڑا (Rubbish) ہیں۔ مغربی ملکوں میں ان کے ذریعہ سے اسلام کے تعارف کا کام نہیں کیا جا سکتا۔

انھوں نے کہا کہ یہ انگریزی ترجمے زبان کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ ان کی زبان جاندار زبان نہیں۔ تاہم اس سے قطع نظر مضمون کے اعتبار سے بھی ان کتابوں میں ایسی کمیاں ہیں کہ وہ مغربی انسان پر کوئی گہرا اثر نہیں چھوڑ سکتیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے چند باتیں بتائیں

انھوں نے کہا کہ ان کتابوں کے پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا مغرب کے خلاف شدید نفرت میں مبتلا ہے۔ وہ مغرب اور مغربی تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کے اس مزاج کی وجہ سے ان کی کتابیں غیر سائنٹفک ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہندو مفکرین کی کتابوں میں اپنے مخاطب کے لیے محبت کا جذبہ ملتا ہے مگر موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین کی کتابوں میں کم از کم مغربی مخاطب کے لیے نفرت اور حقارت کے سوا اور کچھ نہیں۔

چنانچہ ان کتابوں کی ایک کمی یہ ہے کہ ان میں غلط قسم کی تعمیم (Generalisation) پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ مغربی سوسائٹی سے کوئی منفرد اور استثنائی واقعہ لیں گے اور اس کو اس طرح بیان کریں گے گویا کہ یہی مغربی سوسائٹی کی عام حالت ہے۔ مثلاً ایک مسلم مصنف نے اپنی کتاب

یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص ایک مغربی خاتون کے گھر پر اس سے ملنے کے لیے گیا۔ اس نے گھنٹی بجائی، اس وقت مغربی خاتون غسل خانہ میں نہارہی تھی۔ وہ گھنٹی کی آواز سن کر بالکل ننگی باہر نکل آئی۔ اس قسم کا واقعہ کوئی استثنائی واقعہ ہوسکتا ہے مگر یہی مغربی سوسائٹی کی عام حالت نہیں۔ ان مصنفین کا حال یہ ہے کہ وہ مغربی سوسائٹی کا کوئی برا واقعہ لیں گے اور اس کو مغربی سوسائٹی کی عام حالت بتائیں گے۔ دوسری طرف یہی لوگ اسلام کے بارہ میں یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کا ایک نہایت اچھا واقعہ منتخب کرتے ہیں اور اس کو اسلامی سوسائٹی کی عام حالت بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تقابل علمی اعتبار سے صحیح نہیں۔

اسی طرح ان کتابوں میں ایک عام کمی یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں آئیڈیل کا تقابل پریکٹس سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً اسلام کے تصور مساوات کو بتانے کے لیے وہ خطبہ حجۃ الوداع کے الفاظ نقل کریں گے اور مغرب کے تصور مساوات کو بتانے کے لیے ساؤتھ افریقہ کی مثال دیں گے۔ حالاں کہ یہ تقابل سراسر غلط ہے۔ ان کو چاہیے کہ آئیڈیل کا تقابل آئیڈیل سے اور پریکٹس کا تقابل پریکٹس سے کریں۔ مثلاً پیغمبر کے حجۃ الوداع کی تقریر کا تقابل اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر سے کرنا چاہیے نہ کہ ساؤتھ افریقہ کی عملی صورت حال سے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مسٹر اسٹیو اسکلر کی مذکورہ نشاندہی بالکل درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید قومیں ہمارے مسلم رہنماؤں کے لیے نفرت اور حقارت کا موضوع بن گئیں۔ یہ ذہن اتنا عام ہوا کہ مسلمانوں کی غیر سیاسی شخصیتیں بھی اس نفسیات سے محفوظ نہیں رہیں۔ اس کی ایک عبرت ناک مثال وہ ہے جس کو مولانا سعید احمد اکبرآبادی (۱۹۰۸-۱۹۸۵) نے نقل کیا ہے۔

مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری نے سیرت نبوی پر اپنی کتاب "اصح السیر" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چوں کہ طبقات ابن سعد کو ایک عیسائی نے ایڈٹ کیا اور چھاپا ہے اور اس نے ضرور کتاب کے اصل مخطوطہ میں ردوبدل کیا ہوگا۔ اس لیے میرے نزدیک وہ معتبر اور قابل استناد نہیں ہے۔ اصح السیر میں یہ بات پڑھ کر مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی طرف رجوع کیا جن کی نظر مخطوطات پر بڑی وسیع اور عمیق ہے۔ مولانا اعظمی نے جواب

میں تحریر فرمایا کہ طبقات ابن سعد کا اڈیشن جس مخطوطہ پر مبنی ہے، اس کو میں نے دیکھا اور مطبوعہ اڈیشن اور مخطوطہ دونوں کا حرفاً حرفاً مقابلہ کیا ہے اور کہیں ایک حرف کا فرق بھی نہیں پایا ہے (ماہنامہ برہان، دہلی جون ۱۹۸۲)

اس نفسیات کی بنا پر مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ جدید اسلوب یا جدید معیار ادب کو سمجھیں جن کو پیدا کرنے والی خود یہی قومیں تھیں۔ جدید قوموں سے نفرت مسلمانوں کے لیے اس میں مانع ہو گئی کہ وہ جدید اسلوب کو سمجھیں اور اس میں مہارت پیدا کر کے لسانِ قوم میں اسلامی لٹریچر فراہم کریں۔

خلاصہ

اوپر جو باتیں عرض کی گئیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں سب سے بڑا کام یہ ہے کہ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان حریف اور رقیب کا رشتہ ختم کیا جائے اور ان کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کیا جائے۔ جس دن ایسا ہوگا کہ مسلمان اپنے آپ کو داعی اور دوسری قوموں کو مدعو سمجھنے لگیں، اسی دن مسلمانوں کے اندر وہ تمام اعلیٰ صفات پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی جو موجودہ زمانہ میں اسلام کے احیاء کی جدوجہد کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ داعی اور مدعو کا رشتہ پر جوش تقریری الفاظ بول دینے کا نام نہیں ہے۔ یہ موجودہ دنیا میں سب سے بڑی قربانی ہے۔ اس کے لیے ہمیں دوسری قوموں سے اپنی تمام شکایتوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دینا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ دوسری قوموں سے محبت کی جائے خواہ وہ ہماری دشمن بنی ہوئی ہوں۔ دوسری قوموں کے لیے نیک دعائیں کی جائیں، خواہ وہ ہمارے خلاف سازش کر رہی ہوں۔ دوسری قوموں کو خیر خواہی کا موضوع بنایا جائے خواہ ہمارے نزدیک وہ ہماری بدخواہی میں مشغول ہوں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل یہ ہے کہ وہ حق کے داعی بنیں اور حق کے داعی صرف وہ لوگ بنتے ہیں جو اپنے مدعو کو اپنے لیے محبت اور خیر خواہی کا موضوع بنا چکے ہوں۔

ایک سفر

۲۳ فروری سے ۲ مارچ ۱۹۸۰ تک میں ایک سفر میں تھا۔ دہلی سے الہ آباد، الہ آباد سے بمبی۔ بمبئی سے اعظم گڈھ، اعظم گڈھ سے الہ آباد ہوتے ہوئے واپس دہلی۔ یہ سفر اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان تمام سفروں سے مختلف تھا جن کی رودادیں اب تک الرسالہ کے صفحات میں آتی رہی ہیں۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جو غالباً میں نے اپنی باشعور زندگی میں پہلی بار کیا ہے۔ یعنی شادی اور بارات کا سفر۔ اس شادی کی بارات ۲۴ فروری کی شام کو بذریعہ ہوائی جہاز بمبئی گئی اور ۲۶ فروری کی شام کو دوبارہ بذریعہ ہوائی جہاز بمبئی سے واپس آئی۔

میرے ایک بے حد قریبی عزیز ہیں جو ہمارے خاندانی بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے حکم کو میں ٹال نہیں سکتا۔ ان کے آخری صاحبزادہ کا نکاح تھا۔ ان کا حکم ہوا کہ میں لازمی طور پر اس تقریب کے لیے سفر کروں اور اس میں شروع سے آخر تک شریک رہوں۔ بچپن کی زندگی کے بعد میں اپنی ساری عمر میں شادی کی تقریبات سے دور رہا ہوں۔ مگر مذکورہ عزیز کا حکم ٹالنا میرے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے "بارات" کے ساتھ شریک سفر ہو گیا۔

اس سفر کا آغاز ۲۳ فروری ۱۹۸۰ کی شام کو ہوا جب کہ میں ٹرین کے ذریعہ دہلی سے الہ آباد کے لیے روانہ ہوا۔ ٹرین کیا ہے۔ ٹرین ایک قسم کا دوڑتا ہوا گھر ہے۔ ایک ہزار سال پہلے اگر کوئی شخص کہتا کہ میں نے دوڑتا ہوا گھر دیکھا ہے تو سننے والے سمجھتے کہ شاید یہ جادو کے دیس کی باتیں ہیں۔ مگر آج ایسے گھر بطور واقعہ وجود میں آچکے ہیں۔ ٹرین کے اندر وہ تمام ضروری سامان ہوتا ہے۔ جو ایک گھر کے اندر ہوتا ہے۔ آپ صرف یہ کرتے ہیں کہ ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وہ تیز رفتاری کے ساتھ روانہ ہوتا ہے اور دوڑتا ہوا آپ کو آپ کی منزل پر پہونچا دیتا ہے۔ کیسی عجیب ہے خدا کی وہ نعمت جس کو جدید سواری کہا جاتا ہے۔

دہلی سے الہ آباد کا سفر پریاگ راج اکسپریس سے ہوا۔ رات کو دس بجے ہم گاڑی میں داخل ہو کر سو گیے۔ صبح اٹھے تو گاڑی الہ آباد پہونچ رہی تھی۔ یہ انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے سفر کو اس کے لیے اتنا آسان بنا دیا۔ ایک وقت تھا کہ آدمی اپنے پاؤں سے جتنا چلتا تھا اتنا

ی اس کا سفر طے ہوتا تھا۔ اس کے بعد جانوروں کے ذریعہ سواری کا زمانہ آیا۔ اب آدمی دن کو سفر
رتا اور رات کو پڑاؤ ڈالتا۔ موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی سواریاں دیدی ہیں کہ رات
ور دن کے فرق کے بغیر وہ مسلسل اپنا سفر طے کر سکتا ہے۔ تاہم حقیقی مسافر وہ ہے جس کے لیے اس کا
دی سفر معرفت کا سفر بن جائے۔

موجودہ زمانہ پچھلے تمام زمانوں سے زیادہ خدائی نعمتوں کے ظہور کا زمانہ ہے۔ اس اعتبار
سے آج کے انسان کو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔ مگر آج کا زمانہ شاید
اریخ کا وہ زمانہ ہے جب کہ سب سے کم ایسے انسان ہیں جو واقعی معنوں میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا
رتے ہوں۔ موجودہ زمانہ میں جو انسانی بگاڑ ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یقینی طور پر یہی ہے۔ شکر
دمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے اور اگر آدمی کے اندر سے شکر کا جذبہ نکل جائے تو اس کے بعد جو چیز
بتی ہے وہ سرکشی ہے اور سرکشی بلاشبہ تمام برائیوں میں سب سے بڑی برائی ہے۔

الٰہ آباد کے لیے میرا پہلا سفر غالباً ۱۹۵۰ میں ہوا تھا۔ اس سفر کا مقصد ایک پمفلٹ (اطاعت
راکی یا انسان کی) چھپوانا تھا۔ یہ پمفلٹ ونڈائک طریقہ پر اسرار کریمی پریس سے چھپوایا گیا تھا۔

یہاں کی ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات وہ تھی جو جناب انوار علی خاں سوز ایم اے سے ہوئی۔
ہ اس وقت جماعتِ اسلامی کے اخبار الانصاف کے اڈیٹر تھے جو بعد کو "دعوت" کے نام سے دہلی
سے نکلنا شروع ہوا۔ جناب انوار علی خاں سوز ہائی اسکول پاس کر کے انٹر کالج میں تعلیم حاصل کر رہے
تھے کہ جماعتِ اسلامی کے انقلابی فکر سے متاثر ہو گئے۔ اس فکر کے مطابق انسان کی حاکمیت پر مبنی ہر نظام
اغوتی نظام ہے اور اس سے علٰحدگی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کفر و شرک سے علٰحدگی۔ تعلیمی اداروں
یسے بظاہر معصوم ادارے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ بہت سے دوسرے نوجوانوں کی طرح
ذار علی خاں سوز صاحب نے بھی تعلیم چھوڑ دی اور اخبار الانصاف میں کام کرنے لگے۔ جہاں تک یاد ہے
ے چھوٹے سے کمرے کے اندر، کاغذات کے ڈھیر کے درمیان وہ اکیلے کام کیا کرتے تھے۔

اس ناقابل عمل نظریہ کے خالق مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی تھے۔ پاکستان منتقل ہونے کے
د سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنا مسئلہ تو اس طرح حل کیا کہ ۱۹۴۹ میں جب پاکستان کی دستور ساز
بلی نے قرار داد مقاصد منظور کی تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ پاکستان کی ریاست نے کلمہ پڑھ لیا

ہے۔ اس لیے اب یہاں کے نظام میں شرکت افراد جماعت کے لیے جائز ہو گئی ہے۔

ہندستان کی جماعت اسلامی کے افراد بدستور مشکل میں پھنسے ہوئے تھے۔ آخر کار انھوں نے عملی مزورت کی منطق کے تحت اس مشکل کا حل تلاش کر لیا۔ وہ عقیدۃً جس چیز کو ناجائز سمجھ رہے تھے اس کو انھوں نے حالات کے دباؤ کے تحت بلا اعلان اپنے لیے جائز کر لیا۔ انھوں نے دوبارہ ان اداروں میں جانا شروع کر دیا جن کو انھوں نے طاغوتی ادارہ قرار دے کر چھوڑ دیا تھا۔ جناب انو علی خاں سوز بھی انھیں نوجوانوں میں سے ایک تھے۔ چنانچہ بعد کو الانصاف سے الگ ہو کر انھوں نے بی اے کیا۔ اور پھر انگلش لٹریچر سے ایم اے کیا۔ اب وہ جامعہ ملیہ (دہلی) میں انگلش لٹریچر کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

الہ آباد کے لیے میرا دوسرا سفر ۱۹۶۰ میں ہوا۔ ۲۲ مئی ۱۹۶۰ کو الہ آباد میں آریہ سماج کی طرف سے ایک سرو دھرم سمیلن (کل مذاہب کانفرنس) ہوئی۔ اس موقع پر مجھے ایک مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس پروگرام کے تحت الہ آباد کا سفر ہوا۔ میرا مقالہ پیشگی طور پر چھپوا لیا گیا تھا جو وہاں عمومی طور پر تقسیم ہوا۔ یہ مقالہ "منزل کی طرف" کے نام سے اسلام اور عصر حاضر نا کتاب میں شامل ہے۔

اس سفر کی یادوں میں سے ایک یاد یہ ہے کہ میں نے اس سفر میں پہلی بار گنگا اور جمنا کا سنگم دیکھا۔ ہندو عقیدہ کے مطابق گنگا دنیا کا سب سے زیادہ مقدس دریا ہے۔ الہ آباد کے پاس گنگا اور جمنا دونوں کا پانی ملتا ہے۔ یہاں ملاپ کے مقام پر واضح طور پر ایک لکیر سی نظر آتی ہے جو دور تک چلی گئی ہے۔ یہ منظر گویا قرآن کی اس آیت کا مشاہدہ کراتا ہے: مرج البحرين يلتقيا بينهما برزخ لا يبغيان۔

الہ آباد کے لیے میرا تیسرا سفر ۱۹۸۱ میں اور چوتھا سفر ۱۹۸۳ میں ہوا۔ ان دو نوا سفروں کا مقصد اپنے بھائی اور اپنی والدہ سے ملاقات کرنا تھا۔ الہ آباد کے لیے میرا پانچواں سفر فروری ۱۹۸۷ میں ہوا۔ اس آخری سفر کی روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

الہ آباد ہندستان کا ایک قدیم شہر ہے جو گنگا اور جمنا کے سنگم پر آباد ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی ہندستان کی قدیم یونیورسٹیوں میں سے ہے جو سو سال پہلے ۱۸۸۷ میں قائم ہوئی تھی۔ یہاں ایک

پرانا قلعہ ہے جس کو شہنشاہ اکبر نے ۱۵۸۳ میں بنوایا تھا۔ قدیم زمانہ میں یہاں "پریاگ" نام سے ایک شہر آباد تھا۔ ۱۵۸۳ میں مغلوں نے اس کو موجودہ نام کے ساتھ از سرِ نو آباد کیا۔ ۱۸۰۱ میں وہ برطانیہ کے قبضہ میں آیا۔

الٰہ آباد کے لفظ سے سب سے پہلے میں قبل از آزادی کے دور میں اس وقت واقف ہوا جب کہ میں نے ایک آزادی پسند ہندستانی کا مضمون پڑھا۔ انھوں نے انگریز اور انگریزی تہذیب کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ الٰہ آباد ان کی زبان میں آل بیڈ (Allahabad) بن جاتا ہے اور لالہ ان کے یہاں پاپی (Poppy) کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

"الٰہ آباد" کے لفظ سے دوسری بار میں ایک شاعر کے شعر کے ذریعہ آشنا ہوا۔ وہ اعظم گڈھ کے رہنے والے تھے۔ ان کا تخلص نادان تھا۔ ان کے دو اشعار یہ ہیں:

فلک تیرا بگڑ جاتا کیا اگر ناداں بھی سر ہوتا مزے کی زندگی کٹتی الٰہ آباد گھر ہوتا

ملا میں چیف جسٹس سے ملا سر تیج سپرو سے اگر ناداں نہ ہوتا میں تو کل میرا ڈنر ہوتا

یہ دونوں واقعات موجودہ صدی کے ربع ثانی سے متعلق ہیں جس میں میرا بچپن اور نوجوانی کا زمانہ گزرا ہے۔ یہ واقعات علامتی طور پر بتاتے ہیں کہ پچاس سال پہلے کا وہ ماحول کیا تھا جس میں میرے جیسے کروروں لوگوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام گزارے ہیں۔ یہ ایسا دور تھا جس میں بڑوں کے پاس اپنے چھوٹوں کو دینے کے لیے صرف ایسے الفاظ تھے جن کا کوئی مطلب نہ حال میں تھا اور نہ مستقبل میں۔ چنانچہ جب میں بڑا ہوا تو زندگی کی ہر حقیقت مجھے خود اپنی تلاش سے دریافت کرنی پڑی، کیوں کہ میرا ماحول مجھے زندگی کی حقیقتوں سے آگاہ کرنے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔

الٰہ آباد میں مسٹر نصر حشمت سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے گھر میں ایک ہرن پالے ہوئے تھے۔ ۱۴ سال کی عمر کو پہونچ کر وہ مر گیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہرن کی یہ موت قبل از وقت تھی۔ وہ اس کے کھانے پینے کا نہایت اعلیٰ اہتمام کرتے تھے۔ مگر ہرن جب کھلے جنگل میں چوکڑی بھرتا ہے تو اس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ جب کہ قید (Captivity) میں اس کی عمر کم ہو جاتی ہے۔ یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے جو ہرن کے لیے بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنا کہ انسان کے لیے۔ اس دنیا میں عمل کا نام زندگی ہے اور بے عملی کا نام موت۔

الٰہ آباد سے بمبئی جانے کے لیے بابت پور (بنارس) کے ہوائی اڈہ سے جہاز پکڑنا تھا۔ الٰہ آباد سے بارات کاروں کے ایک قافلہ کی صورت میں روانہ ہوئی۔ راستہ میں کئی بار ایسا ہوا کہ سامنے کوئی لاری یا ٹرک آگیا۔ ہماری گاڑی نے "پاس" کے لیے بار بار ہارن دیا مگر اس نے پاس نہیں دیا۔ ان سڑکوں پر آج کل یہ عام حالت ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ چند سال پہلے یہی معاملہ ایک ایس پی (پولیس افسر) کے ساتھ پیش آیا۔ وہ جیپ پر سفر کر رہا تھا، سامنے ایک لاری والا آگیا۔ بار بار ہارن کے باوجود اس نے پاس نہیں دیا۔ جیپ مجبوراً اس کے پیچھے چلتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک بازار آیا جہاں لاری کو سواری اتارنے کے لیے رکنا تھا۔ جیسے ہی لاری کھڑی ہوئی، ایس پی نے اپنی جیپ لاکر اس کے آگے کھڑی کر دی۔ اور نہایت تیزی کے ساتھ ڈرائیور کو کھینچ کر باہر نکالا اور اس کو مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس کو بری طرح نڈھال کر دیا۔ بتانے والے نے بتایا کہ اس کے بعد ایک سال تک اس سڑک پر لاری اور ٹرک والے صرف ایک ہارن پر فوراً پاس دے دیا کرتے تھے۔

موجودہ بڑھی ہوئی بدعنوانی کی واحد وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے ڈر نکل گیا ہے۔ اگر لوگوں کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ جو کچھ کریں گے اس کی سزا انھیں بھگتنی پڑے گی تو وہ کبھی بدعنوانی نہ کریں۔

"پاکستان" کا لفظ اگرچہ بعد کو وضع ہوا، مگر علٰحدہ مسلم اسٹیٹ کے تصور کے طور پر سب سے پہلے یہ نظریہ ڈاکٹر محمد اقبال نے الٰہ آباد میں پیش کیا تھا۔ ۱۹۳۰ میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

> I would like to see the Punjab, North-west Frontier Province, Sind and Baluchistan amalgamated into a single state. Self-government within the British Empire, or without the British Empire, the formation of a consolidated North-west Indian Muslim State appears to me to be the final destiny of the Muslims, at least of North West India.
>
> *Speeches, Writings, Statements of Iqbal*, edited by Latif Ahmed Sherwani (Iqbal Academy, Lahore, Pakistan 1977).

میں یہ دیکھنا پسند کروں گا کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک

واحد ریاست بنادی جائے۔ ایک خود اختیاری حکومت ، خواہ برطانی شہنشاہیت کے تحت یا برطانی شہنشاہیت کے بغیر۔ شمال مغربی حصہ کو ملاکر ہندستانی مسلمانوں کی ایک اسٹیٹ کا قیام مجھے مسلمانوں کی آخری تقدیر نظر آتی ہے ، کم ازکم شمال مغربی ہندستان کے لیے ۔

اقبال کو نظر آرہا تھا کہ غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کا وجود خطرہ میں ہے ۔ اس لیے انھیں علحدہ ریاست قائم کرنا چاہیے ۔ مگر بعد کے واقعات نے اس کی تصدیق نہیں کی ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے ترقی کے وہ سارے امکانات پوری طرح موجود تھے جس کے لیے غیر ضروری طور پر انھوں نے پاکستان بنوایا۔

۲۴ فروری کو جب تقریباً ۴۰ آدمیوں کی بارات کے ساتھ الہ آباد سے بمبئی کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز روانگی ہوئی تو میں نے سوچا کہ ۵۷ سال پہلے ڈاکٹر اقبال ٹرین پر سوار ہو کر الہ آباد آئے تھے تاکہ مسلمانوں کو یہ خبر دیں کہ غیر منقسم ہندستان میں تمہارا وجود خطرہ میں ہے ۔ اب ۵۷ سال بعد اسی الہ آباد سے مسلمانوں کا قافلہ ہوائی جہاز سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو رہا ہے ۔ اقبال اگر زندگی کے امکانات کو جانتے تو وہ مسلمانوں کو " علحدگی " کے بجائے " اتحاد " کا مشورہ دیتے ۔

اقبال اور ان کے ساتھی صرف حال کے اندیشوں میں گم تھے ۔ وہ مستقبل کے امکانات کو نہ جان سکے ۔ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کا یہی فکری افلاس ہے جس کی بنا پر وہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو صحیح رہنمائی دینے میں ناکام رہے ۔

۲۴ فروری کی رات کو ہم لوگ بمبئی پہونچے ۔ بمبئی کے بعض ساتھیوں (ڈاکٹر عبدالکریم نائک ، نسیم علی خاں صاحب) کو میرے سفر کی خبر مل گئی تھی ، اس لیے وہ لوگ بھی ایرپورٹ پر آگیے ۔ ان سے مشورہ کے بعد بمبئی کے لیے چند پروگرام طے کیے گیے تاکہ اس قیام کا دعوتی فائدہ بھی حاصل ہوجائے ۔ بمبئی میں میرا قیام ہوٹل میٹرو انٹرنیشنل میں تھا ۔

۲۵ فروری ۱۹۸۷ کی صبح کو پونا اور بمبئی کے کئی ساتھی ہوٹل میں آگیے ۔ ان سے دیر تک گفتگو اور مشورہ جاری رہا ۔

دوپہر کو آل انڈیا ریڈیو کے بمبئی یونٹ میں ایک تقریر ریکارڈ کی گئی جو ۱۲ اپریل کو نشر کی گئی ۔ اس تقریر کا عنوان تھا : فرقہ واریت کا مسئلہ ۔ ریڈیو اسٹیشن کے پروڈکشن اسسٹنٹ مسٹر

سریش میرچندانی نے اس کو ریکارڈ کرایا۔ جب میں فارغ ہو کر اسٹوڈیو سے باہر آیا تو مسٹر چندانی نے کہا کہ آپ کی ٹاک مجھ کو بہت پسند آئی۔ میں نے کہا کہ اس کی کیا بات آپ کو پسند آئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے اپنی ٹاک میں نمرتا کی بات کہی، اور میں سمجھتا ہوں کہ نمرتا آدمی کی سب سے بڑی صفت ہے۔

ظہر کی نماز کے بعد روز نامہ انقلاب کے نمائندوں نے انٹرویو لیا۔ ان کے زیادہ تر سوالات ملی مسائل کے بارہ میں تھے۔ میں نے کہا کہ اس سلسلہ میں اصل سوال ذہنی نظریہ (Attitude of mind) کا ہے۔ مسلمان اب تک تعصب کی اصطلاحوں میں سوچتے رہے ہیں۔ اگر وہ یہ سوچنے لگیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ مقابلہ (Competition) کے نتائج ہیں تو ان کی سوچ بدل جائے گی۔ تعصب کا ذہن آدمی کے اندر مایوسی پیدا کرتا ہے، جب کہ مقابلہ کا ذہن امید کی راہ کھولتا ہے۔

آخر میں ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ مسلمان بھیڑ اور اتحاد میں فرق نہیں کرتے۔ اسی لیے وہ اکثر غلط فہمی میں پڑ کر ایک چیز کو اتحاد سمجھ لیتے ہیں۔ حالاں کہ درحقیقت وہ بھیڑ ہوتی ہے۔ اگر آپ دوسروں کے خلاف چیخ و پکار کے لیے جمع ہوں تو یہ بھیڑ ہے، اور اگر آپ اپنی اصلاح و تعمیر کے لیے اکٹھا ہوں تو یہ اتحاد ہے۔ میں نے کہا کہ ایک لفظ میں یہ سمجھ لیجئے کہ: تخریب کے لیے جمع ہونا بھیڑ ہے، تعمیر کے لیے جمع ہونا اتحاد ہے۔ یہ انٹرویو اخبار انقلاب (۱۳، ۱۸ مارچ ۱۹۸۷) میں شائع ہو چکا ہے۔

شام کو ۵ بجے انڈو عرب سوسائٹی (ویر نارائن روڈ) پر ایک تقریر تھی۔ اس تقریر کا عنوان سوسائٹی والوں نے یہ مقرر کیا تھا:

Islam and human brotherhood

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہیومن برادرہڈ دراصل کچھ ہیومن ویلوز (Human values) سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہیومن ویلوز تاریخ میں سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا۔ مثلاً انسان کی آزادی اور مساوات کے اعلان کے سلسلہ میں اکثر روسو (۱۷۷۸ - ۱۷۱۲) کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس کی کتاب (سوشل کنٹریکٹ) کا پہلا جملہ یہ ہے: انسان آزاد پیدا ہوا تھا مگر میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا

یکھتا ہوں۔ لیکن یہ جملہ درحقیقت اس قول کی نقل ہے جو روسو سے بارہ سو سال پہلے حضرت عمر کی زبان سے اس وقت نکلا تھا جب کہ انھوں نے اس نظریہ کو واقعہ بنایا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں مصر کے گورنر عمرو بن العاصؓ کے لڑکے نے مصر کے ایک قبطی کو مارا اور اس کی تحقیر کی۔ حضرت عمرؓ نے ورنر اور ان کے بیٹے کو مدینہ بلایا اور قبطی کے ہاتھ میں کوڑا دے کر کہا کہ جس نے تمہیں مارا ہے تم بھی س کو مارو۔ چنانچہ اس نے مارا۔ آخر میں حضرت عمر نے گورنر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اے عمرو، م نے کب سے انسانوں کو غلام بنا لیا حالاں کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا (یا عمرو، متی تعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا)

۲۶ فروری کو ۱۰ بجے ملاقات کی ایک نشست ہوئی۔ یہ نشست محبوب اسٹوڈیو کے اندر ہوئی۔ س نشست میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک تھے۔ زیادہ تر گفتگو سوال و جواب کے انداز میں ہوئی۔ یں نے خصوصیت کے ساتھ یہ بات کہی کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل المیہ یہ ہے کہ ان کے اندر ارجی طرزِ فکر پیدا ہو گیا ہے۔ ہر آدمی کسی دوسرے کو ذمہ دار قرار دے کر اس کے خلاف لکھنے اور بولنے یں لگا ہوا ہے۔ یہ طرزِ فکر غیر عقلی بھی ہے اور غیر اسلامی بھی۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے ندر داخلی طرزِ فکر پیدا کیا جائے۔ خارجی طرزِ فکر صرف شکایت اور احتجاج کا ذہن پیدا کرتا ہے جب ہ داخلی طرز فکر سے عمل کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ایک بزنس منیجر کے اندر سب سے زیادہ جو چیز دیکھی اتی ہے وہ یہ کہ اس کے اندر فیصلہ لینے (Decision making) کی صلاحیت ہو۔ یہ بلاشبہ بہت اہم ت ہے اور نہ صرف بزنس میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی اہمیت ہے۔

اس سلسلہ میں یہاں ایک واقعہ معلوم ہوا جو اس اصول کی بہت اچھی وضاحت کرتا ہے۔ کتابوں کی تجارت کی دنیا میں آج کل ایک طریقہ بہت رائج ہے۔ وہ یہ کہ کسی مقبول کتاب کو لے کر س کی نقل کو چھپوا لینا اور اس کو بازار میں فروخت کرنا۔ اس کو عام طور پر قزاقی اڈیشن (Pirate edition) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ کتاب میں اپنا نام اور پتہ نہیں دیتے۔ اس لیے ان کو پکڑنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ یہ طریقہ عام طور پر زیادہ چلنے والی ناولوں کے سلسلہ میں اختیار کیا جاتا ہے۔

چند سال ہوئے امریکہ کے مشہور اشاعتی ادارہ پنگوئن کا چیرمین جاپان جاتے ہوئے بمبئی سے

گزرا۔ وہ بمبئی کے تاج ہوٹل میں ٹرانزٹ مسافر کے طور پر ایک دن کے لیے رکا تھا۔ وہ یہاں کتابوں کے بازار میں گیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا چھاپا ہوا ایک ناول بمبئی کے بازار میں فروخت ہو رہا ہے۔ یہ کتاب ابھی بالکل حال میں چھپی تھی اور ابھی تک وہ امریکہ سے یورپ کے بازار میں بھی نہیں پہونچی تھی۔ مگر وہ بمبئی کے بازار میں بک رہی تھی۔ یہ دراصل کتاب کا قزاقی اڈیشن تھا۔ کسی نے امریکہ میں اس کی طباعت کے فوراً بعد اس کا ایک نسخہ حاصل کیا اور اس کا فوٹو لے کر چند دن کے اندر اس کو چھاپا اور اس کو بمبئی کے مارکیٹ میں پہونچا دیا۔

یہ دیکھ کر پنگوئن کے چیرمین نے فوراً بمبئی میں اپنی اقامت بڑھائی۔ اس نے یہاں کے پبلشرز سے بات چیت کی۔ اس کے بعد ایک پبلشر سے معاہدہ کر لیا۔ اس نے یہ انتظام کیا کہ جو کتاب وہ امریکہ میں چھاپے اس کی کاپی فوراً وہ بمبئی کے پبلشر کو بھیج دے۔ وہ اس کو فوراً چھاپ کر بمبئی کے بازار میں پہونچا دے۔ یہ طریقہ نہایت کامیاب رہا۔ امریکہ کے دوسرے پبلشروں نے بھی بعد کو اسی کو اختیار کیا۔ یہاں تک کہ قزاقی اڈیشن چھاپنے والوں کی جڑ کٹ گئی۔

بمبئی سے مجھ کو بنارس آنا تھا اور وہاں سے پھر اعظم گڈھ کا سفر کرنا تھا۔ بمبئی سے بنارس کا سفر ۲۶ فروری کو فلائٹ نمبر ۱۹۵ کے ذریعہ ہوا۔ درمیان میں موسم بہت خراب ہو گیا، اعلان ہوا کہ تمام مسافر کرسی کی پیٹی باندھ لیں۔ اچانک مسافروں میں سنسنی پھیل گئی۔ کیوں کہ جہاز اس طرح نیچے اوپر ہونے لگا تھا جیسے ایک ایسی سڑک پر گاڑی دوڑ رہی ہو جس پر جگہ جگہ گہرے گڑھے کھود دیے گئے ہوں۔ سڑک پر کوئی دوڑتی ہوئی کار اگر اتنا زیادہ نیچے اوپر ہو جتنا جہاز ایسے موقع پر نیچے اوپر ہوتا ہے تو کار الٹ جائے گی اور سفر کا جاری رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ مگر ہوائی سفر میں بڑے بڑے "فضائی گڑھوں" کے باوجود سفر جاری رہتا ہے۔ یہ بھی ایک خدائی مصلحت ہے۔ وہ انسان کو موت کے گڑھے میں ڈالتا ہے اور پھر اس سے نکال کر اسے موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر ادا کرے اور آئندہ کے لیے زیادہ عنایات کا مستحق ثابت ہو۔

۲۶ فروری کی رات کو ہم اعظم گڈھ پہونچے۔ یہاں ۲ مارچ کی صبح تک ۹ بدرقہ، اعظم گڈھ میں میرا قیام رہا۔ اعظم گڈھ اتر پردیش کا ایک شہر ہے۔ اس کو ۱۶۶۵ میں راجہ اعظم خاں نے بسایا تھا۔ انھیں کے نام پر وہ اعظم گڈھ کہا جانے لگا۔ ۱۹۷۱ کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۴۰ ہزار تھی۔

اب اس کی آبادی تقریباً دگنا ہو چکی ہے۔

۲۷ فروری کو نماز جمعہ جامعۃ الرشاد کی مسجد میں ادا کی۔ نماز جمعہ سے پہلے ایک مختصر تقریر کی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ایمان و اسلام کی حقیقت کیا ہے۔ ۲۸ فروری کو دوبارہ جامعۃ الرشاد میں ایک پروگرام تھا۔ یہ پروگرام عصر کی نماز کے بعد تھا۔ اس موقع پر میں نے اساتذہ اور طلبہ کے سامنے ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں زندگی کی تعمیر سے متعلق کچھ باتیں عرض کی گئیں۔

۲۷ فروری کو نماز ظہر کے بعد بلریا گنج (اعظم گڈھ) میں ایک پروگرام تھا۔ یہاں جامعۃ الفلاح کے طلبہ اور اساتذہ کے اجتماع میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا موضوع تھا: اسلامی دعوت کے جدید امکانات۔ اس تقریر میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس موضوع کی وضاحت کی گئی۔ ایک طالب علم نے آٹوگراف کی فرمائش کی۔ میں نے ان کی کاپی پر یہ فقرہ لکھ دیا:

تمام علوم محنت کی درس گاہ میں پڑھائے جاتے ہیں

اسی طرح مختلف طالب علموں کی نوٹ بک پر مختلف فقرے تحریر کیے۔ ایک طالب علم کی نوٹ بک پر حسب ذیل فقرہ لکھا:

سب سے مشکل کام اپنے آپ کو جاننا ہے اور سب سے آسان کام دوسروں کو جاننا

اعظم گڈھ کے دو روزہ (۲۷-۲۸ فروری) قیام میں بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ہمارا آبائی وطن اگرچہ قریب کے ایک گاؤں میں تھا۔ مگر بعد کو ہمارے خاندان کے لوگ شہر منتقل ہو گیے۔ سب سے پہلے میرے چچا زاد بھائی اقبال احمد سہیل اعظم گڈھ شہر میں آئے۔ وہ یہاں کے کامیاب ترین وکیل تھے۔ ۱۹۳۰ کے لگ بھگ زمانہ میں انھوں نے فورڈ موٹر کار منگوائی تو یہ شہر میں دوسری موٹر کار تھی۔ پہلی کار راجہ ہرکھ چند کی تھی اور دوسری کار ہمارے بھائی صاحب کی۔ یہ فورڈ کا ماڈل ۱۹۲۷ تھا۔ ۱۹۴۴ میں میرے بھائی عبد العزیز خاں صاحب نے اعظم گڈھ میں کاروبار شروع کیا۔ مگر اعظم گڈھ ابھی تک "چھوٹی لائن" پر رہے۔ اس لیے یہاں تجارتی ترقی کے مواقع نسبتاً کم ہیں۔ چنانچہ ۱۹۷۹ میں وہ الہ آباد منتقل ہو گیے۔

۱۹۳۰ میں غالباً پہلی بار میں اعظم گڈھ آیا۔ اس وقت کے بعض واقعات اب تک مجھے یاد ہیں۔ میں نے دیکھا کہ شہر کے چوراہہ پر کچھ لوگ چائے فروخت کر رہے ہیں۔ وہ ایک پیسہ میں پانچ پیالی

چائے پلاتے اور اسی کے ساتھ چائے کی پتی کا ایک چھوٹا سا پیکٹ مفت دیتے تھے۔ اسی طرح میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ دیاسلائی فروخت کر رہے ہیں اور یہ آواز لگا رہے ہیں :

دیاسلیا پیسہ میں سو دیا چار منافع میں

کچھ لوگ سگریٹ تقسیم کرتے تھے۔ وہ سگریٹ کا ذخیرہ اپنے ساتھ لیے رہتے اور جہاں کوئی مجمع دیکھتے، بہت سارا سگریٹ ان کے درمیان پھینک دیتے۔ لوگ ان سگریٹوں کو "لوٹتے" اور ان کو تماشہ کے طور پر پیتے۔

یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جو اس ملک میں نصف صدی پہلے پایا جاتا تھا۔ اس وقت لوگ نئی چیزوں سے آشنا نہ تھے۔ وہ انھیں خریدنا پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ تاجر طبقہ انھیں نہایت معمولی قیمت پر لوگوں کو دیتا۔ بلکہ اکثر اوقات مفت دیتا۔ آج جب لوگ عادی ہوگیے ہیں تو آج حالات بالکل مختلف ہیں۔

مدرسہ سے نکلنے کے بعد میں نے مختلف علوم کا جو مطالعہ کیا، اس کا ایک زمانہ اعظم گڈھ میں گزرا ہے۔ یہاں میں انگریزی کتب کے لیے مہتا لائبریری جایا کرتا تھا، اور عربی کتب کے لیے کتب خانہ دار المصنفین۔ یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ مجھے یاد ہے کہ مہتا لائبریری میں میں جو کتابیں پڑھنے کے لیے نکالتا تھا ان پر اکثر گرد جمی ہوتی تھی۔ کیوں کہ سالہا سال سے کسی نے ان علمی کتابوں کو چھوا نہیں تھا۔ یہاں زیادہ تر لوگ اخبار پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ علمی مطالعہ کے لیے آنے والا شاید اکیلا میں ہی تھا۔

دار المصنفین میں مطالعہ کا ایک تذکرہ میری کتاب (تعبیر کی غلطی) میں درج ہے۔ یہ واقعہ مذکورہ کتاب کے دیباچہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یکم مارچ کو دار المصنفین دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ علمی ادارہ ۱۹۱۵ میں مولانا شبلی نعمانی نے قائم کیا تھا۔ اعظم گڈھ میں قیام کے زمانہ میں میں نے اس کے کتب خانہ سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اس زمانہ میں انگریزی کی معلومات میں نے مہتا لائبریری سے حاصل کی تھیں۔ اور عربی کی معلومات دار المصنفین کے کتب خانہ سے۔

دس سال کے بعد یہاں کئی نئی چیزیں نظر آئیں۔ انھیں میں سے ایک چیز میوزیم ہے۔ اس

کے اندر بہت سی نادر چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ فارسی کی ایک کتاب (مخطوطہ) ہے جس کا نام مونس الارواح ہے۔ یہ جہاں آرا بیگم کی تصنیف ہے اور ۱۰۶۸ھ میں سونے کی رنگ کاری کے ساتھ نہایت اہتمام کے ساتھ لکھی گئی تھی۔ یہاں سب سے نادر کتاب یہی ہے۔ وہ خود جہاں آرا بیگم کے استعمال میں رہ چکی ہے۔ لندن کی نمائش ۱۹۱۱ میں یہ کتاب ۱۵ ہزار روپیہ میں انشور ڈ کر کے بھیجی گئی تھی۔

اس میوزیم میں مولانا شبلی نعمانی کا مصنوعی پاؤں بھی رکھا ہوا ہے۔ بندوق چل جانے سے مولانا شبلی کا پاؤں زخمی ہوگیا تھا جو بعد کو کاٹ دیا گیا۔ اس وقت نواب بھاول پور نے خاص اہتمام سے لکڑی کا پاؤں تیار کرا کے بھیجا جس کو وہ آخر تک استعمال کرتے رہے۔ پاؤں کٹنے کے واقعہ پر شعراء نے حسن تعلیل کے انداز میں بہت سے اشعار کہے تھے۔ ان میں سے ایک قطعہ یہ تھا:

شکستہ پائی مقدر تھی سرنوشت میں تھی نہ ہاتھ آئے گا اب کچھ بھی ہاتھ ملنے سے
عدم کی دور ہے منزل نہ جا سکیں گے حضور چلے گا قوم کا کام آپ کے نہ چلنے سے

ہماری قوم کے شاعروں نے شکستہ پائی میں حسنِ تعلیل کے نکتے پا لیے۔ مگر ہماری قوم کے قائدین ملت کی شکست میں فتح کا پہلو دریافت نہ کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی ایک صدی کی مدت بیچ پیکار کی سیاست کی نذر ہوگئی، اس مدت میں کوئی دوررس مثبت کام نہ کیا جا سکا۔

دارالمصنفین میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے دارالمصنفین کی تازہ مطبوعہ کتاب اسلام اور مستشرقین (پانچ حصے) تحفہ میں دیئے۔ ۱۹۱۱ میں جنیوا یونیورسٹی کے ایک عیسائی پروفیسر نے مختلف اسلامی موضوعات پر سات لکچر دیئے تھے۔ یہ لکچر فرانسیسی زبان میں تھے۔ ان کا عربی ترجمہ اسی زمانہ میں بیروت سے شائع ہوا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ان میں سے ایک لکچر کا خلاصہ ایک عربی رسالہ سے لے کر معارف میں شائع کیا تھا۔ اس خلاصہ کو مذکورہ کتاب کی پانچویں جلد میں نقل کیا گیا ہے۔

اس لکچر میں کہا گیا ہے کہ اسلام ابتدا میں جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر جس تیزی سے دنیا میں پھیلا ہے اور اپنی اشاعت میں اس نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ بہت ہی حیرت انگیز

ہے۔ اس کے اسباب کی تفصیل میں تمام مورخین سخت حیران ہیں۔

اس سلسلہ میں صاحب لکچرنے جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمان جس ملک میں گیے وہاں انھوں نے عام ہر دلعزیزی حاصل کی۔ وہ اس ملک یا قوم کے مانوس رسوم و عادات سے سکوت کرتے ہیں، وہ ان کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ غلط مذہبی تخیلات اور مذہبی تہواروں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ اس طرح اس قوم کے افراد کو اسلام بظاہر کوئی نیا مذہب نہیں معلوم ہوتا۔ اور وہ اس میں رفتہ رفتہ جذب ہو جاتے ہیں (صفحہ ۶۰) اسی طرح صاحب لکچرنے لکھا ہے کہ چین میں یہ مشاہدہ ہوا ہے کہ پرجوش مسلمانوں نے شانگ ٹونگ کے ہیبت ناک قحط کے زمانہ میں دس ہزار بچوں کو خرید لیا، اور اسلامی تعلیم و تربیت نے ان بچوں کو مسلمان گھرانوں میں بدل دیا ——— موجودہ زمانہ کے مسلمان تہذیبی تفریق میں اپنی زندگی کا راز تلاش کر رہے ہیں، قدیم مسلمانوں نے تہذیبی یگانگت میں اپنی زندگی کا راز دریافت کیا تھا۔

گاؤں کے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اس علاقہ کے دیہاتوں کے احوال بتائے۔ انھوں نے کہا کہ "ہمارے دیہات اب شہر ہو رہے ہیں۔ لوگ بڑی تعداد میں باہر چلے گیے ہیں اور کافی پیسہ کما رہے ہیں۔ وہ لوگ جن کا حال پہلے یہ تھا کہ جسم پر پورے کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ پاؤں جوتے سے خالی ہوتے تھے۔ اب انھوں نے کئی منزل کے پختہ مکانات بنا لیے ہیں۔ ان کے دروازے پر کار اور ٹریکٹر کھڑے ہوئے ہیں۔

اس طرح کی تفصیلات سن کر مجھے ایک حدیث یاد آگئی۔ یہ ایک لمبی حدیث ہے۔ اس میں قیامت کی نشانیاں بتاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی ہے کہ قیامت کی ابتدائی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھو گے کہ بے لباس اور ننگے پاؤں والے لوگ ایک دوسرے سے بڑھ کر اونچی عمارتیں بنائیں گے (وتری العراۃ الحفاۃ یتطاولون فی البنیان) موجودہ دنیا کے احوال پر جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیامت اب قریب آچکی ہے۔ بظاہر لوگ اس طرح زندگی گزار رہے ہیں جیسے کہ وہ ان سے بہت دور ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قیامت لوگوں سے بہت قریب ہے۔ اور بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ وہ ان کے اوپر اس طرح پھٹ پڑے گی کہ وہ نہ اس کو روک سکیں گے اور نہ ان کے لیے یہی ممکن ہوگا کہ اس سے

بھاگ کر کہیں پناہ لے سکیں۔

اس علاقہ کے لوگ بڑی تعداد میں باہر گئے ہیں اور باہر کی کمائی کے نتیجہ میں کافی خوشحال ہو گئے ہیں۔ ایک صاحب نے بنک کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ صرف ضلع اعظم گڈھ میں ہر مہینہ تقریباً ڈیڑھ کرور روپیہ باہر سے آرہا ہے۔ مگر گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ بہت کم لوگ ہیں جو پیسہ کا صحیح استعمال کر رہے ہوں۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے بتایا کہ ان کی گفتگو پولس کے ایک آدمی سے ہوئی، اس نے فخریہ انداز میں کہا کہ ہم نے فلاں گاؤں سے ایک سال کے اندر پانچ لاکھ روپئے وصول کیے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس زیادہ پیسے آگئے ہیں وہ جھگڑے فساد میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس طرح پولس کو موقع مل جاتا ہے کہ وہاں پہونچے اور لوگوں سے پیسے وصول کرے۔

یہ ایک مسلم گاؤں کا قصہ ہے۔ عام طور پر ہمارے لیڈر مسلمانوں پر غیر مسلموں کے معاشی ظلم کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اپنی نادانیوں کے نتیجہ میں ہر روز اپنا جو معاشی نقصان کر رہے ہیں وہ دوسروں کے نام نہاد معاشی ظلم سے سیکڑوں گنا زیادہ ہے۔

ایک صاحب نے الرسالہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا: الرسالہ میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے سبق نکالے جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کی تعریف ادھوری تعریف ہے۔ الرسالہ کوئی تصنیفی کرشمہ نہیں، وہ ایک تربیتی جدوجہد ہے۔ الرسالہ کا مقصد لوگوں کے اندر یہ ذہن بنانا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے واقعات سے سبق لیتے ہوئے زندگی گزاریں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں تزکیہ کہا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ غلّہ اور سبزی سے انسان کے جسم کو غذا ملتی ہے۔ اگر غلّہ اور سبزی اور دوسری کھانے کی چیزیں نہ ہوں تو آدمی کے لیے جسمانی فاقہ کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح گرد و پیش کے واقعات سے نصیحت لینا انسان کی روح کی خوراک ہے۔ اگر آدمی کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو تو وہ روحانی فاقہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور روحانی فاقہ بلاشبہ جسمانی فاقہ سے بھی زیادہ ہلاکت خیز ہے۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے مختلف مسلم اداروں کے احوال بتائے۔ انھوں نے بتایا کہ اکثر مسلم اداروں میں باہمی جھگڑے ہو رہے ہیں۔ عہدوں کی لامتناہی جنگ جاری ہے۔ اس کے نتیجہ میں

ادارے ایک قسم کے ذاتی اکھاڑے بن کر رہ گئے ہیں اور ان کا اصل مقصد اور ان کی ترقی کا کام پس پشت چلا گیا ہے۔

اس گفتگو کو سن کر ایک صاحب نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر روزہ اور نماز کے بارہ میں تو جواب دہی کا احساس موجود ہے۔ مگر دوسرے معاملات میں ان کے اندر سے جواب دہی کا احساس ختم ہو گیا ہے۔ اگر چند لوگ اکٹھا ہوں اور نماز کا وقت آجائے تو کوئی آدمی امامت کے لیے آگے نہیں بڑھے گا، ہر آدمی چاہے گا کہ وہ پیچھے رہے اور دوسرا شخص آگے بڑھ کر نماز پڑھائے۔ مگر یہی لوگ جب نماز سے فارغ ہو کر لوٹتے ہیں تو صدر اور سکریٹری کے عہدے حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز روزہ کے معاملات میں وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہیں۔ مگر دوسرے معاملات میں ان کا خیال یہ ہے کہ وہ جو چاہیں کریں، ان کے لیے وہ خدا کے یہاں پکڑے نہیں جائیں گے۔

میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ جہاں لوگوں کا مفاد نہ ٹکراتا ہو وہاں وہ دیندار ہیں۔ مگر جہاں انھیں دیندار بننے کے لیے مفاد کی قربانی کی قیمت دینی پڑے وہاں انھیں دیندار بننے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

اعظم گڈھ میں ایک حکیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی پریکٹس بہت کامیاب ہے۔ روزانہ دو سو سے زیادہ مریض ان کے یہاں آتے ہیں۔ ان سے گفتگو کے بعد مجھے ایک خاص سبق ملا۔ انھوں نے یہ کیا کہ دوا کی قیمت بہت کم رکھی۔ بلکہ بہت سے مریضوں کا مفت علاج کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مریضوں کی تعداد کافی بڑھ گئی۔ نیز ان کے مریض زیادہ دیر دیر تک ان کے یہاں ٹھہرنے لگے اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے طبی تجربہ کا میدان بہت وسیع ہو گیا۔ ان کے الفاظ میں "ان کو راستہ ملنے لگا"۔ انھوں نے بہت سے مایوس مریضوں کا کامیاب علاج کیا۔ اس طرح ان کی شہرت بڑھنے لگی یہاں تک کہ اب ان کے یہاں روزانہ مریضوں کا میلا لگا رہتا ہے۔

بعض اوقات ایک معمولی تدبیر میں کامیابی کا راز چھپا ہوا ہوتا ہے۔ مگر اکثر لوگ کامیابی کو کسی بہت غیر معمولی تدبیر کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ ہندی کا ایک مقولہ بہت بامعنی ہے: سادھارن گنوں سے اسادھارن منش بنتے ہیں۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ سگریٹ کے عادی تھے۔ ایک روز وہ باتھ روم میں گئے

تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کے لڑکے نے باتھ روم میں چھپ کر سگریٹ پیا ہے۔ وہ خود سگریٹ کی عادت کی وجہ سے اپنی صحت خراب کر چکے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے لڑکے کی صحت بھی سگریٹ نوشی کی وجہ سے تباہ ہو جائے۔ انھوں نے اپنی بیوی کو بتایا تو وہ بھی بہت پریشان ہوگئیں۔ انھوں نے کہا کہ دیکھو ابھی میں لڑکے سے بات کرتا ہوں، اور ابھی یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ وہ سگریٹ کو چھوڑے گا یا نہیں چھوڑے گا۔ اگر اس نے اپنی غلطی مان لی تو وہ اس کو چھوڑ دے گا، اور اگر اس نے غلطی نہیں مانی تو وہ کبھی نہیں چھوڑے گا۔

انھوں نے لڑکے کو بلایا۔ انھوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ تم نے باتھ روم میں سگریٹ پیا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میری صحت اس سگریٹ نوشی کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہے۔ اب اگر تم سگریٹ پینا چاہتے ہو تو پیو۔ مگر چھپ کر نہ پیو۔ لڑکا جھوٹ نہیں بولا۔ اس نے اقرار کر لیا کہ ہاں میں نے باتھ روم میں سگریٹ پی ہے، اور اب میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ اس کے بعد لڑکے نے ہمیشہ کے لیے سگریٹ چھوڑ دی۔

آدمی اگر صاف طور پر کہدے کہ میں نے غلطی کی تو اس کے بعد اس کے اندر یہ عزم جاگتا ہے کہ وہ آئندہ غلطی نہ کرے۔ اور اگر وہ اپنی غلطی کو نہ مانے تو اپنے غلط ہونے کا احساس اس کے اندر نہیں جاگے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بدستور اپنی غلطی میں مبتلا رہے گا۔

ایک لیڈر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ بزدلی سکھاتا ہے۔ میں نے کہا کہ الرسالہ بزدلی نہیں سکھاتا۔ یہ دراصل آپ جیسے لیڈر ہیں جو مسلمانوں کو بزدل بنا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیسے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں نے اپنی پُرجوش تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر سے وہ چیز ختم کر دی ہے جس کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک بے صبر قوم بنے ہوئے ہیں۔ ایسی باتیں جن پر اعراض کرنا چاہیے۔ وہ غیر ضروری طور پر ان سے لڑ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب پولیس آکر مارپیٹ کرتی ہے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ بھاگنا بزبان حال اس کا اعلان ہوتا ہے کہ "ہم بزدل ہیں"۔

انھوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ ایسے مواقع پر ہمیشہ مسلمان ہی مارے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی اس کا ایک فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کا جو پروٹسٹ ہے وہ رجسٹر رہتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر اس کا مقصد

پروٹسٹ کو رجسٹر کرنا ہے تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ خود لیڈر لوگ آگے بڑھ کر گولیاں کھائیں۔ اگر لیڈر لوگ گولی کھائیں گے اور مارے جائیں گے تو پروٹسٹ زیادہ نمایاں ہوگا اور زیادہ موٹے حرفوں کے ساتھ رجسٹر کیا جائے گا۔ ابھی تک تو وہ صرف باریک حرفوں میں رجسٹر کیا جارہا ہے۔ اس پر وہ ہنس کر خاموش ہوگیے۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ لیڈر جو الفاظ بولنے میں بہادر ہوں اور عمل کرنے میں غیر بہادر۔

یہاں انگریزی اخبار پانیر (The Pioneer) پڑھنے کو ملا۔ وہ یہاں کا علاقائی اخبار ہے جو ۱۲۳ سال سے نکل رہا ہے۔ پہلے وہ صرف لکھنؤ سے چھپتا تھا۔ اب وہ لکھنؤ اور بنارس دونوں مقام سے چھپتا ہے۔ یہ وہی اخبار ہے جس کے متعلق اکبر الٰہ آبادی نے طنزیہ انداز میں کہا تھا :

بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے انگریزی اقتدار کے زمانہ میں مسلمان انگریزی چیزوں کو کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ غالباً یہی مزاج وہ سب سے بڑا سبب ہے کہ قدیم زمانہ میں مسلمان انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب کے بارہ میں حقیقت پسندانہ موقف اختیار نہ کرسکے۔ وہ انگریزی صحافت اور جدید قوتوں کے حصول کے معاملہ میں دوسری قوموں سے پیچھے ہوگیے۔ انگریزی تہذیب کو حقیر سمجھنے کا مزاج مسلمانوں میں اتنا بڑھا کہ مفید چیزوں کا بھی مذاق اڑایا جانے لگا۔ مثلاً اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر ہے :

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا   پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

یکم مارچ کو جناب علی حماد عباسی (پیدائش ۱۹۳۱) سے ملاقات ہوئی۔ وہ شبلی نیشنل کالج کے پرنسپل ہیں۔ انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا جس میں بہت بڑا سبق ہے۔

انھوں نے بتایا کہ شبلی کالج میں طالب علمی کے زمانہ میں ان کے جو ساتھی تھے، ان میں سے ایک عبدالقیوم صاحب تھے۔ بی اے کرنے کے بعد انھیں ملازمت کی فکر ہوئی اور وہ بمبئی چلے گیے۔ ایک روز وہ بمبئی کے ایک پارک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی وہاں ٹہلتے ہوئے آئے اور ان کے قریب بیٹھ گیے۔ عبدالقیوم صاحب اپنی بے روزگاری کی وجہ سے کافی پریشان تھے۔ نو وارد ان کے چہرہ پر پریشانی کے آثار دیکھ کر ان سے ہم کلام ہوا۔ دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا

خلاصہ یہ تھا :

What are you worried about?
Nothing sir. I want a job, but I can't get it.
Why?
Because I am a Muslim.
What do you mean by it? If you have talent I will give you a job. Come and see me in my office tomorrow.

یہ نووارد مہاراشٹر کا چیف الیکشن کمشنر تھا۔ عبدالقیوم صاحب اگلے دن بتائے ہوئے پتہ پر پہونچے۔ چیف الیکشن کمشنر نے پوچھا کہ تم ٹائپ کرنا جانتے ہو، انھوں نے کہا کہ ہاں، انھوں نے معمولی ٹسٹ لیا اور اسی وقت ان کو اپنے دفتر میں ٹائپسٹ مقرر کر دیا۔ اس وقت الیکشن کمیشن کے دفتر میں ۱۷ عورتیں ٹائپسٹ تھیں۔ عبدالقیوم صاحب ۱۸ ویں شخص تھے جو وہاں ٹائپسٹ مقرر کیے گیے۔ یہ واقعہ ۱۹۵۰ کا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کو مواقع ملے تو انھوں نے مزید تعلیم کی تدبیر شروع کی۔ وہ پڑھتے رہے اور ترقی کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ امریکہ کی پورٹ لینڈ یونیورسٹی میں پہونچ گیے۔ آج کل وہ وہاں کے ایک ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ ہیں۔

اعظم گڈھ میں مولانا مجیب اللہ ندوی سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں وہ کئی بار مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملے تھے۔ ایک بار وہ پندرہ دن تک مولانا مرحوم کے ساتھ دہلی میں تھے۔ ان دنوں مولانا مرحوم کے خطوط کا جواب دینا ان کے ذمہ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اس زمانہ میں جو منی آرڈر آتے تھے، مولانا مرحوم اکثر منی آرڈر فارم پر یہ لکھوا کر اسے واپس کر دیتے کہ :

ہم کو مال کی ضرورت نہیں، ہم کو جان کی ضرورت ہے

بظاہر ایک آدمی سوچے گا کہ یہ نادانی ہے۔ جان تو ملی نہیں، اور جو چیز مل رہی تھی اس کو واپس کر دیا۔ مگر یہ نادانی نہیں، یہ سب سے اونچی دانش مندی ہے۔ بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ مولانا مرحوم نے مال کو واپس کیا تو ان کو مال اور جان دونوں ملے۔ اور جو لوگ مال واپس کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، وہ مال اور جان دونوں سے محروم رہتے ہیں۔

مولانا مجیب اللہ ندوی نے خدمت خلق کی اہمیت بتاتے ہوئے اپنا ایک تجربہ (۱۹۶۶) بیان کیا جو ان کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"اعظم گڈھ میں جس کرایہ کے مکان میں میں بال بچوں سمیت رہتا تھا اسی کے سامنے ایک ہریجن لکڑی کی ٹال کرتا تھا اور اس کے گھر کے عورت بچے میرے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ ایک دن چار بجے کے قریب میں دارالمصنفین سے واپس آیا تو دیکھا کہ ہریجن کی بیوی رو رہی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے، بولی نرائن (اس کے لڑکے کا نام) کے باپ کو پولیس والے کوتوالی پکڑ لے گیے ہیں۔ میں نے کہا گھبراؤ نہیں میں کوتوالی جاتا ہوں۔ عصر کی جماعت کا وقت قریب تھا، میں نے نماز پڑھی اور پھر آکر واقعہ پوچھا تو بتایا کہ ایک '' کرول کی دوکان سے ایک آدمی کے غلہ کی گٹھری لے کر بھاگا۔ پولیس نے اس کا پیچھا کیا وہ لڑکا گٹھری لکڑی کی ٹال پر پھینک کر چمپت ہوگیا۔ جو پولیس والا لڑکے کی تلاش میں نکلا تھا اس نے لڑکے کو تو پایا نہیں مگر گٹھری ٹال پر مل گئی اس لیے ان کو پکڑ لیا اور کوتوالی لے گیا۔ میں نے شیروانی پہنی اور رکشہ کرکے کوتوالی پہونچا۔ اس سے پہلے کبھی کوتوالی جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میں ایک اجنبی کی طرح کوتوالی کے صحن میں ٹہلنے لگا۔ اتفاق سے کوتوال صاحب کمرے سے باہر نکلے اور ایک سفید پوش آدمی کو ٹہلتے ہوئے دیکھ کر پوچھا کہ آپ کیوں ٹہل رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ آدمی جو حوالات کے قریب بیٹھا ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ کیا کہنا ہے۔ میں نے صحیح واقعہ بیان کیا۔ ان کو میری بات پر یقین آگیا اور ڈانٹ کر ایک پولیس مین سے کہا کہ اس بے چارے کو کیوں بٹھا رکھا ہے مولوی صاحب کے ساتھ کر دو۔ میں نے اسے رکشہ پر بٹھایا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آگیا۔ اس تھوڑی سی خدمت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بیس برس گزر جانے کے بعد بھی وہ ہریجن اور اس کے بچے مجھ سے ایسا معاملہ کرتے ہیں کہ جیسے میں نے کوئی بہت بڑا احسان کر دیا ہے۔ اس کے لڑکے پاس ہوتے ہیں تو میرا پیر چھونے آتے ہیں۔ ملازمت ملتی ہے تو ممنونیت کے اظہار کے لیے کچھ تحفہ تحائف بھی لاتے ہیں، وہ دوسروں سے کہتے ہیں کہ یہ دیوتا ہیں"

ایک صاحب سے میں نے کہا کہ اپنا کوئی خاص تجربہ بتائیے۔ انھوں نے کہا کہ ایک بار میں ایک دیہاتی علاقہ میں سفر کر رہا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ ایک جگہ پہونچا تو وہاں تین آدمی لاٹھی لیے ہوئے

موجود تھے۔ اتنے میں سامنے سے دو آدمی آگیے۔ ان میں سے ایک شخص وہ تھا جس کو قتل کرنے کے ارادے سے یہ تینوں آدمی یہاں چھپے ہوئے تھے۔ وہ آدمی جب وہاں پہونچا اور تین آدمیوں کو اسلحہ لیے ہوئے دیکھا تو اس نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ لوگ اس کو مارنے کے لیے آئے ہیں۔ اس نے فوراً اپنے ساتھی کو آواز دی اور اپنا کرتہ اتار کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بلند آواز سے کہا: یہ کرتا لے جا کر میری ماں کو دیدے اور اس سے بول کہ میری قبر تیار رکھے۔ اس نے بلند آواز سے یہ جملہ کہا اور پھر کھڑے ہوئے آدمیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا: تم میں سے جس کو آنا ہے میرے مقابلہ میں آئے، میں تیار ہوں۔ اس کے بعد تینوں میں سے کوئی شخص آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ سب خاموشی کے ساتھ واپس چلے گیے ——— اکثر اوقات جرأت کا مظاہرہ ہی دشمن کو زیر کرنے کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔

بعض لوگوں نے کہا کہ اخبارات و رسائل میں آپ کے خلاف بہت لکھا جا رہا ہے، پھر آپ ان کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں میں قرآن کے اس اصول پر عمل کر رہا ہوں کہ: واعرض عن الجاھلین (نادانوں سے اعراض کرو) میں اپنے ان ناقدین کی چیزیں برابر پڑھتا رہتا ہوں۔ مگر اب تک کوئی ایسی بات نہیں ملی جس کا جواب دیا جائے۔ اب تک ہمارے خلاف چھپی ہوئی تمام تنقیدیں محض بے معنی الفاظ کے مجموعے ہیں نہ کہ حقیقتہً وہ چیز جس کو علمی زبان میں تنقید کہا جاتا ہے۔ پھر آخر جواب دیا جائے تو کس بات کا جواب دیا جائے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کے سفرناموں میں خودستائی (Self-praise) ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ دو چیزیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک ہے خودستائی اور دوسری چیز ہے بیانِ واقعہ۔ الرسالہ میں جو چیز ہوتی ہے وہ بیانِ واقعہ ہے نہ کہ خودستائی۔ اور بیانِ واقعہ میں کوئی بھی شرعی یا علمی قباحت نہیں۔

۳ مارچ ۱۹۸۷ کی صبح کو میں واپس دہلی پہونچا۔

بنگلور کی بک فیر (مارچ ۱۹۸۷) کے موقع پر اسلامی مرکز کا بک اسٹال لگایا گیا۔ خدا کے فضل سے اسٹال کامیاب رہا۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں کتابیں دیکھیں اور حاصل کیں۔ تاثراتی رجسٹر میں بہت سے لوگوں نے اپنے تاثرات درج کیے۔ ایک صاحب نے اپنے تاثرات کے تحت لکھا: یہ کیسا عجیب معاملہ ہے کہ ایک عرصہ سے میں مختلف مصنفین کی کتابیں پڑھتا آیا ہوں۔ لیکن جب سے مولانا وحید الدین صاحب مدظلہ کی کتابیں پڑھنے لگا ہوں، سوائے آپ کے دیگر مصنفین کی کتابیں بے مزہ معلوم ہوتی ہیں (سید شہاب الدین، بنگلور)

۲۔ ایک اور صاحب نے اپنے بارہ میں حسب ذیل الفاظ قلم بند کیے:

I want to know about Islam in a philosophical way.
L.C. Reddy, Anuikshaki, Study Centre,
Aravinda Nagar, Bangalore 560084

۳۔ انگریزی الرسالہ میں اس سے پہلے سفرنامہ کا ترجمہ شائع نہیں کیا جاتا تھا۔ اب بعض لوگوں کی تجویز پر اس کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ قارئین کے درمیان بہت پسند کیا گیا ہے۔ انگریزی الرسالہ میں اردو سفرنامہ کا خلاصہ دیا جارہا ہے۔

۴۔ لندن میں ۱۴۔ ۱۶ اپریل ۱۹۸۷ کو ایک کتابوں کی نمائش (بک فیر) ہوئی۔ اس میں منتظمین کی طرف سے اسلامی مرکز کی بعض انگریزی کتابیں بھی برائے نمائش رکھی گئیں۔ اس موقع پر "بکس فرام انڈیا" کے نام سے منتظمین کی جانب سے سو صفحات کا ایک انگریزی کتابچہ چھاپ کر تقسیم کیا گیا۔ اس کتابچہ میں صفحہ ۳۸، اور صفحہ ۸۸ پر کتاب کا نام اور اس کا مختصر تعارف درج تھا۔

۵۔ نئی دہلی (مندر مارگ) پر ۹ مئی کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے نماز کے موضوع پر قرآن و حدیث کی روشنی میں درس دیا۔

۶۔ ۲۱۔ ۲۲ مارچ ۱۹۸۷ کو صدر اسلامی مرکز نے مراد آباد کا سفر کیا تھا۔ واپسی کے بعد اقبال احمد صاحب کا خط (۲۹ مارچ) موصول ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ دونوں ہی دنوں کی آپ کی تقاریر سامعین نے بے حد پسند کی ہیں۔ سب ہی نے بہت عمدہ الفاظ میں اپنی

پسندیدگی اور دینی معلومات میں اضافہ کا تاثر دیا۔ آپ کی آمد اور آپ کی تقریروں اور نصیحتوں نے یہاں الرسالہ کے مشن کو عملی جامہ پہنانے میں بہت مدد کی ہے۔

۷۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: تین سال سے الرسالہ زیر مطالعہ ہے۔ میں نے کئی بار چاہا کہ الرسالہ کے سلسلہ میں اپنے تاثرات آپ کو لکھوں۔ مگر لکھنا ممکن نہ ہوا۔ اس کی وجہ غالباً الفاظ کی کمی تھی۔ انسان قطب مینار کو دیکھتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے کہ "بہت اونچا ہے" یہی انسان جب ایورسٹ پہاڑ کو دیکھتا ہے تو دوبارہ یہی کہتا ہے کہ "بہت اونچا ہے" حالانکہ دونوں کی اونچائی میں بہت فرق ہے۔ لیکن انسان کیا کرے کہ یہ جاننے کے باوجود "بہت اونچا" سے زیادہ کوئی لفظ وہ کہہ نہیں پاتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں الفاظ اپنے معنی کو کھو دیتے ہیں۔ راقم الحروف نے جب بھی الرسالہ کے بارہ میں قلم اٹھانا چاہا تو الفاظ اپنی حیثیت کھوتے ہوئے نظر آئے۔ اس کو الرسالہ جس بلندی پر نظر آیا اس کو کوئی نام دینے کے لیے میرے پاس لفظ نہ تھا۔ آج کل مسلم نوجوان عام طور پر جس ذہنی حالت میں ہیں اسی حالت کا آج سے تین سال قبل میں بھی شکار تھا۔ حقیقت سے کوسوں دور میرا ذہن خواب کی دنیا میں تھا جہاں نظام اعلیٰ قائم کرنے، باطل کو طاقت کے زور پر مٹانے، اپنے قومی پچھڑے پن کے خلاف حکومت سے احتجاج کرنے کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میرے نزدیک جہاد یہی تھا اور میرے رہنما اور اسلام کے حقیقی خادم وہی تھے جو مذکورہ بالا باتوں کو لوگوں تک پھیلا رہے تھے۔ اور اس پر عمل کی ترغیب دیتے تھے۔ نچلا بیٹھ جانا، خاموش رہ جانا، معاف کر دینا، برداشت کر لینا یہ سب چیزیں میری نظر میں قوم کی موجودہ حالت میں زہر تھیں۔ نومبر ۱۹۸۳ میں بہ سلسلہ ملازمت پٹنہ آیا۔ برادرم اسلم جمالی صاحب اور برادرم کریم صاحب نے الرسالہ سے متعارف کرایا۔ الرسالہ کی باتوں کو ذہن نے فوراً مان لیا۔ الرسالہ کے مضامین میں سچائی نظر آتی مگر وہ کڑوی معلوم ہوتی۔ مگر یہ مضامین میرے مفروضات اور جذبات کو ایک ایک کرکے مٹاتے اور گراتے چلے گئے۔ کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی تھی۔ الرسالہ بھی میرے لیے ایک دریافت ہے۔ اس دریافت نے ذاتی طور پر مجھے اتنا ہی متاثر کیا ہے جتنا کولمبس کی دریافت نے دنیا کو (شاہ واصف امام)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۹ اگست ۱۹۸۷

فہرست

الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون: 697333, 611128

دو قسم کے انسان

اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجہم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیائہم الطاغوت یخرجونہم من النور الی الظلمات اولئک اصحاب النار ہم فیہا خالدون۔

(البقرہ ۲۵۷)

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا ان کے دوست شیطان ہیں، وہ ان کو اجالے سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ آگ والے لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا اعتماد خدا پر ہو، جو اللہ کی بتائی ہوئی باتوں کو سچ جانتے ہوئے اس کی روشنی میں اپنا راستہ طے کرتے ہوں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جن کا اعتماد غیر خدا پر ہو۔ جن کا حال یہ ہو کہ جب انھیں کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ خدا کے علاوہ دوسری دوسری باتوں کی بنیاد پر اپنی راہ عمل متعین کریں۔

جو لوگ خدا کو اپنا ولی و مددگار بناتے ہیں ان کا ذہن خدا رخی بن جاتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں خدائی انداز میں سوچتے ہیں۔ وہ اپنی تدبیروں سے زیادہ خدا کی مدد پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کے جذبات کا رُخ انسان کے بجائے خدا کی طرف رہتا ہے۔ وہ غصہ اور انتقام کے بجائے ہمیشہ صبر اور معافی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں ——— یہ اندھیرے سے روشنی کی طرف سفر کرنے والے لوگ ہیں۔

جو لوگ خدا کو اپنا ولی نہ بنائیں ان کا ولی شیطان بن جاتا ہے۔ ان کا ذہن ہمیشہ تخریب کاری کی طرف چلتا ہے۔ وہ سازش اور انتقام کے طریقوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو ان کا ذہن فوراً منفی تدبیروں کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ ان کو کبھی روشنی میں آنا نصیب نہیں ہوتا ——— یہ وہ لوگ ہیں جن کو شیطان نے اجالے سے اندھیرے کی طرف دوڑا دیا۔ اول الذکر گروہ کے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی ہے، دوسرے گروہ کے لیے دنیا و آخرت میں ناکامی۔

بعد از وقت

مسٹر بوکاسا (Jean Bedel Bokassa) ۱۹۲۱ میں پیدا ہوئے۔ وہ سنٹرل افریقہ کی فوج میں جنرل تھے۔ وہ اپنے اس عہدہ پر قناعت نہ کرسکے، جنوری ۱۹۶۶ میں انھوں نے فوجی بغاوت کردی۔ اور صدر ڈاکو (David Dacko) کو معزول کرکے خود سنٹرل افریقہ کے صدر بن گیے۔ جنرل بوکاسا صدر بوکاسا بننے پر بھی قانع نہیں ہوئے۔ کیوں کہ انھیں اندیشہ تھا کہ اگلے الکشن میں وہ صدارت کھودیں گے۔ چنانچہ ۱۹۷۶ میں انھوں نے پارلیمنٹ کو ختم کرکے اپنے شہنشاہ (Emperor) ہونے کا اعلان کردیا۔ اب انھوں نے تاج پہن لیا اور شہنشاہ بوکاسا کہے جانے لگے۔

تاہم مسئلہ اب بھی ختم نہیں ہوا۔ اب شہنشاہ بوکاسا کا سامنا اس چیز سے تھا جس کو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (3/1100) نے (Realities of French economic control) سے تعبیر کیا ہے۔ سنٹرل افریقہ کی قیمتی کانیں فرانس کے قبضہ میں تھیں۔ نئے سیاسی نظام میں فرانس کو اپنا اقتصادی مفاد خطرہ میں نظر آیا۔ چنانچہ فرانس کی مدد سے ۱۹۸۰ میں ایک اور فوجی انقلاب ہوا اور مسٹر ڈیوڈ ڈاکو دوبارہ سنٹرل افریقہ کے صدر بنادیے گیے۔ جون ۱۹۸۷ میں بوکاسا کو پھانسی دیدی گئی۔

انقلاب کے بعد مسٹر بوکاسا ملک سے باہر جانے میں کامیاب ہوگیے تھے۔ وہ اکتوبر ۱۹۸۶ میں دوبارہ سنٹرل افریقہ واپس آئے۔ ملک میں داخل ہوتے ہی انھیں گرفتار کرلیا گیا (انڈین اکسپریس ۹ جون ۱۹۸۷) ان کے اوپر بہت سے سنگین الزامات تھے۔ مثلاً ۲۰ آدمیوں کو قتل کرانا، سرکاری خزانہ سے کروروں ڈالر رشوت دینا وغیرہ۔ اسٹیٹ پراسیکیوٹر مسٹر جبریل مبودو (Gabriel Mboudou) نے بینگوئی (Bangui) کی کریمنل عدالت سے کہا تھا کہ مسٹر بوکاسا نے اپنے ۱۴ سالہ زمانۂ حکومت میں جو جرائم کیے ہیں اس کے بعد ضروری ہے کہ انھیں موت کی سزا دی جائے۔ ۸ جون ۱۹۸۷ کو مسٹر بوکاسا کی پیشی عدالت میں ہوئی تو انھوں نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا کہ آج میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ معمولی شہری کی حیثیت سے پُرامن زندگی گزاروں:

Today, I only want to live in peace as a simple citizen.

آدمی اگر قناعت کا طریقہ اختیار کرے تو وہ کبھی ذلت اور ناکامی سے دوچار نہ ہو۔

Swami Vivekananda on Islam

The Hindus may get the credit of arriving at it earlier than other races, yet practical Advaitism, which looks upon and behaves to all mankind as one's own soul, was never developed among the Hindus.

On the other hand, my experience is that if ever any religion approached to this equality in an appreciable manner, it is Islam and Islam alone, I am firmly persuaded, therefore, that without the help of practical Islam, theories of Vedantism, however fine and wonderful they may be, are entirely valuless to the vast mass of mankind.

For our own motherland as junction of the two great systems, Hinduism and Islam, — Vedanta brain and Islam body — is the only hope. I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this chaos and strife, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body (pp. 379-380).

Letters of Swami Vivekananda,
Advaita Ashrama
5, Dehi Entally Road,
Calcutta, 1970, pp. 463

Indian Muslims at the Crossroads

By Shailendranath Gosh

As one who, early in his youth, was attracted to the Islamic message of social equality and universal sharing of resources and lived, as a peasant organiser, among the Muslim masses for many years in pre-partition Bengal's countryside sharing their ethos; and as one who, in 1947-48, witnessed the depths of their remorse over their earlier separatist craze, I direct this appeal to our Muslim brothers and sisters.

The true interests of the Muslims can be served much better by defining the goal in harmoniously constructive terms rather than in a spirit of separatist negativism. To be better Muslims and more prosperous would be a laudable goal.

My Muslim brethren need to know that I, a Hindu, am interested in the affairs of the Muslims for many reasons. I had hoped that the Indian Muslims, after their chastening experience of 1947, could turn to another road — to find a **separate identity** for themselves by being ahead of others in **creativity** and thus be the harbinger of a new Indian Renaissance. It has happened many times in history that a creative minority has sparked the rebirth of a whole nation.

The Hindustan Times, April 4, 1986

انسانیت انتظار میں ہے

مشہور ہندو عالم سوامی ویویکانند نے لکھا ہے کہ زندگی کے وحدانی تصور (ادویتا واد) پر دوسری نسلوں سے پہلے پہونچنے کا کریڈٹ ہندوؤں کو مل سکتا ہے، مگر عملی وحدانیت جو کہ تمام انسانیت کو ایک سمجھے اور سب سے ایک طرح کا سلوک کرے، کبھی ہندوؤں میں پیدا نہ ہو سکی۔

دوسری طرف میرا تجربہ ہے کہ اگر کوئی مذہب کبھی اس مساوات تک قابل لحاظ طور پر پہونچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس بنا پر میں یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ عملی اسلام کی مدد کے بغیر، ویدانت کے نظریات، خواہ وہ کتنے ہی عمدہ اور حیرت انگیز ہوں، وسیع انسانیت کے لیے مکمل طور پر بے فائدہ ہیں۔

ہماری مادر وطن کے لیے جو کہ دو بڑے مذہبی نظاموں ہندوازم اور اسلام کا سنگم ہے، ویدانت دماغ اور اسلام جسم واحد امید ہے۔ میں اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندستان بحران اور انتشار سے نکل کر شاندار اور ناقابل تسخیر بن رہا ہے اور یہ واقعہ ویدانت دماغ اور اسلام جسم کے ذریعہ ہو رہا ہے۔

مسٹر شیلندر ناتھ گھوش نے لکھا ہے کہ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو اپنی جوانی کے ابتدائی دور میں اسلام کے سماجی مساوات اور عالمی اشتراک کے پیغام سے متاثر ہوا، اور تقسیم سے پہلے بنگال میں مسلم عوام کے درمیان کسانی تنظیم کے تحت رہا اور ان کے عقائد و نظریات سے قریبی واقفیت حاصل کی، اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے ۴۸-۱۹۴۷ میں تقسیم کے بعد میں ان کے سابقہ دیوانہ پن پر انھیں شرمندہ ہوتے ہوئے دیکھا، میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے نام یہ اپیل جاری کر رہا ہوں۔

مسلمانوں کے سچے مفادات اس طرح زیادہ بہتر طور پر حاصل کیے جا سکتے ہیں کہ ان کی منزل متحدہ تعمیری اصطلاحات میں مقرر کی جائے نہ کہ منفی انداز اور تفریق کی روح کے ساتھ ان کا تعین کیا جائے۔ اچھا مسلمان اور زیادہ خوش حال بننا بلاشبہ ان کا اعلیٰ مقصد قرار دیا جانا ہے۔ میرے مسلمان بھائیوں کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ میں جو کہ ایک ہندو ہوں۔ مختلف

اسباب سے مسلمانوں کے معاملات میں دل چسپی رکھتا ہوں۔ میں نے امید کی تھی کہ ہندستان کے مسلمان ۱۹۴۷ کے سبق آموز تجربہ کے بعد، ایک اور راستہ کی طرف مڑسکیں گے، وہ اپنا علٰحدہ تشخص اس میں پائیں گے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ تخلیقی ثابت کریں اور اس طرح وہ ہندستان کی نشأۃ ثانیہ کے نقیب بنیں۔ تاریخ میں ایسا بہت بار ہوا ہے کہ ایک تخلیقی اقلیت ایک پوری قوم کو نئی زندگی کی طرف لے جانے کا ذریعہ بن گئی ہے۔

تبصــــرہ

ہندستان کے ہندوؤں میں، میرے اندازہ کے مطابق، پچاس فیصد سے زیادہ ایسے لوگ ہیں جو مسلمانوں کے بارہ میں وہ مثبت اور خیر خواہانہ تصور رکھتے ہیں جس کا دو نمونہ اوپر کے اقتباس میں نقل کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات، خاص طور پر توحید اور مساوات، سے متاثر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلام کی ان قدروں کو ملک میں فروغ دیا جائے۔ کیوں کہ ان کے بغیر ملک کی حقیقی ترقی نہیں ہوسکتی۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ مسلمان اٹھیں اور اپنے اس تخلیقی کردار کو ادا کریں۔ مسلمان امکانی طور پر پوری طرح اس کی استعداد رکھتے ہیں۔ بلکہ وہی واحد گروہ ہیں جو اس قسم کا ثبت کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ وہی وہ لوگ ہیں جن کے پاس خدا کی آفاقی تعلیمات کا غیر محرف اڈیشن موجود ہے۔

مسلمان بلاشبہ اس تاریخی کردار کو ادا کرکے موجودہ ماحول میں اپنے لیے باعزت جگہ حاصل کرسکتے ہیں۔ مگر اس کردار کو ادا کرنے کی ایک لازمی شرط ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو وقتی حالات سے اوپر اٹھائیں۔ وہ یک طرفہ طور پر ہر قسم کی شکایتوں اور ناانصافیوں کو نظر انداز کردیں۔ وہ کھونے پر غم کرنا چھوڑ دیں اور محرومی کی تلخیوں کو بھلا دیں۔ جس دن وہ ایسا کریں گے اسی دن وہ اس قابل ہوجائیں گے کہ وہ اس ملک میں وہ ایجابی رول ادا کرسکیں جس کا تاریخ کو صدیوں سے انتظار ہے۔

یہی وہ قربانی ہے جس کو قرآن میں صبر کہا گیا ہے، اور صبر کرنے والوں ہی کے لیے مقدر ہے کہ وہ قانونِ قدرت کے مطابق قوموں اور ملکوں کے قائد بنیں (وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا)

محبت کی طاقت

سوامی رام تیرتھ (۱۹۰۶ - ۱۸۷۳) نہایت قابل آدمی تھے۔ ان کا ایک بہت بامعنی قول ہے: زندگی کے سب دروازوں پر لکھا ہوا ہوتا ہے "کھینچو" مگر اکثر ہم اسے "دھکا" دینا شروع کر دیتے ہیں۔

سوامی رام تیرتھ روانی کے ساتھ انگریزی بولتے تھے۔ وہ دھرم کے پرچار کے لیے ۱۹۰۳ میں امریکہ گئے۔ ان کا جہاز سان فرانسسکو کے سمندری ساحل پہ لنگر انداز ہوا۔ وہ اترے تو ایک امریکی ازراہِ تعارف ان کے قریب آیا۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی:

" آپ کا سامان کہاں ہے " امریکی نے پوچھا۔

" میرا سامان بس یہی ہے " سوامی رام تیرتھ نے جواب دیا۔

" اپنا روپیہ پیسہ آپ کہاں رکھتے ہیں "

" میرے پاس روپیہ پیسہ ہے ہی نہیں "

" پھر آپ کا کام کیسے چلتا ہے "

" میں سب سے پیار کرتا ہوں، بس اسی سے میرا سب کام چل جاتا ہے "

" تو امریکہ میں آپ کا کوئی دوست ضرور ہوگا "

" ہاں ایک دوست ہے اور وہ دوست یہ ہے "

سوامی رام تیرتھ نے یہ کہا اور اپنے دونوں بازو امریکی شخص کے گلے میں ڈال دیے۔ امریکی ان کی اس بات سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے بعد وہ امریکی ان کا اتنا گہرا دوست بن گیا کہ وہ انھیں اپنے گھر لے گیا اور سوامی رام تیرتھ جب تک امریکہ میں رہے وہ برابر ان کے ساتھ رہا اور ان کی خدمت کرتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ ان کا شاگرد بن گیا۔

اس دنیا میں محبت سب سے بڑی طاقت ہے۔ محبت کے ذریعہ آپ اپنے مخالف کو جھکا سکتے ہیں اور ایک اجنبی شخص کو اپنا بنا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ کی محبت سچی محبت ہو، وہ دکھاوے اور نمائش کے لیے نہ ہو۔

سابق شاہ روس

ولادیمیر اول (Vladimir I) ۹۵۶ء میں پیدا ہوا، اور ۱۰۱۵ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ روس کا پہلا عیسائی بادشاہ ہے۔ وہ ابتداءً بت پرست تھا۔ اس نے عیسائی مذہب قبول کرلیا۔ اس کے بعد اس نے روسی باشندوں کو عیسائی بنانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ تمام بُت دریاؤں میں پھینک دیئے گیے۔

گیارھویں صدی عیسوی کے ایک مسیحی راہب یعقوب (Jacob) نے اس سلسلہ میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بہت سبق آموز ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ شاہ روس ولادیمیر کا یقین اپنے آبائی مذہب (بت پرستی) سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے تحقیق کے لیے یہودی، عیسائی اور اسلامی علماء کو بلایا۔ اور ہر ایک سے اس کے مذہب کے بارہ میں مفصل گفتگو کی (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ۱۹۸۴، تذکرہ ولادیمیر)

یعقوب کے بیان کے مطابق یہودی علماء نے کہا کہ ہمارا خدا ہم سے ناراض ہے۔ اس لیے ہم کو نہیں معلوم کہ ہمارا مقام زمین میں ہے یا آسمان میں۔ ولادیمیر نے کہا کہ مجھے ایسے مذہب کی ضرورت نہیں۔

مسلم علماء کی زبان سے اسلام کی تعلیمات سن کر اس کو اسلام سے دلچسپی ہوئی۔ حتی کہ وہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مگر اس نے کہا کہ میں شراب کا بہت زیادہ عادی ہوں، میں اور سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں مگر میں شراب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مسلم علماء نے کہا کہ ہمارے مذہب میں شراب حرام ہے اس لیے اگر تم اسلام قبول کرتے ہو تو تم کو شراب بھی لازماً چھوڑنی پڑے گی۔ اس نے علماء سے بہت زیادہ کہا کہ شراب کے معاملہ میں اسے رخصت دیدی جائے۔ مگر علماء راضی نہیں ہوئے۔ چنانچہ بات ختم ہوگئی اور شاہ روس اسلام قبول کرنے سے باز رہا۔

اس کے بعد شاہ روس ولادیمیر نے عیسائی مذہب کے لوگوں سے گفتگو کی۔ عیسائی عالموں نے زیادہ حکمت اور دانش مندی کا ثبوت دیا وہ اگرچہ اپنے مذہب اور عقائد کے معاملہ میں بادشاہ کو زیادہ مطمئن نہ کر سکے۔ مگر انھوں نے شراب کے معاملہ میں بادشاہ کو رخصت دے دی۔

مسیحیت پر اصولی اعتبار سے مطمئن نہ ہونے کے باوجود عملی اعتبار سے اس نے اس کو پسند کرلیا۔ چنانچہ گفتگو کے آخر میں شاہ روس نے مسیحی مذہب کو اختیار کرلیا۔ پروفیسر رابرٹس کے الفاظ میں :

It was a turning-point in Russian history and culture.
J.M. Roberts, *The Pelican History of the World*.
Penguin Books Ltd., 1980, p. 355.

یہ واقعہ روس کے تاریخ اور کلچر میں ایک نقطۂ انقلاب بن گیا۔ ایک ملک جس کا مستقبل اسلام کی طرف جا سکتا تھا، اس کا مستقبل مسیحیت کی سمت میں چلا گیا۔

جن علمار نے سابق شاہ روس سے گفتگو کی، ان کو اسلام کا ایک مسئلہ معلوم تھا، مگر ان کو اسلام کا دوسرا مسئلہ معلوم نہ تھا۔ وہ حرام و حلال کے قانونی مسئلہ کو جانتے تھے مگر وہ حکمت دعوت کے زیادہ گہرے مسئلہ کو نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے وہ نادانی کی جو اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

اسلام میں بلاشبہ شراب کو حرام کیا گیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ شراب اول روز سے حرام نہ تھی۔ مکہ میں جو لوگ مسلمان ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے توحید اور رسالت کی بیعت لیتے تھے مگر شراب چھوڑنے کا حکم نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ مکہ کے اہل ایمان میں ایسے لوگ شامل تھے جو اسلام کے باوجود شراب پیتے رہے۔ انھوں نے بعد کو اس وقت شراب پینا چھوڑا جب کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آئے اور شراب کے بارہ میں آخری حکم نازل ہو گیا۔

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا آغاز شراب کا حکم بیان کرنے سے نہیں ہوتا اور نہ یہ ضروری ہے کہ ایمان لانے کے لیے ہر حال میں ترکِ شراب کی شرط لگائی جائے۔ ترکِ شراب اگر پہلے مرحلہ میں ممکن نظر نہ آئے تو اس کو دوسرے مرحلہ کے لیے موخر کیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ شراب کے بارے میں رخصت اس وقت تک تھی جب تک اس کے بارے میں واضح حکم قرآن میں نہیں آیا تھا۔ اب جب کہ شراب کی حرمت کا واضح حکم آچکا ہے تو اب یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک حرام کی ہوئی چیز کے بارے میں کسی کو رخصت دی جائے۔ مگر یہ استدلال صحیح نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے دعوتی مصالح کے تحت بعض احکام میں لوگوں کے ساتھ وقتی طور پر نرمی اور رخصت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ اس کی ایک واضح مثال قبیلۂ ثقیف کا معاملہ ہے۔ قبیلۂ ثقیف (طائف) کا وفد رمضان ۹ھ میں مدینہ آیا اور اسلام قبول کیا۔ انھوں نے قبولِ اسلام کے لیے یہ شرط لگائی کہ وہ زکواۃ نہ دیں گے اور جہاد نہیں کریں گے۔ اس وقت زکواۃ اور جہاد کا حکم واضح طور پر قرآن میں آچکا تھا۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شرطوں کو منظور کر لیا، اور فرمایا کہ بعد کو وہ خود ہی اس پر بھی عمل کریں گے۔ اس سلسلہ میں ابوداؤد کی ایک روایت یہاں نقل کی جاتی ہے:

عن وهب، سألت جابرا عن شأن ثقيف اذ بايعت. قال: اشترطت على رسول الله صلى الله عليه وسلم ان لاصدقة عليها ولاجهاد، وانه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول بعد ذالك: "سيتصدقون ويجاهدون اذا اسلموا۔"

سیرۃ ابن کثیر، جلد ۴، صفحہ ۵۶

وہب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر سے ثقیف کے معاملہ میں پوچھا جب کہ انھوں نے بیعت کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ثقیف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط لگائی کہ ان پر زکواۃ نہ ہوگی اور نہ ان پر جہاد ہوگا۔ اور یہ کہ انھوں نے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سُنا: جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو آئندہ وہ زکواۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔

اسلام کے مستقل احکام وہی ہیں جو قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔ یہ احکام بلاشبہہ کسی تفریق وتقسیم کے بغیر مطلوب ہیں۔ مگر مخصوص حالات میں کسی شخص کے ساتھ وقتی طور پر رخصت اور رعایت کا طریقہ اختیار کرنا بھی خود اسلام ہی کا تقاضا ہے۔

دعوت کے معاملہ میں خاص طور پر اس کا بہت زیادہ لحاظ کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں کسی شخص یا قوم کا داخلہ ایک تدریجی عمل ہے۔ حکمت دعوت اسی تدریج کو ملحوظ رکھنے کا دوسرا نام ہے۔ رسول اور اصحاب رسول نے اسی تدریج کی حکمت کو اختیار کرکے ایک عالم میں اسلام کو پھیلا دیا۔ بعد کے زمانہ میں جب مسلمان اس حکمت کو بھول گیے تو اسلام کی اشاعت کا کام بھی رک گیا۔

قومی شریعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد کے زمانہ کی بابت بہت سی پیشین گوئیاں کی تھیں جو حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں ان کا ایک مجموعہ وہ ہے جن میں یہ پیشگی خبر دی گئی ہے کہ مسلمان بعد کے زمانہ میں ان طریقوں پر چلیں گے جو یہود و نصاریٰ کے طریقے ہیں۔ یعنی وہ اپنی زبان سے اسلام کا نام لیں گے مگر عملاً ان کی روش وہ ہوگی جو یہود و نصاریٰ کی روش ہے۔ اس سلسلہ کی ایک روایت یہاں نقل کی جاتی ہے:

عَنْ اَبِی سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رسولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وسلم قَالَ: لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ من کانَ قبلکم شِبْراً بِشِبْرٍ وذراعًا بِذِرَاعٍ حتّٰی لو دَخَلوا جُحْرَ ضَبٍّ لَتَبِعْتُمُوْهُمْ۔ قُلْنا یَارسولَ اللّٰہِ الیَهُوْدُ والنصاریٰ۔ قَالَ فَمَنْ۔

(اخرجہ البخاری و مسلم)

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ ضرور پچھلی امتوں کے پیچھے چلو گے، بالشت بالشت اور ہاتھ ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہوں تب بھی تم ان کی پیروی کرو گے۔ ہم نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اور کون۔

قرآن میں یہود کی بہت سی "سنتیں" بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک سنت وہ ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ میں آیا ہے۔ متعلقہ آیات کا ترجمہ یہ ہے:

اور جب ہم نے تم سے یہ عہد لیا کہ تم اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے۔ اور اپنے لوگوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو۔ پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو، ان کے مقابلہ میں ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ۔ پھر اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آتے ہیں تو تم فدیہ دے کر ان کو چھڑاتے ہو۔ حالاں کہ خود ان کا نکالنا تمہارے اوپر حرام تھا۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ کا انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا

ہے کہ ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن ان کو سخت عذاب میں ڈال دیا جائے۔ اور اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔ پس نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مدد پہونچے گی (البقرہ ۸۴ - ۸۶)

ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ قدیم مدینہ میں دو مشرک قبیلے آباد تھے۔ ایک کا نام اوس اور دوسرے کا نام خزرج تھا۔ دوسری طرف مدینہ اور اطراف مدینہ میں تین یہودی قبیلے تھے۔ بنو قینقاع بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ اوس اور خزرج کا حال یہ تھا کہ ان کے درمیان اکثر جنگ جاری رہتی تھی۔ گویا قدیم مدینہ میں دو مشرکانہ محاذ قائم تھے۔ ایک اوس کا محاذ، اور دوسرا خزرج کا محاذ۔ یہودی قبائل ان سے الگ نہ رہ سکے۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر قبیلۂ خزرج کے محاذ میں شامل ہو گئے۔ اور بنو قریظہ قبیلۂ اوس کے محاذ میں، ٹھیک ویسے ہی جیسے موجودہ زمانہ میں ایک مسلم ملک روس کے کیمپ میں شامل ہو جاتا ہے اور دوسرا مسلم ملک امریکہ کے کیمپ میں۔ یا جیسے ہندستان میں کچھ مسلمان کانگریس کے ساتھ مل جاتے ہیں اور کچھ مسلمان اپوزیشن کے ساتھ۔ اور پھر یہ مسلمان دو محاذوں میں بٹ کر آپس میں لڑتے ہیں۔

مدینہ کے ایک مشرک محاذ اور دوسرے مشرک محاذ کے درمیان جب جنگ چھڑتی تو یہودی قبائل کے لوگ بھی دونوں طرف سے شامل ہو جاتے۔ اس طرح ایک یہودی قبیلہ دوسرے یہودی قبیلہ کے خلاف جنگ کرتا۔ ایک یہودی دوسرے یہودی کو مارتا اور اس کو اس کی آبادی سے نکال کر جلاوطن کرتا۔ یہ فعل یہودی شریعت کے سراسر خلاف تھا۔ کیوں کہ ان کو ان کے پیغمبروں کے ذریعہ جو احکام دیئے گیے ان میں واضح طور پر لکھا ہوا تھا کہ ایک یہودی پر لازم ہے کہ وہ دوسرے یہودی کے جان و مال کا احترام کرے۔ ایک یہودی دوسرے یہودی پر کوئی ظلم نہ کرے۔

آپس کی لڑائی میں یہود اپنی شریعت کے احکام کو بھول جاتے۔ مگر جب جنگ ختم ہو جاتی اور وہ دیکھتے کہ یہودیوں کی ایک تعداد گرفتار ہو کر مشرک قبائل (اوس یا خزرج) کے قبضہ میں چلی گئی ہے اور وہ ان کو قیدی بنائے ہوئے ہیں تو اس وقت ان کی غیرت قومی جاگ اٹھتی۔ اس وقت وہ اپنی شریعت کا یہ حکم لوگوں کو سنانا شروع کرتے کہ "کوئی یہودی اگر غیر یہودی کے ہاتھ گرفتار ہو جائے تو اس کو فدیہ دے کر چھڑاؤ" اب تقریریں ہوتیں۔ قومی چندے جمع کیے جاتے۔

یہودی قیدیوں کو مشرک قبائل سے فدیہ دے کر چھڑایا جاتا۔ اور پھر وہ فخر کے ساتھ اعلان کرتے کہ ہم نے موسوی شریعت کے فلاں حکم کے تحت ایسا کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد اوّل، صفحہ ۲۱-۱۲۰)

ان کے اس تضاد پر قرآن میں کہا گیا کہ تمہاری شریعت میں دو باتوں کا حکم تھا۔ ایک یہ کہ ایک یہودی دوسرے یہودی کو نہ مارے اور اس کو اس کے گھر سے نہ نکالے۔ تم نے بہت بڑے پیمانہ پر یہ جرم کیا اور اس وقت تم کو اپنی شریعت کا حکم یاد نہ آیا۔ تمہاری شریعت میں دوسرا حکم یہ تھا کہ یہودی غیر یہودی کے قبضہ میں چلا جائے تو اس کو فدیہ دے کر چھڑاؤ۔ اس دوسرے حکم پر تم عمل کر رہے ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ تمہارا عمل حقیقۃً قومی جذبہ کے تحت ہے نہ کہ دینی جذبہ کے تحت۔ اگر اس کا محرک دینی جذبہ ہوتا تو تم دونوں جگہ دینی احکام پر عمل کرتے۔ مگر جہاں مسئلہ خالص دینی تھا وہاں تم کو دین یاد نہ آیا اور جب مسئلہ قومی غیرت کا بن گیا تو تم کو دینی حکم یاد آرہا ہے۔ ایسا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول نہیں۔ کیوں کہ اللہ کے یہاں اندرونی جذبہ کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے نہ کہ عمل کی ظاہری صورت کی بنیاد پر۔

اس بات کو لفظ بدل کر اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ معاملہ جب اپنی قوم کے دو افراد کے درمیان ہو تو چپ رہنا۔ اور جب معاملہ اپنی قوم اور غیر قوم کا بن جائے تو ہنگامہ کرنا اور خطرہ کی نفسیات جگا کر پُرشور تحریکیں چلانا، اس کا نام یہودی سنّت یا یہودی روش ہے۔ یہودی آپس میں ایک دوسرے سے معاملہ کرتے ہوئے شریعتِ خداوندی کو پامال کرتے تھے، مگر ان کے رہنما اس کے خلاف کوئی جوش نہ دکھاتے۔ یہ انھیں تحفظ شریعت کا مسئلہ نظر نہ آتا۔ مگر جب یہودی کے اوپر غیر یہودی کوئی ظلم کرتا تو فوراً انھیں شریعت خطرہ میں نظر آنے لگتی۔ وہ اس کے خلاف دھواں دار تحریکیں چلاتے اور اپنی اس مہم کے حق میں شریعت الٰہی سے دلائل پیش کرتے۔

بدقسمتی سے یہود کی یہ سنّت آج مسلمانوں میں پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ آپس کی بے دینی اور ناانصافی کو دیکھتے ہیں مگر اس معاملہ میں وہ بالکل بے حس بنے رہتے ہیں۔ ان کی اسی بے حسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ ان کے اندر داخلی ناانصافیوں پر کوئی بڑی تحریک اٹھائی جاسکے۔ البتہ غیروں کی ناانصافی کے معاملہ میں وہ انتہائی حساس ہیں۔ چنانچہ ایسے کسی معاملہ کو لے کر صبح و شام میں ان کے درمیان ایک دھواں دار تحریک اٹھائی جاسکتی ہے۔

ہمارے جو رہنما فخر کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں مسئلہ پر لاکھوں مسلمانوں کا مجمع اکٹھا کرلیا وہ بھول جاتے ہیں کہ جس مسئلہ پر انھوں نے لاکھوں مسلمانوں کی بھیڑ جمع کی ہے وہ غیر قوم کی ناانصافی کا مسئلہ تھا۔ یہی رہنما اگر داخلی ناانصافی کے مسائل پر مسلمانوں کو پکاریں تو مجھے یقین ہے کہ انھیں ایسے پُرفخر کلمات بولنے کی خوش قسمتی حاصل نہ ہوسکے گی۔ غیر قوم کی ناانصافی کے عنوان پر اگر وہ بھرے ہوئے پنڈال میں بولنے کا موقع پا رہے ہیں تو داخلی ناانصافیوں کے نام پر کیے جانے والے جلسہ میں انھیں رہنماؤں کو یقینی طور پر خالی پنڈال میں خطاب کرنا پڑے گا۔

پچھلے پچاس برس کے اندر (مسلم لیگ سے لے کر مسلم پرسنل لا بورڈ تک) بہت سی بڑی بڑی تحریکیں مسلمانوں نے اٹھائی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے اٹھائے ہوئے گرد وغبار کے نتیجہ میں کبھی کبھی "زمیں شش شد و آسماں ہشت شد" کا منظر پیدا ہوگیا ہے۔ مگر یہ تمام تحریکیں وہ ہیں جو غیروں کی ناانصافی کے نام پر اٹھائی گئیں۔ ان میں سے کوئی ایک تحریک بھی ایسی نہیں جو مسلمانوں کی داخلی ناانصافی کے نام پر اٹھائی گئی ہو۔ حالاں کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ غیر اقوام مسلمانوں کے اوپر جو ظلم کررہی ہیں اس سے بہت زیادہ بڑا ظلم وہ ہے جو مسلمان خود اپنے ہم قوموں پر ہر روز کرتے ہیں اور کررہے ہیں۔

ایک اسلامی ادارہ نے ایک شہر میں عمارت خریدی اور وہاں اپنی شاخ قائم کی۔ اس شاخ میں ایک مسلمان کو مقامی انچارج بنایا گیا۔ اس مسلمان نے امانت میں خیانت کی۔ اس نے خفیہ طریقہ پر ایک بوگس رجسٹری کرائی اور اس بوگس رجسٹری کے ذریعہ اس عمارت کو اپنے نام کرالیا۔ یہ واضح طور پر غصب اور بددیانتی کا معاملہ تھا۔ اس کا علم مسلمانوں کو اور مسلم رہنماؤں کو ہوا۔ مگر ان میں سے کوئی شخص نہ تھا جو اس معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت سمجھے۔

اس طرح کے معاملات آج ہر بستی اور ہر شہر میں پیش آرہے ہیں۔ ایک مسلمان موقع پاکر دوسرے مسلمان کی چیز پر قبضہ کرلیتا ہے۔ مگر مسلم عوام اور مسلم رہنماؤں میں کوئی نہیں جو ان معاملات کو لے کر اٹھے۔ وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک حق دار کو اس کا حق نہ دلالے۔ دوسری طرف انھیں عوام اور رہنماؤں کا یہ حال ہے کہ اگر انھیں اس کی اطلاع ملے کہ مسلم قوم کی عمارت پر غیر مسلم قوم کے کسی شخص نے قبضہ کرلیا ہے تو وہ فوراً اس کے خلاف متحرک ہوجاتے ہیں۔ وہ بستر مرض

سے اٹھ کر اس کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ مسلمان اور غیر مسلمان کا معاملہ ہو تو شریعت پر آنچ آنا انھیں گوارا نہیں۔ لیکن اگر معاملہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو تو انہیں کوئی بے چینی نہیں ہوتی، خواہ شریعت کے اعتبار سے وہ کتنا ہی زیادہ غلط کیوں نہ ہو۔

یہ عین وہی روش ہے جس کا الزام قرآن میں یہودیوں کو دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت پیغمبر اسلام کی پیشین گوئی کی تصدیق ہے۔ مسلمانوں کا مسلم — مسلم مسئلہ میں چپ رہنا، اور مسلم — غیر مسلم مسئلہ میں "احتجاج اور شکایت" کی مہم چلانا بلاشبہ یہودی سنت ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان اصولی دینداری کے مقام سے گر کر قومی دینداری کے مقام پر پہونچ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک جگہ متحرک ہوتے ہیں اور دوسری جگہ متحرک نہیں ہوتے۔ اگر ان کا اسلام اصولی اسلام ہوتا تو وہ دونوں جگہ یکساں طور پر متحرک ہوتے، نہ کہ صرف اس جگہ جہاں معاملہ قومی نوعیت اختیار کرلے۔

آج ہمارے عوام اور خواص دونوں یکساں طور پر اس یہودی سنت کی پیروی کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ غیر مسلم ناانصافی پر مہم چلانا اس وقت تک اللہ کی نظر میں بے قیمت ہے جب تک وہ مسلمان ناانصافی پر بھی اسی قسم کی مہم نہ چلائیں۔ کیوں کہ اللہ کے نزدیک مسلمان کے اوپر مسلمان کا ظلم بھی اتنا ہی برا ہے جتنا کہ مسلمان کے اوپر غیر مسلمان کا ظلم۔ اس قسم کی روش ان کی قومی شریعت میں خواہ کتنی ہی زیادہ اہم ہو، مگر الٰہی شریعت میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

آہ یہ مسلمان

کوئی آدمی اسی وقت تک مسلمان نظر آتا ہے جب تک وہ کسی آزمائش میں نہ پڑا ہو۔ آزمائش میں پڑتے ہی ہر آدمی نامسلمان بن جاتا ہے۔ آپ جس شخص کا چاہیں جائزہ لے کر دیکھ لیں۔ آپ اس میں کوئی استثنار نہ پائیں گے

ایک شخص اپنے گھر میں سیدھی سادی زندگی گزارتا ہے۔ بظاہر وہ ایک سادہ مسلمان ہے۔ مگر جب اس کی لڑکی کی شادی آتی ہے تو اچانک وہ دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے گھر میں وہی سب ہوتا ہے جو ایک عام دنیا دار کے گھر میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی لڑکی کو تمام رسوم اور تمام جاہلی آداب کے ساتھ رخصت کر کے خوش ہوتا ہے مگر خدا کے فرشتے لکھ رہے ہوتے ہیں کہ یہ ایک گھر ہے جس سے اسلام کا جنازہ نکالا گیا۔

ایک شخص لوگوں کو دیکھنے میں معقول نظر آتا ہے۔ وہ دین اور اخلاق کی باتیں کرتا ہے۔ لیکن کسی واقعہ سے اگر اس کے دل پر چوٹ پڑ جائے تو اس کے بعد اس کے معقول خول سے ایک اور انسان برآمد ہوتا ہے جو ویسا ہی نامعقول ہوتا ہے جیسا کوئی ایسا شخص جو اپنی نامعقولیت کے لیے بدنام ہو۔ دنیا کے رجسٹر میں اب بھی اس کا نام مسلمانوں کے خانہ میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر خدا کے نزدیک وہ ایسا شخص ہوتا ہے جس کا اسلام بغض اور حسد اور بے انصافی کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

ایک شخص دینی خدمت کے لیے اٹھتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی اصلاح کا کام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر اس کا ایک شاندار ادارہ بن جائے، اس کو کچھ پیسے ہاتھ آجائیں، اس کے گرد عوام کی بھیڑ اکٹھا ہو جائے، اس کو کوئی بڑا رتبہ مل جائے تو اس کے بعد وہ ایک اور ہی انسان کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اب اس کا اسلام نمائشی اسلام بن جاتا ہے۔ اس کی تواضع گھمنڈ کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ دینی خدمت کا جذبہ اپنا مقام بنانے کے شوق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقت کی نگاہ میں وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو اسلام کے راستہ پر چلا مگر وہ کچھ دور آگے بڑھا تھا کہ شیطان اس کو اچک لے گیا۔

تاریخ دعوت

مسلمان خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔ مسلمانوں کی یہی حیثیت یہ متعین کر رہی ہے کہ بحیثیت امت ان کی ذمہ داری موجودہ دنیا میں کیا ہے۔ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کا وہ کام انجام دیں جس کے لیے پچھلے زمانہ میں رسول آیا کرتے تھے۔ رسول کا آنا بلاشبہ ختم ہوگیا۔ مگر رسول کا کام بلاشبہ جاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ کارِ نبوت سے کم تر درجہ کا کوئی کام ان کی حیثیتِ امت کے تحقق کے لیے کافی نہیں ہوسکتا۔

رسول کا کام کیا ہے۔ رسول کا کام اللہ کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہونچانا ہے۔ شرک میں مبتلا لوگوں کو توحید کا پیغام دینا ہے۔ جو لوگ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہیں، انھیں آخرت کے آنے والے دن سے باخبر کرنا ہے۔ ہر شخص کو یہ بتانا ہے کہ موجودہ دنیا میں وہ آزاد نہیں ہے کہ جو چاہے کرے۔ وہ خدا کے احکام کے ماتحت ہے۔ اسے پابند زندگی گزارنی ہے نہ کہ آزاد زندگی۔ قرآن وسنت کی صورت میں جو علمِ ربانی محفوظ ہے اس کو تمام لوگوں تک اس طرح پہنچانا ہے کہ آخرت میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ میں اس سے بے خبر تھا۔

یہی امت مسلمہ کا اصل منصبی فریضہ ہے۔ مگر یہی وہ سب سے بڑا فریضہ ہے جس کو موجودہ زمانہ کے مسلمان سب سے زیادہ چھوڑے ہوئے ہیں۔ اس چھوڑنے کی سب سے بڑی وجہ صرف ایک ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ذہن پر ان کے قومی مسائل چھائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتی مسائل ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیے ہیں۔

عرب دنیا کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے کہا کہ مسلمانوں کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ انھوں نے فوراً جواب دیا: آج کے مسلمانوں کو تو خود اپنے مسائل سے فرصت نہیں، پھر وہ دوسری قوموں میں دعوت کا کام کس طرح کر سکتے ہیں۔

مذکورہ جواب اس نفسیات کو بتاتا ہے جس کے تحت موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے عمومی

دعوت کے کام کو یکسر چھوڑ رکھا ہے۔ ان پر اپنے تحفظاتی مسائل کا غلبہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بحیثیت قوم ان کا وجود خطرہ میں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ساری توجہ دفاع کے محاذ پر لگا دی ہے۔ یہ فکر ان کے اوپر اتنا زیادہ چھایا کہ دعوت کی ذمہ داریوں کا احساس ان کے اندر سے نکل گیا۔ حتی کہ بہت سے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دفاعی کام ہی کو " اسلامی دعوت" کا نام دے دیا ہے۔

یہ سراسر غیر اسلامی اور غیر قرآنی ذہن ہے۔ کیوں کہ قرآن کی رو سے مسلمانوں کے تحفظ کا مسئلہ بھی خود اسی دعوتی کام سے وابستہ ہے۔ اگر وہ دعوت الی اللہ کا کام کریں تو خدا کی طرف سے ان کے قومی تحفظ کی بھی ضمانت ہے۔ اور اگر وہ دعوت الی اللہ کا کام نہ کریں تو ان کے قومی تحفظ کی بھی کوئی ضمانت نہیں۔ ماضی کی تاریخ پہلی بات کا ثبوت ہے اور مسلمانوں کی حال کی تاریخ دوسری بات کا ثبوت۔

دعوت کے ذریعہ تحفظ

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ۔ واللہ یعصمک من الناس ان اللہ لایھدی القوم الکفرین (المائدہ ۶۷)

اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہونچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔

اس آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں کئی روایتیں حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں آئی ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب مجھ کو اپنے پیغام کے ساتھ بھیجا تو میں نے اپنے اندر اس کے لیے تنگی محسوس کی۔ اور مجھے خیال ہوا کہ لوگوں میں ایسے ہیں جو مجھے جھٹلائیں گے۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت اتاری۔ اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہریداری کی جاتی تھی۔ حتی کہ یہ آیت اتری۔ اس وقت رسول اللہؐ نے اپنے حجرہ سے سر نکالا اور فرمایا کہ اے لوگو واپس جاؤ۔ کیوں کہ اللہ نے مجھ کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے (صفوۃ التفاسیر، المجلد الاول، صفحہ ۳۵۵)

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا
ا ہے۔ رسول کے لیے حفاظت کا مسئلہ ہو تو اس کا الگ سے مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں، دعوت
عمل ہی اس کی حفاظت کا بھی ضامن ہے۔ اللہ کا یہ وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصلاً
ا اور آپ کی امت کے لیے یہ وعدہ تبعاً ہے۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جس کی روشنی میں
ں اپنے معاملات کو دیکھنا چاہیے۔ دوسری اقوام کی طرف سے جب بھی اہل اسلام کے لیے
ا ظت کا مسئلہ پیدا ہو تو اس کا سبب یہی ہوگا کہ امت نے دعوت الی اللہ کے فریضہ کو چھوڑ
ا ہے۔ اور جب امت دعوت الی اللہ کے فریضہ کے لیے اٹھے تو اس کو یقین رکھنا چاہیے کہ
ہ تمام خطرات اور اندیشے کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی ضمانت ہے۔ بقیہ خطرات کے لیے الگ سے
ابلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ دعوت الی اللہ کا کام کیجئے، اور بقیہ تمام خطرات کے دفعیہ کی
درتیں اپنے آپ پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔

دعوت سے یہاں مراد غیر مسلموں میں دعوت ہے۔ یعنی اللہ کے پیغام کو اللہ کے ان بندوں
ـ پہونچانا جو ابھی اللہ کے حلقۂ اطاعت میں داخل نہیں ہوئے۔ قرآن میں دعوت یا تبلیغ کا لفظ
اں بھی آیا ہے غیر مسلموں ہی میں دعوت پہونچانے کے لیے آیا ہے۔ مسلمانوں کے اندر جو کام کرنا ہے
ں کے لیے قرآن میں تذکیر، اصلاح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
یرہ الفاظ آئے ہیں۔ مسلمانوں کی دینی اصلاح کے کام کو مجازی طور پر دعوت اور تبلیغ کہا
سکتا ہے، مگر دعوت اور تبلیغ کا لفظ اصلاً جس دینی کام کا عنوان ہے وہ غیر مسلم اقوام تک خدا
پیغام پہونچانا ہے نہ کہ مسلمانوں کی داخلی اصلاح کرنا۔

قرآن میں حضرت موسیٰ کے زمانہ کے ایک "رجل مومن" کا ذکر ہے۔ یہ فرعون کے دربار
ا ایک شخص تھا جو اپنے ایمان کو بربنائے مصلحت چھپائے ہوئے تھا۔ مگر ایک وقت آیا جب کہ
رعون نے اپنے اس فیصلہ کا اعلان کیا کہ وہ حضرت موسیٰ کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔ اس وقت یہ
جل مومن خاموشی کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ حضرت موسیٰ کی حمایت میں بول پڑا اور فرعون اور
س کے درباریوں کے سامنے ایک پوری دعوتی تقریر کر ڈالی۔

یہ ایک بے حد نازک معاملہ تھا۔ کیوں کہ فرعون نے جب حضرت موسیٰ کے ساتھ اپنی دشمنی

پوری طرح ظاہر کر دی تو اس کے بعد یقینی تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کی حمایت کرنے والے کے ساتھ بھی وہی برا معاملہ کرے گا جو وہ خود حضرت موسیٰ کے ساتھ کرنا چاہتا ہے۔ مگر رجل مومن نے تبلیغ حق کو دوسرے ہر پہلو پر ترجیح دی اور نہایت کھلے طور پر سچائی کا اعلان کیا۔

قرآن میں رجل مومن کی مفصل تقریر نقل کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے:

فوقٰہ اللہ سیآت ما مکروا وحاق بآل فرعون سوء العذاب۔	پھر اللہ نے اس کو ان لوگوں کی بری تدبیروں سے بچایا اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کو برے عذاب نے گھیر لیا۔
المومن ۴۵	

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رجل مومن کو جو چیز "سیئات ما مکروا" سے بچانے والی ثابت ہوئی وہ دعوت حق تھی۔ رجل مومن کے پاس صرف حق کی معرفت اور اس کی دعوت کا سرمایہ تھا۔ اس کے مقابلہ میں فرعون کے پاس ہر قسم کی مادی طاقتیں تھیں۔ مگر رجل مومن جب داعی بن کر کھڑا ہو گیا تو خدا کی حمایت اس کے ساتھ ہو گئی۔ فرعون اپنی ساری طاقتوں کے باوجود اس کے خلاف اپنے برے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

دعوت الی اللہ کے کام پر عصمت و حفاظت کا خدائی وعدہ بلاشبہ یقینی ہے۔ مگر اس وعدہ کی تکمیل حقیقی دعوت ہی کے کام پر ہو سکتی ہے نہ کہ کسی اور کام پر۔ اگر ہم کوئی اور کام کریں اور اس کو "دعوت الی اللہ" کا عنوان دیدیں تو ہمیں ہرگز یہ توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ خدا کا وعدۂ حفاظت ہمارے حق میں پورا ہوگا۔

تاریخ کی تصدیق

تاریخ حیرت انگیز طور پر اس قرآنی بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ دور اول سے لے کر بعد کے زمانہ تک بار بار یہ واقعہ ہوا ہے کہ غیر مسلموں کی طرف سے اہل اسلام کے لیے حفاظت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اور ہر بار جس چیز نے اس مسئلہ کو حل کیا وہ دعوت الی اللہ ہی کی طاقت تھی۔

دعوت کے ذریعہ حفاظت کی مختلف صورتیں ہیں۔ اگر ایسا ہو کہ اہل اسلام خدا کی بات کو پوری طرح پہونچا دیں۔ اس کے باوجود مخاطب انکار اور سرکشی کا رویہ اختیار کرے تو اس وقت یہ معاملہ براہِ راست خدا کا معاملہ بن جاتا ہے۔ خدا کی طرف سے خصوصی مدد آتی ہے جو اہل حق

کو غالب اور ان کے دشمنوں کو مغلوب کر دیتی ہے۔ حضرت ہود اور حضرت لوط کے واقعات اسی کی مثالیں ہیں۔

خدا کا دین ہر آدمی کی خود اپنی فطرت کی آواز ہے۔ دین حق کی دعوت دینا گویا آدمی کے دل کے دروازے پر دستک دینا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کے اندر اگر کچھ بھی سنجیدگی ہو تو اس کا دل فطرت کی پکار کے آگے جھک جاتا ہے۔ اگر وہ باقاعدہ طور پر اس کو قبول نہ کرے تب بھی اس کے دل میں ایسے لوگوں کے حق میں نرم گوشہ پیدا ہو جاتا ہے جو خود اس کے دل کی دھڑکنوں کی زبان میں کلام کر رہے ہوں۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کم از کم انسانی اور اخلاقی سطح پر اسے ان لوگوں کی مدد کرنا چاہیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اسی نوعیت کی ایک مثال ہے۔

تیسری شکل وہ ہے جس کو انتہائی شکل کہا جا سکتا ہے۔ یعنی مخاطب کا داعی کی بات سے اس حد تک متاثر ہونا کہ وہ اس پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو جائے۔ یہ آخری صورت بھی تاریخ میں بار بار پیش آئی ہے اور جہاں یہ صورت پیش آجائے وہاں ہر قسم کا مسئلہ اپنے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی تیسری صورت پیش آئی۔ آپ کے ساتھ پیش آنے والی صورت اس نوعیت کی آخری کامل ترین مثال تھی۔

ایک اعتراف

ٹامس کارلائل (۱۸۸۱–۱۷۹۵) نے اسلامی دعوت کی تسخیری قوت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

یہ بات بہت کہی گئی ہے کہ محمد نے اپنا مذہب تلوار کے ذریعہ پھیلایا۔ تلوار یقیناً، مگر آپ تلوار کہاں سے لائیں گے۔ ہر نیا فکر اپنے آغاز میں لازمی طور پر ایک کی اقلیت میں ہوتا ہے۔ وہ ابتداءً صرف ایک انسان کے دماغ میں آتا ہے۔ ساری دنیا میں صرف ایک آدمی اس کو ماننے والا ہوتا ہے۔ تمام آدمیوں کے مقابلہ میں صرف ایک آدمی۔ ایسی حالت میں اگر وہ ایک تلوار لے اور اس کے ذریعہ سے اپنے عقیدہ کو پھیلانے کی کوشش کرے تو اس کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

Much has been said of Mahomet's propagating his religion by the sword. The sword indeed; but where will you get your sword. Every new opinion, at its starting, is precisely in a minority of one. In one man's head alone, there it dwells as yet. One man alone of the whole world believes it; there is one man against all men. That he take a sword, and try to propagate with that, will do little for him.
Thomas Carlyle, *The Hero As Prophet*, p. 23.

اگلے صفحات میں ہم اسلامی تاریخ کے کچھ حوالے نقل کریں گے جس سے دعوت کی تسخیری حیثیت کا واقعاتی ثبوت ملتا ہے۔

تدبیر انسانی، تدبیر ربانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تقریباً تیرہ سال رہے۔ مکہ کے قیام کے آخری زمانہ میں مشرکین نے یہ منصوبہ بنایا کہ آپ کے مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں ان کے سرداروں نے مختلف رائیں پیش کیں۔ اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وإذ يمكر بك الذين كفروا ليثبتوك او يقتلوك اويخرجوك ويمكرون ويمكر الله والله خير الماكرين (الانفال ۳۰)

اور جب منکرین تمہاری نسبت تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیریں کر رہا تھا۔ اور اللہ بہترین تدبیر والا ہے۔

پیغمبر اسلام کے بارہ میں مشرکین کا منصوبہ یہ تھا کہ آپ کو قید یا قتل یا اخراج کے ذریعہ اپنے میدان سے ہٹا دیں۔ آیت کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیادہ بہتر تدبیر کے ذریعہ اس ظالمانہ منصوبہ کو ناکام بنا دیا۔ یہ خدائی منصوبہ کیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ منصوبہ یہ تھا کہ عین اس زمانہ میں جب کہ مکہ میں آپ کے خاتمہ کی تدبیریں کی جارہی تھیں، مکہ کے دو مسلمان مدینہ بھیجے گئے اور وہاں انھوں نے اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ ان کی تبلیغ سے مدینہ میں کثرت سے لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مدینہ میں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں ہو گئے کہ انھوں نے مدینہ میں غالب حیثیت حاصل کر لی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

خاموشی کے ساتھ مکہ سے مدینہ منتقل ہو گیے۔ یہی بات ہے جو حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: امرت بقریۃ تاکل القری (مجھے ایک ایسی بستی کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی) بخاری و مسلم۔

یہ آیت واضح طور پر تدبیر انسانی اور تدبیر ربانی کا فرق بتا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدبیر انسانی قید اور قتل اور اخراج کی سطح پر چلتی ہے، اور تدبیر ربانی دعوت کے ذریعہ تسخیر قلوب کی سطح پر۔ انسان کی سوچ کی آخری حد یہ ہے کہ وہ اپنے حریف کو محبوس کرکے اس کی سرگرمیوں کو روک دے۔ یا اس کو اپنے علاقہ سے نکال دے یا اس کو قتل کرکے اس کا خاتمہ کر ڈالے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا طریقہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنے دین کا مبلغ بنا کر بستیوں میں داخل کرتا ہے۔ وہ اپنے پیغام کے لیے لوگوں کے دلوں کے دروازے کھولتا ہے۔ اس طرح یہ ہوتا ہے کہ تمام زندہ لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر دین حق کی جانب اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ دین حق کی طاقت اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ دشمنوں کی کوئی تدبیر ان کے اوپر کارگر نہ ہو سکے۔

تسخیری کلمہ

ابو طالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو قریش کے سردار ان کے پاس جمع ہوئے اور کہا کہ "ہمارے اور محمد کے درمیان کوئی بات طے کر دیجیے" تاکہ دونوں ایک دوسرے سے رُکے رہیں"۔ ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا کہ یہ قریش کے سردار لوگ جمع ہیں بتائیے کہ آپ ان سے کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

نعم، کلمۃ واحدۃ تعطونہا تملکون بہا العرب وتدین لکم بہا العجم (سیرۃ ابن کثیر)

ہاں، تم مجھے ایک کلمہ دیدو، تم اس کے ذریعہ سے عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم اس کے ذریعہ سے تمہارے لیے جھک جائیں گے۔

انھوں نے پوچھا کہ وہ کلمہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم کہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اس کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو ان کو چھوڑ دو (تقولون، لا الہ الا اللہ وتخلعون ماتعبدون

من دونه)

آپ جب مکہ میں حق کا پیغام لے کر اٹھے تو آپ ایک فی دنیا کی اقلیت رکھتے تھے۔ مگر بہت جلد عرب کے ذہین اور صالح افراد کو آپ کے کلمہ (بالفاظ دیگر آپ کے فکر کی طاقت) نے کھینچ لیا۔ اگرچہ ابتداءً آپ کی شدید مخالفت کی گئی۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ سنجیدہ اور صاحب فکر افراد کے لیے آپ کا پیغام اپنے اندر مقناطیسی کشش رکھتا تھا۔

مکہ کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ طفیل بن عمرو الدوسی کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ آئے۔ وہ اپنے قبیلہ کے معزز آدمی تھے۔ قریش کے کچھ لوگ ان سے ملے اور کہا کہ یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ایک جادوگر آدمی ہیں۔ تم ان کی بات نہ سننا اور ان سے دور رہنا۔ طفیل بن عمرو کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں ہیں۔ چنانچہ وہ وہاں گیے تو اپنے کانوں میں روئی ڈال لی تاکہ آپ کی آواز نہ سن سکیں۔

بعد کو انھیں خیال آیا کہ میں خود ایک سمجھ دار آدمی ہوں۔ مجھے کان میں روئی ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے محمد کا کلام سننا چاہیے۔ آخر میں کیوں ڈروں کہ میں ان کا کلام سن کر بھٹک جاؤں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا اور پورا قصہ انھیں بتایا۔ پھر کہا کہ آپ مجھے اپنا کلام سنائیے۔ آپ نے طفیل بن عمرو کو قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم وہ اتنا اچھا کلام تھا کہ اتنا اچھا کلام میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ ایسا منصفانہ امر تھا کہ ویسے منصفانہ امر سے میں ابھی تک واقف نہیں ہوا تھا (فلا واللہ ما سمعت قولاً قط احسن منہ ولا امراً اعدل منہ) اس کے بعد طفیل بن عمرو اسلام کے حلقہ میں داخل ہوگیے۔

ہجرت حبشہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب کام شروع کیا، اس وقت وہاں شرک چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ مکہ کے لوگوں نے آپ کی مخالفت شروع کر دی۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کو طرح طرح سے ستایا جاتا۔ نبوت کے پانچویں سال آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ تم لوگ مکہ چھوڑ کر حبش چلے جاؤ۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے دو بار حبش کی جانب ہجرت کی۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد تقریباً ۱۲۰ ہے۔

مکہ کے مشرکین کو جب یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ کے ساتھی حبش چلے گیے ہیں اور وہاں اطمینان کے ساتھ رہ رہے ہیں تو انھوں نے مشورہ کرکے اپنے دو آدمیوں (عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ) کو حبش کے بادشاہ نجاشی کے پاس بھیجا۔ انھوں نے وہاں جاکر شاہ نجاشی اور اس کے درباریوں کو تحفے پیش کیے اور کہا کہ ہمارے شہر کے کچھ نادان لوگ اپنا آبائی دین چھوڑ کر تمہارے یہاں آگیے ہیں۔ ان کو ہمارے حوالے کردو کہ ہم انھیں اپنے ساتھ واپس لے جائیں۔

یہ ایک طویل قصہ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ نجاشی کے درباری مشرکین مکہ کے وفد کی باتوں سے متاثر ہوگیے اور انھوں نے شاہ سے یہ سفارش کی کہ مسلمانوں کو دوبارہ مکہ واپس بھیج دیا جائے۔ یہ ایک بے حد نازک لمحہ تھا۔ کیوں کہ واپسی کا مطلب بھیڑیوں کے منہ میں واپس جانا تھا۔ مگر اس نازک لمحہ میں جو چیز مسلمانوں کے کام آئی وہ وہی "دعوت" تھی جس کو یہ بے سروسامان لوگ اپنے ساتھ لے کر وہاں گیے تھے۔

چنانچہ آخری مرحلہ میں یہ طے ہوا کہ مسلمان نجاشی کے دربار میں حاضر ہوں اور بتائیں کہ وہ دین کیا ہے جو انھیں پیغمبر عربی سے ملا ہے۔ اس وقت حضرت جعفر بن ابی طالب کھڑے ہوتے۔ انھوں نے دربار میں ایک تقریر کی جو سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اس کے بعد حضرت جعفر نے قرآن سے سورہ مریم کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا۔ روایات بتاتی ہیں کہ اس کو سُن کر بادشاہ اور اس کے درباریوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ حتیٰ کہ بادشاہ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ اس کے بعد شاہ نجاشی نے حکم دیا کہ مشرکین مکہ کا وفد جو تحفے لایا تھا وہ اُسے واپس کردیا جائے۔ اس نے مسلمانوں کو عزت کے ساتھ اپنے دربار سے رخصت کیا۔ ان کو امان دی اور مشرکین کے دونوں آدمی ذلیل ہوکر وہاں سے نکلے اور مسلمان وہاں اچھے مقام اور اچھے پڑوس میں ٹھہرے رہے (ورَدّ المسلمین ردّاً کریما وامّنهم وخرجا (عبد الله بن ابی ربیعه وعمرو بن العاص) من عنده مقبوحین۔ فاقام المسلمون بخیر دار مع خیر جار)

اسلام عمر بن الخطاب

نبوت کے چھٹے سال تک مکہ کی ایک قابلِ لحاظ تعداد اسلام کے حلقہ میں داخل ہوچکی تھی مگر یہ لوگ زیادہ تر نیچے کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے مکہ میں ابھی تک اسلام کا دبدبہ

قائم نہیں ہو سکا تھا۔ یہ دروازہ بھی پہلی بار دعوت ہی کے ذریعہ سے کھلا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دعا فرمائی کہ اے اللہ عمر بن الخطاب یا عمرو بن ہشام کے ذریعہ اسلام کو طاقت دے۔ (اللھم اعز الاسلام باحد العمرین) اس کے بعد حالات بڑھتے رہے یہاں تک کہ مکہ کے سردار ابوجہل نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص محمد کو قتل کر ڈالے اس کو میں سو اونٹ دوں گا۔ عمر بن خطاب مکہ کے نہایت طاقتور اور پہلوان قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے تلوار ہاتھ میں لی اور اس ارادہ سے گھر سے روانہ ہوئے کہ رسول اللہ کو قتل کر کے ایک سو اونٹ حاصل کریں۔

وہ جا رہے تھے کہ راستہ میں یہ معلوم ہوا کہ ان کی بہن فاطمہ بنت خطاب اور ان کے بہنوئی سعید بن زید دونوں اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گیے ہیں۔ عمر کو یہ سن کر غصہ آگیا۔ وہ اپنی بہن کے گھر پہونچے اور بہن اور بہنوئی کو مارنا شروع کیا۔ بہن نے کہا کہ اے خطاب کے بیٹے، تم جو کچھ کر سکتے ہو کرو، ہم تو اب اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اس کے بعد عمر کچھ نرم پڑے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے بتاؤ کہ وہ دین کیا ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے۔ انھوں نے ایک صحیفہ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا جس میں قرآن کی سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ عمر نے اس کو پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ ان کی زبان سے نکلا: ما احسن ھذا الکلام واکرمہ (کیسا اچھا اور برتر یہ کلام ہے)

خلاصہ یہ کہ اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عمر اپنے زمانہ میں مکہ کے نہایت طاقتور آدمی تھے۔ ان کا قد اتنا بلند تھا کہ مسجد نبوی (مدینہ) بننے کے بعد جب وہ اس میں داخل ہوئے تو ان کا سر دروازہ سے ٹکرا گیا۔ ایسے شخص کا اسلام کے حلقہ میں داخل ہونا بلاشبہ اسلام کی عظیم الشان مدد تھی۔ اور اسلام کو یہ عظیم الشان مدد دعوت کے راستہ سے حاصل ہوئی، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ عمر کا اسلام ایک فتح تھا۔ ہم کعبہ کے پاس نماز نہیں پڑھ سکتے تھے یہاں تک کہ عمر نے اسلام قبول کیا۔ جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو انھوں نے مشرکین مکہ سے لڑائی کی یہاں تک کہ انھوں نے خود بھی کعبہ کے پاس نماز پڑھی اور ہم نے بھی ان کے ساتھ نماز پڑھی

(انّ اسلام عمر کان فتحاً ولقد کنا ما نصلّی عند الکعبۃ حتی اسلم عمر فلما اسلم قاتل قریشا حتی صلّی عند الکعبۃ وصلینا معہ)

قبائل یثرب کا قبول اسلام

اسلام ایک فطری دین ہے۔ وہ ہر آدمی کے دل کے دروازہ پر دستک دیتا ہے۔ اگر کوئی نفسیاتی رکاوٹ حائل نہ ہو تو آدمی اس کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے اور اس کی صداقت کے آگے جھک جاتا ہے۔ اس کی ایک تاریخی مثال مدینہ کے انصار (اوس اور خزرج) کا معاملہ ہے۔

مکی دور میں مدینہ سے ایک صاحب زیارت کعبہ کے لیے مکہ آئے۔ ان کا نام سُوَید بن الصامت تھا۔ وہ نہایت باصلاحیت آدمی تھے۔ چنانچہ ان کی قوم ان کو الکامل کہتی تھی۔ مکہ میں ان کی ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ آپ نے ان کو اسلام کی دعوت پیش کی۔ سُوید نے کہا کہ آپ کے پاس شاید اسی قسم کی چیز ہے جو میرے پاس ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکمتِ لقمان۔ آپ نے کہا کہ اس کو میرے سامنے پیش کرو۔ انھوں نے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اچھا کلام ہے۔ مگر میرے پاس قرآن ہے جو اس سے بھی زیادہ بہتر ہے۔ پھر آپ نے قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر انھیں سنایا۔ سُوید بن الصامت نے اس کو سن کر کہا: ان ھذا القول حسن (بے شک یہ بہتر کلام ہے)

اس کے بعد ابوالحیسر انس بن رافع مکہ آئے۔ ان کے ساتھ قبیلہ اوس کے چند اور افراد تھے۔ اس وقت اوس اور خزرج میں لڑائی چل رہی تھی۔ اور یہ لوگ خزرج کے مقابلہ میں قریش کی حمایت حاصل کرنے کے لیے مکہ آئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی بابت سنا تو آپ ان کے پاس آئے۔ اور ان سے کہا کہ جس چیز کے لیے تم آئے ہو کیا اس سے بہتر چیز کی طرف تمہیں رغبت ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیا چیز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر انھیں سنایا۔ اس کے بعد مدینہ کے وفد کے ایک نوجوان ایاس بن معاذ نے کہا۔ اے قوم، خدا کی قسم یہ اس سے بہتر ہے جس کے لیے تم

آئے ہو (ای قوم ھذا واللہ خیر مما جئتم لہ) تاہم اس وقت انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا اور مدینہ واپس چلے گیے۔

اس کے بعد زیارت کعبہ کا زمانہ آیا اور عرب کے مختلف قبیلے مکہ آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکل کر ان قبائل کے پاس گیے اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی۔ اس سلسلہ میں عقبہ کے پاس آپ کی ملاقات قبیلۂ خزرج (مدینہ) کے چھ آدمیوں سے ہوئی۔ جس میں اسعد بن زرارہ اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ ابتدائی گفتگو کے بعد آپ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ یہ لوگ مدینہ کے یہود سے یہ سنتے آئے تھے کہ ایک آخری نبی آنے والے ہیں ان کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ خزرج کے لوگوں نے آپ کا پیغام سن کر پہچان لیا کہ یہ وہی نبی ہیں۔ انھوں نے آپس میں کہا کہ اے قوم، خدا کی قسم یہی وہ پیغمبر ہیں جن کے بارے میں یہود تمہیں بتا رہے تھے۔ تو یہود اس کے بارے میں تم پر سبقت نہ کرنے پائیں۔ چنانچہ انھوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہی اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ قال بعضهم لبعض یا قوم تعلمون واللہ انہ النبی الذی توعدکم بہ الیہود فلا تسبقنکم الیہ فاجابوہ وصدقوہ واسلموا۔

مدینہ میں اسلام کی اشاعت

یہ لوگ اسلام کے بعد مدینہ واپس ہوئے اور وہاں کے لوگوں کو اسلام سے متعارف کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ہر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اگلے سال موسم حج میں دوبارہ مدینہ کے ۱۲ آدمی مکہ آئے۔ یہ لوگ اسلام سے متاثر ہو چکے تھے۔ انھوں نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت اسلام قبول کرنے کے ساتھ آپ کی حمایت کرنے کی بیعت بھی تھی۔ چنانچہ اس کو بیعت النساء کہا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا نام تاریخ اسلام میں بیعت عقبہ اولیٰ ہے۔

یہ لوگ مدینہ واپس ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر کو بھیج دیا تاکہ وہ مدینہ کے لوگوں کو اسلام سے متعارف کریں اور قرآن سنائیں اسی لیے ان کو مدینہ میں مُقری (پڑھ کر سنانے والا) کہا جاتا تھا۔

اس وقت مدینہ کے ایک نمایاں سردار اُسید بن حُضیر تھے۔ ان کو مدینہ میں اسلام کی اشاعت کی خبر ہوئی تو وہ اس پر غصہ ہوگیے۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ مکہ کے کچھ لوگ یہاں آکر ہمارے کم سمجھ لوگوں کو بہکا رہے ہیں اور ان کے آبائی دین سے انھیں پھیر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے گھر سے ہتھیار لے کر نکلے تاکہ ایسے لوگوں کو مار کر بھگا دیں۔

ان کی ملاقات ایک باغ میں مصعب بن عمیر سے ہوئی جو کچھ لوگوں کو اسلام کی باتیں بتا رہے تھے۔ اُسید بن حُضیر نے انھیں بُرا بھلا کہا اور کہا کہ تم یہاں اس لیے آئے ہو کہ ہمارے کمزور لوگوں کو ان کے دین سے پھیرو۔ مصعب بن عمیر نے کہا کہ آپ بیٹھئے اور ہماری بات سنیے۔ اگر وہ صحیح ہو تو اس کو مان لیجئے، اور اگر صحیح نہ ہو تو اسے رد کر دیجئے۔ اُسید بن حضیر نے کہا کہ تم نے انصاف کی بات کہی (انصفت)

اس کے بعد وہ اپنا ہتھیار الگ رکھ کر بیٹھ گیے۔ مصعب بن عمیر نے ان کے سامنے قرآن کی آیتیں پڑھیں۔ اس کو سُن کر اُسید بن حضیر کا ذہن بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتنا اچھا اور کتنا حسین کلام ہے (ما احسن ھذا و اجملہ) اس کے بعد انھوں نے غسل کر کے اپنے کو پاک کیا اور کلمۂ شہادت ادا کر کے اسلام میں داخل ہوگیے۔

تقریباً یہی واقعہ مدینہ کے دوسرے بڑے سردار سعد بن معاذ کے ساتھ پیش آیا۔ ان کو مدینہ میں اسلام کی اشاعت کی خبر ہوئی۔ ابتداءً وہ بھی غصہ ہوئے۔ اور اپنا ہتھیار لے کر نکلے تاکہ ایسے لوگوں کو تنبیہ کر دیں۔ وہ مصعب بن عمیر کے پاس پہونچے تو انھوں نے کہا کہ آپ پہلے میری بات سنیے اس کے بعد کوئی فیصلہ کیجئے۔ اس کے بعد انھوں نے سعد بن معاذ کو قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ راوی کہتے ہیں کہ قرآن کو سنتے ہی ہم نے ان کے چہرے پر اسلام کی جھلک دیکھی۔ (فعرفنا واللہ فی وجھہ الاسلام) اس کے بعد انھوں نے پوچھا کہ اس دین میں داخل ہونے کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے۔ مصعب بن عمیر نے کہا کہ آپ غسل کیجئے اور اپنے کپڑوں کو پاک کیجئے اس کے بعد حق کی گواہی دیجئے پھر دو رکعت نماز پڑھیے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور اسلام میں داخل ہوگیے۔

اس کے بعد دونوں سردار سعد بن معاذ اور اُسید بن حُضیر اپنے قبیلہ کی طرف واپس آئے

اور لوگوں سے کہا کہ میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمارے سردار ہیں اور ہمارے بہترین شخص ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تمہارے مردوں اور عورتوں سے بولنا میرے لیے اس وقت تک حرام ہے جب تک تم اللہ اور رسول پر ایمان نہ لاؤ۔ چنانچہ اسی دن شام تک ان کے قبیلہ کے تمام مرد اور عورت مسلمان ہوگیے۔

مدینہ کے قبائل اپنی سادہ فطرت پر تھے۔ ان کے اندر سلامت طبع کمال درجہ میں موجود تھی۔ وہ حق کو جان لینے کے بعد اس سے اعراض کرنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ مدینہ کے قبائل میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ یہاں تک کہ انصار کے گھروں میں سے کوئی گھر نہ رہا جس میں کچھ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں موجود نہ ہوں۔

اس کے بعد حضرت مصعب بن عمیرؓ مکہ واپس آئے۔ ان کے ساتھ ستّر مرد اور دو عورتیں تھیں۔ یہ لوگ حج سے فارغ ہوئے تو قرار داد کے مطابق ایک روز رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی جس کو بیعت عقبۂ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ کافی تفصیل کے ساتھ سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ آخری مرحلہ میں جب آپ ان لوگوں سے بیعت لے رہے تھے تو ان میں سے ایک شخص (عباس بن عبادہ بن نضلہ) نے کہا کہ اے لوگو، تم جانتے ہو کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ یہ عرب و عجم کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اگر ہم نے بیعت کا حق ادا کر دیا تو ہمارے لیے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جنّت۔ انھوں نے کہا کہ ہاتھ بڑھائیے۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور انھوں نے بیعت کی (قالوا فمالنا بذالك يارسول الله ان نحن وافينا قال الجنة. قالوا ابسط يدك فبسط يده فبايعوه) التفسیر المظہری، المجلد الثانی، صفحہ ۱۲ – ۱۰۷

ہجرتِ حبشہ

قدیم عرب میں آدمی قبیلہ کی حمایت میں زندگی گزارتا تھا۔ قبیلہ اس کی جان و مال کی حفاظت کا ضامن ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو ہاشم کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے سردار اس وقت ابو طالب بن عبد المطلب تھے۔ نبوت کے دسویں سال ابو طالب کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد قبیلہ کے رواج کے مطابق سرداری کا عہدہ ابو لہب کو ملا۔ ابو لہب نے آپ کو اپنی حمایت

میں لینے سے انکار کر دیا۔

یہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ تھا۔ کیوں کہ قبیلہ کی حمایت سے محرومی کا مطلب یہ تھا کہ آدمی کی جان و مال دوسروں کی نظر میں مباح ہو جائے۔ چنانچہ اس کے بعد آپ کے مخالفین آپ کے اوپر جری ہو گیے۔ سیرت کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ ابوطالب کی زندگی تک قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہ کر سکے۔ مگر جب ابوطالب کی وفات ہوگئی تو وہ آپ کے خلاف جارحیت کرنے لگے یہاں تک کہ قریش کے بعض نادانوں نے آپ کے سر پر مٹی ڈال دی۔

مکہ میں قیام بظاہر اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔ عین اس وقت دعوت کے ذریعہ ایک نیا شاندار امکان آپ کے لیے نکل آیا۔ نبوت کے گیارہویں سال مدینہ کے چند آدمی کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ آئے اور آپ کے پیغام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد اگلے سال مزید کچھ لوگ آئے۔ انھوں نے آپ کی زبان سے قرآن سنا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو گیے۔ یہ لوگ جب واپس ہونے لگے تو ان کے ساتھ مکہ سے دو آدمی (عبداللہ بن ام مکتوم اور مصعب بن عمیر) قرآن اور اسلام کی تعلیم کے لیے بھیجے گیے۔ مدینہ پہونچ کر انھوں نے لوگوں کو قرآن سنانا شروع کیا۔ اور اسلام کی تعلیم سے لوگوں کو آگاہ کرنے لگے۔ مدینہ کی زمین اسلام کی دعوت کے لیے نہایت زرخیز ثابت ہوئی۔ وہاں کے لوگ تیزی سے اسلام قبول کرنے لگے۔ حتی کہ یہ نوبت آگئی کہ اسلام مدینہ کے تمام محلوں میں پھیل گیا۔ انصار مدینہ کے گھروں میں سے کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں کچھ مرد اور کچھ عورت مسلمان نہ ہو گیے ہوں (وجعل الاسلام یفشو فی منازل الانصار۔ حتی لم تبق دار من دور الانصار الا وفیها رجال و نساء مسلمون)

مدینہ کی فضا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے موافق دیکھا تو آپ نے مکہ کے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ خاموشی کے ساتھ مدینہ چلے جائیں۔ چنانچہ وہ لوگ ہجرت کر کے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت مکہ سے مدینہ منتقل ہوگئی۔ مکہ کے مشرکین نے اس صورت حال کو اپنے خلاف ایک چیلنج سمجھا۔ انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ لوگ مدینہ کو اپنا مرکز بنا کر دوبارہ ہمارے

خلاف کارروائی کریں گے۔ انھوں نے طے کیا کہ قبل اس کے کہ مدینہ کے مسلمان کوئی کارروائی کریں پیغمبر اسلام کو قتل کر دیا جائے۔ مگر اب معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ جس رات کو وہ آپ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے تھے عین اسی رات کو آپ مکہ سے نکل کر مدینہ پہونچ گیے۔

اس کے بعد مدینہ میں اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہوئی اور اس نئی تاریخ کا دروازہ جس چیز نے کھولا وہ بلاشبہ دعوت تھی۔

حدیبیہ کے بعد اشاعت اسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً ۱۳ سال مکہ میں رہے۔ اس کے بعد آپ مکہ والوں کی شدید مخالفت کی بنا پر مکہ سے مدینہ چلے گیے۔ مگر مکہ کے مشرکین کا غصہ اب بھی ختم نہ ہوا۔ انھوں نے سمجھا کہ اگر انھوں نے مسلمانوں کو اسی طرح چھوڑ دیا تو وہ طاقت ور ہو جائیں گے اور ایک روز مکہ پر حملہ کر دیں گے۔ چنانچہ انھوں نے خود پہل کر کے اہلِ اسلام کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ بدر و اُحد جیسی کچھ بڑی جنگیں ہوئیں اور زیادہ تر چھوٹے مقابلے ہوئے جن کو جھڑپ کہا جا سکتا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد تقریباً ۸۰ تک پہونچتی ہے۔

ایک کے بعد ایک جنگیں ہوتی رہیں۔ مگر اہل شرک اور اہل توحید کے درمیان فیصلہ نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گہرا دعوتی منصوبہ بنایا۔ یہ دعوتی منصوبہ وہی ہے جس کو اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ (۶ھ) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی تفصیلات حدیث کی تمام کتابوں میں مذکور ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مختلف واقعات کے بعد وہ مرحلہ آیا جب کہ مقام حدیبیہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے درمیان صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش کش کی کہ آپ کے اور مشرکین کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ (No-war pact) ہو جائے۔ مشرکین مکہ سے اس موضوع پر گفت گو شروع ہوئی تو انھوں نے اس ناجنگ معاہدہ پر راضی ہونے کے لیے بالکل یک طرفہ قسم کی شرطیں پیش کیں۔ مثلاً یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب عمرہ کیے بغیر مقام حدیبیہ سے مدینہ واپس چلے جائیں۔ قریش کا کوئی آدمی مسلمانوں کے یہاں چلا جائے تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ اس کے برعکس کوئی مسلمان مدینہ

سے مکہ چلا جائے تو مکہ کے لوگ اسے واپس نہیں کریں گے۔ مشرکین مکہ کی ضد یہاں تک بڑھی کہ جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو انھوں نے معاہدہ کی عبارت میں محمد رسول اللہ لکھنے نہیں دیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ محمد بن عبداللہ لکھا جائے۔ اسی طرح انھوں نے اور بھی بہت سی اشتعال انگیز باتیں کیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یک طرفہ طور پر ان کی تمام اشتعال انگیزیوں کو برداشت کر لیا۔ اور مشرکین مکہ کی اپنی شرائط پر دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر کے حدیبیہ سے واپس آگیے۔

مشرکین کی شرائط کو یک طرفہ طور پر مان کر یہ معاہدہ اسی لیے کیا گیا تھا کہ دعوت کا دروازہ کھلے۔ چنانچہ اس معاہدے کے بعد امن قائم ہوگیا۔ دونوں فریق کے لوگ آپس میں ملنے لگے۔ مومن اور غیر مومن کے درمیان دعوتی گفت گوئیں ہونے لگیں۔ علم دین چاروں طرف پھیلنے لگا (وامن الناس واجتمع بعضهم ببعض وتكلم المومن مع الكافر وانتشر العلم النافع و الايمان، ابن کثیر)

جنگ بند ہونے کے بعد جو دعوتی کام شروع ہوا اس کے نتیجہ میں قبائل کے لوگ کثرت سے مسلمان ہونے لگے۔ معاہدہ حدیبیہ کے وقت قابلِ جنگ مسلمانوں کی تعداد اگر ڈیڑھ ہزار تھی تو دو سال سے بھی کم عرصہ میں ان کی تعداد دس ہزار ہوگئی۔ چنانچہ اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف مارچ کیا تو مکہ کے سردار ابوسفیان نے اعلان کر دیا کہ اطاعت قبول کرلو، کیوں کہ آج ہمارے اندر ان سے مقابلہ کی طاقت نہیں (هذا محمد قد جاءكم فيما لاقِبَلَ لكم به فمن دخل دار ابي سفيان فهو آمن)

دعوت ایک ابدی طاقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذی قعدہ ۶ھ میں مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ کے ساتھ آپ کے چودہ سو اصحاب تھے۔ آپ کا مقصد مکہ پہنچ کر عمرہ کرنا تھا۔ لمبا پُرمشقت سفر طے کر کے آپ حدیبیہ کے مقام پر پہونچے جو مکہ سے نو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں قریش کے لوگ آگیے اور انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ آپ مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کریں۔ دو ہفتہ تک گفت گو ہوتی رہی۔ مگر قریش راضی نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ آپ خود قریش کی شرائط پر ایک صلح کر کے واپس چلے آئے جس کو تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔

اس سفر سے واپسی کے بعد ہی آپ نے اطرافِ عرب کے حاکموں اور بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کیے۔ یہ دعوتی خطوط ۶ھ میں روانہ کیے گئے۔ جن لوگوں کو یہ خطوط روانہ کیے گئے ان کے نام یہ ہیں :

ہرقل	شہنشاہِ روم	مُنذر بن ساویٰ	شاہِ بحرین
خسرو پرویز	شہنشاہِ ایران	جیفر و عبد جلندری	شاہِ عمان
نجاشی	شاہِ حبش	ہوذہ بن علی	حاکمِ یمامہ
مقوقس	شاہِ مصر و اسکندریہ	حارث غسانی	حاکم دمشق

اگرچہ بعض حکمرانوں نے آپ کے دعوتی مکتوب کے ساتھ متکبرانہ معاملہ کیا اور اس کے نتیجہ میں وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے۔ مگر اکثر کے دل اس سے مرعوب اور متاثر ہو گئے اور کچھ نے اسلام قبول کر لیا۔ قیصر روم نے اپنی قوم کے ذمہ داروں سے کہا کہ آؤ ہم ان کے پیرو بن جائیں اور ان کی تصدیق کریں تاکہ ہماری دنیا اور آخرت دونوں سلامت رہیں (فھلموا فلنتبع و لنصدقہ فتسلم لنا دنیانا و اٰخرتنا) حاکم یمامہ نے اپنے جواب میں لکھا کہ کتنی اچھی ہے وہ چیز جس کی طرف آپ بلاتے ہیں (ما احسن ما تدعوا الیہ و اجملہ)

عین اس وقت جب کہ اسلام مادی اعتبار سے پیش قدمی کی پوزیشن میں نہ تھا، وہ فکری اعتبار سے اس پوزیشن میں تھا کہ شاہانِ وقت کو اپنا مخاطب بنا سکے۔ یہ تمام تر دعوت کا کرشمہ تھا۔ کوئی دشمن اسلام کے مادی اقدام پر روک لگا سکتا ہے۔ مگر اسلام کے فکری اقدام پر روک لگانا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اسلام بیرون عرب میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے گئے تو اسلام عرب میں غالب آچکا تھا۔ تاہم عرب کے آس پاس ممالک میں جو قومیں آباد تھیں ان کا مذہب تہذیب اور زبان سب اسلام سے بالکل الگ تھی۔ اس وقت وہ وسیع دنیا وجود میں نہیں آئی تھی جس کو آج عرب دنیا (Arab world) کہا جاتا ہے۔

یہ صورت حال اسلام کی زندگی کے لیے مستقل خطرہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اگر صرف جزیرہ نمائے عرب تک محدود رہتا تو بعد کے زمانے میں خود اس کا وجود قائم رہنا مشکل

تھا۔ اسلام کی مستقل زندگی کے لیے ضروری تھا کہ وسیع خطہ میں اسلام کا مذہب اس کی زبان اور اس کی تہذیب غالب حیثیت حاصل کرے۔ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تقریباً نصف صدی کے اندر پیش آگیا۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ عظیم واقعہ اسلام کی دعوتی قوت کے ذریعہ پیش آیا نہ کہ اس کی سیاسی قوت کے ذریعہ۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی قوت اس قسم کے واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے ناکافی ہے۔ اگر سیاسی قوت کے ذریعہ مذہب کو بدلنا ممکن ہوتا تو آج ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سب کے سب عیسائی ممالک ہوتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بیرون عرب کی اقوام سے لڑائیاں شروع ہوئیں۔ اور اہل اسلام نے بہت کم مدت میں ایشیا سے لے کر افریقہ تک کا بہت بڑا علاقہ فتح کر ڈالا۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان مفتوحہ ممالک میں کبھی بھی تبدیلیٔ مذہب کے لیے جبر نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر مصر کو لیجیے جو خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے مصر کی تاریخ پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے ۶۴۲ء میں مصر کو نہایت تیزی سے فتح کر لیا۔ مگر انھوں نے وہاں شدت کے ساتھ مذہبی رواداری (Religious tolerance) پر عمل کیا۔ مصریوں کو اسلام قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ حکومتی سطح پر انھیں ترغیب بھی نہیں دلائی گئی۔ عرب حکمرانوں نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ عیسائی گرجاؤں کو باقی رکھیں گے:

> There was no attempt to force, or even to persuade, the Egyptians to convert to Islam. The Arabs even pledged to preserve the Christian Churches (6/487-88).

اسی طرح پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب (پریچنگ آف اسلام) میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مصر کے مسلم فاتحین نے عیسائیوں کے ساتھ کامل رواداری کا ثبوت دیا۔ اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ مصری عیسائیوں کا کثرت سے اسلام قبول کرنا مسلم حکمرانوں کی طرف سے کسی ظلم یا نامنصفانہ دباؤ کا نتیجہ تھا:

> There is no evidence of their widespread apostasy to Islam being due to persecution or unjust pressure on the part of their new rulers (p. 104).

اسی طرح پروفیسر آرنلڈ نے دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ مصریوں کا قبول اسلام کسی سیاسی یا فوجی جبر کا نتیجہ نہ تھا :

These conversions were not due to persecutions (110).

اب سوال یہ ہے کہ جب اہلِ مصر پر تبدیلیٔ مذہب کے لیے جبر نہیں کیا گیا تو کیوں کر ایسا ہوا کہ ان کی بہت بڑی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کا جواب مصریات کے ماہر سر آرتھر کیتھ نے ان الفاظ میں دیا ہے کہ ــــــــ مصر کے عیسائی تلوار سے فتح نہیں کیے گئے بلکہ قرآن کے ذریعہ فتح کیے گئے :

The Egyptians were conquered not by the sword, but by the Koran.
Sir Arthur Keith, *A New Theory of Human Evolution*, London, Watts & Co. 1950, p. 303.

یہی صورت تمام مفتوحہ ممالک میں پیش آئی۔ ان ملکوں کی غیر مسلم آبادی کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے کسی قسم کا جبر نہیں کیا گیا۔ یہ صرف اسلام کی دعوتی طاقت تھی جس نے انھیں مسخر کرلیا اور وہ بہت تھوڑے عرصہ میں اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگیے۔ جو مسلمان ان کے ملک میں داخل ہوئے تھے ان سے روزانہ کے میل جول میں وہ اسلام کی باتیں سنتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے اسلامی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس سے ان پر یہ بات کھلی کہ ان کے آبائی مذہب کے مقابلہ میں اسلام زیادہ معقول ہے۔ اس کی تعلیمات زیادہ سادہ اور قابل عمل ہیں۔ اس تاثر کے تحت وہ دھیرے دھیرے اسلام قبول کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت مسلمان ہوگئی اور جغرافی نقشہ پر وہ دنیا وجود میں آئی جس کو اسلامی دنیا کہا جاتا ہے۔

سلجوق ترکوں کا قبول اسلام

سلجوق، ترکانِ غز کے ایک سردار کا نام تھا۔ اس نے قبائل کی ایک فوج جمع کی اور گیارہویں صدی عیسوی میں مغربی ایشیا پر حملہ کردیا۔ اس نے ایک طاقتور سلطنت بنائی۔ اس کی سلطنت میں اُردن، شام، عراق، فلسطین وغیرہ علاقے شامل تھے۔ ان علاقوں میں اس وقت مسلمانوں کی حکومت تھی۔ سلجوقی ترکوں نے مسلم افواج کو زیر کرکے یہاں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

سلجوق کے بعد طغرل بیگ (م ۱۰۶۳) اور الپ ارسلان (م ۱۰۷۳) وغیرہ اس کے وارث ہوئے۔ تاریخ اسلام کا یہ عظیم الشان واقعہ ہے کہ سلجوق ترک جو ابتداءً وحشی قبائل تھے، انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور ۲۰۰ سال سے زیادہ مدت تک اسلام کی پاسبانی کی۔ انھوں نے شیعہ، سنی لڑائیوں کو ختم کرکے اسلامی دنیا میں اتحاد پیدا کیا۔ انھوں نے بڑی بڑی مسجدیں اور مدرسے بنائے۔ انھوں نے اسلام کے خلاف عیسائی حملوں کا طاقت ور دفاع کیا۔

ہماری تاریخی کتابوں میں سلاجقہ کے اس قسم کے کارنامے بہت ملیں گے مگر یہ کتابیں اس بارہ میں بالکل خاموش ہیں کہ سلجوق ترکوں نے کس طرح اور کس مرحلہ پر اسلام قبول کیا۔ اسلام کی مدون تاریخ کا یہ عظیم خلا ہے کہ اس میں جنگی واقعات اور سیاسی فتوحات کی داستانیں تو نہایت تفصیل کے ساتھ ملتی ہیں۔ مگر یہ کتابیں اس عظیم تر فتح کی تفصیلات سے ہمیں آگاہ نہیں کرتیں کہ اسلام نے کس طرح لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی۔ اور کس طرح قومیں کی قومیں اسلام کے دائرے میں داخل ہوتی چلی گئیں۔ اسلامی تاریخ کی موجودہ کتابیں " دولت سلجوقیہ " کی تفصیلات بتاتی ہیں مگر وہ " اسلام سلجوقیہ " کی تفصیلات سے ہمیں آگاہ نہیں کرتیں۔

پورے اسلامی لٹریچر میں غالباً تاریخ دعوت کے موضوع پر ایک ہی قابلِ ذکر کتاب لکھی گئی ہے اور اس کتاب کے مصنف کا نام ٹی ڈبلیو آرنلڈ ہے۔ پروفیسر آرنلڈ مذکورہ واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests: on two great historical occasions, infidel barbarians have set their feet on the necks of the followers of the Prophet,—the Saljuq Turks in the eleventh and the Mongols in the thirteenth century,—and in each case the conquerors have accepted the religion of the conquered (p. 2).

اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی شاندار روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔ دو بڑے تاریخی مواقع پر وحشی کافروں نے اپنے پاؤں محمد کے پیروؤں کے گردن پر رکھ دیے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے اور تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں نے۔ مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کر لیا۔

منگول تاتاریوں کا قبول اسلام

قدیم زمانہ میں ترکستان (روس) اور منگولیا (چین) کے علاقے میں کچھ قبائل آباد تھے جن کو ترک کہا جاتا تھا۔ ان کا ایک سردار چنگیز خاں (۱۱۶۲ - ۱۲۲۷) تھا۔ یہ غیر معمولی صلاحیت کا آدمی تھا۔ وہ ۲۰ ہزار جنگجو افراد کو جمع کر کے اپنے علاقہ سے نکلا اور فتوحات کرتا ہوا چین سے ایران تک پہونچ گیا۔

اس کے بعد یہ قبائل آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ہلاکو خاں (۱۲۱۷ - ۱۲۶۵) اٹھا۔ اس نے اسلامی سلطنت کو برباد کرنے کے بارہ میں اپنے دادا (چنگیز خاں) کے منصوبہ کو مکمل کیا۔ اس نے دار السلطنت بغداد کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اور خلیفہ مستعصم کو قتل کر ڈالا۔ تاتاری سرداروں کو مسلم حکمراں (خوارزم شاہ) سے کچھ شکایت پہونچی تھی، اس بنا پر وہ غضب ناک ہوگئے اور مسلم سلطنت کو برباد کرنے کے درپے ہوگئے۔

یہ اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ خوف ناک واقعہ تھا۔ تاتاریوں کے ظلم و فساد کی بنا پر اسلامی دنیا میں ان کا اتنا زیادہ ہول طاری ہوا کہ کہا جانے لگا: اذا قیل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق (اگر کہا جائے کہ تاتاری شکست کھاگئے تو یقین مت کرنا)

یہ ہولناک مسئلہ بھی دعوت ہی کے ذریعہ حل ہوا۔ تاتاری جب مسلمانوں کا خون پوری طرح بہا چکے تو ان کے انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی۔ اب انھوں نے اپنی "رعایا" کے مذہب پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا شروع کیا۔ مختلف طریقوں سے تاتاریوں کا سابقہ مسلمانوں کے ساتھ پیش آتا تھا۔ بے شمار مسلمان مرد اور عورتیں گرفتار ہو کر ان کے گھروں پر پہنچیں، سڑکوں اور بازاروں میں مختلف اسباب کے تحت ایک تاتاری کی ملاقات ایک مسلمان سے ہوتی تھی۔ تاتاری حکمرانوں کے دربار میں مسلمان جاتے رہتے تھے۔ اس طرح مختلف طریقہ سے تاتاری لوگ اسلام کی تعلیمات سے آشنا ہوئے اور اس سے تعارف حاصل کیا۔

اس کے بعد ان کے اسلام قبول کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اولاً ان کے حکمرانوں اور سرداروں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد عام تاتاریوں نے اس کی پیروی کی۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اسلام کی عمارت کو ڈھایا تھا

وہی دوبارہ اسلام کی عمارت تعمیر کرنے والے بن گئے۔ تاریخ اسلام کے اس عظیم دعوتی واقعہ کی تفصیل بیش کرتے ہوئے پروفیسر آرنلڈ نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ فاتح نے مفتوح کے مذہب کو اختیار کرلیا:

The conquerors have accepted the religion of the conquered.

پروفیسر فلپ ہٹی نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ہسٹری آف دی عربس میں لکھا ہے:

The religion of the Muslims had conquered where their arms had failed (p. 488).

مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے۔

سب کچھ چھننے کے بعد بھی

دعوت ایک ایسی طاقت ہے جو اہل ایمان کے پاس اس وقت بھی باقی رہتی ہے جب کہ ان کا سب کچھ ان سے چھن چکا ہو۔ اس کی ایک سبق آموز مثال وہ ہے جو افریقہ میں پائی جاتی ہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں دکھایا ہے کہ الجزائر کے بربری قبائل میں اسلام کس طرح پھیلا۔ ان قبائل میں کچھ لوگ عیسائی تھے اور زیادہ تر وہ لوگ تھے جو قدیم مشرکانہ مذہب پر قائم تھے۔

یہ لوگ پہاڑی علاقہ میں رہتے تھے اور پہاڑوں کے حصاروں میں بند تھے۔ قبائلی مزاج کے تحت وہ اپنی خود مختاری کے دل دادہ بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے عرصہ تک اپنے یہاں عربی عناصر کے داخلے کو کامیابی سے روکا، لہذا ان کو مسلمان بنانے میں بہت سی مشکلات حائل تھیں۔ اس سے پہلے قادریہ سلسلہ کی ایک خانقاہ (ساقیۃ الحمرا) کے صوفیوں نے ان کے یہاں ایک تبلیغی مشن قائم کرنے کی کوشش کی تھی، مگر انھیں اس کام میں کامیابی نہ ہوئی۔ ان کے درمیان اسلام کے لیے راستہ ہموار کرنے کا سہرا اندلسی مسلمانوں کے سر ہے جو سقوطِ غرناطہ (۱۴۹۲ء) کے بعد اسپین سے نکال دیے گئے تھے۔ اور اس خانقاہ میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ خانقاہ کے شیخ نے دیکھا کہ یہ لوگ تبلیغ کے اس دشوار کام کے لیے بہت موزوں ہیں جس کے سرانجام دینے میں ان کے اپنے مریدوں کی کوششیں ناکام رہی تھیں۔ اس کام پر روانہ کرنے سے پہلے انھوں نے ان کو ان الفاظ میں مخاطب کیا:

"ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسلام کی مشعل اُن ملکوں میں لے جائیں جو برکاتِ اسلام کی نعمت سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان بدقسمت قبائل کے ہاں نہ تو مدارس ہیں اور نہ کوئی شیخ ہے جو اُن کے بچوں کو اصولِ اخلاق اور محاسنِ اسلام کی تعلیم دے سکے۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح رہتے ہیں جن کو نہ خدا کا علم ہے، نہ دین کا۔ لہٰذا میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس ناگوار صورتِ حال کی اصلاح کے لیے تمہاری دینی حمیت اور تمہارے نورِ ایمان سے درخواست کروں تاکہ یہ کوہستانی لوگ اپنی قابلِ رحم جہالت کی دلدل میں غلطاں و پیچاں نہ رہیں اور ہمارے دین کی شاندار صداقتوں سے باخبر ہو جائیں۔ جاؤ اور ان کے ایمان کی بجھتی ہوئی آگ کو ہوا دو اور اس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو دوبارہ روشن کرو۔ اپنے پہلے مذہب یعنی عیسائیت کی جس ضلالت سے وہ اب تک آلودہ ہیں، اس سے ان کو پاک کرو اور ان کو یہ سمجھاؤ کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں عیسائیت کے برعکس میل کچیل اللہ تعالیٰ کی نظروں میں مقبول نہیں ہے۔ میں تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ تمہارے کام میں بہت سی دشواریاں ہیں۔ لیکن تمہاری ناقابل تسخیر حمیّتِ اسلامی اور حرارتِ ایمانی خدا کے فضل و کرم سے تمام مشکلات پر غالب آئے گی۔ میرے بچو! جاؤ، اور اس بدنصیب قوم کو خدا اور اس کے رسول کی طرف دوبارہ لاؤ جو اس وقت جہالت اور کفر کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ ان کو نجات کا پیغام پہنچاؤ۔ خدا تمہارے شاملِ حال رہے اور تمہاری مدد فرمائے۔"

یہ مبلغ پانچ پانچ، چھ چھ کی جماعتوں میں مختلف اطراف میں روانہ ہوگیے۔ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں عصا لیے چل دیے اور انھوں نے پہاڑوں کے سنسان اور غیر آباد مقامات کا انتخاب کرکے وہاں کے غاروں میں چٹانوں کے درمیان خانقاہیں قائم کیں۔ قبائل کے درمیان ان کی پرہیزگاری اور عبادت گزاری کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ یہ قبیلے جلد ہی ان کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے لگے۔ ان مبلغوں نے آہستہ آہستہ اپنے علمِ طب اور صنعت و حرفت اور تمدن کے دوسرے فوائد کی بدولت بربری قبائل کے یہاں کافی اثر و رسوخ قائم کرلیا۔ حتیٰ کہ ہر خانقاہ اسلامی تعلیم و دعوت کا مرکز بن گئی۔ ان نو واردوں کے علم و فضل کی کشش سے بہت سے لوگ علم کی طلب میں ان کے گرد جمع ہوگیے۔ کچھ عرصہ بعد یہی طالب علم اپنے ابنائے وطن میں اسلام کی تبلیغ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کا مذہب بربری قبائل کے تمام علاقوں اور الجزائر کی تمام بستیوں میں پھیل

گیا (صفحہ ۲۹-۱۲۸)

جزائر ملایا میں اسلام

جنوب مشرقی ایشیا کے علاقہ میں ۲۰۰ ملین (۲۰ کرور) مسلمان ہیں۔ صرف انڈونیشیا میں ۱۲۰ ملین مسلمان ہیں۔ یہ تعداد کسی بھی دوسرے مسلم ملک سے زیادہ ہے۔ اس علاقہ میں مسلمانوں کی کثیر تعداد کا سب سے زیادہ اثر انگیز پہلو یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر صرف تبلیغی عمل کے ذریعہ مسلمان ہوئے ہیں۔ اس علاقہ میں کبھی بھی مسلمانوں کی طرف سے کوئی فوجی اقدام نہیں کیا گیا۔

اس علاقہ میں اسلام کا نمایاں ظہور ۱۳ ویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اور یہی وہ صدی ہے جس میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت پر زوال آیا۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے لکھا ہے کہ جزائر ملایا کی تاریخ پچھلی چھ صدیوں میں اسلامی تاریخ کا نہایت دلچسپ باب پیش کرتی ہے۔ جہاں اسلام کی اشاعت تمام تر صرف تبلیغی کوششوں کے ذریعہ ہوئی (صفحہ ۳۶۷)

۱۳ ویں صدی وہ صدی ہے جب کہ اسپین میں اسلامی سلطنت پر زوال آیا۔ اور یہی وہ صدی ہے جب کہ اسلام جزائر ملایا میں فکری فتح حاصل کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کرافورڈ (Dr. Crawford) نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بڑا عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ اسلامی مذہب عین اس وقت ایشیا میں بڑھ رہا تھا جب کہ وہ یورپ سے نکال دیا گیا تھا:

It may be remarked as a singular co-incidence that the Mohammedan religion was extending itself thus in Asia at the very time it was expelled from Europe.

پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں لکھتے ہیں کہ بعد کے سالوں میں اگرچہ اسلام کی عظیم سلطنت ٹوٹ گئی اور اسلام کی سیاسی طاقت بہت گھٹ گئی تب بھی اس کی روحانی فتوحات کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہیں۔ جب منگول قبائل نے ۱۲۵۸ میں بغداد کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کی عظمت کو خون میں غرق کر دیا، اور جب فرڈینینڈ نے ۱۲۳۶ میں مسلمانوں کو قرطبہ سے نکال دیا اور غرناطہ کے مسلم سلطان نے عیسائی بادشاہ کو خراج ادا کیا اس وقت اسلام سماترا میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اور جزائر ملایا میں فاتحانہ اقدام کر رہا تھا۔ سیاسی انحطاط کے لمحات میں اسلام نے

اپنی بعض شاندار روحانی فتوحات حاصل کی ہیں (صفحہ ۲)

وان لیر (Van Lear) نے لکھا ہے کہ جو شخص بھی انڈونیشیا کی تاریخ میں داخل ہوتا ہے وہ ایک نامعلوم دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی پُراسرار، معجزاتی طاقت کارفرما تھی جس نے جنوب مشرقی ایشیا کے لوگوں کو اسلام میں داخل کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ ایک معجزاتی طاقت اس اشاعتِ اسلام کے پیچھے کام کر رہی تھی۔ مگر یہ کوئی پُراسرار طاقت نہ تھی بلکہ یہ اسلام کی دعوتی طاقت تھی۔ اسلام کی دعوتی طاقت کے اندر بلاشبہ اس بات کی معجزاتی صلاحیت چھپی ہوئی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچے اور لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے کے لیے مجبور کر دے۔

اس علاقے میں اسلام تاجروں کے ذریعہ داخل ہوا۔ تاجر کے اندر جو اخلاقیات ہوتی ہیں وہ داعی کی اخلاقیات ہیں۔ بہترین داعی وہی ہے جو تاجر کی طرح مدعو کے ساتھ معاملہ کرے۔ ایسا داعی کبھی اپنے مشن میں ناکام نہیں ہو سکتا۔

الکس ڈی ٹاکویل (Alex de Toqueville) نے لکھا ہے کہ تجارت متشدّدانہ جذبات کی قاتل ہے۔ تجارت اعتدال اور مفاہمت کو پسند کرتی ہے۔ تاجر آدمی اس معاملہ میں نہایت محتاط ہوتا ہے کہ وہ غصہ سے اعراض کرے۔ تاجر برداشت والا ہوتا ہے۔ تجارت ایک تاجر کے اندر یہی صفات پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے ایک مفکر نے کہا ہے کہ خدا تجارت کو اپنا مبلغ بناتا ہے:

God is making commerce His missionary.

اسلامی دعوت بیسویں صدی میں

بیسویں صدی مسلم تحریکوں کی صدی ہے۔ اس صدی میں مسلمانوں نے بے شمار بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں۔ یہ تمام کی تمام سیاسی اور انقلابی تحریکیں تھیں۔ ان تحریکوں کو افراد اور وسائل کا اتنا زیادہ سرمایہ ملا جو کمیت کے اعتبار سے انھیں کامیاب بنانے کے لیے کافی تھا۔ مگر یہ تحریکیں اپنی تمام تر وسعت کے باوجود ناکام ہو کر رہ گئیں۔ ان سے امت کو کسی بھی قسم کا کوئی مثبت فائدہ نہیں ملا۔ یہ تحریکیں طوفان کی طرح اٹھیں اور گرد و غبار کی طرح مٹ گئیں۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کا یہ حال سیاسی اعتبار سے تھا۔ مگر عین اسی صدی میں اسلام کی دعوتی طاقت ہر ملک کے لوگوں کو مسخر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگرچہ اسلامی دعوت کے میدان میں مسلم قائدین نے کوئی بھی قابلِ ذکر کوشش نہیں کی۔ مگر اسلام اپنی ذاتی قوت سے مسلسل لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتا رہا ہے۔

پچھلے ایک سو سال کے اندر دنیا کے مختلف حصوں میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ یہاں ہم ان میں سے کچھ افراد کا نام بطور علامت درج کر رہے ہیں۔ اس فہرست سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح پچھلے سو سال کے اندر ہر زمانہ میں لوگ اسلام قبول کرتے رہے ہیں۔ ناموں کے سامنے ان کے قبولِ اسلام کا سن دیدیا گیا ہے:

1	Prof. Haroon Mustafa Leon	England	1822
2	Mohammad Alexander Russel Webb	U.S.A.	1890
3	Dr Nishikanta Chattopadhya	Hyderabad	1904
4	Lord Headly al-Farooq	England	1913
5	Dr William Burchell B. Pickard	England	1922
6	Sir Abdulla Archibald Hamilton	England	1923
7	Mohammad Leopold Asad	Austria	1926
8	Muhammad Marmaduke Pickthall	England	1935
9	Dr Abdul Karim Germanus	Hungary	1940
10	Dr ali Muhammad Mori	Japan	1947
11	Dr Ali Selman Benoist	France	1953
12	Dr R.L. Mellema	Holland	1955
13	Ibrahim Khalil Phillips	Egypt	1960
14	Prof. A.H.B. Hewett	U.S.A.	1966
15	Umar Bongo (President, Gabon)	Gabon	1973
16	Dr Roger Garoudy	France	1982
17	Moosa Fondi	Tanzania	1986
18	Abdullah Adiar	Madras	1987

یہ تمام لوگ وہ ہیں جنھوں نے بطور خود اسلام کا مطالعہ کیا۔ ان کو اسلام کی تعلیمات نے متاثر کیا۔ ان میں سے کئی لوگوں نے اسلام کو براہِ راست سمجھنے کے لیے عربی زبان سیکھی۔ اور آخرکار اسلام قبول کر لیا ——— بیسویں صدی مسلمانوں کے لیے بحیثیت قوم ناکامی کی صدی ہے، مگر عین اسی صدی میں اسلام بحیثیت دین کے مسلسل آگے بڑھتا رہا ہے اور بڑھ رہا ہے۔

حرفِ آخر

اسلام کی پوری تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ اسلام کی دعوت اسلام کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اسلام عین انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ اگر وہ اپنی اصلی صورت میں انسان

کے سامنے لایا جائے تو وہ سیدھا آدمی کے دل میں اتر جاتا ہے، وہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی صداقت کا اعتراف کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنی ذات میں تسخیری طاقت رکھتا ہے۔ وہ خود لوگوں کو متاثر ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

مگر اس طاقت کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام اور اس کے مخاطب کے درمیان سے تمام نفسیاتی رکاوٹیں دور کر دی گئی ہوں۔ دور اول کے مسلمان اس راز کو جانتے تھے۔ چنانچہ وہ جن قوموں کے درمیان گیے اور جن ممالک کو فتح کیا، انھوں نے ان کے ساتھ کامل رواداری کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے ہر ایک کو اس کے مذہب کی پوری آزادی دی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انھوں نے لوگوں کے ساتھ قومی نزاع کھڑی کی یا مذہب کے معاملہ میں ان پر جبر کرنا شروع کیا تو ان کے اندر ضد کی نفسیات پیدا ہو جائے گی۔ ضد کی بنا پر وہ ایک ماننے والی چیز کو بھی ماننے سے انکار کر دیں گے۔

مشہور انگریز مورخ ہنری ٹامس بکل (۱۸۶۲-۱۸۲۱) نے قدیم مسلمانوں کی اس حکمت اور تدبر کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اسلامی مبلغ بے حد سمجھ دار اور دور اندیش ہیں

The Mahometan missionaries are very judicious (p. 409).

پروفیسر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام *(The Preaching of Islam)* میں اس کے مصنف نے نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ دور اول کے مسلمانوں نے ہر جگہ مکمل مذہبی رواداری کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے باوجود کبھی غیر مسلموں کے ساتھ مذہبی جھگڑے نہیں کھڑے کیے۔ اور یہ بہت بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر دور قدیم کی آباد دنیا کا بہت بڑا حصہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گیا۔

اسلام کی یہ دعوتی قوت آج بھی ظاہر ہو سکتی ہے، بشرطیکہ موجودہ مسلمان وہ تمام قومی نزاعات ختم کر دیں جو وہ ہر ملک میں اپنے غیر مسلم ہمسایوں سے چھیڑے ہوئے ہیں۔ یہ قومی نزاعات جن کو غلطی سے "جہاد" کا نام دیدیا گیا ہے، اسلام کی دعوتی قوت کے ظہور میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جس دن یہ نزاعات ختم ہوں گے، اسی دن اسلام کا دعوتی سیلاب موجزن ہو جائے گا اور اس وقت تک نہ تھمے گا جب تک وہ اپنی آخری حد کو نہ پہونچ جائے۔

ہر انسانی گروہ کا ایک نظامِ عقائد ہوتا ہے اور ایک اس کا نظامِ اقتدار۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان نظامِ اقتدار کے اعتبار سے دوسری قوموں سے پیچھے ہو گیے ہیں۔ لیکن نظامِ عقائد کے اعتبار سے آج بھی وہ تمام قوموں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ مگر مسلمانوں کے قائدین ساری دنیا میں یہ کر رہے ہیں کہ وہ نظامِ اقتدار کے میدان میں دوسری قوموں سے ٹکرا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے حصہ میں شکست اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں آرہا ہے۔ اگر وہ اس بے فائدہ ٹکراؤ کو ختم کر دیں اور نظامِ عقائد کے میدان میں دوسری قوموں کو اپنا مخاطب بنائیں تو بہت جلد وہ دیکھیں گے کہ ان کی شکست کی تاریخ فتح کی تاریخ میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اسلام کو فکری طاقت کی حیثیت سے اٹھائیے۔ اِس کے بعد وہ فکری اعتبار سے بھی دنیا پر غالب آجائے گا اور نتیجۃً دوسرے تمام اعتبارات سے بھی۔

واقعاتِ سفر

(مصر میں) ہمارے پہنچنے سے پہلے ہماری کتاب ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین اہل علم وفکر کے حلقہ میں پہنچ چکی تھی اور اس نے اپنی جگہ پیدا کر لی تھی، وہ میرے لیے ایک بطاقۃ الزیارۃ اور ایک تعارف نامہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور اکثر جگہ یہ کہنا کافی ہوتا تھا: مولف ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین (صفحہ ۳۶۸) عبدالحمید سعید ہال میں میری تقریر العالم علیٰ مفترق الطرق کے عنوان سے ہوئی۔ اس تقریر کا عام طور پر چرچا ہوا۔ اس کے بعد ایک صاحب قلم استاذ عبدالمنعم خلّاف نے اپنی تقریروں میں بڑے اچھے تبصرے کیے (۳۶۹) میرا ایک مقالہ مصر کے مقبول ترین رسالہ (الرسالہ) میں شائع ہوا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے اس کو ایک الگ رسالہ کی شکل میں مصر ہی میں (اسمعی یامصر) کے عنوان سے شائع کروایا اور وہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھا گیا (۵، ۳) حمص میں مرکز اخوان المسلمین میں ۲۹ جولائی ۱۹۵۱ کو میری ایک ولولہ انگیز تقریر ہوئی۔ حلب کے بھی ایک بھرے جلسہ میں میری ایک پُرجوش تقریر ہوئی (۳۹۰) ان تقریروں کے علاوہ میرا ایک اہم مضمون وہاں کے واحد عربی اخبار البلاد السعودیۃ میں شائع ہوا (۳۹۲) واپسی میں لکھنؤ کے اسٹیشن پر تبلیغی احباب اور لکھنؤ کے دوستوں کی ایک بڑی تعداد استقبال کے لیے موجود تھی (۳۹۳) مصر اور شام سے واپسی پر لکھنؤ کی تبلیغی جماعت کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں مسلم اور غیر مسلم سبھی شریک تھے۔ وہاں میں نے تقریر کی۔ بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ اس جلسہ میں حاضرین کی اتنی تعداد تھی جو بڑے سے بڑے سیاسی رہنما حتیٰ کہ جواہر لال کے خطاب میں بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ من جانب اللہ بات تھی کہ مضامین کی ایسی آمد اور تقریر میں ایسی روانی اور جوش تھا کہ سامعین ایک سکتہ کے عالم میں تھے۔ بہت سے رکشے والوں نے جن کا اڈہ قریب تھا، سواری لینے سے انکار کر دیا اور کھڑے سنتے رہے۔ اس جلسہ کی ایک خصوصیت یہ تھی جو میرے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ بھائی صاحب مرحوم بھی پاس کی ایک عمارت میں بیٹھے ہوئے تقریر سن رہے تھے اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ اپنی محنت اور تربیت ذہنی پر مسرور و مطمئن ہوئے ہوں گے (۳۹۷) سیوان میں شب کے مخلوط اجتماع میں حسب معمول تقریر کر کے بیٹھنا چاہتا تھا کہ جلسہ سے آوازیں آئیں کہ ابھی اور فرمائیے ہم ابھی سننا چاہتے ہیں۔ میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ ایک سن رسیدہ ہندو اسٹیج پر ونڈر فل، ونڈر فل کے الفاظ کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ ہم لوگوں نے ان کو مہذب طریقہ پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اسٹیج تک پہونچ گئے۔ معززین شہر نے بتایا کہ یہ یہاں کے بہت کامیاب وکیل اور یہاں کی پرجا سوشلسٹ پارٹی کے سکریٹری یا صدر ہیں۔ انھوں نے مائک پر کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں دو تقریریں سنی ہیں جن سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ ایک مسٹر سی آر داس کی تقریر اور

ایک آج مولانا صاحب کی (۴۰۰) لاہور کے سفروں میں ہمارے فاضل دوست مولانا عطاء اللہ حنیف نے میرے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی۔ مجھے اس دعوت و اعزاز کے قبول کرنے میں کوئی تردد نہیں ہوا۔ لیکن اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب مجھے وہاں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا اور مولانا سید داؤد غزنوی صاحب نے اس کو خود پڑھا (۴۱۰) مجھے دمشق یونیورسٹی کا دعوت نامہ (۱۹۵۵) ملا۔ میں اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتا کہ مجھے ایک ترقی یافتہ عرب ملک (شام) کی ایک مؤقر دانش گاہ کی طرف سے ایسی دعوت آنے پر بڑی مسرت ہوئی اور میں نے اس کو ایک علمی اعتماد و اعزاز کا مرادف سمجھا۔ یہاں مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے ایک خط کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے تحریر فرمایا کہ "اخبار میں اس تاریخی امتیاز کی خبر پڑھی جو صدیوں کے بعد ہندستان کو حاصل ہوا۔ علامہ صفی الدین بداؤنی کے بعد شاید آپ دوسرے ہندی عالم ہیں جن کو شام میں پڑھانے اور اپنے علوم سے شامیوں کو فائدہ پہونچانے کا موقع ملا (۴۲۱) یہ حسن اتفاق تھا کہ اسی اپریل ۱۹۵۶ میں جب کہ مجھے سفر کرنا تھا، بمبئی سے دمشق کے لیے پہلی مرتبہ ایرانڈیا کی ڈائرکٹ سروس شروع ہوئی۔ اپنے مخلص دوست و کرم فرما عالی مرتبت شیخ یوسف الفوزان سفیر مملکت سعودیہ کی سفارش و کوشش سے مجھے اس کے فرسٹ کلاس کی ایک سیٹ مل گئی۔ چونکہ یہ ہندستان اور شام کے مابین پہلی پرواز تھی، اس کی فلم لی گئی جس کا مجھے پتہ نہیں چلا۔ لیکن لکھنؤ کے پہچاننے والوں نے کسی سنیما میں یہ فلم دیکھی اور جہاز سے اترتا ہوا مجھے دیکھا اور عزیزوں کو بتایا کہ انھوں نے مجھے دمشق میں دیکھا۔ ہوائی اڈہ پر ہمارے اصل داعی اور ان کے متعدد احباب موجود تھے جو بڑی محبت اور تپاک سے ملے اور میری آمد پر مسرت کا اظہار کیا (۴۲۳) دمشق میں آخری محاضرہ (۲۶ مئی ۱۹۵۶) سے پہلے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے مہمان کے اعزاز میں دمشق کے بڑے ہوٹل نادی الشرق میں ظہرانہ دیا گیا جس میں یونیورسٹی کے پروفیسر اور بہت سے معززین شہر مدعو تھے (۴۲۵) حلب میں اخوان کے مرکز میں میری ایک اہم تقریر حاجتنا الیٰ ایمان جدید کے عنوان سے تھی۔ تقریر ختم ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ محبت کا دریا امنڈ آیا۔ کم کبھی کسی مجمع نے اپنی محبت کا اس طرح والہانہ اظہار کیا ہوگا (۴۳۲) کراچی میں ایک دن سفیر شام نے میرے اعزاز میں سفارت خانہ میں دعوت کی جس میں علامہ محمد بشیر الابراہیمی اور مولانا محمد یوسف بنوری نے شرکت کی (۴۴۰) حیدرآباد میں ایک روز پرنس مکرم جاہ بہادر نے بھی کھانے پر بلایا جہاں پروفیسر الیاس برنی سے بھی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بڑی عنایت فرمائی۔ مولانا الیاس برنی نے میرے ان مضامین کی تحسین کی جو ہندستانی مسلمانوں کی خدمات کے سلسلے میں لکھے گئے تھے (۴۵۱) ہم ۱۸ دسمبر ۱۹۶۰ کو رنگون پہونچے۔ اخبارات میں چھپا کہ آزاد برما میں کسی عالم کا اس سے پہلے ایسا استقبال نہیں ہوا (۴۵۷)

ماخوذ از کاروانِ زندگی، حصہ اوّل، مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

شمارہ ۱۳۰ ستمبر ۱۹۸۷

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون: 697333, 611128

سبب اپنے اندر

قرآن میں اہل ایمان کو یہ یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ اگر تم ایمان اور ہدایت پر قائم رہوگے تو دوسروں کی مخالفانہ کارروائیاں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ اس سلسلہ میں دو آیتوں کا مطالعہ کیجئے :

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

اے ایمان والو، تم اپنی فکر رکھو۔ کسی کی گمراہی تم کو نقصان نہیں پہنچائے گی اگر تم ہدایت پر ہو۔

(المائدہ ۱۰۵)

وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ

(آل عمران ۱۲۰)

اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ بے شک اللہ کے بس میں ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔

قرآن کے اس اعلان کے مطابق، اہل ایمان کے لیے اصل قابل توجہ چیز ان کا داخل ہے نہ کہ ان کا خارج۔ اہل ایمان کو سب سے زیادہ جس چیز کا اہتمام کرنا ہے وہ یہ کہ وہ خدا کی ہدایت پر قائم رہیں۔ یہ ہدایت ربانی ان کے اندر صبر اور تقویٰ کی صفت پیدا کرے گی۔ اور صبر اور تقویٰ کی صفت ان کے لیے اغیار کی ضرر رسانی کے مقابلہ میں مانع بن جائے گی۔ صبر اور تقویٰ ان تمام تدبیروں اور سازشوں کے لیے ایک ناقابل تسخیر روک ہے جو امکانی طور پر دوسرے لوگ کر سکتے ہیں۔

دنیا میں کوئی شخص یا کوئی قوم تنہا نہیں۔ یہاں دوسرے بہت سے لوگ بھی ہیں۔ اور ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے آزادی عطا کی ہے۔ ہر آدمی اپنے مقصد کے لیے دوڑ رہا ہے۔ ہر آدمی دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے چوٹ لگتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے کوئی نقصان پیش آتا ہے۔ یہ صورت حال خود خدا کی قائم کردہ ہے۔ اس کو ختم کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ وہ جس طرح مسلم اور غیر مسلم کی مخلوط آبادی میں ہے اسی طرح وہاں بھی جاری رہے گی جہاں صرف مسلمان ہوں، اور کوئی دوسری قوم وہاں نہ پائی جاتی ہو۔

ایسی حالت میں مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ آدمی ہر ٹکرانے والے سے ٹکرائے۔ اس کا واحد حل وہی

ہے جس کو قرآن میں اعراض (Avoidance) کہا گیا ہے۔ اعراض ہی واحد تدبیر ہے جس کے ذریعہ کوئی شخص اس دنیا میں اپنا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکتا ہے۔

صبر اسی اعراض کی قیمت ہے۔ جن لوگوں کے اندر صبر اور برداشت کا مادہ نہ ہو وہ اعراض نہیں کرسکتے، اور جو لوگ اعراض نہ کریں ان کے لیے اس دنیا میں کامیاب ہونا بھی ممکن نہیں۔

تاہم صبر کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ صبر کے لیے آدمی کو اپنے مشتعل جذبات کو دبانا پڑتا ہے۔ صبر کا درجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی کھونے کو برداشت کرے۔ صبر کے طریقہ پر وہی آدمی چل سکتا ہے جو ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھ جائے۔

تقویٰ آدمی کے اندر یہی جوہر پیدا کرتا ہے۔ تقویٰ سے مراد اللہ کا خوف ہے۔ عام آدمی لوگوں میں جیتا ہے۔ متقی آدمی لوگوں سے گزر کر خدا میں جینے لگتا ہے۔ متقی کی ساری توجہ اس پر لگ جاتی ہے کہ جو کچھ خدا سے ملنے والا ہے اس کو وہ نہ کھوئے۔ وہ بظاہر اسی دنیا میں ہوتا ہے مگر اپنے احساس کے اعتبار سے وہ دنیا سے اٹھ کر آخرت میں پہونچ جاتا ہے۔ اس طرح تقویٰ آدمی کو بے پناہ حد تک طاقتور بنا دیتا ہے۔ کوئی بھی حادثہ اس کے ذہنی استحکام کو منتشر نہیں کرتا۔ کوئی بھی نقصان اس کو اتنا بڑا نظر نہیں آتا جس کو وہ برداشت نہ کرسکے۔ یہ بلاشبہ اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ اعلیٰ صفت پیدا ہو جائے ان کو تمام قومیں مل کر بھی زیر نہیں کرسکتیں۔

صبر اور تقویٰ کا ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہے۔ صبر کرنا اپنے آپ کو خدا کے حد پر روکے رکھنا ہے۔ اس کے برعکس آدمی جب دشمن کی دشمنانہ کارروائیوں پر بے صبر ہوتا ہے تو اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا سے بے خوف ہو کر حد سے باہر نکل جاتا ہے۔ وہ ایسے کام کرنے لگتا ہے جن سے خدا نے اس کو منع کیا تھا۔ مثلاً دشمن سے متنفر ہو کر اس سے اشتعال انگیزی کا سلوک کرنا، غصہ اور نفرت کی بنا پر فریق ثانی کے بارہ میں انصاف کی بات نہ کرنا، اپنی زیادتی کو گھٹانا اور دوسرا اگر زیادتی کرے تو اس کو بڑھا کر بیان کرنا، دشمنانہ فعل کسی اور نے کیا ہو اور اس کا بدلہ کسی اور سے لینا، حق کی حمایت کرنے کے بجائے قوم کی حمایت کرنا، وغیرہ۔

جو شخص تقویٰ پر ہو وہ خدا کی مدد سے ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور جو شخص تقویٰ کی حد پر قائم نہ رہے وہ خدا کی مدد سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

ایک مشورہ

ڈاکٹر رائٹ (Dr Theodore Paul Wright Jr.) ایک امریکی عالم ہیں۔ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کو اپنے اختصاصی مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ میں ایل (Yale) یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور ۱۹۶۳ سے ہندستانی مسلمانوں کے معاملات کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا جو کہ تقریباً ایک سو ملین تعداد کے ساتھ انڈونیشیا کے بعد دوسری سب سے بڑی مسلم آبادی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ ہندستان اور پاکستان کے کئی تفصیلی سفر کر چکے ہیں اور پچھلے تقریباً ۲۵ سال سے خاص اسی موضوع پر پڑھتے اور لکھتے رہے ہیں۔ اس موضوع پر ان کے مقالات ممتاز عالمی جرنلوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر رائٹ نے اپنی کتاب ہندستانی مسلمان (Muslims in India) میں لکھا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے مستقبل کا معاملہ بڑی حد تک اس پر منحصر ہے کہ ہندستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کیا صورت اختیار کرتے ہیں۔ انھوں نے پاکستانیوں سے کہا ہے کہ آپ لوگوں کو چاہیے کہ غیر موثر انداز میں ان کے مسئلہ کا چمپین بن کر ان کے مسئلہ کو مشکل تر نہ بنائیں :

You shouldn't make things difficult for them
by championing their cause ineffectively.

ڈاکٹر رائٹ نے ہندستان کے مسلمانوں کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ساحلی مسلمان اور اندرونی علاقوں کے مسلمان۔ ساحلی مسلمانوں سے ان کی مراد خاص طور پر جنوبی ہند کے مسلمان ہیں۔ اور اندرونی مسلمانوں سے مراد شمالی ہند کے مسلمان۔ دوسری قسم کے مسلمانوں کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ یادگاری ذہن والے (Monument-conscious) ہیں۔ یہ وہ مسلمان ہیں جو تاج محل اور لال قلعہ اور چار مینار کے درمیان رہتے ہیں۔ ان کا ذہن ابھی تک انھیں شاہی یادگاروں میں اٹکا ہوا ہے۔ یہ یادگاریں انھیں یہ بھولنے نہیں دیتیں کہ وہ کبھی اس ملک میں حکمراں طبقہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

ڈاکٹر رائٹ کا کہنا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ذاتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے سماج کا لازمی نتیجہ ہے :

What was happening in India was the inevitable result of the working of a caste-ridden, communal-oriented society.

ڈاکٹر رائٹ نے حالات کے گہرے تجزیہ کے بعد ہندستانی مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر نمایاں بنالیں تاکہ وہ ہندو (اکثریتی فرقہ) کے غضب ناکی کا شکار نہ ہوں۔ یہ ایسے لوگوں کے لیے بہت سخت مشورہ ہے جو فخر کی نفسیات میں مبتلا ہوں اور اپنی عظمت کے نشانات کے درمیان رہتے ہوں۔ مگر اس کے بغیر وہ فسادات کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرتے رہیں گے، جو بہت مہنگی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں ماننا چاہیے کہ ہندو ساحلی علاقہ کے تجارت پیشہ مسلمانوں کے خلاف بہت کم یا بالکل توجہ نہیں دیتے :

My advice to Indian Muslims is to be inconspicuous so as not to draw Hindu backlash. This is a very hard advice to follow for a proud people living in the midst of their monuments of glory. But then the price they pay is very heavy in terms of the riots that occur. Hindus, let us admit, pay little or no attention to coastal Muslim trading communities.

ہندستانی مسلمانوں پر مسلمان لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے تقریباً تمام قابلِ ذکر حصہ کو راقم الحروف نے پڑھا ہے۔ مگر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سلسلہ میں اردو یا عربی یا انگریزی میں جو کچھ لکھا گیا ہے ان سب پر مذکورہ امریکی مستشرق کی تحریر بھاری ہے۔ کسی بھی مسلم اہلِ قلم نے اس مسئلہ کا اتنا گہرا جائزہ نہیں پیش کیا جیسا کہ مذکورہ امریکی عالم نے پیش کیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ گزرے ہوئے ماضی کی پُرفخر یادوں میں اٹکے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اب تک اپنے حال کو نہیں سمجھا اور نہ حال کے مطابق وہ اپنے لیے حقیقت پسندانہ منصوبہ بنا سکے۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے بہترین مشورہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس "پچھلی سیٹ" پر بیٹھنے کے لیے راضی کرلیں جہاں حالات نے انھیں پہنچایا ہے۔ جدید ہندستان میں باعزت مقام حاصل کرنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا جو راستے ان کے لیڈر پیش کر رہے ہیں وہ صرف بربادی میں اضافہ کرنے والے ہیں نہ کہ کامیابی کی طرف لے جانے والے۔

جنگ مطلوب نہیں

انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا کی ایک مستقل سرخی ہے : آج کے لیے ایک خیال (A Thought for Today) ۔ اس سرخی کے تحت اخبار ہر روز کوئی خاص مقولہ نقل کرتا ہے ۔ ۱۹ مئی ۱۹۸۷ کی اشاعت میں اخبار نے اس عنوان کے تحت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول نقل کیا جو انگریزی میں اس طرح ہے :

Paradise lies in the shadow of swords.

(جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے) یہ اقتباس پڑھ کر ایک صاحب نے کہا : اب میری سمجھ میں آیا کہ مسلمان کیوں ہر وقت شمشیر بکف رہتے ہیں ۔ جب ان کے پیغمبر نے خود یہ کہا ہو کہ " جنت تلواروں کے سایہ میں ہے " تو اس کے بعد تو وہ یہی کریں گے کہ ہر وقت لڑنے مرنے کے لیے تیار رہیں ۔ کیونکہ لڑکر مرنا ان کے عقیدہ کے مطابق ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولنے والا ہے ۔

مگر یہ غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ۔ مذکورہ فقرہ ، اس میں شک نہیں کہ حدیث میں آیا ہے ۔ مگر اخبار میں اس کو سیاق سے الگ کرکے نقل کیا گیا ہے ، اس لیے وہ عجیب وغریب مفہوم کا حامل بن گیا ہے ۔ اگر اس فقرے کو اس کے پورے مجموعہ کے ساتھ دیکھا جائے تو بالکل دوسرا نقشہ نظر آئے گا ۔

یہ فقرہ دراصل ایک لمبی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے ۔ یہ حدیث مختلف کتابوں میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے ۔ ذیل میں ہم اس کے اصل الفاظ نقل کرتے ہیں :

عن ابی النضر : سالم مولی عمر بن عبید اللہ قال : کتب الیہ عبد اللہ بن ابی اوفیٰ فقرأتہ حین سار الی الحروریۃ ، یخبرہ : ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی بعض ایامہ التی لقی فیہا العدوّ انتظر حتی اذا مالت الشمس ، قام فیہم فقال : یا ایہا الناس لا تتمنّوا لقاء العدو ، واسئلوا اللہ العافیۃ ، فاذا لقیتموہم فاصبروا ، واعلموا انّ الجنۃ تحت ظلال السیوف ، ثم قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : اللّٰہم مُنزِلَ الکتاب ومجریَ السحاب وہازمَ الاحزاب ، اہزِمہم وانصُرنا علیہم ۔ (اخرجہ البخاری ومسلم وابو داؤد)

حضرت سالم کہتے ہیں کہ عمر بن عبید اللہ کو عبداللہ بن ابی اوفیٰ نے لکھا۔ میں نے اس کو پڑھا جب کہ وہ خارجی فرقہ کی طرف گئے تاکہ اس کو بتائیں۔ اس خط میں لکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعض دنوں میں جب کہ آپ کا مقابلہ دشمن سے ہوا۔ آپ نے انتظار کیا یہاں تک کہ سورج جھک گیا۔ آپ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو، اور اللہ سے عافیت مانگو۔ پھر جب ان سے تمہارا مقابلہ پیش آئے تو ثابت قدم رہو۔ اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ، کتاب کو نازل کرنے والے، اور بادل کو چلانے والے، اور فوجوں کو شکست دینے والے، ان کو شکست دے اور ان کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

اس حدیث کو امام بخاری، امام مسلم اور امام ابو داؤد نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ تینوں کے یہاں وہ کتابُ الجہاد میں ہے۔ مگر وہ اس کو جس "باب" کے تحت لائے ہیں وہ نہایت بامعنی ہے۔ تینوں نے اس کو اس باب کے تحت نقل کیا ہے کہ "دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو"۔ تینوں کے یہاں ترجمۂ باب کے الفاظ یہ ہیں:

بخاری : باب لا تتمنوا لقاء العدو

مسلم : باب کراهية تمنی لقاء العدو

ابو داؤد : باب کراهية تمنی لقاء العدو

گویا تینوں محدثین کے نزدیک اس حدیث کا اصل مدعا شمشیر زنی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا اصل مدعا یہ ہے کہ اہلِ ایمان اپنی حد تک ہمیشہ امن کو پسند کریں، وہ کسی حال میں خود سے جنگ کا آغاز نہ کریں۔

حدیث میں جس عمل کو جنت میں داخلہ کا ذریعہ بتایا گیا ہے وہ اسلامی دفاع ہے نہ کہ اسلامی جارحیت۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام کے نام پر لوگوں سے لڑا جائے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب اسلام پر کوئی حملہ ہو تو اس کی طرف سے پورا مقابلہ کیا جائے۔ مومن کو خود سے لڑائی نہیں چھیڑنا ہے، مگر جب اسلام کے خلاف جارحیت کی جائے تو اس وقت اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام کے دفاع میں پوری بہادری کے ساتھ حملہ آور سے لڑے۔

قومی اسلام

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیاتی حالت بیان کرنا ہو تو اس کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کا قول موزوں ترین ہوگا۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا :

میں مسلمان ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں مسلمان ہوں

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ جملہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی صحیح ترین تصویر ہے۔ مگر ان کی اسی صحیح تصویر میں ان کے المیہ کی پوری داستان بھی چھپی ہوئی ہے۔

مذکورہ فقرے پر غور کیجئے۔ "مسلمان" کے لفظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد قرآنی انسان ہو۔ اگر اس سے قرآنی انسان مراد لیا جائے تو اس سے وہ انسان مراد ہوگا جو اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ مگر مذکورہ فقرہ کو اس معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قرآنی مفہوم کے اعتبار سے یہ فقرہ بالکل لغو ہے۔ اس کی لغویت کو نہایت آسانی کے ساتھ اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ اس کے الفاظ کو بدل دیا جائے۔ آپ "مسلمان" کی جگہ "اللہ سے ڈرنے والا" رکھ دیجئے اور پھر اس کو اس طرح کہیے :

میں اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں اللہ سے ڈرنے والا ہوں

دیکھیے، لفظ کو بدلتے ہی یہ فقرہ بالکل بے معنی معلوم ہونے لگا۔ کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو واقعۃً اللہ سے ڈرتا ہو اور وہ اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کرے۔ کیوں کہ اللہ کا ڈر آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے نہ کہ فخر۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا مذکورہ فقرہ قرآنی مفہوم میں نہیں ہے۔ وہ یقینی طور پر کسی اور مفہوم میں ہے۔

یہ دوسرا مفہوم کیا ہے۔ یہ قومی اور تاریخی مفہوم ہے۔ اس فقرہ میں "مسلمان" کا لفظ اس قوم یا اس نسل کے ایک فرد کے لیے بولا گیا ہے جو ایک خاص تاریخ سے وابستہ ہے۔ جس کے اسلاف نے ملک فتح کیے۔ بڑی بڑی عمارتیں بنائیں۔ شاندار تمدن پیدا کیا۔ دنیا میں اپنی سیاسی اور مادی عظمت قائم کی۔ اس دوسرے مفہوم کے اعتبار سے دیکھیے تو مذکورہ فقرہ بالکل درست نظر آئے گا۔ اس دوسرے مفہوم میں لینے کی صورت میں اس فقرہ کی وہ لغویت ختم ہو جائے گی جو پہلے مفہوم میں لینے

کی صورت میں نظر آتی تھی ۔

یہ تجزیہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی حقیقت کو پوری طرح بے نقاب کر رہا ہے۔ موجودہ زمانہ کا مسلمان قرآن کی پیداوار نہیں، وہ تاریخ کی پیداوار ہے ۔ اس کا سرمایہ قومی فخر ہے نہ کہ قرآنی حقیقتوں کی دریافت ۔ موجودہ مسلمان دوسری قوموں کی طرح ایک قوم ہیں نہ کہ وہ امت جو خدا اور رسول کی بنیاد پر فکری اور روحانی انقلاب کے ذریعہ ظہور میں آئی ہو ۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہ حالت اتنی عام ہے کہ اس میں ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔ ایک ہی رنگ ہے جس میں تمام مسلمان رنگے ہوئے ہیں، خواہ وہ ان کے چھوٹے ہوں یا ان کے بڑے ۔ وہ ان کے پڑھے لکھے لوگ ہوں یا بے پڑھے لکھے لوگ ۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں ۔ یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تمام خرابیوں کی اصل جڑ ہے ۔ موجودہ مسلمانوں کو فخر والا اسلام ملا ، انھیں تواضع والا اسلام نہیں ملا۔ بالفاظ دیگر، انھوں نے تاریخ کو پایا مگر انھوں نے خدا کو نہیں پایا۔ ایسی حالت میں ان کے اندر وہ صفات کیسے پیدا ہو سکتی تھیں جو صرف اس انسان یا اس گروہ میں پیدا ہوتی ہیں جو خدا کو اس طرح پائے کہ وہ اس کے پڑوس میں اپنے صبح و شام گزارنے لگے ۔

مسلمانوں کی اسی نفسیات کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر معاملہ میں ان کا رویہ قومی رویہ بن کر رہ گیا ہے۔ اپنے رسول میں انھیں فخر و مباہات کا سامان ملتا ہے مگر اس میں انھیں اطاعت و پیروی کا سامان نہیں ملتا۔ ان کا اسلام انھیں لڑائی جھگڑا سکھاتا ہے مگر وہ انھیں صبر اور اعراض کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ قرآن وسنّت میں انتقام کا سبق پالیتے ہیں مگر وہ اس کے اندر عفو و درگذر کا سبق نہیں پاتے ۔ جہاد کا یہ مطلب تو ان کی سمجھ میں آتا ہے کہ دوسری قوموں کو اپنا حریف بنا کر ان سے لامتناہی جنگ چھیڑ دی جائے ، مگر جہاد کا یہ مطلب سمجھنے سے وہ معذور رہتے ہیں کہ دوسری قوموں کو خدا کے دینِ رحمت کی طرف مائل کرنے کے لیے ان کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے ۔

دنیا میں کامیابی کے لیے اعتراف اور مفاہمت اور صبر اور اعراض کی ضرورت ہوتی ہے مگر فخر پسند مسلمانوں کو اس قسم کا رویہ اپنے شایانِ شان نظر نہیں آتا ۔ اس لیے وہ ان کو اختیار بھی نہیں کر پاتے ـــــــ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے ۔

اقبال اور ابوالکلام اور ان کے جیسے دوسرے شاعروں اور خطیبوں نے مسلمانوں کو جو فکری سرمایہ دیا وہ ایک لفظ میں "فخر" تھا۔ انھوں نے اسلام کو فخر کی چیز بنا کر پیش کیا۔ ایک زوال یافتہ قوم کے لیے یہ ایک دل پسند غذا تھی، چنانچہ مسلمانوں نے دوڑ کر اس کو قبول کر لیا۔ آج تقریباً تمام مسلمان جس اسلام پر کھڑے ہوئے ہیں وہ یہی فخر والا اسلام ہے، اور یہی ان کی تمام بربادیوں کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

ایک مثال لیجئے۔ ایک بڑے شہر کے مسلم لیڈروں کو یہ تدبیر سوجھی کہ مسلمانوں کو اٹھانے کے لیے ان کے اندر فخر والا اسلام زندہ کریں۔ انھوں نے مسلم محلّوں کی دیواروں پر جلی حرفوں میں جگہ جگہ یہ جملہ لکھ دیا :

فخر سے کہو کہ میں مسلمان ہوں

اس کے بعد ہندوؤں کی باری تھی۔ ان کے اندر بھی جوابی جوش پیدا ہوا۔ انھوں نے شہر کی سڑکوں پر اور بھی زیادہ جلی قلم کے ساتھ ہر طرف یہ الفاظ لکھ ڈالے :

گورو سے کہو کہ میں ہندو ہوں

اس لفظی جنگ کے نتیجہ میں شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ وہاں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ اس کے برعکس اگر مسلمان ایسا کرتے کہ وہ شہر کی دیواروں پر یہ فقرہ لکھتے :

لوگو، خدا سے ڈرو

تو نہ کوئی مقابلہ اور تناؤ ہوتا اور نہ فساد کی صورت پیدا ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام مسائل ان کے خود ساختہ اسلام کے نتائج ہیں۔ اگر وہ قرآن وحدیث والے اسلام کو پکڑ لیں تو ہر قسم کے فساد کی جڑ کٹ جائے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من تواضع رفعه الله (جو تواضع اختیار کرے اللہ اس کو بلند کرتا ہے)، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ترقی اور کامیابی کا راز تواضع ہے۔ مگر مسلمانوں کا فخر پسندی کا ذہن عین اپنی طبیعت کے اعتبار سے تواضع کا طریقہ اختیار نہیں کر پاتا، اس لیے خدا کی دنیا میں اس کو سرفرازی بھی حاصل نہیں ہوتی۔

اصل مسئلہ

ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۲ جولائی ۱۹۸۷ میں لکھتے ہیں : میرٹھ اور دہلی کے فسادات کا حال معلوم ہوا۔ اللہ پاک اپنی پناہ میں رکھے اور رحم وکرم کا معاملہ فرمائے۔ ایک واقعہ میرے دماغ کو جھنکا دے رہا ہے کہ یہ اللہ کا عذاب تو ہم پر نازل نہیں ہورہا ہے۔ بنگلہ والی مسجد میں تین دن حاضری کے لیے میں دہلی گیا تھا۔ شاہجہاں پور کٹھور میں میری بہن ہے۔ اس سے ملنے کے لیے گیا۔ ۲۰ مارچ ۱۹۸۷ کو ۱۱ بجے میرٹھ بھینسالی بس اسٹینڈ پہنچا۔ بھینسالی بس اسٹینڈ پر انکوائری کے لیے جارہا تھا کہ شاہجہاں پور کٹھور کے بارہ میں معلوم کروں۔ انکوائری پر دو غیر مسلم عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی نرمی اور خوش خلقی سے مسافروں کی انکوائری کا جواب دے رہی تھیں۔ مجھ سے آگے ایک مسلم نوجوان اور اس کے ساتھ ایک برقعہ پوش مسلم خاتون انکوائری کررہے تھے۔ یہ دونوں بھائی بہن تھے۔ وہاں حسب ذیل سوال وجواب ہوئے :

مسلم نوجوان — دلی کے واسطے ویڈیو کوچ ابھی نہیں آیا کیا۔

انکوائری خاتون — بھیا، ویڈیو کوچ ابھی نہیں آیا۔ اس کے بدلے لگزری بس لگی ہوئی ہے، اس سے نکل جاؤ۔

مسلم نوجوان — (زور سے بگڑ کر) ہم ویڈیو کوچ پوچھ رہے ہیں، وہ لگزری بس بتارئی۔

انکوائری خاتون — ویڈیو کوچ دو گھنٹے بعد آئے گا۔ تب تک تم دلی پہنچ جاؤگے۔

برقعہ پوش خاتون — تجھے کیا مطلب، ہم پہنچیں نہ پہنچیں۔ تو بتا ویڈیو کوچ کب آئے گا، تو اپنی ڈیوٹی کر۔

انکوائری خاتون — آپ لوگوں کے فائدے کو کہہ رہی ہوں۔ سمے بھی اُدھک لگے گا، پیسہ بھی ڈھائی روپیہ اُدھک۔

برقعہ پوش خاتون — بڑی آئی فائدہ بتانے والی۔ تجھے کیا مطلب، ہم ویڈیو سے جاویں یا نہ جاویں۔

مسلم نوجوان — چل آیا بیٹھ۔ دو گھنٹے بعد ویڈیو نہ آیا تو اس کی خبریں گے۔ (اس کے بعد وہ ناراض ہوتا ہوا چلا گیا)

اس کے بعد انکوائری کاؤنٹر کی غیر مسلم خاتون نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا : "مولانا صاحب، ان لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بہن بھائیوں پر ویڈیو کا بھوت سوار ہے " مسلمان اسلام کو اپنے عملی رُخ کے ذریعہ ذبح کر رہے ہیں تو مالک کائنات مدعو اقوام کے ذریعہ مسلمانوں کو ذبح کرا رہا ہے۔

عبدالسلام خاں، مائننگ انجینیر، سرکلر روڈ، چھندواڑہ ۴۸۰۰۰۱

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جو بتا رہی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا مزاج کیا ہے۔ وہ مزاج ہے ـــــــ خلافِ مزاج بات کو برداشت نہ کرنا۔ مسلمانوں کا عدم برداشت کا مزاج اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ معمولی اختلافی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ اپنی خواہش کے خلاف کوئی ذرا سی بات ہو تو فوراً لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

ہر بار جب کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو وہ مسلمانوں کے اسی بگڑے ہوئے مزاج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ جھگڑالو قوم ہیں۔ ان کا یہ جھگڑا جب آپس میں ہو تو وہ انفرادی واقعہ بن کر رہ جاتا ہے، وہ عمومی فساد کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ مگر جب اس جھگڑے کا ایک فریق مسلمان اور دوسرا فریق ہندو ہو تو وہ فوراً عمومی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کو فرقہ وارانہ فساد کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی یہ حالت صرف ہندستان میں نہیں ہے۔ ان کا یہی حال، بلکہ اس سے بھی زیادہ بدتر حال، پاکستان میں ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب کہ پاکستان کے مسلمان معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑ نہ جاتے ہوں۔ بات کی وضاحت کے لیے یہاں میں صرف ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔

کراچی کا واقعہ ہے۔ ۱۹ جولائی ۱۹۸۰ کی رات کو کچھ مسلم نوجوان ایک منی بس میں سفر کر رہے تھے۔ سفر کے دوران ان کے اور کنڈکٹر کے درمیان تکرار ہو گئی۔ نوجوانوں نے کنڈکٹر پر حملہ کر دیا۔ بس رک گئی۔ اس کے بعد پولس آئی۔ پولس نے دخل دے کر معاملہ کو ختم کر دیا۔ مگر نوجوانوں کا غصہ ختم نہیں ہوا۔ اس وقت وہ چلے گئے اس کے بعد انھوں نے پولس کی " زیادتی " کی داستان سنا کر اپنی قوم کے مزید نوجوانوں کو بھڑکایا۔ اور ایک بھیڑ جمع کر کے ۲۱ جولائی کو کراچی کے اس تھانہ پر حملہ کر دیا۔ جہاں کی پولس نے دخل دے کر معاملہ کو ختم کیا تھا۔

اس " حملہ " میں ایک پولس افسر شدید طور پر زخمی ہوا۔ اور دو پولس کانسٹبل مارے گئے

اب پولیس مشتعل ہوگئی۔ اس نے لوگوں کے اوپر اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ اس کے نتیجہ میں بیس آدمی سخت زخمی ہوگیے۔ ان زخمی ہونے والوں میں دو بچے بھی شامل تھے۔ کئی موتیں بھی واقع ہوئیں (ٹائمس آف انڈیا ۲۳ جولائی ۱۹۸۷)

یہ بات میں نے ایک مسلمان لیڈر سے کہی تو وہ بگڑ گیے۔ انھوں نے تیز و تند لہجے میں کہا: یہ جھوٹ ہے۔ مسلمان کبھی فساد نہیں کرتا۔ آپ مسلم دشمن طاقتوں کے ایجنٹ ہیں اس لیے ایسی باتیں کہہ رہے ہیں آپ کو اپنی یہ بکواس بند کرنی پڑے گی، ورنہ مسلمان آپ کو سبق پڑھانے پر مجبور ہوں گے۔

میں نے نرمی کے ساتھ جواب دیا: میرے بھائی، آپ نے خود ہی میرے دعوے کا ثبوت فراہم کردیا۔ آپ نے اس وقت جو انداز اختیار فرمایا ہے، اسی کا نام اشتعال انگیز ردعمل ہے اور یہ اشتعال انگیز ردعمل ہی تمام فرقہ وارانہ فسادات کی اصل جڑ ہے۔ آپ اور آپ جیسے دوسرے مسلمان باہمی معاملات میں سنجیدہ انداز اختیار کرنا نہیں جانتے، اسی سے معمولی واقعہ فساد بن جاتا ہے۔ اگر آپ لوگ سنجیدہ اور مثبت انداز اختیار کرنا سیکھ لیں تو تمام فسادات کی جڑ کٹ جائے۔

یک طرفہ اقدام کی ضرورت

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں یہ بات تقریباً ثابت شدہ ہے کہ اس کا آغاز ہمیشہ کسی مسلمان کی اشتعال انگیز کارروائی سے ہوتا ہے۔ یہ معاملہ ابتداءً ایک ہندو اور ایک مسلمان کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کے بعد خود مسلمانوں ہی کے پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ یہ انفرادی واقعہ بہت جلد قومی واقعہ بن جاتا ہے۔ دو فرد کا فساد دو قوم کے فساد کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اب ہندو چونکہ اس ملک میں طاقت ور پوزیشن میں ہے، اس کا ردعمل مسلمان کے حق میں بہت ہولناک ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو ایک کے بدلے میں ایک سو کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

فساد کے نتائج کو اگر صرف کمیت اور اعداد و شمار کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہندو ظالم نظر آئیں گے اور مسلمان مظلوم۔ مگر میں اس تقسیم کو صحیح نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ قرآن کی رو سے اصل مجرم وہ ہے جو آغاز کرے (وھم بدؤکم اول مرۃ) تاہم ایک شخص کو یہ کہنے کا حق ہے کہ یہ ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ یعنی اس کا امکان ہے کہ میری رائے درست ہو اور یہ بھی امکان ہے کہ ان

لوگوں کی رائے درست ہو جو ہندو کو ظالم قرار دیتے ہیں۔ مگر معاملہ کا ایک پہلو اور ہے۔ اور اس معاملہ میں یقینی طور پر سنجیدہ انسانوں کی دو رائے نہیں ہو سکتی۔

یہ دوسرا پہلو معاملہ کا عملی پہلو ہے۔ یعنی یہ کہ یہ فسادات ختم کس طرح ہوں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس طرح کے پے چیدہ نزاعات ہمیشہ یک طرفہ اقدام سے ختم ہوتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ ۵۰ فی صد ذمہ داری ہندو لیں اور ۵۰ فی صد ذمہ داری مسلمان قبول کریں اور اس طرح دونوں کے مشترکہ فیصلہ سے فسادات کا خاتمہ کیا جائے تو ایسا مشترکہ فیصلہ کبھی ہونے والا نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں مشرکین مکہ اور مسلمانانِ مدینہ کا جھگڑا صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کی شکل میں یک طرفہ طور پر معاملہ کو ختم کرنے پر راضی ہو گیے دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور جاپان کا جھگڑا صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ جاپان نے یک طرفہ طور پر امریکہ کی تمام شرائط کو مان لیا۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات بھی اسی طرح یک طرفہ تدبیر کے ذریعے ختم ہوں گے یا پھر وہ اسی طرح لامتناہی طور پر جاری رہیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس یک طرفہ اقدام کے لیے کون آگے بڑھے۔ جواب بالکل واضح ہے۔ یک طرفہ اقدام پر ہمیشہ وہ فریق راضی ہوتا ہے جو تصادم کی صورت میں زیادہ نقصان اٹھا رہا ہو۔ میرے نزدیک اس معاملہ میں زیادہ بڑا نقصان مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ اس لیے مسلمانوں ہی کو اس معاملہ میں پہل کرنا چاہیے۔

اس نقصان سے میری مراد مادی نقصان نہیں ہے، بلکہ آخرت کا نقصان ہے۔ اس معاملہ میں یقینی طور پر ہندو بھی نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ نقصان براہ راست کم اور بالواسطہ زیادہ ہے۔ تاہم ہندو کا جو نقصان ہے وہ مادی اور اقتصادی اعتبار سے ہے۔ جب کہ مسلمان کا نقصان یہ ہے کہ وہ دعوت کے امکان کو کھو دیتا ہے۔ ہر بار جب فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو ہندو مسلم تناؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس مسلسل تناؤ نے اس فضا کو برباد کر کے رکھ دیا ہے کہ ہندو کے سامنے مسلمان اپنی وہ دعوتی ذمہ داری ادا کریں جو آخری پیغمبر کا امتی ہونے کی حیثیت سے لازمی طور پر ان کے اوپر عاید ہوتی ہے۔ اور جس ذمہ داری کو ادا کیے بغیر خود مسلمانوں کی اپنی نجات بھی سخت مشتبہ ہے۔

دکان دار اور گاہک میں جھگڑا ہو اور دونوں کے درمیان دوری پیدا ہو جائے تو زیادہ بڑا لوزر (کھونے والا) کون ہوگا۔ واضح ہے کہ ایسی صورت میں زیادہ بڑا لوزر دکان دار ہوگا۔ اس لیے دکاندار ہی کو یہ ذمہ داری لینی پڑتی ہے کہ وہ اپنے اور گاہک کے درمیان دوری کے اسباب پیدا نہ ہونے دے۔ اگر بالفرض دوری کا کوئی سبب پیدا ہو جائے تو وہ یک طرفہ طور پر اس کو ختم کرے۔

یہ ایک دنیوی مثال ہے۔ یہی مثال آخرت کے معاملہ کی بھی ہے۔ مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان جھگڑا اور تناؤ پیدا ہو تو زیادہ بڑا لوزر یقینی طور پر مسلمان ہوگا۔ کیوں کہ اس دوری کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے مدعو کو کھو رہا ہے۔ جب کہ مسلمان کے عقیدے کے مطابق، مدعو اس کے لیے تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ دعوت کا عمل اس کو انصار اللہ کا درجہ عطا کرتا ہے۔ دعوت کا عمل اس کو پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل کرتا ہے۔ اس لیے مسلمان ہی کو یہ ذمہ داری لینی ہے کہ وہ اپنے اور مدعو کے درمیان تناؤ پیدا نہ ہونے دے اور اگر کسی وقت تناؤ کی صورت پیدا ہو جائے تو یک طرفہ طور پر اس کو ختم کر دے۔

اصل مسئلہ

اس دنیا کا ایک خالق اور مالک ہے۔ اس نے تمام انسانوں کو ایک خاص منصوبہ کے تحت پیدا کیا ہے۔ وہ منصوبہ یہ ہے کہ انسان کو موجودہ دنیا کے حالات میں رکھ کر آزمائے۔ اور پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جنت یا جہنم میں داخل کرے (الملک ۲)

یہی وہ حقیقت ہے جس سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے تمام پیغمبر آئے (رسلاً مبشرین ومنذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل) مگر پچھلے پیغمبروں کی تعلیمات کو ان کی امتیں ضائع کرتی رہیں۔ آخر میں اسی انذار و تبشیر کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے۔ آپ جو تعلیم لائے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اصلی حالت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

قرآن میں یہی ابدی دین اپنی محفوظ حالت میں موجود ہے۔ اب انسان کی نجات کا انحصار اسی محفوظ دین کو اختیار کرنے پر ہے جس کا نام اسلام ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ (آل عمران ۸۵)

ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ مسلمانوں کی یہ منصبی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو اس حقیقت سے باخبر کریں تاکہ بھٹکی ہوئی قوموں پر نجاتِ آخرت کا دروازہ کھلے۔ اور جو لوگ معلوم ہو جانے کے باوجود خدا کی ہدایت کو اختیار نہ کریں ان پر یہ گواہی قائم ہو جائے کہ انھیں حقیقتِ واقعہ سے باخبر کر دیا گیا تھا (لیکون الرسول شھیدا علیکم وتکونوا شھداء علی الناس، الحج ۷۸) یہ ذمہ داری اتنی اہم ہے کہ اس کو ادا نہ کرنے کی صورت میں خود یہ معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے یہاں پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی قرار پائیں گے یا نہیں۔

اس حقیقت کی روشنی میں غور کیجیے تو مسلمانوں کے ساتھ اس ملک میں جو کچھ پیش آرہا ہے وہ اسی خدائی ڈیوٹی سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں نے دوسری قوموں کو خدائی پیغام سے آگاہ کرنے کا کام انجام نہیں دیا۔ اس لیے اب خدائی قانون کے مطابق ان کی تنبیہ کی جارہی ہے تاکہ وہ اپنی ذمہ داری کے بارے میں آگاہ ہو جائیں۔

جب بھی اس ملک میں کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے اور مسلمان غیر مسلموں کے ہاتھ سے مارے جاتے ہیں تو ہمیشہ اس سے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ "قال" کی زبان میں نہیں بلکہ "حال" کی زبان میں۔ وہ آواز یہ ہوتی ہے:

تم نے ہماری آخرت کو برباد کیا، ہم تمہاری دنیا کو برباد کریں گے

مسلمانوں کے پاس خدا کے محفوظ دین کی امانت ہے۔ مسلمانوں پر لازم تھا کہ وہ اس ملک کے تمام انسانوں کو اس نازک حقیقت سے باخبر کریں۔ وہ اس کو لوگوں کی قابلِ فہم زبان میں لوگوں تک پہنچائیں۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ صدیاں گزر گئیں مگر مسلمانوں کے درمیان اس مقصد کے لیے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اس حقیقت ربانی سے لوگوں کو آشنا کریں۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے یہ کیا کہ انھوں نے لوگوں سے نفرت کی۔ انھوں نے لوگوں کو حقیر سمجھا۔ وہ لوگوں کی ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر ان سے لڑائی چھیڑتے رہے۔ انھوں نے اپنے اور ان کے درمیان مصنوعی تشخصات کی دیواریں کھڑی کیں۔ اس کے نتیجہ میں لوگ مسلمانوں سے اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے دین سے بیزار ہو گئے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان وہ معتدل

فضا باقی نہ رہی جس میں دوسرے لوگ مسلمانوں کے دین پر غور کریں اور اس کے بارے میں ٹھنڈے ذہن کے ساتھ فیصلہ کر سکیں۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ تھا۔ داعی ایک کامیاب دکاندار کی طرح، یک طرفہ اخلاقیات پر کھڑا ہوتا ہے۔ داعی اپنے آپ کو اس کا پابند بناتا ہے کہ وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی تلخیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرے گا۔ مدعو اگر کوئی برا سلوک کرے تب بھی وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا، تاکہ دونوں کے درمیان کہنے اور سننے کا ماحول برباد نہ ہونے پائے۔ مگر مسلمان اس داعیانہ اخلاق پر قائم نہ رہ سکے۔

مسلمانوں نے لوگوں سے ان کی آخرت چھینی تھی، اب لوگ ان سے ان کی دنیا چھین رہے ہیں۔ لوگ اپنے ظلم سے صرف اس وقت باز آئیں گے جب کہ ہم اپنے ظلم سے باز آئیں۔ اس سے پہلے یہ سلسلہ بند ہونے والا نہیں۔

خدا کی تنبیہ

مسلمانوں کے ساتھ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہندو کا ظلم نہیں بلکہ وہ خدا کی تنبیہ ہے جو آدمی اس میں شک کرے اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے، یا کم از کم یہ کہ وہ قرآن و حدیث سے بالکل ناواقف ہے۔

مسلمانوں کے مسئلہ کی جڑ یہ ہے کہ انھوں نے خدا کے بندوں کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو خدا کے حکم کے سراسر خلاف تھا۔ مسلمان اپنے دور اقتدار میں ہندوؤں کو حقیر سمجھتے رہے۔ اور اب جب کہ ان کے پاس اقتدار نہیں ہے تو وہ ہندوؤں کو اپنا دشمن سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں ہی باتیں یکساں طور پر جرم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہندو قوم مسلمانوں کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسلمان داعی ہیں اور ہندو مدعو ہیں۔ ہندو کی نسبت سے مسلمان کے اوپر سب سے پہلا اور سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اس کو خدا کے دین کا پیغام پہنچائیں۔ اپنے اور ہندو قوم کے درمیان ناصحانہ فضا قائم کرنے کے لیے مسلمانوں پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ ہندو کی طرف سے پیش آنے والی شکایتوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کریں۔ جس طرح مسلمانوں پر دعوت فرض ہے، اسی طرح دعوت کی خاطر صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرنا بھی

ان کے اوپر فرض ہے۔

مسلمان اس ملک میں سیکڑوں سال سے ہندوؤں کے ساتھ رہ رہے ہیں مگر ان کے درمیان کوئی ایک بھی قابلِ ذکر تحریک یا قابل ذکر شخصیت نہیں ابھری جو مسلمانوں کو ان کے داعیانہ فرض کی طرف توجہ دلائے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا سب سے بڑا خلا ہے جس پر انھیں سب سے زیادہ غور کرنا چاہیے۔

مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا یہ حال ہے کہ اس کو اس کام کی اہمیت کا شعور ہی نہیں۔ بعض افراد اگر اس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں تو وہ بھی یہ کہہ کر عملاً اسے قابلِ ترک قرار دیدیتے ہیں کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرلو، اس کے بعد غیر مسلموں کی اصلاح کرنا۔ یہ دونوں ہی باتیں یکساں طور پر خدا کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں۔ پہلی روش اگر خدا اور رسول کے حکم سے سرتابی ہے تو دوسری روش کا مطلب خود اپنے آپ کو خدا اور رسول کی جگہ بٹھانا ہے۔ کیوں کہ سارے قرآن وحدیث میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرو، اور جب مسلمانوں کی اصلاح کا کام مکمل ہوجائے اس کے بعد غیر مسلموں کو خدا کے دین کی دعوت دو۔ اور جب قرآن وحدیث میں ایسا کوئی حکم بیان نہیں ہوا تو کسی کو کیا حق ہے کہ وہ احکام دین کی فہرست میں خود ساختہ طور پر اس قسم کے ایک حکم کا اضافہ کرے۔

مسلمانوں کا موجودہ مسئلہ اسی فرض سے ان کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ مسائل کا یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک غفلت کی یہ صورت حال باقی رہے۔ ان مسائل کا حل یہ نہیں ہے کہ مسلمان دوسروں کو اس کا ذمہ دار قرار دے کر ان سے لڑنا شروع کردیں۔ ان کا واحد حل یہ ہے کہ وہ اپنی کوتاہی کا اقرار کرکے اس فریضۂ دعوت کو ادا کرنا شروع کردیں جس کو انھوں نے صدیوں سے چھوڑ رکھا ہے۔ اس کے سوا ہر دوسری تدبیر ان کی سرکشی میں اضافہ کے ہم معنی ہے نہ کہ مسئلہ کے حل کی طرف پیش قدمی۔

مسلمان اگر بالفرض یہ محسوس کریں کہ وہ برادران قوم کو دعوت دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ تب بھی وہ یقینی طور پر ایک کام کرنے کی پوزیشن میں ہیں، اور وہ دعا ہے۔ "دعوت نہ دے سکو تو دعا کرو" یہ ایک لفظ میں مسلمانوں کے پروگرام کا خلاصہ ہے۔ مسلمانوں کو پورے اخلاص

کے ساتھ برادرانِ وطن کی ہدایت کا حریص بننا چاہیے۔ دعوت کے مواقع نہ ہوں تو ان کے حق
کی گہرائیوں کے ساتھ دعا کرنا چاہیے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ براہ راست دعوت کے مواقع ہما
لیے کھول دے۔

مگر مسلمانوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ برادران وطن کو خدا کے دینِ رحمت
مخاطب بنانا تو درکنار، مسلمان پچاس برس سے ان کے خلاف بددعائیں کرنے میں مشغول ہی
کے تمام اصاغر و اکابر اللّٰھم اھلك الكفرة والمشركين کی پکار بلند کیے ہوئے ہیں۔ م
کو جاننا چاہیے کہ ان کی اس قسم کی بددعا کبھی خدا کے یہاں قبول ہونے والی نہیں، خواہ مسل
ہزار سال تک اس کے الفاظ دہراتے رہیں، اور خواہ ان کے تمام اکابر و اعاظم جمع ہو کر ا
آمین کہہ رہے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی تمام بددعائیں خدا کی منشا کے بالکل خلاف ہیں۔ دوسری
کے لیے ہمارے اندر یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ ہم ان کو خدا کے دین رحمت کے سایہ میں لائیں نہ ک
رحمت میں لانے کی واقعی کوشش کیے بغیر انھیں عذاب کے گڑھے میں دھکیلنے لگیں۔ آج خدا
انتظار میں ہے کہ ہم اس کے سامنے لوگوں کی ہدایت کی دعا پیش کریں تاکہ وہ اس کو قبول کر
اقوام عالم کے لیے ہدایت کا راستہ کھولے۔ اور ہمارا حال یہ ہے ہم خدا کے سامنے لوگوں کی ہلاکہ
دعا پیش کر رہے ہیں۔ ایسی دعا خود دعا کرنے والے کے منھ پر مار دی جائے گی، وہ کبھی قبو
کا شرف حاصل کرنے والی نہیں۔

روشنی دینا دنیا کو سب سے بڑی چیز دینا ہے۔ مگر روشنی دینا سب سے بڑی قربانی ک
پر ہوتا ہے۔ دنیا کو "روشن" کرنے کے لیے اپنے آپ کو "بے روشن" کر لینا پڑتا ہے۔ اسی با
یک مغربی مفکر نے ان لفظوں میں کہا ہے کہ موم بتی دوسروں کے لیے اُجالا کرتی ہے مگر وہ خو
پ کو فنا کر لیتی ہے:

A candle lights others and consumes itself.

داعی کی مثال بھی یہی ہے۔ چنانچہ پیغمبرؐ کو قرآن میں سراج منیر کہا گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت
۔ داعی کا مقام بہت بلند ہے۔ داعی کے لیے دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمتیں مہ

۔ مگر اس خصوصی انعام کا حق دار بننے کے لیے آدمی کو خصوصی قربانی بھی دینا ہے۔ اور وہ خصوصی قربانی
ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر تمام ناخوش گواریوں کو برداشت کرے۔ وہ ہر حال میں مدعو کا خیر خواہ
ے، خواہ مدعو اس کے ساتھ ظلم اور عداوت کا معاملہ کیوں نہ کر رہا ہو۔

مدعو کے خلاف نفرت اور انتقام اور مقابلہ آرائی کا طریقہ اختیار کرنا منصوبۂ خداوندی کے
اسر خلاف ہے۔ اور جو لوگ خدا کے منصوبہ کے خلاف عمل کریں وہ خدا کی دنیا میں کس طرح
میاب ہو سکتے ہیں۔

موجودہ مسائل کو حل کرنا ہے تو اس کے سبب کو دور کیجیے۔ اور وہ سبب یہ ہے کہ اپنی داعیانہ
تاہی کو ختم کیجیے۔ اپنے اور برادرانِ وطن کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ بحال کیجیے۔ اس فریضہ
ادا کرنے کے بعد ہی مسلمان عزت کا مقام پا سکتے ہیں۔ بندوں کی نظر میں بھی اور خدا کی نظر میں بھی۔
ں کے سوا نجات اور کامیابی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

حج کا پیغام

۱۹۸۲ سے پہلے میں نے حج کے بارے میں صرف کتابوں میں پڑھا تھا۔ ۱۹۸۲ میں مجھے خود بھی حج کا فریضہ ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس مطالعہ اور تجربہ کے بعد حج کا پیغام جو میری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ ـــــــ انسان اپنے رب کی طرف دوڑے، انسان اپنے خالق کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنائے۔ حج کا عمل اگرچہ صرف چند دن کے لیے کیا جاتا ہے مگر وہ پوری زندگی کا ایک سبق ہے۔ وہ انسان کی پوری زندگی کے لیے ایک علامتی رہنما ہے۔

ایک آدمی جب اپنے وطن اور اپنے گھر بار کو چھوڑ کر حج کے سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اس کا احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ سفر کر کے اللہ کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنی دنیا سے نکال کر خدا کی دنیا میں پہنچا رہا ہے۔ وہ وہاں جا رہا ہے جہاں اللہ کا گھر (بیت اللہ) ہے۔ جہاں اللہ کے رسول اور اس کے اصحاب کے کارنامے ثبت ہیں۔ جہاں ان لوگوں کی زندگیوں کے نشانات ہیں جو اللہ کے لیے جئے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان دیدی۔ اسی کے ساتھ حاجی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس مقام کی زیارت کے لیے جا رہا ہے جس کو خدا نے اپنی آخری ہدایت کے اظہار کے لیے خصوصی طور پر چنا تھا۔

اس طرح حج کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے (یا یہ ہونا چاہیے) کہ حاجی کا ذہن خدا رخی ذہن بن جاتا ہے۔ اس کو خدا کی یاد آنے لگتی ہے۔ اس کا دماغ خدا کی باتوں سے بھر جاتا ہے۔ اب تک اس کی سوچ اگر اپنی ذات کی طرف چل رہی تھی تو اب اس کی سوچ خدا کی طرف چل پڑتی ہے۔

آدمی جس چیز کے بارے سوچے اسی کے لحاظ سے اس کی نفسیات بنتی ہے۔ آپ اپنے ذاتی مقصد کے لیے اٹھیں تو آپ کا ذہن خود اپنی ذات کے گرد گھومے گا۔ مگر جب ایک شخص خدا کی طرف روانہ ہو رہا ہو تو اس کا ذہن خدا کی طرف لگ جاتا ہے۔ اس کو خدا والی باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ خدا نے مجھے پیدا کیا۔ اسی نے مجھے ہر قسم کے مواقع دیئے۔ اس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں دنیا میں کام کروں۔ اسی کی توفیق سے یہ ممکن ہوا کہ میں وہ وسائل جمع کروں جن کی مدد سے آج میں بیت اللہ کی طرف جا رہا ہوں۔ پھر آخر کار مجھ پر وہ دن آنے والا ہے جب کہ مجھ پر موت آئے۔

اور میں خدا کے دربار میں براہِ راست حاضر کر دیا جاؤں۔

یہ چیزیں حاجی کے سفر کو مکمل معنوں میں ایک روحانی سفر بنا دیتی ہیں۔ بظاہر وہ ایک مادی سفر میں ہوتا ہے مگر اپنی اندرونی کیفیات کے اعتبار سے وہ ایک معنوی سفر کے اعلیٰ منازل طے کر رہا ہوتا ہے۔

جب حرم میں داخل ہونے کا وقت قریب آتا ہے تو تمام حاجی اپنے اپنے کپڑے اتار کر ایک نئے قسم کا "یونیفارم" پہن لیتے ہیں۔ ہر شخص ایک ہی قسم کا بغیر سلا ہوا لباس اپنے جسم کے اوپر ڈال لیتا ہے۔ یہ اس بات کی ایک عملی یاد دہانی ہے کہ حاجی اب نئی دنیا میں داخل ہو گیا ہے۔ اپنے قومی لباس کو اتار کر وہ اپنے آپ کو گویا اس طرزِ زندگی سے الگ کر لیتا ہے جو اس کے ماحول نے اسے سکھایا تھا۔ وہ اس احساس کو اپنے آپ پر طاری کر لیتا ہے جو خدا کو مطلوب ہے کہ آدمی اپنے اوپر طاری کرے۔ لاکھوں انسان اپنے اپنے رنگ کو چھوڑ کر اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔

جسم پر احرام کا ربّانی لباس ڈالنے کے بعد حاجی کی زبان بھی ربّانی کلام بولنا شروع کر دیتی ہے۔ اب حاجی لبیک لبیک کی صدا بلند کرنے لگتا ہے۔ گویا کہ خدا اس کو پکار رہا تھا اور وہ اس کی پکار پر دوڑ کر آ گیا اور کہنے لگا کہ خدایا میں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں۔ لبیک لبیک کہنے کا یہ عمل حاجی کی طرف سے برابر جاری رہتا ہے۔

"حاضر ہوں" کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مکّہ میں رہنے کے لیے حاضر ہوں۔ یہ وطن کو چھوڑ کر آنے کا کلمہ نہیں بلکہ روش کو چھوڑ کر آنے کا کلمہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تیری فرمانبرداری کے لیے حاضر ہوں۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ تو جو حکم دے اس پر میں دل و جان سے قائم ہو جاؤں۔ "لبیک" کا اقرار آدمی حج کے مقام پر کرتا ہے مگر اس کی عملی تصدیق وہاں سے لوٹ کر اس کو اپنے وطن میں کرنی پڑتی ہے جہاں کے روز و شب میں وہ اپنی زندگی گزار رہا ہے۔

مکّہ پہنچ کر آدمی پہلا کام یہ کرتا ہے کہ وہ کعبہ کا طواف کرتا ہے۔ بیت اللہ ایک وسیع مسجد ہے۔ اس کے کشادہ صحن کے بیچ میں کعبہ کی وہ تاریخی عمارت کھڑی ہوئی ہے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ حاجی بیت اللہ کے صحن میں اس کعبہ کے چاروں طرف گھومتا ہے۔ وہ سات

باراس کا چکر لگاتاہے۔ اس طرح گویا وہ تمثیلی طور پر اس بات کا عملی مظاہرہ کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ خدا کے گرد گھومے گا۔ وہ خدا کو اپنی زندگی میں مرکزی مقام دے کر اس کے گرد اپنی پوری زندگی گزارے گا۔

طواف کے بعد حاجی صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان سعی کرتا ہے۔ وہ صفا سے مروہ کی طرف جاتا ہے اور پھر مروہ سے صفا کی طرف جاتا ہے۔ اس طرح وہ تیز قدمی کے ساتھ سات بار سعی کرتا ہے۔ یہ بھی گویا تمثیل کے روپ میں ایک عہد ہے۔ یہ اپنی سرگرمیوں کو خدا کی راہ میں لگا دینے کے عزم کا اظہار ہے۔ اس عمل کے دوران بظاہر حاجی دو پہاڑیوں (صفا اور مروہ) کے درمیان سعی کرتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ سعی خدا کی راہ میں دوڑ دھوپ کا اظہار ہے، جو ایک تاریخی واقعہ کے اعادہ کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔

حج کے دوران کی سب سے اہم عبادت وہ ہے جس کو وقوف عرفہ کہا جاتا ہے۔ یعنی عرفات کے میدان میں پہنچ کر وہاں قیام کرنا۔ یہ ایک بڑا عجیب منظر ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے لوگ "خدایا میں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں" کہتے ہوئے اور ایک ہی سادہ لباس پہنے ہوئے عرفات کے وسیع اور کھلے ہوئے میدان میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ یہ گویا حشر کے میدان میں خدا کے سامنے حاضری کا ایک دنیوی نقشہ ہوتا ہے۔ عرفات میں اس طرح جمع ہونا حاجی کو میدان حشر میں جمع ہونے کا منظر یاد دلاتا ہے وہ اس کو اس سب سے بڑی حقیقت کا احساس دلاتا ہے جس کا احساس اگر واقعی معنوں میں انسان کو ہو جائے تو اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اس کے تمام معاملات اپنے آپ سنورتے چلے جائیں۔

حج کے دوران کا ایک عمل یہ ہے کہ جمرۂ عقبہ پر کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ یہ ایک علامتی عمل ہے۔ جمرہ پر کنکری مار کر حاجی اپنے اس عزم کو تازہ کرتا ہے کہ اسی طرح وہ شیطان کو مارے گا اور اس کو اپنے سے دور بھگائے گا۔ شیطان سے اس کا رشتہ دوستی کا رشتہ نہیں بلکہ دشمنی اور مقابلہ کا رشتہ ہے۔ اس علامتی عمل کو آدمی اگر حقیقی عمل بنالے، وہ واقعۃً شیطان کو اپنے سے دور بھگائے تو اس کے اندر سے تمام خرابیاں نکل جائیں۔ کیوں کہ ہر قسم کی خرابیاں شیطان ہی کے سکھانے سے آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے بعد حاجی اللہ کی راہ میں جانور قربان کرتا ہے۔ یہ قربانی بھی ایک تمثیلی عمل ہے۔ چنانچہ اس کو قرآن میں شعائر اللہ (علاماتِ خداوندی) میں سے شمار کیا گیا ہے۔ جانور کی قربانی خود اپنی قربانی

کی تمثیل ہے۔ جانور کو قربان کرکے حاجی عمل کی زبان میں اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ خدا کی راہ میں سب کچھ دینے کے لیے تیار رہے۔ حتی کہ اگر وہ وقت آجائے کہ اس کو اپنی جان خدا کی راہ میں دے دینا ہو تو وہ اپنی جان بھی خدا کی راہ میں دیدے گا۔ وہ اپنی آخری قیمتی پونجی بھی اللہ کے حوالے کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

یہ تقریر ۱۸ جولائی ۱۹۸۰ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

سفرِ آخرت

جولائی ۱۹۸۷ کی ۲۱ تاریخ تھی اور دن کے ساڑھے دس بجے کا وقت۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی "میں حیدر آباد سے حبیب بھائی بول رہا ہوں"۔ السلام علیکم اور وعلیکم السلام کے تبادلہ کے بعد دوسری آواز غم ناک لہجہ میں یہ سنائی دی "میرے والد کا انتقال ہوگیا"۔

آواز جانی پہچانی تھی۔ واضح طور پر یہ حبیب بھائی تھے جو ٹیلی فون پر بول رہے تھے۔ "میرے والد" کے لفظ سے بھی بلا اشتباہ بابو بھائی (غلام محمد صاحب) مراد تھے۔ مگر اس اچانک خبر کو سننے کے لیے میرا ذہن تیار نہ تھا۔ میں نے دوبارہ کہا "کیا فرمایا، کیا بابو بھائی" انھوں نے کہا کہ ہاں بابو بھائی۔ میں نے کئی بار اپنے سوال کو دہرایا اور ہر بار یہی جواب ملا کہ ہاں، بابو بھائی کا انتقال ہوگیا۔ آخر مجھے ماننا پڑا کہ وہ بزرگ اب اس دنیا میں نہیں رہے جو اسلامی مرکز کے مشن میں اول روز سے میرے قریبی رفیق بنے ہوئے تھے۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۵۳ سال تھی۔ سالِ پیدائش ۱۹۳۴ ہے۔

بابو بھائی کو پہلی بار میں نے بھوپال میں ہونے والے اسلامی مرکز کے اجتماع میں دیکھا تھا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۸۲ کو جب میں اجتماع گاہ میں پہنچا تو ایک صاحب ملاقات کے لیے میری طرف بڑھے۔ بھرا ہوا جسم، سادہ لباس، چہرہ پر ہلکی مسکراہٹ، بولنے سے زیادہ سننا، کہنے سے زیادہ کرنا، پورا وجود سنجیدگی کی تصویر بنا ہوا۔ یہ تھا ان کا حلیہ۔ غائبانہ طور پر میں ان کو پہلے ہی جان چکا تھا۔ اب ملاقات کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ میری ذہنی تصویر سے کہیں زیادہ عظیم ہیں۔

اس کے بعد بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے کئی بار دہلی کا سفر کیا۔ میں خود جب بھی حیدر آباد جاتا تو انھیں کے یہاں ٹھہرتا۔ وہ بہت کم بولتے تھے مگر بہت زیادہ سمجھتے تھے۔ وہ بہت زیادہ حساس تھے مگر ان کی حساسیت پوری طرح ان کے شعوری فیصلہ کے تابع تھی۔ ۲۱ جولائی کی شام کو میں حیدر آباد پہونچا تو ان کے صاحبزادے حبیب بھائی صاحب مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ حبیب بھائی کی زبان سے بار بار اس قسم کے

الفاظ نکل رہے تھے : آپ کا ایک اچھا پروانہ چلا گیا، آپ کا ایک اچھا عاشق چلا گیا ۔۔۔۔

مولانا اکبرالدین قاسمی نے بتایا کہ بابو بھائی نے مرکز کے لیے کبھی کسی چیز کا انکار نہیں کیا۔ اسلامی مرکز کے ہر خرچ کو اپنی جیب سے دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ بلکہ انھیں یہ شکایت رہتی کہ آپ لوگ " خرچ " کا کوئی منصوبہ بنا کر نہیں لاتے۔ دو کتابیں (سچا راستہ اور دینی تعلیم) زبان میں ترجمہ کر کے شائع کی گئیں تو اس کا پورا خرچ بابو بھائی نے ادا کیا۔

بابو بھائی حیدرآباد میں اسلامی مرکز کے مشن کو پھیلانے کے لیے مستقل طور پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے رہتے تھے۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ ایک بار بھی انھوں نے مجھ سے کہا ہو کہ میں نے فلاں مد میں اتنی رقم دی ہے۔ مجھے جب بھی ان کے انفاق کے متعلق معلوم ہوا تو حیدرآباد کے دوسرے احباب کے ذریعہ معلوم ہوا۔ حیدرآباد کے ساتھیوں نے بتایا کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کام کا نقشہ آپ لوگ بنائیے، پیسہ مجھ سے لیجئے۔ وہ مختلف لوگوں کے نام اپنی طرف سے الر جاری کرتے رہتے تھے یا کتاب بھیجتے رہتے تھے مگر کبھی اپنی زبان سے انھوں نے یہ نہیں کہا فلاں کی طرف سے رقم میں نے ادا کی ہے۔

علم النفس کی اصطلاح کے مطابق وہ پورے معنی میں ایک (Balanced personality) متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ حیدرآباد کے ایک تاجر شری اُتم بھائی نے کہا کہ میرے ساتھ ان کا ۲۰ سال سے کاروباری تعلق تھا۔ مگر کبھی اختلاف یا شکایت کی نوبت نہیں آئی۔ ان کے کارخانہ کے ایک کارکن صالح عمودی نے کہا کہ ہم لوگوں کے لیے وہ باپ کے برابر تھے۔ ایسا مشکل سے ملے گا، بلکہ ملے گا ہی نہیں۔

حبیب بھائی نے بتایا کہ وہ ہمیشہ معاملات کی اصل جڑ کو دیکھتے تھے۔ ایک بار کارخانہ میں آگ لگی تو سب سے پہلے انھوں نے سوچنا شروع کیا کہ آگ کیسے لگی۔ جب معلوم ہوا کہ یہ آگ تار سے لگی ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تار پرانے ہو گیے ہیں تو انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ سارے تار بدلوا دیئے۔ وہ بڑے نقصان کے مقابلہ میں چھوٹے نقصان کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ یہ "بڑا نقصان ایک بار پیش آتا ہے اور چھوٹا نقصان بار بار ہوتا ہے"۔

ایک مرتبہ ان کے کارخانہ کے ورکروں نے اسٹرائک کر دی۔ کیس عدالت تک پہونچا

بابو بھائی کو کامیابی ہوئی اور کئی ورکر، یونین کے صدر اور سکریٹری سمیت نکال دیئے گیے۔ کچھ دن کے بعد بابو بھائی کو معلوم ہوا کہ وہ لوگ بے روزگار پھر رہے ہیں تو ان کو بلایا اور انھیں دوبارہ اپنے کارخانہ میں رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ لوگ اتنا متاثر ہوئے کہ آئندہ وہ کارخانہ کے بہترین ورکر بن گیے۔

بابو بھائی اپنے ظاہر کے اعتبار سے ایک تاجر تھے مگر وہ اپنے اندرونی احساس کے اعتبار سے متوکل علی اللہ تھے۔ وہ اپنی اولاد کو ہمیشہ یہ تلقین کیا کرتے تھے کہ زیادہ کی حرص میں نہ پڑو، بلکہ قناعت کا طریقہ اختیار کرو۔ ایک بار جب ان کے کارخانہ میں آگ لگ گئی تو انھوں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ فائر بریگیڈ کو ٹیلی فون کر دو اور خود تم لوگ جو کر سکتے ہو کرو۔ یہ کہہ کر مسجد میں نماز کے لیے چلے گیے اور پر سکون طور پر نماز ادا کر کے واپس آئے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ وہ حج کے سفر پر جا رہے تھے۔ آخر میں انھیں محسوس ہوا کہ ان کے پاس پیسے کچھ کم ہیں۔ وہ بابو بھائی کے پاس آئے اور ان سے دو ہزار روپئے قرض کے لیے کہا۔ بابو بھائی زبان سے کچھ نہیں بولے۔ کچھ دیر کے بعد وہ گھر کے اندر گیے اور روپیوں کی ایک گڈی لا کر ان کے ہاتھ میں دیدی۔ انھوں نے دیکھا تو وہ تین ہزار روپے تھے۔ انھوں نے بابو بھائی سے کہا کہ میں نے تو صرف دو ہزار روپئے کے لیے کہا تھا۔ بابو بھائی نے جواب دیا: آپ لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔ رکھ لیجیے، شاید ضرورت پیش آجائے۔ بابو بھائی کے کچھ مسلمان کاریگروں نے رمضان کے آخری عشرہ میں روزہ چھوڑ دیا۔ بابو بھائی نے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ روزہ اور ڈیوٹی دونوں ساتھ ساتھ نہیں ہو پاتی۔ بابو بھائی نے ان لوگوں کو دس دن کی باتنخواہ رخصت دیدی۔ انھوں نے کہا کہ روزہ مت چھوڑو، خواہ کام چھوٹ جائے۔

انتقال سے صرف دو ماہ پہلے بابو بھائی مکہ گیے اور عمرہ کر کے واپس آئے۔ اللہ تعالیٰ کو یقیناً معلوم تھا کہ " ۲۱ جولائی " کو ان کی روح قبض کی جانے والی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آخرت کے مقدس ترین مقام کی طرف لے جانے سے پہلے انھیں دنیا کے مقدس ترین مقام کی زیارت کرا دے۔

انتقال کے دن ۲۱ جولائی کو وہ فجر کے وقت بالکل ٹھیک حالت میں تھے۔ دن نکلنے کے

بعد اشراق کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو ایک رکعت کے بعد مزید نماز ادا نہ کر سکے۔ عین حال
میں دل کا شدید دورہ پڑا۔ اس کے دو گھنٹہ بعد انتقال ہوگیا۔ کیسی عجیب تھی ان کی زندگی
عجیب تھی ان کی موت۔

بابو بھائی مجھ سے عمر میں کم تھے اور صحت میں مجھ سے بہتر۔ اس لیے شعوری یا غیر شع
طور پر میرا خیال یہ تھا کہ پہلے میری باری آئے گی اور اس کے بعد بابو بھائی کی۔ مگر موت کم
زیادہ عمر کا فرق نہیں جانتی۔ وہ تندرست اور کمزور کے درمیان تمیز نہیں کرتی۔ وہ خود اپ
کے مطابق آتی ہے نہ کہ ہمارے اپنے اندازہ کے مطابق۔ اس طرح موت گویا ہر ایک کو یہ
دے رہی ہے کہ تیار رہو، ہر ایک جاگتے رہو۔ کیوں کہ کچھ نہیں معلوم کب کس کی باری آ

آخری دن ان کے مطالعہ میں ایک کتاب تھی جو آخرت کے موضوع پر تھی۔ "بک مار
طور پر اس کے جس صفحہ پر نشان رکھا ہوا تھا وہ صفحہ وہ تھا جس میں اصحاب الجنۃ کا ذکر تھا۔
اللہ تعالیٰ انھیں جس آخری منزل کی طرف لے جا رہے تھے، یہ غالباً اس کی پیشگی خبر تھی جو انھیں
دنیا میں دی جا رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں مرحوم کے درجات بلند کرے۔ اور ان کو ج
اعلیٰ مقامات میں جگہ عطا فرمائے۔

موت کی خبر سننے کے بعد حیدر آباد سے چند بار ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد می
جانے کے لیے باہر نکلا۔ اس وقت دہلی میں گرمی اتنی شدید تھی گویا آسمان سے آگ برس ر
گویا انسان کو آنے والی جہنم سے متعارف کرایا جا رہا ہو۔ محکمہ موسمیات کی اطلاع کے مط
دہلی میں اس سال تقریباً سو سال کا ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ کیوں کہ سو سال سے کبھی ایسا
ہوا کہ جولائی کا مہینہ گزر جائے اور مانسونی بارش نہ ہو۔

ایک طرف موسم کی یہ شدت اور دوسری طرف بابو بھائی جیسے نادر انسان کی موت
میرا یہ حال ہوا کہ میں نے سوچا، اگر آسمان سے آواز آئے کہ آخری نیک انسان دنیا سے اٹھا
اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ قیامت کا طوفان لوگوں کے اوپر ٹوٹ پڑے، تو میں سمجھوں گا
آخری نیک انسان شاید بابو بھائی تھے اور ان کے اٹھ جانے کے بعد اب دنیا کے اوپر خد
آخری فیصلہ کے ظہور میں کچھ دیر نہیں۔

ایمان

ایمان کسی تقلیدی عقیدہ کا نام نہیں۔ ایمان ایک زندہ شعور کا نام ہے۔ ایمان کے لفظی معنی اقرار کے ہیں۔ آدمی جب اللہ کو اس کی تمام صفات کمال کے ساتھ مانے اور اس کی تمام باتوں (وحی آخرت، ملائکہ وغیرہ) پر کامل یقین کر کے ان کی تصدیق کرے، وہ اللہ کے فیصلوں پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہو جائے تو اسی کا نام ایمان ہے۔

ان چیزوں کو ماننے کی ایک شکل یہ ہے کہ ان کو باپ دادا کی تقلید کے طور پر مان لیا جائے مگر اس قسم کا تقلیدی ایمان وہ ایمان نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہو۔ اس قسم کا ماننا بالکل بے روح ماننا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے ہاتھ میں چھنگلیا۔ چھنگلیا بظاہر انگلی کی مانند ہوتی ہے۔ مگر آدمی کے ہاتھ میں چھنگلیا کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی فنکشن نہیں ہوتا۔ وہ ہاتھ کے ایک طرف بے کار لٹکی رہتی ہے۔ کچھ لوگ اس کو چھوڑے رکھتے ہیں اور کچھ لوگ اس کا آپریشن کرا دیتے ہیں۔

یہی معاملہ تقلیدی ایمان کا ہے۔ تقلیدی ایمان آدمی کی زندگی میں ایک بے اثر عقیدہ کے طور پر شامل رہتا ہے۔ وہ اس کی زندگی کا حاکم نہیں ہوتا۔ آدمی کی زندگی میں اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی الگ رہتی ہے اور اس کا ایمان الگ۔

حقیقی ایمان ایک قسم کا شعوری سفر ہے، وہ اس کا نام ہے کہ آدمی نہ دکھائی دینے والے خدا کو دیکھ لے۔ وہ غیب میں چھپی ہوئی حقیقت کا مشاہدہ کرلے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایمان ایک دریافت ہے۔ ایمان ایک ڈسکوری ہے، سب سے بڑی ڈسکوری۔ جو چیز آدمی کی زندگی میں بطور ڈسکوری کے داخل ہو اس کا داخل ہونا محض ایک سادہ چیز کا داخل ہونا نہیں ہوتا۔ وہ ایک

انقلاب ہوتا ہے ۔ وہ ایسا ہوتا ہے جیسے پُرسکون زمین میں زلزلہ آجائے ۔ یا ٹھہرے ہوئے
میں طوفان برپا ہوجائے ۔

اس قسم کا ایمان جب کسی کو ملے تو وہ اس کی سوچ کو بدل دیتا ہے ۔ وہ اس کے مزا
دیتا ہے ۔ وہ اس کی سرگرمیوں کے رخ کو پھیر کر ایک طرف سے دوسری طرف کر دیتا
اس کے بعد آدمی کے اندر ایک نئی شخصیت ابھرتی ہے ۔ اس کے بعد اس کے اندر سے ایک
انسان ظہور کرتا ہے ۔ اس کے بعد آدمی وہ نہیں رہتا جو وہ پہلے تھا ۔ اپنے قول اور عمل دونوں
سے وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے ۔

اس کی وضاحت کے لیے ہم قرآن سے کچھ واقعاتی مثالیں پیش کریں گے ۔

ایمان نیا انسان بناتا ہے

ایک مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کے جادوگروں کی ہے ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا خدائی معجزہ سے بہت بڑا سانپ بن جاتا تھا ۔
بادشاہ فرعون نے اس کے توڑ کے لیے اپنے ملک کے جادوگروں کو جمع کیا ۔ جادوگر جب
تو انہوں نے فرعون سے خوشامدانہ انداز میں کہا : اگر ہم موسیٰ پر فتح پالیں تو کیا ہمیں بادشاہ
طرف سے کچھ انعام دیا جائے گا ۔ (أإنّ لنا لأجراً ان كنا نحن الغالبين) (الشعراء

جادوگروں کا یہ حال اظہار حقیقت سے پہلے تھا ۔ اس کے بعد جب کھلے میدان میں ا
حضرت موسیٰؑ سے ہوا اور جادوگروں نے دیکھا کہ ان کے سانپوں کو حضرت موسیٰؑ کے عصا
نگل لیا ہے تو جادوگروں پر کھل گیا کہ حضرت موسیٰؑ خدا کے پیغمبر ہیں ۔ اتنا بڑا واقعہ خدا
ہی کے ذریعہ ظاہر ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ جادوگر اسی وقت خدا کے سامنے سجدے میں گر
کہہ پڑے کہ آمنا برب العالمین (ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے)

جادوگروں کا حضرت موسیٰؑ کے دین کو قبول کر لینا فرعون کے لیے ذاتی شکست تھی
نے بگڑ کر کہا کہ میں تم کو سخت ترین سزا دوں گا ۔ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسر
کے پاؤں کٹواؤں گا ۔ اور پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا ۔ جادوگروں نے یہ سن کر کہا
فاقض ما انت قاض انما تقضى هٰذه الحياة الدنيا (جو کچھ تجھے کرنا ہے کر

تو جو کچھ کرسکتا ہے موجودہ دنیا کی زندگی میں ہی کرسکتا ہے۔ (طٰہٰ ۷۲)

اس مثال میں صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ ایمان کے بعد آدمی کے اندر کس طرح کا انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ کس طرح اس کے اندر سے ایک نیا انسان ظہور (Emerge) کرتا ہے۔ وہی جادوگر جو چند لمحہ پہلے بادشاہ کی عظمت سے دبے ہوئے تھے، اور اس کی خوشامد کررہے تھے، ایمانی انقلاب کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ وہ فرعون کی سخت ترین سزا کی دھمکی سن کر بھی متاثر نہیں ہوئے۔ باہر سے اگرچہ وہ پہلے ہی جیسے دکھائی دیتے تھے۔ مگر اب ان کے اندر ایک نیا انسان پیدا ہوچکا تھا۔ ایک ایسا انسان جو صرف خدا سے ڈرتا تھا، ایک ایسا انسان جس کی نظر میں آخرت کے سوا ہر چیز بے وقعت ہوچکی تھی۔

ایمان معرفت ہے

قرآن میں ایمان کو معرفت کہا گیا ہے (مما عرفوا من الحق ، المائدہ ۸۳) اسی طرح حدیث میں ایمان کو علم کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ جس شخص نے جان لیا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ جنت میں داخل ہوگا (من عَلِمَ انہ لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ ، مسلم) معرفت اور علم کسی چیز کو شعوری طور پر پالنے کا نام ہے۔ جب آدمی کسی چیز کو شعوری طور پر پائے تو ایسا پانا محض بے اثر عقیدہ یا جامد نظریہ نہیں ہوتا۔ وہ آدمی کے پورے وجود میں سما جاتا ہے۔ وہ آدمی کی پوری شخصیت کو ہلا دیتا ہے۔

اس قسم کے ایمان کا ایک واقعہ قرآن میں ساتویں پارہ کے شروع میں مذکور ہے۔ نجران کے علاقہ سے دس عیسائیوں کا ایک وفد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے مدینہ آیا۔ آپ نے ان کو قرآن کے کچھ حصے سنائے۔ اس کو سن کر ان کے ذہن کی گرہیں کھل گئیں۔ انہوں نے خدا کو پہچان لیا۔ ان پر یہ منکشف ہوا کہ قرآن خدا کی کتاب ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اس انکشافِ حقیقت کے بعد ان کا جو حال ہوا وہ قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوا ہے: اور جب انہوں نے سنا اس کلام کو جو رسول کی طرف اترا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں، اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے، تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے (واذا سمعوا

ما انزل الی الرسول تری اعینهم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا آمنا فاکتبنا مع الشاھدین ، المائدہ ۸۳)

مذکورہ اہل ایمان کو جب ایمان کا شعور ملا تو وہ بے اختیار رو پڑے ۔ رونا کوئی سادہ واقعہ نہیں ۔ یہ اندرونی طوفان کا ایک خارجی اظہار ہے ۔ جب حقیقت کا ادراک دل کے تار کو چھیڑتا ہے ، جب ایک عظیم انکشاف سے آدمی کا سینہ پھٹ جاتا ہے ، جب خدا اور بندہ کے اتصال سے بندہ کی تاریک دنیا روشن ہو جاتی ہے ، اس وقت انسان کے دل میں ہیجان خیز جذبات اٹھتے ہیں ۔ یہ جذبات اپنے نکاس کے لیے جو راستہ پاتے ہیں ان میں سے ایک آنکھوں کا راستہ ہے ۔ آنکھ کے راستہ سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ کر اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ آدمی نے قربتِ خداوندی کا تجربہ کیا ہے ۔ آدمی کو اس نعمتِ ربانی کا حصہ ملا ہے جس کو ایمان کہتے ہیں ۔

ایمان خدا کا خوف پیدا کرتا ہے

مفسر ابن کثیر نے ایمان کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الخشیۃ خلاصۃ الایمان (خدا کا خوف ایمان کا خلاصہ ہے) جلد اول ، صفحہ ۴۱

یہ تفسیر بہت بامعنیٰ ہے ۔ آدمی جس چیز کا مومن ہو اسی کے لحاظ سے اس کے اندر کیفیت پیدا ہوتی ہے ۔ مثلاً آپ چیونٹی کی موجودگی کا اقرار کریں تو اس وقت آپ کے اندر جو کیفیت پیدا ہو گی وہ اس سے بالکل مختلف ہو گی جب کہ آپ ایک شیر کی موجودگی کا اقرار کر رہے ہوں ۔ چیونٹی کی موجودگی آدمی کے اندر کوئی جاگ پیدا نہیں کرتی ، مگر شیر کی موجودگی کو محسوس کر کے آدمی سر سے پاؤں تک جاگ اٹھتا ہے ۔

میں ایک مرتبہ ایک چڑیا گھر میں تھا ۔ اچانک میں نے دیکھا کہ تمام زائرین تیزی سے باہر کے گیٹ کی طرف بھاگ رہے ہیں ۔ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ چڑیا گھر میں یہ افواہ اڑ گئی تھی کہ ایک شیر کٹہرے سے باہر آگیا ہے ۔ ابھی کسی نے شیر کو دیکھا نہیں تھا ۔ صرف اس کی خبر سے لوگوں کا یہ حال ہو گیا ۔ جب شیر کی موجودگی کو محسوس کرنے پر انسان کا یہ حال ہوتا ہے تو اس شخص کا کیا حال ہو گا جو شیر کے خالق کی موجودگی کو محسوس کر لے ۔ جس کو خالق کائنات کی موجودگی Presence کا ادراک ہو جائے ۔

ایمان اگر زندہ ایمان ہو ۔ اگر وہ خدا کی ذات پر یقین کے ہم معنیٰ بن گیا ہو تو ایسا ایمان

آدمی کو لرزا دیتا ہے ۔ خدا کی ہیبت سے اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی آواز پست ہو جاتی ہے ۔ اس کے چلتے ہوئے قدم رُک جاتے ہیں ۔ اس کی زندگی ایسی پابند زندگی بن جاتی ہے جیسے خدا اس کے رات اور دن کا نگراں بن گیا ہو ۔

بعض مفسرین نے مومنین کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ وہ غیب پر اس طرح یقین رکھتے ہیں جس طرح وہ مشاہدہ پر یقین رکھتے ہیں ۔ (یومنون بالغیب کما یومنون بالشہادة) تفسیر ابن کثیر جلد اول ۔ صفحہ ۴۱ ۔

گویا قیامت میں خدا کو دیکھ کر لوگوں کا جو حال ہوگا وہ حال مومن کا بغیر دیکھے ہوئے اسی دنیا میں ہو جاتا ہے ۔ غیر مومن قیامت میں خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑیں گے ، مومن اسی آج کی دنیا میں خدا کے سامنے ڈھ پڑتا ہے ۔ قیامت میں خدا کے فرشتے لوگوں کو عدالت الٰہی کی ترازو میں کھڑا کریں گے مومن اسی دنیا میں اپنے آپ کو عدالت الٰہی کی ترازو میں کھڑا کر لیتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ غیر مومن پر قیامت میں گزرے گا وہ مومن پر اسی دنیا میں گزر جاتا ہے ۔ ۔ اسی زلزلہ خیز تجربہ کا نام ایمان ہے ۔

ایمان ایک اضافہ پذیر حقیقت ہے

سورہ ابراہیم میں ایمان اور مومن کو درخت سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ ارشاد ہوا ہے کہ کلمۂ ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ستھرا درخت ۔ اس کی جڑ زمین میں قائم ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں (الم ترکیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء)

درخت کی ایک انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ برابر بڑھتا رہتا ہے ۔ بیج سے اکھوا ، اکھوا سے تنہ ، تنہ سے شاخیں ، شاخوں سے پتیاں اور پھر پورا درخت ۔ یہ خاص صفت جو درخت کو حاصل ہے یہی مومن کی بھی صفت اس دنیا میں ہوتی ہے ۔ وہ ہر آن بڑھتا رہتا ہے ۔ وہ بیج سے شروع ہو کر بڑھتے بڑھتے سرسبز درخت بن جاتا ہے ۔

ایمان کس طرح بڑھتا ہے ۔ اس کے بڑھنے کی صورت بھی وہی ہوتی ہے جو درخت کے بڑھنے کی صورت ہے ۔ درخت زمین اور فضا سے معدنیات گیسیں اور پانی لے کر اپنے وجود کو بڑھاتا

رہتا ہے۔ حتیٰ کہ فضا کی مضر گیس (کاربن) بھی اس کے غذائی کارخانہ میں داخل ہو کر اس کے وجود کا جزء بن جاتی ہے اور وہ مفید گیس (آکسیجن) کی صورت میں باہر نکلتی ہے۔ یہی مومن کا حال اس دنیا میں ہوتا ہے۔

مومن اپنے ماحول میں پیش آنے والے ہر واقعہ اور ہر مشاہدہ کو اپنے لیے غذا بناتا رہتا ہے۔ اس پر مصیبت پڑتی ہے تو وہ فریاد کرنے کے بجائے صبر کرتا ہے۔ گویا مصیبت اس کے ایمانی کارخانہ میں داخل ہو کر مثبت نفسیات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح مومن کو کامیابی حاصل ہوتی ہے تو وہ فخر نہیں کرتا بلکہ اس کو خدا کی طرف سے سمجھ کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ گویا کہ جو چیز عام انسانوں کو خدا سے غفلت اور سرکشی کی طرف لے جاتی ہے وہ مومن کو خدا سے قریب کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مومن کو اگر کسی سے شکایت ہوتی ہے تو وہ اس کو معاف کر دیتا ہے۔ گویا جو واقعہ عام انسان کو انتقام کی آگ میں جلانے کا باعث بنتا ہے۔ وہ مومن کو خدا کی رحمت کے سائے میں پہنچانے کا سبب بن جاتا ہے۔

اسی طرح مومن جب زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی چیزوں کو دیکھتا ہے تو اس کے ذہنی خانہ میں داخل ہو کر یہ سب چیزیں خدا کی نشانیاں بن جاتی ہیں وہ مخلوقات کے آئینہ میں خالق کو دیکھ لیتا ہے۔ گویا جو مشاہدہ عام انسان کے لیے صرف مادی فائدہ یا Exploitation کا ذہن پیدا کرتا ہے وہ مومن کے ایمانی کارخانہ میں خدا کی یاد کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی طرح ہر معاملہ اور ہر مشاہدہ مومن کو ربانی غذا دیتا رہتا ہے اور اس کے ایمان و یقین میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے۔

ایمان ہر موقع پر اپنا پھل دیتا ہے

سورۂ ابراہیم کی مذکورہ آیت میں ایمان کو ستھرے درخت سے مثال دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ ہر موسم میں اپنا پھل دیتا ہے۔ (تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا)

پھل دار درخت کا یہ قاعدہ ہے کہ جب اس کا موسم آتا ہے تو اس کی شاخوں پر پھل نکلنے لگتے ہیں۔ مومن کا حال بھی اخلاق اور عمل کے دائرہ میں یہی ہوتا ہے۔ مومن کا زندہ شعور، اس کا خدا کو حاضر و ناظر جاننا، اس کا یہ یقین کہ مرنے کے بعد خدا کی عدالت میں کھڑا ہونا ہے۔ یہ چیزیں

مومن کو اتنا احساس اور اتنا ذمہ دار بنا دیتی ہیں کہ وہ ہر موقع پر وہی کرتا ہے جو اس کے ایمان کا تقاضا ہو۔ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو اس سے وہی اخلاق اور کردار ظاہر ہوتا ہے جو خداوند ذوالجلال پر زندہ یقین رکھنے والے آدمی سے ظاہر ہونا چاہیے۔

جب اس کے سامنے کوئی سچائی ظاہر ہوتی ہے تو وہ کسی تحفظ کے بغیر کھلے دل سے اس کا اقرار کر لیتا ہے۔ جب خدا کی عبادت کی پکار بلند ہوتی ہے تو وہ ہر دوسرے کام کو چھوڑ کر خدا کے آگے سجدے میں گر پڑتا ہے۔ جب اس کے مال میں سے خدا کا حصہ مانگا جاتا ہے تو وہ بلا تاخیر اس کو ادا کر دیتا ہے۔ جب کوئی حق دار اس سے اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ پورے انصاف کے ساتھ اس کو اس کا حق پہونچا دیتا ہے۔ جب وہ کسی سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے تو اس کو پورا کیے بغیر اس کو چین نہیں آتا۔

اس طرح مومن کا ایمان ہر موقع پر ایک ربانی لوزبن کر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں ربانی کردار کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ وہ ہر موقع پر وہی کرتا ہے جو اس کو کرنا چاہیے۔ اور وہ نہیں کرتا جو اس کو نہیں کرنا چاہیے۔

ایمان ایک فکری انقلاب

ایمان کوئی جامد عقیدہ نہیں۔ ایمان ایک متحرک فکری سیلاب ہے۔ ایمان ایک ربانی چشمہ ہے جو کسی بندۂ خدا کے سینہ میں بہہ پڑتا ہے۔ ایمان یہ ہے کہ ایمان آدمی کو اس طرح ملے کہ وہی اس اس کی زندگی بن جائے۔ وہ ایسی روشنی ہو جس سے اس کا پورا وجود جگمگا اٹھے۔ وہ ایسا رنگ ہو جس میں آدمی کے سارے معاملات رنگے ہوئے نظر آئیں۔

ایمان خدا کی موجودگی کو پا لینے کا نام ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی خدا کی عظمتوں میں گم ہو جائے، وہ احساس خداوندی میں نہا اٹھے۔ ایمان آدمی کے جذبات کا حد خداوندی میں ڈھل جانا ہے۔ یہ دنیا میں رہتے ہوئے خدا تعالیٰ تک پہنچ جانا ہے۔

ایمان ایک بھونچال ہے جو خدا کی معرفت سے آدمی کے اندر ابل پڑتا ہے۔ ایمان ایک دریا ہے جو خدا کے فیضان کو پا کر آدمی کے دل و دماغ میں جاری ہو جاتا ہے۔ ایمان خدا کو پا لینا ہے، اور خدا کو پانا سب کچھ کو پا لینا ہے۔ پھر کیا چیز ہے جو اس کے بعد آدمی کو نہ ملے۔

حصّہ دوم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

قولوا امنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الی ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیون من ربھم لانفرق بین احدٍ منھم ونحن لہ مسلمون۔ فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ فقد اھتدوا وان تولّوا فانما ھم فی شقاق فسیکفیکھم اللّٰہ وھو السمیع العلیم (البقرۃ ۱۳۶-۱۳۷)

کہدو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس کلام پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب پر اتارا گیا۔ اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو اللہ کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔ پس اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو انہوں نے ہدایت پائی۔ اور اگر وہ پھر جائیں تو وہی ضد پر ہیں۔ اللہ تمہاری طرف سے ان کے لیے کافی ہو جائے گا۔ اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

مثل صحابہ ایمان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ میں اور اطراف مدینہ میں یہود آباد تھے۔ یہ آیت انہیں یہودیوں کے ذیل میں آئی ہے۔ یہ یہودی ان تاریخی نبیوں کو مانتے تھے جو پچھلے زمانہ میں ان کی نسل میں آئے اور جن کا ذکر ان کی کتاب بائبل میں موجود ہے۔ مگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا انکار کرتے تھے جو ان یہودیوں کے اپنے زمانہ میں عرب میں پیدا ہوئے۔ اس کے برعکس صحابہ کرام کا حال یہ تھا کہ وہ تمام پیغمبروں کا اقرار کرتے تھے۔ اس پر کہا گیا کہ یہودی اگر صحابہ کی طرح مومن بنیں، وہ پچھلے پیغمبروں کو ماننے کے ساتھ وقت کے پیغمبر کو بھی مانیں تو وہ خدا کی نظر میں مومن ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان دو قسم کا ہے۔ ایک مثل یہود ایمان۔ دوسرا مثل صحابہ ایمان۔

اللہ تعالیٰ کو مثل صحابہ ایمان مطلوب ہے۔ اس کو مثل یہود ایمان مطلوب نہیں۔
اب دیکھئے کہ دونوں میں فرق کیا تھا۔ وہ فرق صرف فہرست کے مکمل ہونے یا نامکمل ہونے کا نہ تھا۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ صحابہ کی فہرستِ انبیاء مکمل ہے اور یہود کی فہرست انبیاء نامکمل۔ یہ فرق حقیقت کا فرق تھا نہ کہ سادہ معنوں میں محض ظاہری فہرست کا۔
یہود حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ کو مانتے تھے۔ ان پیغمبروں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ گزرے ہوئے دور کے پیغمبر تھے۔ یہود کی قومی روایات میں ان کو عظمت کا مقام مل چکا تھا۔ ہر یہودی جو پیدا ہوتا وہ اول دن سے ان پیغمبروں کا نام اس حیثیت سے سنتا کہ وہ اس کی قوم کے عظیم بزرگوں میں سے تھے۔ وہ ان کو ابتدا ہی سے عظیم پیغمبر کی حیثیت سے جانتا تھا۔
اس کے برعکس محمد بن عبد اللہ کا معاملہ یہ تھا کہ مدینہ کے یہود پہلی بار ان سے متعارف ہوئے تو اس طرح متعارف ہوئے کہ وہ اپنے وطن سے نکال دیئے گئے ہیں اور پناہ گزیں کے طور پر مدینہ پہونچے ہیں۔ پچھلے پیغمبروں کے نام کے ساتھ عظمت کی پُراسرار داستانیں شامل تھیں جب کہ محمد بن عبد اللہ ان کو بس ایک عام انسان کے روپ میں دکھائی دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کا پیغمبر ہونا یہود کی سمجھ میں آیا اور محمد بن عبد اللہ کا پیغمبر ہونا ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ آپ کے بارے میں یہود کا پہلا تاثر ہی ان کے لیے آخری تاثر بن گیا۔
صحابہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے بھی اگرچہ آپ کو پہلی بار اسی روپ میں دیکھا جس روپ میں یہود نے آپ کو دیکھا تھا مگر صحابہ اس ظاہری مشاہدہ پر نہیں رکے بلکہ انہوں نے آپ کو اندر تک دیکھنے کی کوشش کی۔ یہود آپ کو ظاہر کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے، صحابہ نے آپ کو حقیقت کے اعتبار سے دیکھا۔ یہود آپ کو آپ کے حال کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے، صحابہ نے آپ کو آپ کے مستقبل کے اعتبار سے دیکھا۔ یہود آپ کو محمد بن عبد اللہ کے روپ میں دیکھ رہے تھے صحابہ نے آپ کو محمد رسول اللہ کے روپ میں دیکھا۔
گویا کہ صحابہ نے جوہر شناسی کا ثبوت دیا اور یہود جوہر شناسی کا ثبوت دینے سے عاجز رہے صحابہ نے حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھا اور اس کو پہچان کر اس کا ساتھ دیا۔ جب کہ یہود نے

یہ ثابت کیا کہ وہ حقیقت کو مجرد سطح پر پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ایک لفظ میں یہود کا کیس تقلید آباء کا کیس تھا اور صحابہ کرام کا کیس جوہر شناسی کا کیس۔ یہی وہ فرق ہے جس نے ایک گروہ کو اللہ کی نظر میں مومن ٹھہرایا اور دوسرا گروہ اللہ کی نظر میں غیر مومن ہو کر رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ صحابہ والا ایمان معرفت والا ایمان ہے۔ صحابہ نے مجرد سطح پر حقیقت کو پہچانا اور اس کا ساتھ دیا۔ آج بھی وہی ایمان حقیقی ایمان ہے جو آدمی کے اندر مجرد سطح پر حقیقت کو دیکھنے کی نظر پیدا کرے۔

یہ فرق بے حد بنیادی فرق ہے۔ اسی سے وہ تمام اعلیٰ خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جو ہم صحابہ کرام کی زندگیوں میں دیکھتے ہیں۔

عبرت و نصیحت کا مزاج

ایک ایمان وہ ہے جو بس جامد عقیدہ ہو جو آدمی کے ذہنی اسٹور میں بہت سی چیزوں میں سے ایک چیز کے طور پر پڑا ہوا ہو۔ وہ آدمی کی زندگی کا کل نہ ہو بلکہ وہ اس کا صرف ایک جزء ہو۔ دوسرا ایمان وہ ہے جو آدمی کے اندر اتنی گہرائی کے ساتھ اترے کہ وہی اس کی فکر و نظر بن جائے۔ آدمی ہر چیز کو اسی خاص زاویہ سے دیکھے۔ وہ ہر چیز میں اپنے ایمان کی جھلک پانے لگے۔ اس کا ایمان اس کا ایک جزء نہ ہو بلکہ وہی اس کا کل بن جائے۔

کوئی حقیقت جب گہرائی کے ساتھ کسی کو ملتی ہے تو وہ اس کی سوچ بن جاتی ہے۔ ایمان اسی قسم کی ایک عظیم حقیقت ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایمان ایک زندہ حقیقت کے طور پر کسی کے اندر داخل ہو اور وہ اس کی سوچ اور اس کے جذبات پر چھا نہ جائے۔

صحابہ کرام کا ایمان اسی قسم کا زندہ ایمان تھا۔ ان کا ایمان ان کے پورے فکر و خیال پر چھا گیا تھا۔ وہ ہر چیز میں اسی کا عکس دیکھنے لگے تھے۔ ہر چیز جو ان کی نگاہ سے گزرتی تھی وہ ان کے ایمان کے سانچہ میں ڈھل جاتی تھی۔ ہر مشاہدہ ان کے ذہنی خانہ میں داخل ہو کر ایمانی سبق کا ذریعہ بن جاتا تھا۔

ایک صحابی کا واقعہ ہے۔ وہ اپنے گھر کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک گاڑی گزری جس میں دو جانور جتے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے ایک جانور بیٹھ گیا اور دوسرا جانور کھڑا رہا۔ جو جانور

بیٹھ گیا تھا اس کو گاڑی والے نے ڈنڈے سے مارا۔ اس کو دیکھ کر صحابی نے کہا، اِنَّ فِی ھٰذَا لَمُعتَبَرًا (اس کے اندر بھی نصیحت ہے) یعنی جو جانور چلتا رہا وہ بچ گیا اور جس جانور نے سستی دکھائی اس پر مار پڑی۔ یہی معاملہ انسان کے ساتھ آخرت میں ہوگا۔ جو انسان خدا کی ڈیوٹی پوری کرے گا وہ نجات پائے گا اور جو انسان خدا کی ڈیوٹی نہیں پوری کرے گا اس کو سزا ملے گی۔

گاڑی کا واقعہ بظاہر ایک دنیوی واقعہ تھا مگر صحابی نے اس دنیوی واقعہ میں آخرت کی جھلک دیکھ لی۔ ایک مادی مشاہدہ صحابی کے ذہنی خانہ میں داخل ہو کر روحانی واقعہ میں ڈھل گیا۔ اسی فکری تبدیلی کا دوسرا نام نصیحت ہے۔

اعتراف

موجودہ دنیا میں کسی آدمی کے لیے سب سے زیادہ مشکل چیز دوسرے کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ میں اتنا زیادہ گم رہتا ہے کہ اس کو دوسرے کی خوبی دکھائی نہیں دیتی۔ مگر ایک سچا مومن اس کمزوری سے پاک ہوتا ہے۔ ایمان درحقیقت خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے عجز کی دریافت ہے۔ جب یہ ایمان کسی کو گہرائی کے ساتھ ملتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی اپنی ذات اس کی نظر سے حذف ہو جاتی ہے۔ اس کا ایمان اس سے اس کی انا کو چھین لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کے اندر اعتراف کا مادہ کمال درجہ میں پیدا ہو جاتا ہے دوسرے کا اعتراف کرنے میں آدمی کی اپنی انا رکاوٹ بنتی ہے۔ جس شخص کی انا مٹ چکی ہو اس کے لیے کیا چیز ہو گی جو دوسرے کے فضل و کمال کا اعتراف کرنے میں رکاوٹ بنے۔

لبید ایک صحابی ہیں۔ وہ عرب کے ایک شاعر تھے۔ انہوں نے جب قرآن کو سنا تو وہ فوراً اس کے مومن بن گئے۔ اس کے بعد ان کی شاعری چھوٹ گئی۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے شاعری کیوں چھوڑی تو انہوں نے کہا: اَبَعْدَ الْقرآن (کیا قرآن کے بعد بھی)

حضرت لبید کے اس جملہ کی اہمیت سمجھنے کے لیے ہم کو ۱۴ سو برس پیچھے جانا پڑے گا۔ حضرت لبید نے یہ جملہ اس وقت کہا جب کہ قرآن ابھی اتر رہا تھا۔ جب قرآن کو ماننے والے مظلوم تھے۔ جب دنیا میں قرآن کی وہ عظمت قائم نہیں ہوئی تھی جو بعد کو پیش آنے والے تاریخی واقعات کے نتیجہ میں قائم ہوئی۔ اس وقت یہ کہنا کہ "کیا قرآن کے بعد بھی" ایک بے حد

مشکل کام تھا۔ اس کے لیے صحابہ والا ایمان درکار تھا جو آدمی کی خودی کو اس سے چھین لے تاکہ وہ اپنی ذات کے باہر کی حقیقتوں کو کھلے طور پر دیکھنے لگے۔

خدا کی نسبت سے دیکھنا

حضرت ابومسعود ایک صحابی تھے۔ ایک بار وہ اپنے غلام پر خفا ہوگئے اور اس کو ڈنڈے سے مارنے لگے۔ اتفاق سے اسی وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا گزر اس طرف سے ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ ابومسعود اپنے غلام کو مار رہے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا: اعلم ابامسعود انّ اللہ اقدر علیک منک علیٰ ھٰذا الغلام (اے ابومسعود، جان لو کہ اللہ تمہارے اوپر اس سے زیادہ قادر ہے جتنا تم اس غلام کے اوپر قادر ہو) حضرت ابومسعود نے جب اس تنبیہ کو سنا تو ان کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ کر گر پڑا۔

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ شخص جو اس سے پہلے اپنے غلام کو مار رہا تھا، اس کے بعد کیوں ایسا ہوا کہ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابومسعود معاملہ کو پہلے بندے اور بندے کی نسبت سے دیکھ رہے تھے۔ اب اس یاددہانی کے بعد وہ معاملے کو خدا اور بندے کی نسبت سے دیکھنے لگے۔

جب وہ معاملے کو بندے اور بندے کی نسبت سے دیکھ رہے تھے تو وہ اپنے اور غلام کے درمیان فرق پا رہے تھے ——— میں مالک ہوں اور وہ ملازم، میں طاقت ور ہوں اور وہ کمزور، میں امیر ہوں اور وہ غریب، میں صاحب حیثیت ہوں اور وہ بے حیثیت۔ مگر جب یہ ذہن ختم ہوا اور انہوں نے معاملہ کو خدا اور بندے کی نسبت سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان میں اور غلام میں کوئی فرق نہیں۔ اب انہوں نے اپنے آپ کو بھی وہیں کھڑا ہوا پایا جہاں انہوں نے اس سے پہلے اپنے غلام کو کھڑا کر رکھا تھا۔ کیونکہ خدا کے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

انسانوں کے درمیان ہمیشہ فرق ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب معاملہ کو بندے اور بندے کی نسبت سے دیکھا جائے تو ایک اور دوسرے کے درمیان فرق دکھائی دیتا ہے۔ یہی فرق تمام ظلم اور فساد کا سبب ہے۔ جو آدمی اپنے آپ کو بڑا محسوس کرتا ہے وہ چھوٹے اور کمزور پر ظلم کرنے لگتا ہے۔ لیکن اگر معاملات کو خدا اور بندے کی نظر سے دیکھا جانے لگے تو سارا فرق مٹ جائے

گا۔ کیوں کہ خدا کی نظر میں سب حقیر اور کمزور ہیں۔ یہ ذہن خود بخود ظلم و زیادتی کے مزاج کو چھین لیتا ہے۔

صحابہ کرام کا حال یہی تھا۔ وہ ہر معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھتے تھے۔ وہ انسان کی طرف بڑھتے ہوئے سمجھتے تھے کہ وہ خدا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاتھ ہر ظلم سے رکے رہتے تھے۔ ان کا قدم زیادتی کی طرف بڑھنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ ہر انسان کے ساتھ اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔

دوسرے مسلمانوں کا ایمان بھی اسی وقت ایمان ہے جب کہ وہ اس قسم کا زندہ ایمان بن جائے۔ جب ان کے اوپر خدا کی عظمت اس طرح چھا جائے کہ وہ ہر وقت اپنے آپ کو اس کے زیر اثر محسوس کرنے لگیں۔ جب بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے بھی وہ یہ سوچ کر سنبھل جائیں کہ وہ خدا سے معاملہ کر رہے ہیں۔ کیوں کہ بندہ کمزور ہے مگر خدا تو کمزور نہیں۔

انتقام نہیں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوہ وہ ہے جس کو غزوہ بنی المصطلق کہتے ہیں۔ یہ غزوہ ۵ھ میں پیش آیا۔ اس غزوہ کے بعد ایک معمولی واقعہ کو شوشہ بنا کر مدینہ کے منافقین نے حضرت عائشہ کو بدنام کرنا شروع کیا۔ بعد کو قرآن (سورہ نور) میں آیت اتری جس نے حضرت عائشہ کی کامل برأت کر دی۔

اس وقت مدینہ میں ایک مہاجر مسلمان تھے جن کا نام مسطح بن اثاثہ تھا۔ وہ بھی منافقوں کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اس الزام میں شریک ہو گئے۔ مسطح حضرت ابو بکر کے دور کے عزیز تھے۔ ان کی غربت کی وجہ سے حضرت ابو بکر ہر ماہ ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ حضرت ابو بکر کی صاحبزادی تھیں۔ قدرتی طور پر ان کو اس واقعہ کے بعد مسطح سے سخت شکایت ہو گئی۔ مسطح کے اس فعل کے بعد حضرت ابو بکر نے قسم کھائی کہ اب میں مسطح کی کوئی مدد نہیں کروں گا۔ اس پر قرآن میں یہ آیت اتری کہ — تم میں جو لوگ وسعت والے ہیں ان کو نہیں چاہیے کہ وہ قسم کھالیں کہ وہ مسکینوں کی مدد نہیں کریں گے۔ بلکہ انہیں چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم اس کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں معاف کر دے۔ اور اللہ بہت معاف کرنے

والا مہربان ہے (ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم)

حضرت ابوبکر نے اس آیت کے بعد کہا: بلیٰ واللہ انی لاحب ان یغفر اللہ لی (ہاں خدا کی قسم میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف کر دے) اور مسطح کو جو اعانت وہ دیا کرتے تھے اس کو دوبارہ جاری کر دیا۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق اس میں اضافہ کر دیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ذاتی شکایت کے معاملہ میں صحابہ کا طریقہ کیا تھا۔ ان کی شکایت کبھی نفرت اور انتقام کی اس حد تک نہیں پہونچتی تھی جو دل سے نکل ہی نہ سکے۔ اور نہ ایسا ہوتا تھا کہ شکایت پیدا ہونے کے بعد وہ شکایت والے آدمی کے لیے ظالم بن جائیں۔ اور اس کے خلاف ہر کارروائی کو اپنے لیے جائز سمجھ لیں۔ صحابہ کرام ہر معاملے کو آخرت کے لحاظ سے دیکھتے تھے۔ وہ دوسروں کے قصور کو معاف کرتے تھے تاکہ خدا ان کے قصور کو معاف کرے۔ وہ دوسروں کی کوتاہی سے درگزر کرتے تھے تاکہ خدا ان کی کوتاہی سے درگزر فرمائے۔ آخرت کا مسئلہ ان کے ذہن پر اتنی شدت سے چھایا ہوا تھا کہ اس کے مقابلہ میں دوسرا ہر مسئلہ انہیں ہلکا نظر آتا تھا۔ وہ آخرت کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتے تھے۔ وہ آخرت کی خاطر ہر رنج کو بھلا دیتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اس اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دے سکے کہ انہوں نے برائی کے بدلے بھلائی کا سلوک کیا۔ انہوں نے تکلیف پہونچانے والوں کو دعائیں دیں۔ جنہوں نے ان کو ستایا ان کے لیے وہ رحمت کا چشمہ بن گئے۔ یہی ایمان مثل صحابہ ایمان ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو جو ایمان مطلوب ہے وہ وہی ہے جو مثل صحابہ ایمان ہو۔ جس شخص کو یہ تمنا ہو کہ آخرت میں خدا اس کے ایمان کو قبول کرے اس کو چاہیے کہ وہ صحابہ کے نمونے کو پکڑ لے۔ وہ صحابہ کے طریقہ کی پیروی کرے۔ وہ ایمان کے معاملے میں صحابہ کی تقلید کرنے والا بن جائے۔

ہر حال میں انصاف

عبدالرحمٰن بن عوف ایک صحابی تھے۔ اور حضرت خالد بن ولید بھی ایک صحابی تھے۔ دونوں کے درمیان کسی دنیوی معاملہ میں شکایت پیدا ہو گئی۔ شکایت اتنی بڑھی کہ وہ عرصہ تک ختم نہ ہو سکی۔

اس درمیان میں ایک شخص حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس آیا۔ اس نے ان کو خوش

کرنے کے لیے حضرت خالد کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس نے یہ تاثر دینا چاہا کہ حضرت خالد دینی اعتبار سے کمزور ہیں۔ ان کا اسلام زیادہ قابلِ اعتماد نہیں۔ یہ سن کر حضرت عبد الرحمٰن بن عوف سنجیدہ ہو گیے۔ انہوں نے مذکورہ آدمی سے کہا: مہ فان ما بیننا لم یبلغ دیننا۔ (دور ہو، ہمارے اور ان کے درمیان جو بات ہے وہ ہم دونوں کے دین تک نہیں پہنچے گی) یعنی ہمارے اور ان کے درمیان دنیا کے معاملہ میں جو شکایت ہے اس کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک دوسرے کے اسلام کو ناپنے لگیں۔ اس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو دینی حیثیت سے بُرا کہنے لگیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا مزاج یہ تھا کہ اگر کسی شخص سے ایک معاملے میں شکایت پیدا ہو جائے تو اس کو بس اسی معاملہ تک محدود رکھا جائے۔ ایک معاملہ کی شکایت کو لے کر آدمی کو ہر معاملہ میں کنڈم نہ کیا جائے۔ وہ قرآن کی اس ہدایت کے سختی سے پابند تھے کہ: ولا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ الّا تعتدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ (المائدہ ۸) یعنی کسی کی دشمنی تمہیں یہاں تک نہ لے جائے کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ بلکہ دشمن کے ساتھ بھی انصاف کرو۔ یہی راستہ تقویٰ سے قریب ہے۔

یہ ایمانی طریقہ جو صحابہ کرام کا تھا یہی عام مسلمانوں کو بھی اختیار کرنا ہے۔

خلاصہ

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے مطابق ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مثل یہود ایمان اور دوسرا مثل صحابہ ایمان۔ مثل یہود ایمان دوسرے لفظوں میں نسلی اور تقلیدی ایمان ہے۔ وہ جامد پتھر کی مانند ہے جس میں کوئی جان نہیں ہوتی۔ اس سے کردار اور عمل کی شاخیں نہیں پھوٹتیں۔ اس سے روحانی ترقی کے چشمے جاری نہیں ہوتے۔ ایسا ایمان آدمی کی دل کی گہرائیوں میں داخل نہیں ہوتا۔ ایسا ایمان الگ رہتا ہے اور آدمی کی زندگی الگ۔

اس کے برعکس مثل صحابہ ایمان ایک معرفت ہے۔ وہ ایک ڈسکوری ہے۔ وہ ایک فکری انقلاب ہے۔ جب کسی آدمی کے اندر یہ ایمان پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کے پورے وجود کو ہلا دیتا ہے۔ اس کی ہستی خدا کے نور میں نہا اٹھتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے سوچنے

اور عمل کرنے کی پوری دنیا بدل جاتی ہے ۔ وہ ظاہری چیزوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے ۔ وہ حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے لگتا ہے ۔ گرد و پیش کی ہر چیز اس کے ایمان کی غذا بن جاتی ہے ۔ ایمان اس کے لیے اتنی بڑی چیز ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہر چیز اس کی نظر میں چھوٹی ہو جاتی ہے ۔ وہ نفرت اور انتقام کی نفسیات سے بلند ہو جاتا ہے ۔ اس کا ایمان اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ انصاف پر قائم رہے ۔ وہ کبھی صراط مستقیم سے اِدھر اُدھر نہ ہٹے ۔

دھلی ، یکم جولائی ۱۹۸۵

۱۔ موجودہ حالات کے بارہ میں الرسالہ کا نقطۂ نظر خدا کے فضل سے عام ہو رہا ہے۔ روزانہ اس کی نئی مثالیں سامنے آ رہی ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی روزنامہ ٹیلی گراف (۱۰ جون ۱۹۸۷) نے صدر اسلامی مرکز کی ایک تحریر نمایاں طور پر شائع کی ہے۔ اور اس کا عنوان ان لفظوں میں قائم کیا ہے : Cure for communalism.

۲۔ اسی طرح ہفت روزہ نئی دنیا (۲۹ جون ۱۹۸۷) کے ایڈیٹر نے مولانا وحید الدین خاں کی ایک تحریر مکمل طور پر نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ تحریر بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس تحریر میں کہا گیا تھا کہ موجودہ مسائل کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمان موجودہ نزاع کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں۔ ایڈیٹر نئی دنیا نے اس نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جو قائدین مسلمانوں کی لاشوں پر اپنی سیاست چمکانا چاہتے ہیں وہ اس حکمتِ عملی کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اسے ناقابلِ عمل اور بزدلانہ قرار دیتے ہیں۔ موجودہ غم وغصہ کے ماحول میں جب کہ مسلمانوں کا دل غم سے چور ہو چکا ہے، جذباتی اور ٹکراؤ کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ ان حالات میں عوام کا ایک طبقہ گفتار کے غازی قائدین کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ اور دور اندیشی سے مستقبل کی تعمیر کی صلاح دینے والوں کو گالیوں سے نوازتا ہے۔ لیکن تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ آخر کار عوام کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون انھیں تباہی اور بربادی کے دلدل میں لے جا رہا ہے اور کون ہوش اور دانش مندی سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے دلدل سے بچ کر گزرنے کی راہ دکھا رہا ہے۔"

۳۔ الرسالہ انگریزی کے ذریعہ ہماری آواز تیزی سے ملک کے اعلیٰ طبقہ تک پہنچ رہی ہے۔ مثلاً ہم کو انگریزی روزنامہ نادرن انڈیا پتریکا کے مینیجنگ ڈائرکٹر مسٹر تمل کانتی گھوش کا خط (۲۷ جون ۱۹۸۷) الہ آباد سے موصول ہوا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انھیں الرسالہ انگریزی کا جون ۱۹۸۷ کا شمارہ ملا۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے اس کو بہت پسند کیا ہے اور چاہتے ہیں کہ اس کو مستقل طور پر اپنے مطالعہ میں رکھیں۔ اس لیے انھیں ہر ماہ انگریزی الرسالہ پابندی کے ساتھ روانہ کیا جائے۔

۴۔ انگلینڈ سے مسٹر ایڈورڈ وٹنر (Edward Witners) نے اپنے خط (۲۵ جون ۱۹۸۷) میں الرسالہ انگریزی کے بارہ میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور دو سال کا زر تعاون بھیجتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے نام پابندی کے ساتھ الرسالہ انگریزی جاری رکھا جائے۔

۵۔ روزنامہ انقلاب میں مسٹر متر ستیارتھی نے "خاتون اسلام" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مولانا وحیدالدین خاں کی شخصیت ہندستانی مسلمانوں کے آئندہ سنہرے دور کی ضمانت ہے۔ ان کا الرسالہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے جس کے ہم ایسے کافر بھی مستقل قاری ہیں۔ ان کا تازہ ترین کارنامہ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب جس کا نام انھوں نے خاتونِ اسلام رکھا ہے، ہم ہندستانیوں کے ذہنوں پر جو مغربی کلچر کا احساسِ برتری چھایا ہوا ہے، اس احساس برتری کے قفل پر موصوف کی یہ تصنیف بھرپور طاقت سے چلایا ہوا ایک ہتھوڑا ثابت ہوئی ہے" تفصیلی تبصرہ انقلاب (۹ مئی ۱۹۸۷) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۶۔ ایک بین اقوامی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے صدر اسلامی مرکز نے افریقہ کا سفر کیا۔ یہ سفر جون ۱۹۸۷ میں ہوا۔ اس کی مفصل روداد آئندہ کسی شمارہ میں انشاء اللہ شائع کردی جائے گی۔

۷۔ میرٹھ کے حالات جاننے کے لیے صدر اسلامی مرکز نے ایک وفد کے ساتھ ۲۸ جون ۱۹۸۷ کو میرٹھ کا سفر کیا۔ اس سفر کے تاثرات اور مشاہدات انشاء اللہ آئندہ شائع کیے جائیں گے۔

۸۔ مندر مارگ (نئی دہلی) میں ۹ مئی ۱۹۸۷ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے قرآن کا درس دیا۔ درس کا موضوع "نماز" تھا۔ قرآن اور حدیث کی روشنی میں نماز کی اہمیت واضح کی گئی۔

۹۔ بعض مقامات پر یہ سوچ ابھری ہے کہ موجودہ فسادات کی اصل جڑ لوگوں کی بے شعوری ہے۔ ان فسادات کو ختم کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ مسلمانوں کی بے شعوری کو ختم کردیا جائے۔ چنانچہ ان مقامات پر یہ کوشش کی جارہی ہے کہ الرسالہ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پھیلایا جائے تاکہ لوگ باشعور بنیں۔ یہ نہایت صحت مند رجحان ہے۔ فساد کی جڑ اسی طرح کٹ سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر جگہ یہی کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو الرسالہ پڑھایا جائے۔

۱۰۔ فسادات کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے ایک بنیادی تجویز یہ ہے کہ ایک جیپ حاصل کی جائے اس میں لاوڈ اسپیکر نصب ہو۔ اور اسی کے ساتھ ضروری تعمیری لٹریچر بھی موجود ہو۔ جیپ کے ذریعہ چند صالح مزاج کے آدمی بستیوں بستیوں کا سفر کریں اور ہر جگہ جا کر لوگوں کو سمجھائیں اور ان کے اندر تعمیری شعور پیدا کریں۔ اس اسکیم کے سلسلہ میں جو لوگ اپنا تعاون دینا چاہیں وہ مطلع فرمائیں۔

۱۱۔ عرب ملکوں میں باہر کے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں اور ان کے درمیان دعوتی کام کے زبردست مواقع ہیں۔ کئی عرب ملکوں سے اس قسم کی اطلاعات مل رہی ہیں۔ مثلاً ایک عرب ملک میں وہاں کے عرب نوجوان جو کمپنیوں میں کام کرتے ہیں وہ اپنی کمپنیوں میں کام کرنے والے مغربی افراد تک انگریزی الرسالہ پہنچا رہے ہیں جن کو وہ بڑے شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

۱۲۔ ایک عرب ملک سے ایک صاحب ایجنسی لکھتے ہیں: "انگلش الرسالہ یہاں الحمدللہ یورپین افسران بڑی دل چسپی سے پڑھتے ہیں۔ ان کے درمیان انگریزی الرسالہ دن بدن مقبول ہوتا جا رہا ہے" انھوں نے انگریزی الرسالہ کی تعداد میں اضافہ کے لیے تحریر فرمایا ہے۔

۱۳۔ ایک صاحب گلبرگہ سے لکھتے ہیں "ماہنامہ الرسالہ کا مطالعہ پابندی سے ہو رہا ہے۔ یہاں کثرت سے لوگوں کے ہاتھوں میں الرسالہ نظر آتا ہے۔ ماضی اور حال کا جائزہ لینے کے بعد یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ الرسالہ کا مستقبل بہت ہی زیادہ روشن ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ الرسالہ سے اپنی تمام اندرونی برائیوں کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور زندگی کی اندھیریوں میں ہمارے لیے الرسالہ ایک شمع کی مثال رکھتا ہے (غیاث رشادی)

۱۴۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں نے آپ کی کتاب تجدید دین کا گہرا مطالعہ کیا۔ واقعی یہ دین کی تجدید کرتی ہے۔ وہ تمام خیالات جو دین میں رخنہ پیدا کرتے ہیں، اس کے مطالعہ سے دور ہو جاتے ہیں اور دین کا صحیح مفہوم دماغ میں آجاتا ہے۔ اس کتاب کو سمجھنے کے لیے وسیع النظری کی ضرورت ہے، کوتاہ ذہن اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں نے تذکیر القرآن کی پہلی جلد کا مطالعہ کیا ہے۔ موجودہ سائنسی دور کے لیے یہ بہترین تفسیر ہے (عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ، سکندر آباد)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے نیے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

شمارہ ۱۳۱ — اکتوبر ۱۹۸۷

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333. 611128

صبر اور اعراض

مکہ کے زمانۂ قیام میں صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم کو اجازت دیجیے کہ ہم اسلام کے دشمنوں کے خلاف اقدام کریں۔ آپ نے فرمایا کہ صبر کرو۔ غزوۂ احزاب میں آپ نے خندق کھود کر اپنے اور دشمنوں کے درمیان آڑ قائم کر دی تاکہ دونوں فریقوں میں جنگ نہ ہونے پائے۔ مکہ کے سفر میں بعض مسلمانوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور کہا تم کسی بہرے کو نہیں پکار رہے ہو۔

اس قسم کے واقعات بتاتے ہیں کہ عمل کسی اندھا دھند کارروائی کا نام نہیں۔ عمل کا تعلق تمام تر حالات سے ہے۔ حالات کے مطابق کبھی ایک چیز مفید ہوتی ہے اور کبھی وہی چیز غیر مفید بن جاتی ہے اس دنیا میں کبھی ضروری ہوتا ہے کہ آدمی بولے اور کبھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ چپ ہو جائے۔ کبھی یہ مطلوب ہوتا ہے کہ آدمی مقابلہ کرے اور کبھی یہ مطلوب ہو جاتا ہے کہ آدمی مقابلہ کے میدان سے اپنے آپ کو ہٹا دے۔

موجودہ حالات مسلمانوں کے لیے حد درجہ نازک حالات ہیں۔ یہ مسلمانوں کے لیے جہاد کا وقت نہیں بلکہ صبر کا وقت ہے۔ آج انھیں مقابلہ نہیں کرنا ہے بلکہ اعراض کرنا ہے۔ اس صبر اور اعراض کا مطلب بزدلی نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وقفۂ تعمیر حاصل کیا جائے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس ظلم اور تعصب کا کیس نہیں۔ وہ ایسے لوگوں کا کیس ہے جو زندگی کی دوڑ میں دوسرے لوگوں سے پچھڑ گیے ہوں۔ مسلمان آج جو کچھ بھگت رہے ہیں وہ خود اپنے پچھڑے پن کی قیمت ہے۔ اب ہمیں ایک وقفۂ تعمیر درکار ہے تاکہ ہم اپنے پچھڑے پن کی تلافی کر سکیں۔ اس وقفۂ تعمیر کو حاصل کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ صبر کا رویہ اختیار کیا جائے۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی ہر شکایت کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے۔ مواقع کو استعمال کرنے کی خاطر مسائل کو نظر انداز کیا جائے۔

یہی زندگی کا راستہ ہے۔ اس کے سوا جو راستے ہیں وہ مسلمانوں کو تباہی کے سوا کسی اور منزل پر نہیں پہنچا سکتے۔

پیغام رسانی

سادہ طور پر ایک انسان کی آواز صرف اس کے قریبی لوگوں تک سنائی دیتی ہے۔ تاہم قدیم ترین زمانہ سے انسانی آواز کی توسیع کے مختلف طریقے رائج رہے ہیں۔ ابتداء اسلام میں اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں۔

اس کا ابتدائی طریقہ زیادہ زور کے ساتھ اپنی آواز نکالنا ہے۔ سورہ برارت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو مکہ بھیجا کہ وہ حج کے موقع پر اس کا اعلان کردیں۔ وہ مجمع کے درمیان بلند آواز سے پکارتے تھے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ کا حج نہیں کرے گا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں پکارتا پھرتا تھا، یہاں تک کہ میری آواز بیٹھ گئی (قال فکنت انادی حتیٰ صحل صوتی، تفسیر ابن کثیر)

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ متکلم خود معتدل آواز سے بولے اور دوسرے لوگ اس کو سُن کر بلند آواز سے اس کو دہرائیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے الفاظ رک رک کر ادا فرماتے تھے اور دوسرے افراد اس کو لے کر بلند آوازسے لوگوں کے سامنے دہراتے تھے (قال کان الرجل الذی یصرخ فی الناس بقول رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھو بعرفۃ ربیعۃُ بن امیۃ بن خلف، سیرۃ ابن ہشام)

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ صاحبِ کلام خود سفر کرکے لوگوں کے پاس پہونچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی کے آخری دور میں یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ آپ خود چل کر مختلف قبائل کی قیام گاہوں میں جاتے اور ان کے سامنے اسلام پیش کرتے۔ سیرۃ ابن ہشام جلد دوم کے آغاز میں اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

چوتھا طریقہ جس کی مثال دورِ نبوت میں ملتی ہے وہ مکتوب کا طریقہ ہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب امن قائم ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف عرب کے رئیسوں اور بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کیے اس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں درج ہے۔

موجودہ زمانہ میں انسانی آواز کی توسیع کے مشینی طریقے رائج ہوگیے ہیں۔ انھیں میں سے ایک کیسٹ اور ویڈیو کیسٹ کا طریقہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ان عصری طریقوں کو بھی اسلام کی دعوت کے لیے استعمال کیا جائے تاکہ خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک موثر ترین انداز میں پہنچ سکے۔

اصل مسئلہ

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سیاست کو، ایک لفظ میں، احتجاج یا پروٹسٹ کی سیاست کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کا ہر چھوٹا بڑا لیڈر ہندو قوم یا "ہندو حکومت" کو نشانہ بنا کر اس کے خلاف پر جوش تقریر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرز عمل نے مسلمانوں کو ایک نئے قسم کا پروٹسٹنٹ فرقہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

اگر ان حضرات سے کہیے کہ آپ اس احتجاجی سیاست میں کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں تو وہ جواب دیں گے کہ یہ ہمارا دستوری حق ہے۔ اس ملک میں باقاعدہ دستور کی حکومت ہے۔ اگر ہمارے دستوری حقوق ہم کو نہ دیے جائیں تو خود دستور ہی ہم کو یہ حق دیتا ہے کہ ہم پُر امن ذرائع کو کام میں لے کر اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔

یہ بات گریمر کے اعتبار سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہے۔ اس دنیا میں ہندستان کے تحریری دستور کے اوپر ایک اور غیر تحریری دستور ہے۔ یہ غیر تحریری دستور پہلے دستور سے زیادہ اہم ہے۔ یہ غیر تحریری دستور یہ ہے کہ ـــــــ جب دستور اور حقیقتِ واقعہ کے درمیان ٹکراؤ ہو تو حقیقتِ واقعہ باقی رہے اور دستور کے الفاظ ہوا میں گم ہو کر رہ جائیں۔

یہاں میں اس کی ایک واضح مثال دیتا ہوں۔ ہندستان کا دستور جو ملکی قیادت کے اتفاق رائے کے ساتھ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ کو نافذ کیا گیا تھا۔ اس کی دفعہ ۳۴۲ میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے کہ پندرہ سال کی مدت تک انگریزی زبان یونین کی سرکاری زبان رہے گی۔ اس کے بعد اس کی سرکاری زبان ہندی دیوناگری رسم الخط میں ہو جائے گی:

> For a period of fifteen years the English language shall continue to be the official language of the Union. Thereafter the official language shall be Hindi in Devanagri script.

اس دستوری دفعہ کے مطابق ہندی زبان کو پندرہ سال کے اندر یونین کی سرکاری زبان بننا تھا۔ مگر دو سنگین حقیقتیں اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئیں۔ ایک یہ کہ ہندی زبان ابھی اتنی زیادہ

ترقی یافتہ نہیں کہ وہ کامیاب طور پر دور جدید کی ایک ریاست کی سرکاری زبان بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی زبان کے تمام بڑے بڑے علم بردار اپنے بچوں کو ہندی اسکول کے بجائے انگلش اسکول میں پڑھانا پسند کرتے ہیں۔

دوسری بڑی وجہ وہ تھی جو جنوبی ہند کی طرف سے پیدا ہوئی۔ جنوبی ہند جو ہندستان کا نصف حصہ ہے، اس کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر ہندی کو انڈین یونین کی سرکاری زبان بنایا گیا تو تمام مرکزی شعبوں میں شمالی ہند کا غلبہ ہو جائے گا اور وہ پیچھے ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ جنوبی ہند میں اس کے خلاف شدید رد عمل ہوا۔ یہاں تک کہ نئی دہلی کے پالیسی ساز لیڈروں کو دستور کی اس دفعہ کو تاریخ کے سرد خانہ میں ڈال دینا پڑا۔

ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کو دستوری حقوق نہ ملنے کا مسئلہ کہنا اس کی سنگینی کو گھٹانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ خود مسلمانوں کے اپنے پچھڑے پن کا مسئلہ ہے۔ مسلمان اس ملک میں دراصل اپنے پچھڑے پن کی قیمت ادا کر رہے ہیں اور اس کو غلط طور پر وہ دوسروں کے ظلم اور تعصب کے خانہ میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔

جو صورت حال حقیقت کے زور پر پیدا ہوئی ہو، اس کو آپ قانون کے زور پر ختم نہیں کر سکتے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ ان کی بے شوری ہے۔ اسی بے شوری کی وجہ سے وہ اب تک تعلیم کی اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ اسی بنا پر وہ اس راز کو نہیں جانتے کہ مواقع کو استعمال کرنے کے لیے مسائل کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ تقریریں کرنے اور بڑے بڑے الفاظ بولنے کو کام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض لفظ بازی ہے نہ کہ کوئی واقعی کام۔

اسی شوری پچھڑے پن کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر چیز میں پیچھے ہو گئے ہیں۔ شعور آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ حالات کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھے۔ وہ اپنے لیے صحیح منصوبہ بنائے۔ وہ لوگوں کی مخالفانہ کارروائیوں کی کاٹ کر سکے۔ وہ اپنے امکانات کو سمجھے اور ہوش مندی کے ساتھ ان کو استعمال کرے۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسروں کے ظلم اور تعصب کے باوجود اپنے لیے راہ نکالنی پڑتی ہے، مسلمان اس صلاحیت کو کھو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حالات کے خلاف صرف چیخ پکار کر رہے ہیں، وہ ابھی تک اپنے لیے کوئی راستہ دریافت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

داخلی احتساب

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنۢ بَنِىٓ إِسْرَاۤءِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُۥدَ وَعِيسَى ٱبْنِ مَرْيَمَ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ۔ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ

(المائدہ ۷۹-۷۸)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی، داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے۔ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے اس برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ نہایت برا کام تھا جو وہ کر رہے تھے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے خارجی احتساب کو زندگی کی علامت سمجھ لیا ہے۔ مگر مذکورہ آیت اس کے برعکس یہ اعلان کر رہی ہے کہ داخلی احتساب مسلمانوں کی ایمانی زندگی کی علامت ہے۔ مسلم معاشرہ کے اندر برائی کو برداشت نہ کرنا اور آپس میں ایک دوسرے کو غلط کام سے روکنا اسلام اور ایمان کی لازمی شرط ہے۔ اہلِ ایمان کے معاشرے میں اگر یہ صفت باقی نہ رہے تو ایسے لوگ اللہ کی نظر میں لعنت زدہ قرار پائیں گے، جیسا کہ یہود کے ساتھ ہوا۔ دوسروں کے خلاف احتجاج اور احتساب کی کوئی بھی مقدار اس کا بدل نہیں بن سکتی۔

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی روایتیں موجود ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بنی اسرائیل (یہود) کی مذکورہ روش سے ڈرایا ہے اور متنبہ کیا ہے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم بھی خدا کی نظر میں اسی طرح ملعون ہو جاؤ گے جس طرح یہود خدا کی نظر میں ملعون قرار پائے۔ یہاں ہم چند حدیثیں نقل کرتے ہیں:

عن عبد الله بن مسعود قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الرجل من بنى اسرائيل كان اذا رأى اخاه على الذنب نهاه عنه تعذيرا فاذا كان من الغد لم يمنعه ما رأى منه ان يكون اكيله وخليطه وشريكه فلما رأى الله ذالك منهم ضرب قلوب بعضهم على بعض ولعنهم على لسان نبيهم داؤد وعيسى ابن مريم ذالك بما عصوا وكانوا يعتدون ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم والذى نفسى بيده لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر ولتاخذن على

يد المسيء ولتأطرنه على الحق أطرا اوليضربن الله قلوب بعضكم على بعض اوليلعنكم كما لعنهم۔

عن حذيفة بن اليمان ان النبي صلى الله عليه وسلم قال والذي نفسي بيده لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر اوليوشكن الله ان يبعث عليكم عقابا من عنده ثم لتدعنه فلا يستجيب لكم۔

عن عدى بن عميرة رضي الله عنه قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول ان الله لا يعذب العامة بعمل الخاصة حتى يروا المنكر بين ظهرانيهم وهم قادرون على ان ينكروه فلا ينكرونه فاذا فعلوا ذالك عذب الله الخاصة والعامة۔ (تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ ان کا ایک آدمی جب اپنے بھائی کو برائی کرتے ہوئے دیکھتا تو وہ پہلی بار اس کو منع کرتا۔ مگر جب اگلا دن آتا تو جو کچھ اس نے دیکھا تھا وہ اُس کو اِس سے نہ روکتا کہ وہ اس کے ساتھ کھائے اور اس کے ساتھ اٹھے بیٹھے۔ پس جب اللہ نے ان کے اندر یہ بات دیکھی تو ان کے دلوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کر دیا۔ اور اپنے پیغمبر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے ان پر لعنت کی، ایسا اس لیے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر جانے والے لوگ تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم کو ضرور ایسا کرنا ہوگا کہ تم (اپنے لوگوں کو) اچھائی کا حکم دو اور ان کو برائی سے روکو اور غلط کار کا ہاتھ پکڑ لو اور اس کو حق کی طرف موڑ دو۔ ورنہ اللہ تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دے گا یا تم پر لعنت کرے گا جس طرح اس نے یہود پر لعنت کی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم ضرور (اپنے لوگوں کو) اچھائی کا حکم دوگے اور ضرور برائی سے روکوگے۔ ورنہ قریب ہے کہ اللہ تمہارے اوپر اپنے پاس سے عذاب بھیج دے۔ پھر تم اللہ کو پکارو مگر وہ تمہاری پکار کو نہ سنے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ بعض لوگوں کے عمل کی سزا عام لوگوں کو نہیں دیتا یہاں تک کہ ان کا یہ حال ہو جائے کہ وہ برائی کو اپنے (لوگوں کے) درمیان دیکھیں اور وہ اس کا انکار کرنے پر قادر ہوں پھر بھی وہ اس کا انکار نہ کریں۔ پس جب وہ ایسا کرتے ہیں تو

اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

مذکورہ آیت اور مذکورہ احادیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ بے حد اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے بارہ میں بھی خدا کا عین وہی قانون ہے جو اس سے پہلے یہود کے بارے میں تھا۔ اس اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو موجودہ فسادات وہی خدائی حکم نظر آنے لگتے ہیں جن کی پیشگی خبر حدیث میں دیدی گئی تھی۔ اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے لعنت کی کوئی صورت نہ ہو۔ لعنت کے معنی ہیں خیر سے بعید کر دینا۔ موجودہ مسلمان شاید خدا کی رحمت سے دور کر دیئے گیے ہیں۔ وہ ہر صبح و شام اپنے "دشمنوں" کی بربادی کی دعائیں کرتے ہیں مگر ان کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ ان کے کچھ شرانگیز عناصر فساد کرتے ہیں اور اس کے بعد پوری قوم کو اس کی بدترین سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ یہ تمام علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ موجودہ مسلمانوں پر شاید وہ کچھ نازل ہو چکا ہے جس کے نازل ہونے کا اندیشہ ان کے پیغمبر نے ظاہر کیا تھا۔

موجودہ حالت یہ ہے کہ مسلمانوں میں بے قیدی اور بے راہ روی عام ہو گئی ہے۔ وہ بات بات پر لڑنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ چنانچہ تمام فرقہ وارانہ فسادات خود مسلمانوں کے بعض عناصر کی شرانگیز کارروائیوں سے شروع ہوتے ہیں۔ پھر جب فساد بڑھتا ہے تو پوری قوم کو اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ یہ صورت حال بار بار پیش آرہی ہے اور تمام مسلمان اس کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ مگر مسلمانوں میں کوئی بھی قابل ذکر گروہ نہیں جو اپنے ان مجرموں کو کنڈم کرے اور ان کا ہاتھ پکڑنے کے لیے کھڑا ہو۔

مسلمانوں میں ایسے قائدین تو بہت ہیں جو حکومت (یا غیر مسلم فرقہ) کے خلاف تقریر اور بیانات کی دھوم مچانے کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔ حتی کہ ان میں ایسے مجاہدین بھی ہیں جو زمانہ کی کلائی موڑنے اور ساری کائنات کا احتساب کرنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔ مگر ان کے درمیان کوئی بھی ایسا قائد نہیں جو مسلمانوں کے اوپر محتسب بن کر کھڑا ہو۔ جو ان مسلمانوں کے خلاف دھوم مچائے جو برادران وطن کے ساتھ اشتعال انگیز کارروائیاں کرتے ہیں اور ان کی انا کو بھڑکا کر پوری قوم کو آگ اور خون میں نہلانے کا سبب بن جاتے ہیں۔

مذکورہ احادیث کے مطابق ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر داخلی احتساب کا نظام قائم ہو۔ ہر جگہ کے مسلمان اپنے ان افراد کی نگرانی کریں جو ابتدائی شرانگیزی کرکے فساد کی آگ بھڑکانے کا سبب بنتے ہیں۔ مسلمانوں کے موجودہ قائدین اپنی ساری طاقت حکومت (یا ہندو فرقہ) کے خلاف ایجی ٹیشن میں لگائے ہوئے ہیں۔ اس کے بجائے انھیں یہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنی ساری طاقت خود مسلم افراد کی روک تھام پر لگا دیں۔ یہی کرنے کا اصل کام ہے مسلمان اس کے سوا جو کچھ بھی کریں گے وہ صرف خدا کے غضب کو بھڑکانے والا ہوگا۔ وہ کسی درجہ میں بھی مسئلہ کو حل کرنے والا نہیں بن سکتا۔

تہذیب جدید کے مسائل

"مغربی سماج میں اگر بگاڑ ہے تو مسلمانوں کے موجودہ سماج میں بھی بگاڑ ہے۔ اس کے باوجود آپ مغربی تہذیب کو غلط اور اسلام کو صحیح کیسے کہتے ہیں"۔ ایک شخص نے کہا۔ مگر یہ اعتراض درست نہیں۔ اس لیے کہ جس اعتبار سے ہم مغربی تہذیب اور اسلام کے درمیان تقابل کر رہے ہیں اس میں دونوں کے درمیان ایک واضح فرق ہے۔ مسلم سماج کا بگاڑ اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہے جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ عین اس کے اصولوں پر عمل کرنے کا نتیجہ۔

مسلمانوں کے درمیان جو بگاڑ ہے وہ اصول اور عمل کے درمیان فرق ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ اصول اور حقیقتِ واقعہ کے درمیان ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جدید مغربی تہذیب نے معاشرتی زندگی کے بارے میں مذہبی اصولوں کے بالمقابل کچھ دوسرے اصول وضع کیے۔ اور قدیم اصول کے مقابلہ میں جدید اصول کی معقولیت کا دعویٰ کیا۔ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ زمین کے قابلِ لحاظ حصہ پر مغربی اقوام کا سیاسی اور مادی غلبہ قائم ہو گیا۔ انھیں یہ حیثیت حاصل ہو گئی کہ وہ قدیم اصولِ حیات کو رد کر کے جدید اصولِ حیات کی بنیاد پر انسانی معاشرہ کی تشکیل کریں۔

مغربی اقوام کے غلبہ کے ساتھ ہی یہ عمل شروع ہو گیا۔ اب اس تجربہ پر ۱۰۰ سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ مگر عملی تجربہ اصول کی صداقت کو ثابت نہ کر سکا۔ اس تجربہ نے صرف یہ بتایا کہ مغرب نے انسانی زندگی کے جو نئے اصول وضع کیے تھے وہ فطرت سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ اصول اور حقیقتِ واقعہ کا یہ ٹکراؤ بہت جلد ظاہر ہو گیا۔ مغربی زندگی میں شدید قسم کی ابتری پیدا ہو گئی جس میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مسلم سماج میں آج جو بگاڑ پایا جاتا ہے اس کا حل یہ ہے کہ مسلم سماج کو سابقہ اسلامی اصولوں کی طرف لوٹایا جائے۔ مگر یہی بات مغرب کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ مغرب کا سماج اگر پیچھے کی طرف لوٹایا جائے تو اس کا لوٹنا عین انھیں اصولوں کی طرف لوٹنا ہو گا جن پر آج بھی وہ پوری طرح قائم ہے۔ جن لوگوں نے آزادانہ جنسی اختلاط کا نظریہ پیش کیا یا جنھوں نے

عورت کو ہر مردانہ شعبہ میں داخل کرنے پر اصرار کیا یا جنھوں نے یہ کہا کہ نکاح کا ادارہ ایک غیر ضروری بندھن ہے۔ وہ آخر اپنے اصولوں کی طرف لوٹیں تو کس چیز کی طرف لوٹیں گے۔ وہ اسی چیز کی طرف لوٹیں گے جس پر آج بھی وہ قائم ہیں اور جس کے ہولناک نتائج سے وہ بالفعل دوچار ہورہے ہیں۔

مسلمانوں کے بگاڑ کا حل یہ ہے کہ وہ اسلام کے چھوڑے ہوئے اصول کو دوبارہ اختیار کریں۔ جب کہ مغربی معاشرہ کے بگاڑ کا حل یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار کردہ اصول کو ترک کردے۔

اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لیے یہاں ہم کچھ واقعاتی مثالیں پیش کریں گے۔

اُلٹی طرف سفر

امریکہ کا انگریزی ہفتہ وار ٹائم (Time) نہایت کثیر الاشاعت میگزین ہے۔ وہ ۹۵ ملکوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس میگزین نے اپنی اشاعت ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ میں امریکہ کے بارہ میں ایک دل چسپ رپورٹ شائع کی ہے۔ یہاں ہم اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

پچھلے ۲۵ سال کے اندر امریکہ میں خاتون کارکنوں کی تعداد بہت بڑھی ہے۔ امریکہ میں اس وقت بچہ پیدا کرنے کی عمر کی خواتین کی ۶۵ فی صد تعداد دفتروں میں کام کرتی ہے۔ ان میں سے ۹۰ فی صد عورتیں وہ ہیں جو کارکردگی کے دوران حاملہ پائی گئی ہیں۔ عورتوں کے لیے یہ زبردست مسئلہ ہے ــــــــ کام کا بھاری بوجھ اٹھانا اور اسی کے ساتھ بیک وقت بچوں کی ماں بننا:

the heavy burden of holding down a job
and having children at the same time.

اسی قسم کی ایک امریکی خاتون لیلین گارلینڈ (Lillian Garland) ہے۔ وہ کیلی فورنیا کی ایک کمپنی میں بطور ریپشنسٹ کام کر رہی تھی۔ ملازمت کے دوران وہ حاملہ ہوگئی۔ چنانچہ اس نے ۱۹۸۲ میں عارضی طور پر دفتر سے چھٹی لے لی۔ اس کے یہاں بچی پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ تین مہینہ تک دفتر نہ جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ مگر تین مہینہ کے بعد جب وہ دوبارہ دفتر آئی تو اس کو بتایا گیا کہ اب کمپنی میں اس کے لیے جگہ نہیں ہے۔ اس کی جگہ دوسرے کارکن کے ذریعہ پُر کر لی گئی تھی۔

گارلینڈ نے ۸۵۰ ڈالر ماہانہ کی سروس کھودی۔ وہ ایسے وقت میں بے روزگار ہوگئی جب کہ بچی کی پیدائش کے نتیجہ میں اس کے اخراجات کافی بڑھ چکے تھے۔ اس نے امریکہ کی فیڈرل کورٹ میں اپیل کی کہ کمپنی نے اس کو ملازمت سے برخواست کرکے اس کے ساتھ امتیاز (Discrimination) کا برتاؤ کیا ہے۔ مقدمہ چلتا رہا۔ گارلینڈ کے وکیل اور کمپنی کے وکیل نے ایک دوسرے کے خلاف دلائل پیش کیے۔ یہاں تک کہ پانچ سال بعد جنوری ۱۹۸۷ میں امریکی سپریم کورٹ کے جسٹس تھرگڈ مارشل (Thurgood Marshall) نے فیصلہ دیا کہ خاتون کارکن اگر حاملہ ہوجائے تو جس ادارہ میں وہ کام کررہی ہے اس کو چاہیے کہ وہ اس کو چار مہینہ کی باضابطہ رخصت دے۔

اس فیصلہ نے امریکہ میں زبردست بحث چھیڑ دی ہے۔ ایک طرف آزادی نسواں کی حامی خواتین خوش ہیں کہ بچے کی پیدائش اور نگہداشت کے مسئلہ میں انھیں قانون کی حمایت حاصل ہوگئی۔ دوسری طرف امریکہ کے سنجیدہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ فیصلہ خواتین کے لیے مضر ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ اس قسم کا تحفظ صرف خواتین کے حق میں امتیاز کو بڑھانے والا ثابت ہوتا ہے۔ یہ تدبیر ایسی ہے جو ہمیشہ الٹا نتیجہ ظاہر کرتی ہے :

That almost always backfires.

لاس اینجلس کی مرچنٹس اینڈ مینوفیکچررس ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر ڈون بٹلر (Don Butler) نے کہا کہ یہ فیصلہ ایک مہلک فیصلہ ہے۔ اگر کمپنیوں کو اس طرح حاملہ خواتین کو چار مہینہ کی باضابطہ رخصت دینی پڑی تو وہ دیوالیہ پن (Bankruptcy) کا شکار ہوجائیں گی۔ امریکی چیمبر آف کامرس کے اٹارنی لیمپ (Attorney Lamp) نے کہا کہ اس طرح عورت کے خلاف امتیاز اور بڑھ جائے گا۔ اس لیے کہ بہت سی کمپنیاں یہ نہ چاہیں گی کہ وہ بچہ پیدا کرنے کی عمر میں عورتوں کو اپنے یہاں ملازم رکھیں :

Discrimination against women might increase. Many companies just won't hire women in their childbearing years (p. 21).

گارلینڈ کے مذکورہ معاملہ کی حمایت میں ایک مشہور خاتون لیڈر بیٹی فریڈان (Betty Friedan)

نے کہا کہ عورت اور مرد کے درمیان برابری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتیں مردوں کے نمونہ پر پوری اتریں :

Equality does not mean women have to fit the male model.

یہ دلیل بھی کیسی عجیب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب عورتیں اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے اتنی مختلف ہیں کہ وہ مردوں کے " ماڈل " کے مطابق نہیں بن سکتیں تو اس عجیب و غریب صنفی برابری کی کیا ضرورت ہے کہ عورتوں کو مردوں کی طرح ہر جگہ کام کے لیے کھڑا کر دیا جائے۔ اور پھر جبری قوانین کے ذریعہ اس مصنوعی برابری کو قائم رکھا جائے۔

اسی طرح سلویا این ہیولٹ (Sylvia Ann Hewlett) نے کہا کہ امریکہ کی عدالت عالیہ کے اس فیصلہ کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ ترین قانونی سطح پر اس حقیقت کا اعتراف کر لیا گیا کہ عورتوں کو دفاتر میں برابری کا مقام دلانے کے لیے ایک خاندانی سپورٹر کو وجود میں لانا ہوگا :

This decision means that there is recognition at the highest legal levels that in order to get equal results for women in the workplace, you have to create family supporters (p. 21).

یہ قدیم روایتی نظام کی معقولیت کا بالواسطہ اعتراف ہے۔ جدید تہذیب نے یہ معیار پیش کیا تھا کہ مرد کو عورت کا سپورٹر نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ عورت خود کمائے اور خود اپنی سپورٹر بنے۔ مگر جب اس اصول کو عمل میں لایا گیا تو معلوم ہوا کہ عورت سپورٹر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے اس سپورٹر کا نام " شوہر " تھا اور اب اس سپورٹر کا نام " کمپنی " ہے۔

قدیم روایتی ماحول جو مذہب کے زیر اثر بنا تھا، اس میں مرد بنیادی طور پر باہر کا کام کرتے تھے اور عورتیں بنیادی طور پر گھر کا کام۔ یہ دراصل ایک طرح کی تقسیم کار تھی۔ مگر جدید تہذیب نے اس کے متعلق کہا کہ یہ ایک صنف اور دوسری صنف کے درمیان امتیاز ہے۔ چنانچہ زور و شور کے ساتھ آزادیٔ نسواں کی تحریک چلی۔ عورتوں کو گھروں سے نکال کر دفتروں اور کارخانوں میں ڈال دیا گیا۔

مگر بہت جلد معلوم ہوا کہ اس نئے انتظام میں مختلف قسم کی رکاوٹیں حائل ہیں۔ مثال کے طور پر عورت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ حاملہ ہوتی ہے۔ وہ بچہ پیدا کرتی ہے اور پھر ایک مدت تک

دفعہ بھی کام کے قابل نہیں رہتی۔ اس مشکل کے حل کے لیے قانون بنایا گیا کہ عورت کو حمل اور رضاعت کے دوران خصوصی چھٹی دی جائے۔ مگر اس قسم کا لفظی کھیل صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو قانون ساز مجالس میں بیٹھ کر قانون بناتے ہیں۔ اس اصول کا تحمل وہ لوگ نہیں کر سکتے جن کو عملاً ایک کارخانہ چلانا ہے یا ایک دفتر کا انتظام کرنا ہے۔ چنانچہ اب مالکوں اور خاتون ملازموں کے درمیان لامتناہی جھگڑے چھڑ گئے ہیں۔

حکومتی ادارہ اب تک اس نزاع میں بظاہر خواتین کا ساتھ دے رہا ہے تاکہ اس کے تہذیبی اصول کی عظمت باقی رہے۔ مگر حقیقت کے خلاف یہ جانب داری قابل عمل نہیں۔ حکومت اگر دفتروں اور کارخانوں سے کہے کہ وہ خاتون کارکنوں کو "چار ماہ" کی باتنخواہ چھٹی دیں تو کون ادارہ اس تہذیبی تعیش کو برداشت کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اداروں میں یہ رجحان بڑھے گا کہ جوان عورتوں کو ملازمت میں نہ لیا جائے اور جب عورتیں بوڑھی ہو چکی ہوں گی تو وہ اپنے آپ ملازمتوں میں جانے سے رک جائیں گی۔ اس طرح مغربی سوسائٹی میں وہی چیز شدید تر صورت میں پیدا ہو جائے گی جس کو ختم کرنے کے لیے آزادی نسواں کی تحریک چلائی گئی تھی۔ یعنی صنفی امتیاز۔

مایوسی کا شکار

۱۲-۱۶ جنوری ۱۹۸۷ کو نئی دہلی (وگیان بھون) میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں پندرہ ملکوں کے فلسفی، سائنٹسٹ، مصنف اور آرٹسٹ شریک ہوئے۔ اس پانچ روزہ کانفرنس کا عنوان تھا: نئے آغاز کی طرف (Towards New Beginning) اس کانفرنس کا اہتمام مرکزی حکومت ہند نے کیا تھا۔

اس عالمی کانفرنس میں مغربی دنیا کی کئی ممتاز خواتین بھی شریک ہوئیں جو اب بڑھاپے کی عمر میں ہیں اور انھوں نے اپنی پوری زندگی آزادئ نسواں کی تحریک چلانے میں گزاری ہے۔ مگر اب وہ مایوسی کا شکار ہیں۔ آسٹریلیا کی جرمین گریر جو بین اقوامی شہرت کی مالک ہیں، ان کے بارہ میں انڈین اکسپریس (۱۴ جنوری ۱۹۸۷) کے نامہ نگار کے الفاظ یہ ہیں کہ آج کل وہ بہت دھیمی نظر آتی ہیں۔ ان کا وہ جوش جو فیمیل یونک نامی کتاب لکھنے کے وقت ان کے اندر تھا وہ

Whither Women's Lib?

They are feminists of different hues — Ms. Germaine Greer, the outspoken, aggressive writer from Australia, and Ms Gisele Halimi, a Tunisian-born lawyer who spearheaded the women's movement in France along with Simone de Beauvoir and others. But both voice a concern that is troubling feminists in the West today -- Whither women's lib? Ms Greer seems more mellow today, the fire that raged in 'The Female Eunuch' is strangely missing. 'The movement has solved some problems and left us with a different set of problems' exclaimed Ms Greer. Perhaps the problem was that we didn't take our mothers with us. We left them behind, found them antiquated. And now that many of us are mothers ourselves with teenaged daughters, perhaps we understand our mothers better. (*Indian Express*, January 14, 1987)

The West has no answers to the problems of inequality between sexes, says the internationally acclaimed writer Germaine Greer. The erroneous belief of the western women that the females in veils are unequal and the ones with make-up minus the head-cover are free and liberated has to be rejected. Referring to the prevalance of 'wife-beating' even in the so-called 'civilised' West, she asks, how about the unequal treatment meted out to females in the US and England in the areas of wages and jobs? Well, one-fourth of the crimes in England enamates from violence against women. The man-woman relationship understood in the West as an extension of role-models is the primary cause of strain in the sexual relationships. All the western women identify themselves with the 'bahu' —the bride — forgetting that the mother-in-law and the sister-in-law are also the specific role-models to be played by females. She feels that child for a woman is a unique investment. 'The joys of motherhood fill the blanks that cannot be satiated in the specific husband-wife role models.' Known for her non-conformist and non-traditional views, she advocates 'Coitus interrupts' in the area of birth-control. 'The array of occlusive devices, spermicidal creams, quinine pessaries, douches, syringes, abortifacient pills and rubber goods of all shapes and sizes are the ill-effects of a growing consumer-culture. These have achieved nothing but added strain in the sexual relationships.' (*The Hindustan Times*, January 12, 1987)

Ms Halimi, is more frank. 'It is a bad time for the women's movement,' she admitted. 'It is down at the moment and we are trying to find the reasons for it. Perhaps we got everything women wanted too fast — contraception, abortion, and divorce. And the problems that face women today are not strong enough to give the movement new force and strength.' Women have very specific values and morals. They have a different view of humanity. I am not saying that it is better than that of men but it is different. And women have to prove that they are women, and not men, she emphasised. (*Indian Express*, January 14, 1987).

حیرت انگیز طور پر غائب نظر آتا ہے۔ جرمین گریر نے مغرب کی آزادی نسواں کی تحریک پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس نے کچھ مسائل حل کیے ہیں اور ہم کو کچھ نئے قسم کے مسائل میں مبتلا کر دیا ہے۔

جرمین گریر اپنی جوانی کی عمر میں اتنی آزاد خیال تھیں کہ وہ نکاح کے طریقہ کو ختم کرنے کی وکیل بنی ہوئی تھیں۔ مگر اب وہ بدل چکی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شاید مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی ماؤں کو اپنے ساتھ نہیں لیا۔ ہم نے انھیں پیچھے چھوڑ دیا اور ان کو قدامت پرست سمجھ لیا۔ اب جب کہ ہم میں سے اکثر ماں بن چکی ہیں۔ اور ہمارے ساتھ لڑکیاں ہیں تو اب ہم مسائل کو کسی قدر مختلف انداز سے دیکھ رہے ہیں۔ شاید اب ہم اپنی ماؤں کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ مغرب کے پاس مرد اور عورت کے درمیان نابرابری کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے۔ مغربی عورت کا یہ خیال غلط ہے کہ پردہ دار عورتوں کو برابری حاصل نہیں ہے اور وہ عورتیں جو بناؤ سنگار کے ساتھ اور کھلے سر ہوتی ہیں وہ آزاد ہیں۔ اس فکر کو اب رد کر دیا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ نام نہاد مہذب مغرب میں بھی عورتوں کے مارنے کے واقعات موجود ہیں۔ مزید یہ کہ امریکہ اور انگلینڈ جیسے ملکوں میں بھی تنخواہ اور ملازمت کے معاملہ میں عورتوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ انگلینڈ میں ہونے والے جرائم کی چوتھائی تعداد وہ ہے جو عورتوں کے خلاف تشدد سے متعلق ہے۔

فرانس کی مزلیمی اس معاملہ میں اور بھی زیادہ کھل کر بولتی ہیں۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ خواتین نے جو کچھ چاہا تھا وہ سب انھوں نے پالیا۔ مگر ان کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ انھوں نے کہا کہ عورتیں بہت مخصوص قسم کی اخلاقی اقدار رکھتی ہیں۔ انسانیت کے بارے میں وہ ایک مختلف نقطۂ نظر کی حامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورتوں کا نقطۂ نظر بہتر ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ عورتوں کا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے کو عورت ثابت کریں نہ کہ غیر حقیقی طور پر مرد بننے کی کوشش کریں۔

مذہب کی تعلیمات کے مطابق عورت کا "رول ماڈل" یہ تھا کہ وہ گھر کو سنبھالے اور بچوں کی تربیت کرے۔ موجودہ زمانہ میں عورتوں کا رول ماڈل یہ بنایا گیا کہ وہ باہر کی زندگی میں نکلیں اور ہر شعبہ میں بالکل مردوں کی طرح کام کریں۔ یہ دوسرا رول ماڈل تجربہ کے بعد قابل عمل ثابت نہ

ہو سکا۔ اپنے بڑھاپے کی عمر میں وہی مغربی خواتین پرانے رول ماڈل کی حمایت کر رہی ہیں جنھوں نے اپنی جوانی کی عمر میں نئے رول ماڈل کی پرجوش وکالت کی تھی۔

کیا اس کے بعد بھی مذہب کے بتائے ہوئے رول ماڈل کی معقولیت پر شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے۔

دردناک انجام

پلین ٹروتھ (The Plain Truth) ایک مشہور امریکی میگزین ہے۔ وہ ۸۵۰۰۰۰ ۷ کی تعداد میں چھپ کر ساری دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ اس ماہنامہ کی اشاعت ستمبر ۱۹۸۶ میں صفحہ اول پر ایک امریکی لڑکی کی تصویر ہے جو حیرانی کے عالم میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس لڑکی کا نام سالی (Sally) ہے۔ میگزین میں اس لڑکی کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا خط ہے۔ مگر وہ جتنا چھوٹا ہے اتنا ہی زیادہ وہ دردناک ہے۔ وہ مختصر خط یہ ہے:

> When I was 8 years old I first had sex with a boy of 15. I did it because I lack love and attention from my parents. I need love, and my parents never show me any. Nothing really changed at home, and at 15 I became pregnant. My boy friend blamed me and left. I had nowhere to turn, I was trapped, so I had an abortion. Now I'm afraid to date anyone, and I cry myself to sleep every night.

ترجمہ: جب میری عمر آٹھ سال تھی اس وقت میں نے پہلی بار ایک پندرہ سالہ لڑکے کے ساتھ جنسی فعل کیا۔ میں نے ایسا اس لیے کیا کہ میں اپنے والدین کی طرف سے محبت اور توجہ پانے سے محروم تھی۔ مجھے محبت کی ضرورت تھی، مگر مجھے کبھی اپنے والدین کی محبت نہ مل سکی۔ (میرے اس حال کے باوجود) گھر کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اور میں پندرہ سال کی عمر میں حاملہ ہو گئی۔ میرے دوست لڑکے نے مجھ کو ملزم ٹھہرایا اور مجھ کو چھوڑ دیا۔ کوئی صورت میرے لیے باقی نہ رہی۔ میں پھنس کر رہ گئی۔ چنانچہ میں نے حمل ساقط کرالیا۔ اب میں کسی لڑکے سے تعلق قائم کرنے سے ڈرتی ہوں۔ ہر رات کو میں روتی رہتی ہوں یہاں تک کہ سو جاتی ہوں۔ (امریکہ میں ہر دو منٹ میں ایک کم عمر لڑکی حاملہ ہو جاتی ہے)

پلین ٹروتھ کے مذکورہ شمارہ میں نیویارک کے اخبار نویس جارج ڈون کی ایک رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں ۱۵ سے ۱۹ سال کے درمیان کی ہر ایک ہزار لڑکیوں

میں لڑکیاں حاملہ پائی گئی ہیں ۔(صفحہ ٦)

یہ انجام ہے فطرت سے انحراف کرنے کا ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مرد اور عورت کی شکل میں بنایا۔ پھر مرد اور عورت کے تعلق کا ایک نظام مقرر کیا ۔ وہ نظام یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک خاص عمر کو پہونچ کر نکاح کریں ۔ پھر وہ مل کر ایک گھر بنائیں ۔ اپنے بچوں کی تربیت اور پرورش کریں۔ اس طرح انسانی نسل چلائی جائے ۔ مگر جدید مغرب نے آزادی کے تصور کو اتنا بڑھایا کہ عورت اور مرد کے باہمی تعلق کو بھی ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد کر دیا ۔ اس کے نتیجہ میں مغرب کے معاشرہ میں بے شمار خرابیاں پیدا ہو گئیں جن میں سے ایک وہ ہے جس کی ایک مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے ۔

عورت اور مرد کے درمیان آزادانہ اختلاط اور بے قید تعلق فطرت کے سراسر خلاف ہے ۔ صنفی معاملہ میں عورت " وحدت " کو پسند کرتی ہے ۔ جب کہ مرد کا معاملہ طبعاً کسی قدر مختلف ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ آزادانہ صنفی تعلق وفاداران صنفی تعلق میں مانع بن جاتا ہے جو مرد سے زیادہ عورت کے لیے نفسیاتی ہلاکت کے ہم معنی ہے ۔ اس کی سب سے زیادہ قیمت عورت کو بھگتنی پڑتی ہے ۔

آسٹریلیا کی مشہور آزادی پسند خاتون مز جرمین گریر (Ms Germaine Greer) نے بڑی عمر کو پہونچ کر یہ اعتراف کیا ہے کہ نوجوانی کی عمر میں آزادیٔ نسواں کے لیے ان کا جوش وخروش حقیقت پسندانہ نہ تھا ۔ انھوں نے ایک انٹرویو (انڈین اکسپریس ۱۴ جنوری ۱۹۸۷) میں کہا :

> What is worrying today is the results of the sexual liberation movement —the number of teenaged girls who have been on the pill since they were 12 and 13, the number of teenaged girls who get pregnant by the time they are 15 and 16. What is happening to them? Sex means something quite different for men. They can love and leave. When the time comes to go to university, they can take off quite easily. Women have a different sensibility. They love with their heads, hearts and loins. And a broken love affair leaves them quite shattered. I have seen it happen to people close to me. And it is terrible.

آج جو چیز پریشان کن ہے وہ آزاد صنفی تحریک کے نتائج ہیں ۔ کم عمر لڑکیاں جو ۱۲ اور ۱۳ سال کی عمر سے مانع حمل گولیوں پر رہنے لگتی ہیں اور وہ لڑکیاں جو ۱۵ اور ۱۶ سال کی عمر میں حاملہ ہو جاتی ہیں، ان کے ساتھ کیا بیت رہی ہے ۔ صنفی تعلق مرد کے لیے کافی مختلف معنی رکھتا ہے ۔ وہ ایسا کر سکتے ہیں کہ محبت کریں اور چھوڑ دیں ۔ جب یونیورسٹی جانے کا وقت آتا ہے تو وہ نہایت آسانی

سے روانہ ہو سکتے ہیں۔ عورتیں مرد سے مختلف حساسیت رکھتی ہیں۔ وہ اپنے دماغ، اپنے دل اور اپنے وجود کے ساتھ محبت کرتی ہیں۔ ایک ٹوٹا ہوا محبت کا رشتہ انھیں بالکل توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ میں نے یہ بات اپنے قریب کے لوگوں میں ہوتے ہوئے دیکھی ہے۔ اور یہ دہشتناک ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سوسائٹی میں بھی بگاڑ پایا جاتا ہے اور مغرب کی سوسائٹی میں بھی۔ مگر دونوں میں ایک فرق ہے۔ مسلمانوں کا بگاڑ اسلامی اصولوں پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ خود ان کے اصولوں پر عمل کی پیداوار ہے۔

مصنوعی مسائل

کیلی فورنیا کے ایک کروڑ پتی رابرٹ گراہم (Dr Robert Graham) نے ایک انوکھا بینک قائم کیا۔ اس کا نام انھوں نے نوبیل اسپرم بینک (Nobel Spermbank) رکھا۔ اس "بینک" میں نوبیل انعام یافتہ افراد کے مادۂ منویہ کو حاصل کرکے محفوظ کیا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے عورتوں کو بار آور کیا جائے اور زیادہ اعلیٰ ذہانت (Above-average intelligence) والے بچے پیدا کیے جائیں۔ بانی کا کہنا تھا کہ یہ بینک اس نے نااہل شوہروں (Infertile husbands) کے لیے قائم کیا ہے۔ تاہم جدید خواتین کی اباحیت پسندی اس پابندی کو ختم کر رہی ہے۔ بہت سی خواتین نکاح کے بغیر بچہ پیدا کرنا چاہتی ہیں، نیز وہ چاہتی ہیں کہ ان کی اولاد اعلیٰ استعداد کی مالک ہو، ایسی خواتین آزادانہ طور پر اس بینک کی خدمات حاصل کر رہی ہیں۔

انھیں خواتین میں سے ایک کیلی فورنیا کی ڈاکٹر آفٹن بلیک (Afton Blake) ہے۔ اس کی عمر اس وقت ۴۴ سال ہے۔ اس نے مذکورہ نوبیل اسپرم بینک سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اپنے لیے جس قسم کی اولاد چاہتی تھی، اس کے مطابق اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ نمبر ۲۸ (Number 28) کا مادہ حاصل کرے۔ واضح ہو کہ اس بنک میں جن لوگوں کے مادۂ منویہ جمع کیے گیے ہیں ان کو ان کے نام سے پکارا نہیں جاتا۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کو ایک نمبر دیا گیا ہے اور اسی خاص نمبر سے اس کو یاد کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر بلیک، نمبر ۲۸۰ کے مادہ کو اپنے رحم میں داخل کرکے حاملہ ہوئی۔ مقرر وقت پر اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام اس نے ڈورون (Doron) رکھا۔ یہ یونانی

لفظ ہے جس کے معنی تحفہ یا عطیہ کے ہوتے ہیں۔ یہ بچہ اب چار سال سے زیادہ کا ہو چکا ہے اور وہ اب اسکول جانے لگا ہے۔ اس کی تصویر ہندستان ٹائمس، ستمبر ۱۹۸۶ (میگزین صفحہ ۴) پر شائع ہوئی ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف کا نمائندہ آئن برو ڈی (Ian Brodie) مذکورہ خاتون سے اس کے لاس اینجلس (کیلی فورنیا) کے مکان پر ملا۔ اس کی رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر بلیک کی خوشیاں دھیرے دھیرے غم میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ باپ کے بغیر بچہ کی ولادت اس کے لیے طرح طرح کے مسئلے پیدا کر رہی ہے۔ ان مسائل کی طویل فہرست میں سے ایک یہ ہے کہ نومولود اب بولنے لگا ہے۔ وہ بار بار پوچھتا ہے کہ میرے باپ کہاں ہیں۔ ڈاکٹر بلیک نے بتایا کہ ایک بار ایسا ہوا جب کہ ڈورون مجھ سے غصہ ہو گیا۔ اس نے کہا کہ وہ باہر جا رہا ہے تاکہ وہ اپنے باپ کے ساتھ رہے:

There was one occasion when Doron got angry with me. He said he was going off to live with his dad.

خاتون کے لیے شوہر کے بغیر اولاد حاصل کرنا پہلے ایک دلچسپ تجربہ معلوم ہوتا تھا، مگر اب وہ نازک مسائل کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ نومولود ڈورون اپنے لیے ایک باپ سے محروم ہے:

One thing Doron is deprived of is a Daddy.

فطرت کے نظام سے انحراف کے بعد آدمی کے لیے ایسے عجیب و غریب مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن کا اس نے پہلے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

مناکحت نہ کہ مسافحت

ٹائم (نیویارک) انگریزی زبان کا مشہور ہفتہ وار میگزین ہے۔ وہ دنیا کے تقریباً ۹۵ ملکوں میں پڑھا جاتا ہے۔ مجموعی طور اس کی اشاعت ۶ ملین ہے۔ (ٹائم ۲ فروری ۱۹۸۷)

اس میگزین کی ہر اشاعت میں ایک تحقیقی مضمون ہوتا ہے جس کو اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی ٹیم خصوصی ریسرچ کے ذریعہ تیار کرتی ہے۔ اس مضمون کو سرورق کا مضمون (Cover story) کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کا ایک مضمون اس کے شمارہ ۱۶ فروری ۱۹۸۷ میں شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے عظیم پژمردگی (The Big Chill) اس مضمون میں مختلف پہلوؤں سے اس نئی

بیماری کی تحقیق کی گئی ہے جس کو ایڈز (AIDS) کہا جاتا ہے۔

ایڈز کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ایک متعدی مرض ہے۔ چنانچہ یہ مرض اب نئے قسم کے اچھوت پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ جو مرد یا عورت ایک بار ایڈز میں مبتلا ہو جائیں، لوگ ان سے دور بھاگنے لگتے ہیں، کیوں کہ انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ انھیں بھی یہ مرض لگ جائے گا۔ بعض مغربی ملکوں میں باربر شاپ پر اس قسم کے نشانات نظر آنے لگے ہیں جن کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ شیو کے لیے یہاں نہ آئیں :

No shaves here.

حکومتی ذمہ داروں نے اس کو ایڈز ہسٹریا کہا ہے۔ تاہم باربر حضرات کا کہنا ہے کہ مریض کے چہرہ کا پسینہ یا شیو کرتے ہوئے معمولی سا خون نکل آنا بھی بیماری کے پھیلنے کا سبب بن سکتا ہے، اس لیے احتیاطی طور پر ایسے مریضوں سے بچنا ضروری ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۹ فروری ۱۹۸۷)

ٹائم کے محققین کی جماعت نے تفصیلات پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ اس مہلک مرض کا سب سے بڑا سبب آزادانہ جنسی تعلق (Promiscuity) ہے۔ اسی بنا پر اس مرض کو رنڈی کا مرض (Gay disease) کہا جاتا ہے۔ یہ مرض بہت تیزی سے پھیلتا ہے۔ چنانچہ اس نے جدید دنیا میں جیومیٹرک انتشار (Geometric explosion) کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ایڈز کی ہلاکت خیزی کو دیکھ کر ایک مبتلائے مرض نے کہا :

Oh, what will happen in this world if we have to die
when we make love? AIDS is the century's evil (p. 32).

آہ، اس دنیا کا کیا ہوگا اگر ہمارا حال یہ ہو جائے کہ ہم کو محبت کرنے کے لیے مرجانا پڑے۔ ایڈز اس صدی کی آفت ہے۔

آزادانہ جنسی تعلق، جس کو مغرب میں خوبصورت طور پر آزادانہ محبت کہا جاتا ہے، وہ اب لوگوں کے لیے عذاب بنتا جا رہا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۹۱ تک امریکہ میں 270,000 افراد اس مرض میں مبتلا ہو چکے ہوں گے۔ جن کا علاج کرنا امریکی ڈاکٹروں کے قابو سے باہر ہو جائے گا۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے جو مخالف ایڈز مہم (Anti-AIDS campaign) چلائی

جارہی ہے، اس کا خاص نعرہ ہے ــــ احتیاط کے ساتھ محبت کیجئے :

Love Carefully

'احتیاط کے ساتھ محبت کیجئے' کی نصیحت کو اگر ہم لفظ بدل کر کہیں تو وہ یہ ہوگی کہ نکاح کے ساتھ محبت کیجئے، بے نکاح محبت کا طریقہ چھوڑ دیجئے۔

ڈی ایچ لارنس (D.H. Lawrence) کا ناول "لیڈی شیٹرلی کا محبوب" (Lady Chatterly's Lover) پہلی بار ۱۹۲۸ میں چھپا۔ اس میں آزادانہ جنسی تعلق کی وکالت کی گئی تھی۔ اس وقت اس ناول کو فحش سمجھا گیا اور جلد ہی اس کو بند (Ban) کردیا گیا۔ اس کے بعد حالات بدلے اور ۱۹۵۹ میں دوبارہ اس ناول کو چھاپنے اور فروخت کرنے کی قانونی اجازت دے دی گئی۔ اس ناول نے امریکی نوجوانوں پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کے اندر آزادانہ جنسی تعلقات عام ہوگئے۔ مگر اب دوبارہ آواز اٹھ رہی ہے کہ اس ناول پر پابندی لگائی جائے۔

یہ ایڈز کا کرشمہ ہے۔ آزادانہ جنسی تعلقات نے ایڈز کی پُراسرار مگر حد درجہ مہلک بیماری پیدا کی ہے۔ اور اب مغرب کے لوگ مجبور ہو رہے ہیں کہ آزادانہ جنسی تعلق کے بارے میں اپنے خیالات پر نظر ثانی کریں (۲۴)

ٹائم کے الفاظ میں، ہر جنسی ترغیب پر دوڑنے والے لوگ، جلد یا بدیر، جنسی احتیاط اور پابندی کے ایک نئے دور کی حقیقت سے دوچار ہوں گے :

Swingers of all persuasions may sooner or later be faced with the reality of a new era of sexual caution and restraint (p. 24).

مذکورہ تبصرہ کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ فطرت کے حقائق انسان کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ آزادانہ جنسی تعلق کے طریقہ کو چھوڑ دے اور پابند جنسی تعلق کے طریقہ کو اختیار کرے۔

شریعتِ خداوندی میں عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلق کو نکاح کی قید کے ساتھ وابستہ کیا گیا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے آزادی پسند لوگوں نے کہا کہ یہ انسان کے اوپر غیر ضروری قسم کی پابندی ہے۔ اس سلسلہ میں بے شمار لٹریچر شائع کیا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ممالک میں

آزادانہ جنسی تعلق ایک عمومی رواج کی صورت اختیار کرگیا۔
لوگ خوش تھے کہ انھوں نے شریعت اور مذہب کی پابندی سے آزاد ہو کر لامحدود عیش کا راز دریافت کر لیا ہے۔ مگر بیسویں صدی کے ربع آخر میں پہونچ کر آزادانہ جنسی تعلق نے نئے نئے امراض پیدا کر دیئے۔ اور بالآخر "ایڈز" کی مہلک بیماری نے لوگوں کو یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ شریعتِ خداوندی کا طریقہ ہی فطری طریقہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں آزادانہ جنسی تعلق انسانی صحت کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ٹائم میگزین کے مذکورہ شمارہ (صفحہ ۲۴) میں ایک مرد اور ایک عورت کو اس حال میں دکھایا گیا ہے کہ ان کو ایک خوفناک سانپ نے چاروں طرف سے لپیٹ لیا ہے۔
قرآن میں ہدایت کی گئی تھی کہ عورتوں کے ساتھ جنسی تعلق قید نکاح میں لاکر کرو نہ کہ بدکاری کے طور پر کرنے لگو (محصنین غیر مسافحین، مائدہ ۵) مفسرین نے قرآن کی اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے کہ عورتوں کے ساتھ نکاح کے ذریعہ تعلق قائم کرو نہ کہ زانی بن کر (یعنی متزوجین غیر زانین) تجربات نے بتایا کہ یہی طریقہ صحیح فطری طریقہ ہے۔ مناکحت اور مسافحت میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک اگر زندگی ہے تو دوسرا موت۔ ایک طریقہ انسانی سماج کے لیے رحمت ہے تو دوسرا طریقہ انسانی سماج کے لیے عذاب۔
ٹائمس آف انڈیا (۱۹ مارچ ۱۹۸۷) نے ایڈز روک (AIDS Check) کے عنوان کے تحت ایک امریکی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی حکومت نے اپنے شہریوں کو بعض تدبیریں اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے جس کے ذریعہ وہ ایڈز کی مہلک بیماری سے بچ سکتے ہیں۔ ان تدبیروں میں سب سے زیادہ خاص تدبیر جنسی پرہیز ہے:

The US government has released its new education plan
which stresses sexual abstinence as a preventive measure.

یہ واقعہ انسانی قانون پر خدائی شریعت کی برتری کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ خدائی شریعت کو ماننے والا ایک شخص اگر خدانخواستہ مسافحت کا طریقہ اختیار کرے اور اس کو ایڈز کی بیماری لگ جائے تو اس کو اصولِ شریعت سے انحراف کا نتیجہ کہا جائے گا۔ اس کے برعکس مغربی

تہذیب کا ایک انسان منافقت کرکے ایڈز میں مبتلا ہو تو وہ عین اس کے اصول کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ پہلے واقعہ کی صورت میں ایک انسان کی غلطی ثابت ہوتی ہے جب کہ دوسرے واقعہ کی صورت میں خود تہذیب جدید کے اصول کی غلطی۔

غیر فطری مساوات کا نتیجہ

"کوئی شخص جو مجھ کو جانتا ہو وہ یقین نہیں کر سکتا کہ میں نے کیا کیا ہے" ایک ۳۵ سالہ امریکی نے کہا۔ جو کہ بظاہر ایک سنجیدہ اور معصوم چہرہ والا آدمی ہے۔ اس نے اپنی عورت کو مارنے کی کہانی بیان کی جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ اس نے گلا گھونٹ کر اس کو بے ہوش کر دیا۔ اس نے اس کو کیچڑ میں دھکیل دیا۔ اس نے چھری سے اس کا گلا کاٹ دینا چاہا، وغیرہ۔

"میں نے کیسے ایسا کیا؟" اس نے تعجب کے ساتھ کہا۔ "لوگ مجھ کو ایک اچھے آدمی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ میرا اپنا ایک بزنس ہے، میں شراب نہیں پیتا، میں سگریٹ نہیں پیتا۔ میں دوسری عورتوں کا پیچھا نہیں کرتا"۔ اس کے باوجود ایسا ہوا کہ اس شخص نے بار بار اپنی بیوی کو مارا۔

امریکی ماہنامہ ریڈرس ڈائجسٹ (مارچ ۱۹۸۷) میں اس طرح کے بہت سے امریکیوں کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ ڈائجسٹ کے اس مضمون کا عنوان ہے۔ لوگ کیوں ان عورتوں کو مارتے ہیں جن سے وہ محبت کرتے ہیں:

Why Men Hurt The Women They Love

پانچ صفحہ کے اس مضمون میں عورتوں کو مارنے (Wife-beating) کی بہت سی مثالیں نقل کرتے ہوئے حسب ذیل رپورٹ دی گئی ہے:

According to one survey in America, a woman is battered by a husband or boy-friend every 18 seconds. And every year, it is estimated that more than a million of these women need medical help. Every day, four die (p. 135).

ایک جائزہ کے مطابق امریکہ میں ہر ۱۸ سکنڈ میں ایک عورت ماری جاتی ہے۔ کبھی اپنے شوہر کے ہاتھوں اور کبھی اپنے دوست لڑکے کے ہاتھوں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ان میں سے ایک

ملین سے زیادہ عورتوں کو ہر سال طبی امداد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر ایک دن میں چار عورتیں مرجاتی ہیں۔

امریکہ کے ترقی یافتہ اور مہذب معاشرہ میں عورتوں کو مارنے کی یہ برائی کیوں ہے۔ اس پر موجودہ زمانہ میں کافی تحقیق کی گئی ہے۔ مسز سوسن شسٹر (Susan Schechter) نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے عورتیں اور مردانہ تشدد (*Women and Male Violence*) ان کا جواب یہ ہے کہ یہ جابرانہ کنٹرول حاصل کرنے کی ایک صورت ہے:

It is a pattern of coercive control (p. 136).

ریڈرز ڈائجسٹ کی مذکورہ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے:

"Any batterer can tell you why he hit her," says Ellen Pence, director of the Domestic Abuse Intervention Programme. "He wanted control over her, he wanted his own way" (p. 140.)

کوئی بھی مارنے والا مرد آپ کو بتائے گا کہ اس نے عورت کو کیوں مارا۔ ڈی اے آئی پی کے ڈائرکٹر الن پنس نے کہا: "اس نے عورت کے اوپر کنٹرول حاصل کرنا چاہا۔ اس نے چاہا کہ اس کی اپنی مرضی چلے"۔

مذکورہ بیان کی روشنی میں غور کیجیے تو یہ صورت حال براہ راست طور پر جدید مغربی تہذیب کا نتیجہ ہے۔ جدید مغربی تہذیب نے عورت کو مرد کے برابر قرار دیا۔ اس نے عورتوں کے لیے علٰحدہ روزگار کا انتظام کرکے انھیں یہ موقع دیا کہ وہ مردوں سے آزاد اپنی مستقل معاشی بنیاد حاصل کرسکیں۔ اس بنا پر عورتوں کے اندر برابری کا احساس شدت کے ساتھ پیدا ہوگیا۔ تاہم یہ احساس مصنوعی تھا۔ کیوں کہ مذکورہ معاشی بندوبست کے باوجود مغربی تہذیب کے لیے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ وہ فطرت کی اس تقسیم کو بدل دے کہ مرد پیدائشی طور پر صنف قوی ہے اور عورت پیدائشی طور پر صنف ضعیف۔

اس مصنوعی مساوات کے نتیجہ میں ان ملکوں کی گھریلو زندگی ایک تضاد کا شکار ہوگئی۔ ان گھروں میں ایسی عورتیں رہنے لگیں جو اپنی جسمانی بناوٹ کے اعتبار سے تو مرد کے مقابلہ

میں اسی طرح کمزور تھیں جس طرح ہر دور کی عورتیں کمزور رہی ہیں۔ مگر مزاج کے اعتبار سے وہ اپنے آپ کو مردوں کا ہمسر سمجھ رہی تھیں۔ مرد صنف قوی ہونے کی وجہ سے عورتوں پر اپنا کنٹرول قائم کرنا چاہتا تھا۔ مگر عورتوں نے اپنے مصنوعی مزاج کی بنا پر کنٹرول قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کش مکش کا نتیجہ یک طرفہ طور پر عورتوں کے حق میں بُرا ثابت ہوا۔

عورت اور مرد دونوں اگر واقعۃً حیاتیاتی طور پر یکساں ہوتے تو کبھی مرد عورت کو مارتا اور کبھی عورت مرد کو مارتی۔ مگر چونکہ یہاں معاملہ یکسانیت کا نہ تھا، اس لیے وہی صورت پیش آئی جو خربوزے اور چھری کے ٹکراؤ میں پیش آتی ہے۔ مرد ہمیشہ مارنے والا ثابت ہوا۔ اور عورت ہمیشہ مار کھانے والی۔

اس معاملہ میں جدید عورت کی مظلومی اتنی زیادہ بڑھی ہوئی ہے کہ وہ بھاگ کر بھی اپنے آپ کو نہیں بچا سکتی۔ رپورٹ کے مطابق ایک عورت نے کہا کہ اگر کوئی عورت بھاگنا چاہے تو اس کا شوہر اس کو دھمکی دیتا ہے کہ میں تم کو پکڑوں گا اور تمہیں مار ڈالوں گا۔ اکثر سنگین ضربیں اور موتیں اس وقت پیش آتی ہیں جب کہ عورتیں باہر بھاگ جانا چاہتی ہیں:

If you try to leave, a husband may threaten, "I'll find you and kill you." Many of the worst injuries and deaths happen as women try to get away (p. 137).

فطرت کی تقسیم میں مرد کو عورت کے اوپر قوام بنایا گیا ہے۔ اب اگر اس تقسیم کو مصنوعی طور پر بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس کا انجام وہی ہوگا جس کی ایک تصویر مذکورہ بالا رپورٹ میں دکھائی دیتی ہے۔ جدید تہذیب سے پہلے کبھی ایسا نہ تھا کہ عورتیں اس طرح اپنے گھروں میں ماری جائیں۔ یہ صرف دور جدید کی خصوصیت ہے۔ اور یہ براہ راست طور پر اس مصنوعی نظریۂ مساوات کا نتیجہ ہے جو تاریخ میں پہلی بار مغربی تہذیب میں اختیار کیا گیا۔ تاریخ کے پچھلے دور میں بھی عورت کو مارنے کے واقعات ہوتے تھے مگر وہ استثنائی طور پر صرف نچلے طبقات میں پیش آتے تھے۔ لیکن جدید حالات نے ان کو بڑھا کر اعلیٰ طبقات کے دائرہ تک پہونچا دیا۔ اس نے ایسے واقعات کو مہذب انسانوں کا مسئلہ بنا دیا جب کہ اس سے

پہلے وہ صرف غیر مہذب انسانوں کے مسئلہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

جدید عورت کی مظلومی

ایک سیاح امریکہ گیا۔ ایک بار وہ وہاں کے ایک کلب میں تھا جہاں لڑکے اور لڑکیاں مل کر رقص کر رہے تھے۔ سیاح کنارے کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک ایک امریکی لڑکی آئی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اداس لہجے میں کہا: مسٹر سیاح، کیا میرے اندر گلیمر (Glamour) نہیں "کیوں نہیں، تمہارے اندر تو گلیمر ہے" سیاح نے جواب دیا۔ "پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی لڑکا مجھے ڈیٹ نہیں دیتا" لڑکی نے کہا۔

ڈیٹ (Date) کے معنی انگریزی زبان میں تاریخ کے ہوتے ہیں۔ مغربی ملکوں میں یہ لفظ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک رواج کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ ہے ایک صنف کا دوسری صنف کو کسی مقررہ تاریخ کو مدعو کرنا۔ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کا تجربہ کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ڈیٹ دے کر ایک دوسرے کو اپنے پاس بلاتے ہیں۔ مغربی زندگی میں یہ رواج اتنا زیادہ عام ہو گیا ہے کہ جس لڑکی کو کوئی لڑکا "ڈیٹ" نہ دے وہ اپنے آپ کو کچھ کم سمجھنے لگتی ہے۔ اس کا خیال یہ ہو جاتا ہے کہ شادی کے بازار میں اس کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

ڈیٹنگ کا یہ طریقہ ابتداءً صرف گفت گو اور ملاقات تک محدود تھا۔ اب بڑھتے بڑھتے وہ باقاعدہ جنسی تعلقات تک پہونچ گیا ہے۔ مغربی لڑکوں کے لیے یہ ایک مہذب طریقہ بن گیا ہے کہ وہ ڈیٹ دے کر ایک لڑکی کو ایک تنہا کمرہ میں بلائیں اور پھر وہاں اس کے ساتھ جبری طور پر بدکاری کریں۔

اس سلسلہ میں امریکی میگزین ٹائم (۲۳ مارچ ۱۹۸۷) نے ایک سبق آموز رپورٹ شائع کی ہے۔ اس کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے: جب ڈیٹ زناکاری میں تبدیل ہو جائے۔

سوسن (Susan) ۲۲ سال کی ایک غیر شادی شدہ خاتون ہے۔ اس کی ملاقات ایک مرد سے ہوئی۔ جب دونوں رخصت ہونے لگے تو مرد نے اس کو ڈیٹ دی۔ اس کے مطابق دونوں ایک کمرے میں جمع ہوئے۔ ۴۵ منٹ تک وہ ٹیلی وزن دیکھتے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں

کرتے رہے۔ اس کے بعد مرد اس کے پاس آگیا اور آگے کے افعال کرنا شروع کردیئے۔ عورت ٹھہرو ٹھہرو کہتی رہی۔ مگر مرد نہیں مانا۔ اس نے کہا کہ تم محض تکلف میں ایسا کہہ رہی ہو، ورنہ حقیقۃً تم مجھ کو روکنا نہیں چاہتی ہو:

You really don't want me to stop.

اس کے بعد اس کمرہ میں وہ سب کچھ ہوا جس کو قانونی اصطلاح میں "زنا بالجبر" کہا جاتا ہے۔

اس قسم کی ڈیٹ ریپ (Date rape) موجودہ ترقی یافتہ ملکوں میں عام ہو چکی ہے۔ ڈیٹ کے ذریعہ بدکاری کرنا، بعض محققین کے نزدیک، آج کا بہت بڑا سماجی مسئلہ ہے۔ کالج کے طلبہ کا جائزہ یہی بتاتا ہے جو کہ ۶۲۰۰ مردوں اور عورتوں کے درمیان ۳۲ کیمپس میں تین سال تک کیا گیا۔ ماہر نفسیات میری کاس نے پایا ہے کہ جن عورتوں کو اس قسم کے تجربات ہوئے جو کہ قانون کے مطابق زنا بالجبر کی تعریف میں آتے ہیں، ان میں آدھے سے زیادہ تعداد ڈیٹ کے ذریعہ بدکاری کرنے کی تھی۔ ایک لکچرر اینڈری پیرٹ نے اندازہ لگایا ہے کہ دو کیمپس جن کا اس نے جائزہ لیا، ان کی ۲۰ فیصد خواتین کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۵ میں زنا بالجبر کے واقعات کی تعداد ۸۷۳۴۰ تھی۔ میری کاس نے کہا: ڈیٹ کے موقع پر بدکاری کا خطرہ اس سے زیادہ ہے کہ اچانک جھاڑی سے نکل کر کوئی اجنبی شخص ایسا کرنے لگے۔ آزادی نسواں کے بعض علم برداروں کا کہنا ہے کہ امریکہ میں ایک بدکاری کلچر پیدا ہو چکا ہے جس میں مردوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ جارحانہ

When the Date Turns into Rape

Date rape, according to some researchers, is a major social problem, so far studied mostly through surveys of college students. In a three-year study of 6,200 male and female students on 32 campuses. Kent State Psychologist Mary Koss found that 15% of all women reported experiences that met legal definitions of forcible rape. More than half those cases were date rapes. Andrea Parrot, a lecturer at Cornel University, estimates that 20% of college women at two campuses she surveyed had been forced into sex during their college years or before, and most of these incidents were date rapes. The number of forcible rapes reported each year — 87,340 in 1985 — is believed to be about half the total actually committed. Says Koss: You're a lot more likely to be raped by a date than by a stranger jumping out of the bushes. Some feminists argue that the U.S. has a 'rape culture' in which males are encouraged to treat women aggressively and women are trained to submit (p. 35).

انداز اختیار کریں اور عورتیں ان کے آگے سپر ڈال دیں۔

مسٹر سری پرکاش (سابق گورنر مہاراشٹر اور پاکستان میں پہلے ہندستانی ہائی کمشنر) نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۷ میں انھوں نے ایک انگریز سے پوچھا کہ تم لوگ ہم ہندستانیوں کو حقیر کیوں سمجھتے ہو۔ انگریز نے اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا اس میں سے ایک بات یہ تھی: "آپ لوگ شادی کے سلسلہ میں بہت سی پابندیاں ملحوظ رکھتے ہیں۔ یورپ کا نظریہ یہ ہے کہ نوجوان لڑکا اور لڑکی خود ایک دوسرے کو پسند کر کے شادی کر لیں۔ آپ کے یہاں ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ سماجی بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں (صفحہ ۱۷۲)

آزادیٔ نسواں کی تحریک کے آغاز میں یہ بات بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ مگر غیر شادی شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان سے ہر قسم کی پابندیوں کو اٹھانے کا نتیجہ آخر کار قبل از نکاح صنفی تعلقات اور پھر زنا بالجبر کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس تجربہ نے بتایا کہ صنفی تعلقات کے معاملہ میں "پابندی" کا اصول ہی صحت مند اصول ہے۔ اس معاملہ میں "آزادی" کا اصول معاشرہ کو بربادی کے سوا اور کہیں نہیں پہونچاتا۔

ایک حدیث

"ڈیٹ" کا مذکورہ مغربی رواج اس بات کو جائز قرار دیتا ہے کہ غیر شادی شدہ عورت اور مرد تنہائی میں ایک دوسرے سے ملیں اور جتنی دیر تک چاہیں ایک ساتھ اپنے اوقات گزاریں۔ اس رواج نے مغرب میں جو اندوہناک صورت حال پیدا کی ہے اس کو نظر میں رکھیے اور پھر مندرجہ ذیل حدیث پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شریعت نے اس معاملہ میں جو اصول مقرر کیے ہیں وہ کس قدر بامعنی ہیں:

من کان یومن باللّٰہ والیوم الآخر فلا یخلوَنّ بامرأۃ لیس معہا ذومحرمٍ منہا فانّ ثالثہما الشیطان (احمد)

جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ ہرگز وہ کسی ایسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ رہے جس کے ساتھ کوئی محرم موجود نہ ہو۔ کیوں کہ وہاں ان کا تیسرا شیطان ہوتا ہے۔

غیر مرد اور عورت اگر تنہائی میں ملیں تو شیطان کو فوراً انھیں ورغلانے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن اگر ملاقات کے وقت کوئی محرم رشتہ دار بھی ساتھ موجود ہو تو شیطان کو ان کی نفسیات میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ ایک صورت میں ملاقات کسی حد پر نہیں رکتی۔ اور دوسری صورت میں ملاقات ایک حد پر رہتی ہے، وہ اس سے آگے جانے نہیں پاتی۔

پاکبازی کی اہمیت

موجودہ زمانہ میں صنفی اباحیت کا طریقہ بہت بڑے پیمانہ پر اختیار کیا گیا۔ مغربی دنیا میں نکاح سے پہلے جنسی تعلق قائم کرنا عام ہوگیا، حتی کہ اس کو ایک فلسفہ بنا دیا گیا۔ کہا گیا کہ مستقل شریک حیات کے انتخاب کے لیے یہ زیادہ محفوظ اور بہتر طریقہ ہے کہ پیشگی طور پر پوری طرح اس کا تجربہ کر لیا جائے۔ مرد اور عورت نکاح سے پہلے اسی طرح کھلے طور پر ایک دوسرے سے ملنے لگے جس طرح ایک مرد اور ایک عورت نکاح کے بعد آزادانہ طور پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

مگر یہ طریقہ فطرت سے ٹکرا گیا۔ تخلیقی نظام کی خلاف ورزی نے ایسے ایسے مسائل پیدا کیے جن کا حل موجودہ ڈھانچہ میں ناممکن نظر آنے لگا۔ ان نتائج نے لوگوں کے اندر نظر ثانی کا ذہن پیدا کیا۔ حتی کہ اب خود وہی لوگ اس طریقہ کے مخالف ہو رہے ہیں جو اس سے پہلے نہایت پرجوش طور پر اس کی حمایت کر رہے تھے۔

اس سلسلہ میں امریکہ کی ایک بڑی سبق آموز رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اے ایف پی (AFP) کے حوالہ سے ٹائمس آف انڈیا (۱۸ مارچ ۱۹۸۷) نے اس رپورٹ کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:

> The survey, conducted among more than 1,400 college students aged 18-19, reveals that young women are more attracted to male virgins than they were 10 years ago. The New York psychologist, Mr Srully Blotnick, whose company carried out the survey, said: "The male virgin may not make the best lover, but usually he's eager to learn — and he's the safest." The safest, that is, from the risk of AIDS and other sexually transmittable diseases. Mr Blotnick said it was the risk of sexually-related diseases that makes the male virgins so attractive to women. His latest survey showed that 22 per cent of college women now want their next lover to be a virgin, compared to just nine per cent 10 years ago.

ایک جائزہ جو ۱۴۰۰ سے زیادہ کالج کے طلبار کے درمیان لیا گیا۔ جن کی عمریں ۱۸-۱۹ سال کی تھیں، بتاتا ہے کہ امریکہ کی نوجوان عورتیں ازدواجی تعلق کے لیے پاکباز مردوں کی طرف زیادہ راغب ہیں، جب کہ دس سال پہلے ایسا نہ تھا۔ نیویارک کے ماہر نفسیات مسٹر سرولی بلاٹنک جن کی کمپنی نے یہ جائزہ لیا ہے، انھوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ پاکباز مرد بہت اچھا محبت کرنے والا نہ ہو مگر عام طور پر وہ سیکھنے کا شوق رکھتا ہے اور وہ محفوظ ہے ۔ وہ ایڈز اور دوسری متعدی جنسی بیماریوں کا خطرہ اپنے ساتھ لیے ہوئے نہیں ہوتا۔ مسٹر بلاٹنک نے کہا کہ یہ دراصل جنس سے تعلق رکھنے والی بیماریوں کا خطرہ ہے جس نے پاکباز مرد کو عورتوں کی نظر میں اتنا زیادہ جاذب بنا دیا ہے۔ ان کے اس جائزہ نے بتایا ہے کہ کالج کی عورتوں میں اب ۲۲ فی صد وہ ہیں جو پاکباز مرد چاہتی ہیں، جب کہ دس سال پہلے اس قسم کی عورتوں کی تعداد صرف ۹ فی صد تھی ۔

ہندستان ٹائمس (۱۹ مارچ ۱۹۸۷) نے امریکی نیوز ایجنسی کی اس خبر کو شائع کرتے ہوئے اس پر یہ سرخی قائم کی ہے : پاکباز مرد کی مقبولیت :

Male virgins in vogue

شادی کے لیے پاکبازی کی شرط طرفین کے لیے صنفی آزادی میں رکاوٹ تھی۔ چنانچہ آزادیٔ نسواں کی تحریک کے ابتدائی دور میں اس کا مذاق اڑایا گیا اور اس کو محض ایک مذہبی افسانہ قرار دیا گیا ۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ یہ مذہبی افسانہ نہیں بلکہ ایک حیاتیاتی حقیقت ہے ۔

اگر آپ اپنے لیے درست اور بے ضرر جوڑا چاہتے ہیں تو آپ کو پاکبازی کی شرط کو قبول کرنا پڑے گا۔ پاکبازی اس سے پہلے صرف ایک مذہبی حکم نظر آتی تھی، آج وہ صحت مند ازدواجی تعلق کے لیے ایک لازمی اصول کی حیثیت اختیار کر گئی ہے ۔ خدائی احکام کے مبنی برحقیقت ہونے کا یہ کیسا عجیب ثبوت ہے جو خود انسانی تجربہ نے موجودہ زمانہ میں فراہم کیا ہے ۔ اس کے بعد بھی آدمی اگر خدائی شریعت کی اہمیت کو نہ مانے تو یہ اس کی دھاندلی ہوگی نہ کہ مبنی برحقیقت رویہ ۔

سرپرستی سے محروم

ہفتہ وار ٹائم (۲۳ مارچ ۱۹۸۷) نے امریکہ کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے بچوں کی خودکشی (Teen Suicide) اس رپورٹ میں دکھایا گیا ہے کہ امریکہ میں ۱۰ سال اور ۲۰ سال کے درمیان کی عمر کے نوجوانوں میں خودکشی کے واقعات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ کے مقابلہ میں یہ تعداد اب تین گنا زیادہ ہو گئی ہے۔ ۱۹۸۵ میں ایک لاکھ آبادی پر ساٹھ نوجوانوں (اور اتنے ہی بڑوں) نے خودکشی کی۔ یہاں ہم تین خواتین کے تاثرات درج کرتے ہیں جو امریکی بچوں کی خودکشی کے سلسلہ میں مذکورہ رپورٹ میں نقل کیے گئے ہیں :

Says Barbara Wheeler, a suicide-prevention specialist in Omaha: "I don't think they think about being dead. They think it's a way of ending pain and solving a problem."
"Everybody is in such a rush that we don't take the time to listen to our youngsters," says Elaine Leader, co-founder of a teen crisis hotline at Cedars-Sinai Medical Centre in Los Angeles. "When something like this happens, I think a lot about my kids," says Barbara O'Leary, a hostess at a local diner. "I have to hope I raised them right. These are the dangerous years. You don't always know what's going on inside their heads" (pp. 18–19).

باربرا وہیلر نے کہا کہ میرا یہ خیال نہیں کہ خودکشی کے وقت یہ بچے سمجھتے ہوں کہ وہ مرنے جا رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ درد کو دور کرنے اور مسئلہ کو حل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ ایلین لیڈر نے کہا کہ ہر شخص اس طرح دوڑ بھاگ میں ہے کہ ہمارے پاس وقت نہیں کہ ہم اپنے بچوں کو سن سکیں۔ باربرا اولیری نے کہا کہ جب اس قسم کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو میں اپنے بچوں کے بارہ میں بہت زیادہ سوچنے لگتی ہوں۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ میں ان کو درست طور پر پرورش کر سکوں۔ یہ ان کی زندگی کے خطرناک سال ہیں۔ آپ ہمیشہ یہ جان نہیں سکتے کہ ان کے دماغ میں کس طرح کے خیالات گھوم رہے ہیں۔

ٹائم (۲۳ مارچ ۱۹۸۷) کی مذکورہ رپورٹ پڑھنے کے بعد کچھ امریکی باشندوں نے مذکورہ ہفت روزہ کے نام خطوط لکھے ہیں جو ٹائم (۱۳ اپریل ۱۹۸۷) میں چھپے ہیں۔ ایک مکتوب نگار لکھتے ہیں کہ میرا دل ان خاندانوں کے لیے خون بہاتا ہے جن کے بچوں نے خودکشی کی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں۔ میرے ۱۶ سال کے پوتے نے اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ ہمارا خاندان زندگی بھر حیران

رہے گا کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور ہم کبھی اس کو جان نہ سکیں گے ؛

My heart bleeds for the families of the teen suicides. I know. My 16-year old grandson committed suicide by hanging. Our family will spend the rest of our lives wondering why, and we will never know.

Eloise Gradin, Pensacola Beach, Florida.

ترقی یافتہ ملکوں کے نوجوانوں میں خودکشی کا رجحان کیوں ہے۔ اس کی واحد وجہ ان کی اپنے سرپرستوں سے محرومی ہے۔ ان ملکوں میں خاندانی انتشار کا مسئلہ بہت بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا ہے اور یہی چیز ہے جس نے نوجوانوں کے اندر خودکشی کا رجحان پیدا کر دیا ہے۔ وہ خاندان کی شفقت سے محروم ہو کر پرورش پاتے ہیں، اور بڑے ہو کر طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ چیز بعض اوقات انھیں خودکشی تک پہونچا دیتی ہے۔

ان ملکوں میں خاندانی انتشار پیدا ہونے کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے ازدواجی زندگی کی بنیاد ذمہ داری کے بجائے لذت پر قائم کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ازدواجی تعلق میں مستقل تقدس کی قدر باقی نہ رہی۔ لوگ لذّت کی خاطر ایک دوسرے سے ملنے اور لذت ختم ہونے پر ایک دوسرے سے الگ ہونے لگے۔ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلاق عام ہو گئی۔ طلاق کے بعد عورت ایک طرف چلی گئی اور مرد دوسری طرف۔ انھوں نے اس دوران میں جو بچہ پیدا کیا تھا، اس کا کوئی سرپرست نہ رہا۔ وہ والدین کی موجودگی میں یتیم بن کر رہ گیا۔

اس کی دوسری وجہ ان ملکوں میں مشترک زندگی کا خاتمہ ہے۔ انھوں نے زندگی کا جو طرز اختیار کیا اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ بوڑھے ماں باپ دارالضعفاء میں بھیجے جانے لگے۔ مشترک خاندان میں دادا اور دادی ، نانا اور نانی بچوں کو سنبھالنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ مگر مغرب کی معاشرت میں ان لوگوں کا مقام گھر نہیں بلکہ وہ ضعیف خانے ہیں جو خاص طور پر اسی مقصد کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ ایک اور صورت میں والدین کے ساتھ ہوا ہے۔ وہاں کے نظام کے مطابق مرد اگر کام کرتا ہے تو عورت بھی کام کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں بیشتر اوقات گھر سے باہر رہتے ہیں۔ اپنے بچوں سے ان کی ملاقات بمشکل صرف "اتوار" کے دن ہوتی ہے۔ گویا مغرب کا بچہ اپنے دادا اور دادی یا نانا اور نانی سے اس لیے محروم ہے کہ

وہ دارالضعفار میں منتقل ہو گیے ہیں۔ اور اپنے ماں باپ سے اس لیے محروم ہے کہ وہ دونوں کام کرنے کے لیے آفس چلے گیے ہیں۔ ایسے بچوں کا وہی انجام ہو سکتا ہے جو اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے۔

خاتون سنگر کی موت کے بعد

ٹائمس آف انڈیا (۳۰ مارچ ۱۹۸۷) میں ایک رپورٹ جاپان کے متعلق شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ کا عنوان ہے:

Suicide Easy Escape for Japanese Youth

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹ سال کے اندر کی عمر کے جاپانی نوجوانوں میں خودکشی کے واقعات تیزی سے بڑھے ہیں۔ ۱۹۸۵ میں ایسے نوجوانوں کی تعداد ۵۵۷ تھی۔ جب کہ ۱۹۸۶ میں ان کی تعداد ۸۰۲ تک پہونچ گئی۔

خودکشی کرنے والے اکثر نوجوان وہ تھے جو عمارتوں کی چھتوں سے کود پڑے۔ یہ واقعہ اس کے بعد ہوا جب کہ ۱۸ سالہ خاتون پاپ سنگر یوکیکو اوکادا نے محبت میں ناکامی کے بعد ایک چھت سے کود کر اپریل ۱۹۸۶ میں اپنی جان دے دی تھی۔ نوجوانوں نے بھی اسی کی نقل کی۔ کچھ لوگ جنھوں نے اس طریقہ سے اپنی جان دی وہ مس اوکادا کی موت سے غم زدہ تھے۔ انھوں نے چاہا کہ وہ بھی موجودہ دنیا سے رخصت ہو جائیں اور جنت میں پہونچ کر اپنی دل پسند سنگر سے جا ملیں۔ کچھ لوگوں نے مرتے وقت ایسی تحریر چھوڑی جس میں مذکورہ پاپ سنگر خاتون کا نام لکھا ہوا تھا:

> Many were youngsters who jumped from roofs of buildings after 18-year old pop singer Yukiko Okada used that method of killing herself in April 1986 because of an unhappy love affair. Some of the people who died killed themselves because they felt sorry for her (Miss Okada) and wanted to be in heaven with her. A few left notes mentioning the singer (p. 6).

یہ ان بے شمار نقصانات میں سے ایک نقصان ہے جو عورتوں کو "اسکرین" کی چیز بنانے کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ عورت اگر گھر کو سنبھالے تو وہ نوجوان نسل کو زندگی دینے والی ثابت

Man-made dwarfism

Human babies are the most tender and weak of all the babies of living creatures. It, therefore, needs its parents' care and guidance for its physical and mental growth for a longer period. This is why nature has endowed parents with a special attraction for their offspring.

In the past, the separation of children from their parents was caused only by emergency situations—war or occasional premature death. In normal circumstances, it was taken for granted that the children would enjoy the protection of their parents for as long as they required it.

However, this exception has come to be a rule in modern, advanced societies. This is the outcome of the modern concept of life which has destroyed the sanctity of matrimony. Either the children are born out of wedlock or the couples get separated shortly after marriage. The result is one in both cases—alienation of children from their parents, because they are "orphaned" during the lifetime of their parents.

The increasing incidence of this kind of orphaning is creating complex problems in modern society, one of which has been termed "Deprivation Dwarfism". The following are exerpts from a recent report by Western medical experts on this subject:-

"Lack of love can stunt children's physical growth, retard their intellect or even kill them."

Medical experts have called the affliction deprivation dwarfism, a disease that used to kill many children in orphanages.

Pediatricians say that as late as 1915 some 90 per cent of the children who died in Baltimore, Maryland (the United States) orphanages within the first year of admission did so because of lack of love.

In deprivation dwarfism a child does not sleep properly and has trouble with his bowels.

Just as the human body can become dwarfed, so can the human spirit. The only cure for this is the tender, loving care which is engendered by love. There is no substitute for it, and the greatest love of all is the love of God.

ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ گھر سے باہر نکل کر لوگوں کی تفریح کا سامان بنے تو وہ نوجوان نسل کو ہلاکت سے دوچار کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

فطرت سے دور ہو کر

انسان کا بچہ تمام جانداروں کے بچے میں سب سے زیادہ کمزور ہوتا ہے۔ اس کو جسمانی پرورش اور ذہنی تربیت دونوں مقصد کے لئے لمبے عرصہ تک اپنے ماں باپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت نے انسان کے اندر اپنے بچے کے لئے خصوصی کشش رکھی ہے۔

قدیم زمانہ میں کسی بچے کے لئے اپنے باپ یا ماں سے محروم ہونا صرف ہنگامی اسباب سے ہوتا تھا۔ جنگ یا کسی اتفاقی حادثے سے قبل از وقت موت۔ عام حالات میں یقین کیا جا سکتا تھا کہ بچوں کو اپنے والدین کی سرپرستی پختگی کی عمر تک حاصل رہے گی۔

جدید ترقی یافتہ سماج میں یہ استثنا اب عموم بن گیا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے جدید تصور زندگی کا جس نے نکاح کے رشتہ کو غیر مقدس بنا دیا ہے۔ اب یا تو نکاح کے بغیر لڑکے پیدا ہوتے ہیں یا نکاح کے جلد ہی بعد طلاق کی شکل میں دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے ــــ بچوں کی اپنے ماں باپ سے جدائی۔ بچوں کا اپنے والدین کے جیتے جی یتیم ہو جانا۔

اس بڑھتی ہوئی "یتیمی" نے جدید معاشرہ کے لئے طرح طرح کے پیچیدہ مسائل پیدا کر دئے۔ اس میں سے ایک وہ ہے جس کو محرومی کا بونا پن (Deprivation dwarfism) کا نام دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں مغرب کے طبی ماہرین کی ایک تازہ رپورٹ (ایوننگ نیوز، ۲۷ جون ۱۹۸۴) سامنے آئی ہے۔

اس رپورٹ میں مغربی طرز حیات کے نتائج کے بارہ میں بہت سے انکشافات کیے گیے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ سے محرومی کی بنا پر جن بچوں کو ابتدائی عمر میں محبت نہیں ملتی ان میں مختلف قسم کا نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جسمانی نشو ونما میں کمی۔ دماغ کا ہلکا پن۔ حتی کہ یہ چیزیں بعض اوقات ان کی قبل از وقت موت کا باعث ہو جاتی ہیں۔

محرومی کا بونا پن نامی بیماری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ ٹھیک طرح سو نہیں پاتا، اس کا نظام ہضم ٹھیک طرح کام نہیں کرتا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اسپتالوں میں جہاں چھوٹے بچے بیڈ پر ڈال دئے جاتے ہیں، پیٹھ کے بل دیر دیر تک پڑے رہنے سے ان کے سر کا پچھلا حصہ گنجا ہو جاتا ہے کیوں کہ وہاں کوئی ماں بار بار کروٹ بدلنے کے لئے موجود نہیں ہوتی۔ ماں باپ سے محروم ہو کر دار الاطفال میں پرورش پانے والے

بچے اپنے ذہنی اور جسمانی ارتقاء سے محروم رہتے ہیں۔

ڈاکٹر گارڈنر (Dr. Gardner) کا کہنا ہے کہ مطالعہ بتاتا ہے کہ دماغ کی اعلیٰ سطح سے ارتعاشات (Impulses) اٹھتے ہیں۔ یہ ارتعاشات جسمانی نظام میں داخل ہو کر مختلف قسم کے ہارمون پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں جو زندگی کی نشوونما کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ انھیں میں سے ایک وہ ہے جو پروٹین کو شکر میں تبدیل کرتا ہے۔ ماں باپ کی محبت سے محروم ہو کر جو بچے پرورش پاتے ہیں ان میں یہ فطرتی عمل کم ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا جسم حاصل شدہ پروٹین کو پوری طرح استعمال نہیں کر پاتا جو ان کے نشوونما کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فطرت کے راستے سے ہٹنا کس قدر تباہ کن ہے۔ انسان خدا کی بنائی ہوئی دنیا سے ہٹ کر اپنے لئے کوئی دوسری دنیا نہیں بنا سکتا۔ اس کے لئے لازم ہے کہ اسی دنیا کے ساتھ مطابقت کرے۔ اگر وہ فطرت کی شاہراہ کو چھوڑ کر اپنے لئے کوئی دوسری شاہراہ بنانا چاہے گا تو وہ صرف ناکامی اور بربادی پر ختم ہوگا۔ اس کے سوا اس کا کوئی انجام نہیں۔

بے قیدی کا تجربہ

امریکی میگزین نیوز ویک (۲۱ جنوری ۱۹۸۵) صفحہ ۳۵ پر ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں امریکی خواتین کا ایک جلوس دکھائی دے رہا ہے۔ جلوس کے آگے ایک نوجوان عورت ایک بینر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے:

Keep your laws and your morality off my body

اپنے قوانین اور اپنے اخلاق کو میرے جسم سے دور رکھو۔

مضمون میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کے لوگ اس وقت دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک وہ جو کھلے عام اسقاط کے قائل ہیں۔ یہ لوگ اپنے کو "اسقاط نواز" نہ کہہ کر اپنے کو انتخاب نواز (Pro-choice) کہتے ہیں۔ دوسرا گروہ جو اسقاط کا مخالف ہے وہ اپنے آپ کو زندگی نواز (Pro-life) کہتا ہے۔

جدید مغربی مفکرین کا کہنا ہے کہ انھوں نے جو سب سے بڑی چیز دریافت کی ہے وہ آزادی ہے۔ مگر بے قید آزادی کا تجربہ جو جدید مغرب میں ہوا وہ بتاتا ہے کہ آزادی خیر اعلیٰ نہیں ہو سکتی۔

آزادی اگر خیر اعلیٰ ہو تو وہ اس قبیح انجام تک کیسے پہنچ جاتی ہے جس کا ایک نمونہ اوپر کے اقتباس میں ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی بے حد قیمتی چیز ہے۔ مگر انسان کے لئے خیر اعلیٰ پابند آزادی ہے نہ کہ مطلق آزادی۔ یعنی انسان کے مقابلہ میں آزادی مگر خدا کے مقابلہ میں پابندی۔

انسان خدا اور بندے کے درمیان ہے۔ جہاں تک اپنے جیسے انسانوں کا تعلق ہے، ان کے مقابلہ میں بلاشبہ ہر انسان کو کامل آزادی حاصل ہے۔ مگر اسی کے ساتھ دوسری شدید تر حقیقت یہ ہے کہ خدا کے مقابلہ میں انسان مکمل طور پر پابند ہے۔ خدا کے مقابلہ میں کسی انسان کو کوئی آزادی حاصل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کو اپنی آزادی کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ وہ ہر حال میں خدا کے احکام کا پابند رہے۔ یہی پابندی آزادی کے صحیح استعمال کی ضمانت ہے۔

خاتون لیڈر کا اعتراف

امریکہ کی مشہور ناول نگار خاتون اور تحریک نسواں کی لیڈر رہوڈا لرمن اپریل ۱۹۸۷ میں ہندستان آئیں۔ یہاں نئی دہلی میں انھوں نے ٹائمس آف انڈیا کے ایک اسٹاف رپورٹر کو انٹرویو دیا۔ یہ انٹرویو اخبار مذکور کے شمارہ ۳۰ اپریل ۱۹۸۷ میں شائع ہوا ہے۔ یہ پورا انٹرویو علحدہ صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

رہوڈا لرمن نے کہا کہ میں بہت بُری خبر لے کر آئی ہوں۔ سماج میں عورت کے بدلتے ہوئے کردار پر بولتے ہوئے انھوں نے انکشاف کیا کہ امریکہ کے غریبوں میں ۷۷ فی صد تعداد عورتوں اور بچوں کی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق اس کا سبب وہ غیر معمولی فرق ہے جو مردوں اور عورتوں کی کمائی کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی کمائی ۶۲ فی صد ہے۔ صرف اس لیے کہ انھیں ہلکے قسم کے کام دیئے جاتے ہیں۔ یکساں مواقع اور یکساں تنخواہ یکساں کام کے لیے محض ایک افسانہ ہے۔ عورتیں ابھی تک صرف نچلے اور درمیانی انتظامی شعبوں میں داخل ہو سکی ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ یہ امتیاز مردانہ تعصب کی بنا پر ہے جو کہ عورتوں کے خلاف کام کر رہا ہے۔ مردوں کا کہنا ہے کہ عورتوں پر انحصار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ وہ زچگی کی چھٹی لیتی ہیں اور بچے

A Pyrrhic Victory

"I come with very bad news," says Rhoda Lerman, American novelist and a leader of the women's movement. Speaking on the changing role of women in society, she revealed that 77 per cent of the poor in America are women and children.

The reason she offers is the high wage differential between the earnings of men and women. Women earn 62 per cent of what men earn, merely because of the "pink-collared" jobs offered to them. "Equal opportunities and equal pay for equal work are just a myth," she declares. Women, by far have been able to infiltrate only the lower and middle management and are offered innumerable jobs in food chains and the secretarial cadres.

This discrimination, she believes is due to the male bias which works against women, branding them as "undependable, since they go in for maternity leave and have children." Although 96 per cent of the working women have children, only 67 per cent of them can enjoy maternity leave, without fear of jeopardising their jobs. However, seniority almost always suffers, says Ms Lerman. "Maternity and child care are the cause of high wage differentials", she adds, "economic reality having nothing to do with spiritual equality." Activists had clamoured for sexual equality and abortion rights and won them, without anticipating the economic backlash that would ensue.

With radical feminism accepted as the code, women are treated as equal, without any concessions to their biological differences. For instance, one out of two marriages in America are ending in divorce, with the responsibility of child care devolving on the mother alone. Alimony and maintenance are merely laws, rarely put into practice. A mere 5-10 per cent of the men pay maintenance, and that too, only for the first year.

For the rest, the burden is borne solely by the mother. Thus, the quality of life of a divorce woman reduces by 73 per cent and that of a man increases by 43 per cent.

Single households, headed by women trying to play the role of "supermoms", are on the increase, she revealed. In the next 10 years, therefore, 40-50 per cent of the children will be living in female-headed households. An unhealthy phenomenon, which has its repercussions in increased suicides amongst children. "Due to a lapse in the dependency structure, suicide is becoming endemic amongst children," she said.

Socialist feminism, which takes into account the intrinsic differences between men and women, is the call of the hour, Ms Lerman believes. We have had an excess of the American dream — of a husband who works, a house in the suburbs, two children, two cars and a mother who stays at home and bakes cookies.

With the family structure falling apart, she feels that only government support in the form of day-care centres, maternity leave benefits and subsidies to override the economic limitations of single women can hold the social fabric together. "Otherwise, our victories will be merely pyrrhic victories", she predicts. Similar, perhaps to the freedom experienced on the funeral pyre.

The Times of India, New Delhi, April 30, 1987

پالتی ہیں۔ اگرچہ ۹۶ فی صد کام کرنے والی عورتوں کے یہاں بچے ہیں، ان میں سے صرف ۷۶ فی صد اس اندیشہ کے بغیر زچگی کی چھٹی سے فائدہ اٹھا پاتی ہیں کہ اس سے ان کی ملازمت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تاہم سینیرٹی کا نقصان انھیں ہمیشہ اٹھانا پڑتا ہے۔ زچگی اور بچوں کی پرورش تنخواہوں میں زبردست فرق کا سبب ہیں۔ معاشی حقیقت روحانی برابری سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ آزادیٔ نسواں کے علم برداروں نے جنسی برابری اور اسقاط کے حق کے لیے شور وغل کیا اور اس کو حاصل کرلیا، وہ اس معاشی تباہی کا اندازہ نہ کرسکے جو کہ اس کے بعد آنے والی تھی۔

انقلابی نسوانی تحریک کے تحت عورت اور مرد برابر مان لیے گیے ہیں، مگر عورت کو اس کے حیاتیاتی فرق کی کوئی رعایت نہیں ملی۔ مثال کے طور پر، امریکہ میں ہر دو شادی میں سے ایک شادی طلاق پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد بچہ کی پرورش کی ذمہ داری تنہا عورت پر آجاتی ہے۔ نفقہ اور گزارہ محض لفظی قوانین ہیں، وہ بہت ہی کم عمل میں آتے ہیں۔ صرف ۵ سے ۱۰ فی صد تک ایسے مرد ہیں جو گزارہ ادا کرتے ہیں، اور وہ بھی صرف پہلے سال تک۔ بعد کے سالوں میں پورا بوجھ صرف ماں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس طرح زندگی کا معیار ایک مطلقہ عورت کے لیے ۷۳ فی صد تک گھٹ جاتا ہے، اور مرد کا اس کے مقابلہ میں ۴۳ فی صد بڑھ جاتا ہے۔

ایسے گھروں کی تعداد بڑھ رہی ہے جن میں صرف عورت ذمہ دار ہو اور وہ تنہا ماں اور باپ دونوں کا کردار ادا کرے۔ چنانچہ اگلے دس برسوں میں ۴۰ تا ۵۰ فی صد بچے وہ ہوں گے جو ایسے گھروں میں پرورش پائیں گے جن کی ذمہ دار صرف عورت ہو۔ یہ ایک غیر صحت مندانہ مظہر ہے جس کے نتیجہ میں بچوں میں خودکشی کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔ خاندانی نظام میں انحصار کے فقدان کی وجہ سے خودکشی بچوں کی خصوصیت بن رہی ہے۔

اشتراکی نسوانیت جو کہ مرد اور عورت کے درمیان پائے جانے والے ناگزیر فرق کو ملحوظ رکھتی ہے آج وقت کی پکار ہے۔ امریکی زندگی کے بارہ میں (ابتداءً) ہمارا ایک بڑھاپا ہوا خواب تھا ــــ ایک شوہر جو کام کرے، شہر کے کنارے ایک مکان، دو لڑکے، دو کاریں اور ماں جو گھر پر رہے اور کیک بنائے (مگر آزادی نسواں کی تحریک نے اس خواب کو منتشر کر دیا)

خاندانی نظام کے ٹوٹنے کے بعد صرف حکومت کی مدد ہی مسئلہ کو حل کر سکتی ہے۔ حکومت کی طرف سے بچوں کی نگہداشت کے لیے مراکز ہوں، زچگی کی چھٹی کی سہولت ہو اور تنہا عورت کی معاشی کمیوں کی تلافی کے لیے اس کو مدد دی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہماری فتوحات جھوٹی فتوحات بن کر رہ جائیں گی یا ویسی ہی آزادی جس کا تجربہ چتا کے اوپر ہوتا ہے۔

امریکہ کی خاتون لیڈر نے مذکورہ بیان میں اعتراف کیا ہے کہ تحریک نسواں کی کامیابیاں پِرک فتوحات (Pyrric Victories) بن کر رہ گئی ہیں۔ تیسری صدی قبل مسیح میں ایک یونانی بادشاہ تھا جس کا نام پِرہس (Pyrrhus) تھا۔ اس نے ۲۸۱ ق م میں اٹلی پر حملہ کیا۔ لمبی جنگ کے بعد اس کو فتح حاصل ہوئی۔ مگر فتح تک پہونچتے پہونچتے وہ اپنا سب کھو چکا تھا۔ چنانچہ بعد کو ۲۷۵ ق م کی جنگ میں اس کو دوبارہ شکست ہوئی۔ ۲۷۲ ق م میں اس کو قتل کر دیا گیا۔ پِرک وکٹری اسی کی طرف منسوب ہے۔ اس کا مطلب ہے ـــــ ایسی فتح جو بربادی لے کر آئے۔

یہ صحیح ترین لفظ ہے جو جدید عورت کی فتح کے بارہ میں بولا جا سکتا ہے۔ جدید عورت نے لمبی جدوجہد کے بعد "مساوات" حاصل کی۔ مگر اس خیالی مساوات کو حاصل کرنے تک وہ اپنا سب کچھ کھو چکی تھی۔ مذکورہ خاتون کا کہنا ہے کہ مغربی عورت کی محرومی کی تلافی کی اب صرف ایک صورت ہے۔ یہ کہ حکومت اس کی سرپرست بن جائے، وہی حکومت جو آج بھی پوری طرح مردوں کے قبضہ میں ہے۔ گھریلو مرد کی سرپرستی پر عورت راضی نہ تھی۔ اس کی قیمت میں عورت کو حکومتی مرد کی سرپرستی پر راضی ہونا پڑا۔

دو مثالیں

آزادی کے مصنوعی تصور نے مغربی گھروں میں جو مسائل پیدا کیے ہیں، ان کا تعلق صرف نچلے یا درمیانی طبقہ کے لوگوں سے نہیں ہے۔ اس کے برے اثرات اونچے خاندانوں اور نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں تک پہونچے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں ہم دو مثالیں نقل کریں گے۔

حال میں آئن سٹین کے کچھ خطوط ملے ہیں۔ یہ خطوط اس نے ایک عورت (میلیوا میرک)

کے نام لکھے تھے جو بعد کو اس کی پہلی بیوی بنی۔ یہ خطوط ان کے تعلقات کی خوشی اور غم کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ یہ خطوط آئن سٹین کی تحریروں کے مجموعہ کے لیے مواد کی تلاش کے دوران حاصل ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا نام ہے:

The Collected Papers of Albert Einstein

میلوا میرک (Mileva Maric) کی عمر آئن سٹین سے چار سال زیادہ تھی۔ خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً آئن سٹین کی ماں اس رشتہ پر راضی نہ تھی جس کی بنا پر انھیں مایوسی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ بعد کو آئن سٹین اور میلوا کا نکاح ہوا۔ تاہم نکاح سے پہلے ان کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہو چکی تھی۔ اس بات کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ لڑکی کے ساتھ کیا پیش آیا۔ بظاہر وہ آئن سٹین کے ساتھ کبھی نہیں رہی۔ آئن سٹین اور مس میرک کی ملاقات ۱۸۹۶ میں فیڈرل ٹکنکل انسٹی ٹیوٹ (زیورک) میں ہوئی تھی۔ ان کا نکاح جنوری ۱۹۰۳ میں ہوا۔ یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی اور ۱۹۱۹ میں ان کے درمیان طلاق ہو گئی:

They were married in January 1903, and
their marriage ended in divorce in 1919.

The Times of India, May 5, 1987

دوسری مثال موجودہ برطانی ولی عہد چارلس کی ہے۔ مسز پینی جونر نے حال میں پرنس چارلس کی سوانح عمری شائع کی ہے۔ اس میں وہ کہتی ہیں کہ پرنس چارلس نے ایک غلط عورت سے شادی کی۔ اس سلسلہ میں بی بی سی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پرنس چارلس ایک غم زدہ شخص ہیں۔ وہ زمین پر بالکل تنہا ہو کر رہ گیے ہیں۔ ایک بیوی سے جو مدد

Charles, Diana Misfits

Prince Charles, heir to the British throne, married the wrong woman, said his biographer, Mrs Penny Junor in a recent interview with the BBC. Charles, she said, was a sad character with the loneliest position on earth. He did not have the support he should have from a wife. Prince Charles and Princess Diana were growing more and more apart. Mrs Junor said she had drawn her conclusions after talking to people who were close to him. "The palace has seen what I have written and the conclusions I have come to. No one has told me that I am on the wrong lines."

ملنی چاہیے وہ انھیں حاصل نہیں۔ شہزادہ چارلس اور شہزادی ڈائنا ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ مسز جونز نے کہا کہ انھوں نے یہ نتیجہ ان لوگوں سے بات کرکے حاصل کیا ہے جو شہزادہ سے بہت قریب ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اور جو نتیجہ نکالا ہے اس کو شاہی محل دیکھ چکا ہے۔ محل کے کسی آدمی نے نہیں کہا کہ میں غلط راستہ پر ہوں۔

(ٹائم (نیو یارک) ۱۱ مئی ۱۹۸۷، ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس ۲۹ اپریل ۱۹۸۷)

ناقابل اعتماد کردار

ٹائم (نیو یارک) نے اپنے شمارہ ۲۵ مئی ۱۹۸۷ میں پنٹاگان سے متعلق ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کا عنوان ہے ___ جنس کا تعلق راز داری سے :

Mixing Sex And Secrets

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکی ادارہ پنٹاگان ۷ ر ۲ ملین لوگوں کے جنسی اعمال کی بابت محکمہ دفاع کے سیکوریٹی کلیرنس کے معاملہ میں پریشان ہے۔ جنوری ۱۹۸۷ میں پنٹاگان نے اپنے ضوابط کی توسیع کرتے ہوئے فوج کے لوگوں، شہری کارکنوں اور ٹھیکہ کے ملازموں پر یہ شرط عائد کردی ہے کہ وہ کلیرنس کے تحت یہ بتائیں کہ کیا وہ جنسی اعمال مثلاً زنا، اغلام اور محرّمات کے ساتھ مباشرت میں مبتلا رہے ہیں۔ ان قوانین کا مقصد یہ اطمینان حاصل کرنا ہے کہ وہ لوگ جن کی پہونچ حکومت کے رازوں تک ہے ان میں یہ کمزوری نہیں ہے کہ ان کو بلیک میل کیا جاسکے :

The Pentagon has been fretting about the sexual practices of the 2.7 million people with Defense Department security clearances. In January (1987) the Pentagon expanded its rules to compel service personnel, civilian workers, and contract employees with clearances to divulge workers and contract employees with clearances to divulge whether they have engaged in such sexual acts as adultery, sodomy and incest. The rules are intended to ensure that those with access to secrets are not vulnerable to blackmail (p. 29).

اباحیت پسند لوگوں کا دعویٰ تھا کہ نکاح سے باہر جنسی تعلقات محض "گناہ" ہیں۔ یعنی

وہ خدا کے نزدیک بُرے ہو سکتے ہیں، مگر انسانی معاملات میں ان سے کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا۔ مگر تجربات نے بتایا کہ جو شخص جنسی تعلق کے معاملہ میں نکاح کے حدود کا پابند نہ ہو وہ ایک ناقابل اعتماد شخص بن جاتا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسا اخلاقی رخنہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے داخل ہو کر دشمن ہمارے نازک ترین رازوں تک پہونچ جائے۔

ایک مثال

مسٹر گاری ہارٹ (Gary Hart) امریکہ کے صدارتی الکشن (۱۹۸۷) کے لیے ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار تھے۔ تمام اندازوں کے مطابق ان کی کامیابی یقینی تھی۔ مگر اس درمیان میں ایک واقعہ ہوا۔ اس کے بعد امریکہ میں اتنا طوفان اٹھا کہ مسٹر ہارٹ کو صدارت کے مقابلہ سے استعفا دینا پڑا۔

۵۰ سالہ مسٹر ہارٹ الکشن کی مہم میں مصروف تھے۔ اس کے لیے انھوں نے ایک ملین ڈالر سے زیادہ قرض لیا تھا۔ اس درمیان میں ہفتہ کا آخری دن گزارنے کے لیے یکم مئی کو وہ خاموشی کے ساتھ میامی پہونچے۔ یہاں انھوں نے ایک ۲۹ سالہ ایکٹرس مس ڈونا رائس (Donna Rice) کے ساتھ ایک دن اور ایک رات گزاری۔ اس کی خبر ایک امریکی اخبار میامی ہیرالڈ (The Miami Herald) کو ہوگئی۔ اس نے اپنی ۳ مئی ۱۹۸۷ کی اشاعت کے صفحۂ اوّل پر یہ کہانی حسب ذیل سنسنی خیز سرخی کے ساتھ چھاپ دی:

Miami woman is linked to Hart.

اس کے فوراً بعد ریڈیو، ٹیلی وزن، اخبارات ہر جگہ اس کا چرچا ہونے لگا۔ مسٹر ہارٹ کی تصویریں مس ڈونا رائس کے ساتھ چھپنے لگیں۔ مسٹر ہارٹ جہاں جاتے وہاں ان سے پوچھا جاتا کہ کیا وہ زنا کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مسٹر ہارٹ عوامی عدالت میں زناکاری کے ملزم کی حیثیت سے کھڑے کر دیئے گیے:

Hart stood in the public dock accused of adultery (p. 6).

میامی ہرالڈ میں اگر یہ خبر چھپتی کہ مسٹر ہارٹ فلاں مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ رات بھر رہے تو کوئی اس پر دھیان نہ دیتا۔ مگر اخبار نے جب یہ خبر چھاپی کہ مسٹر ہارٹ نے میامی کے فلاں مکان

میں ایک غیر عورت کے ساتھ رات گزاری تو ہر طرف ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ یہ واقعہ اس بات کا تجرباتی ثبوت ہے کہ غیر عورت کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنا فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ اگر یہ فعل انسانی فطرت کے خلاف نہ ہوتا تو ہنگامہ کرنے والے کبھی اپنے منصوبہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

مسٹر ہارٹ نے اس مصیبت سے بچنے کے لیے اپنی ساری ذہانت صرف کر دی۔ پہلے انھوں نے انکار کیا۔ پھر ٹالنے والے جوابات دیتے رہے۔ انھوں نے اپنی بیوی لی ہارٹ (Lee Hart) کو راضی کیا کہ وہ ۱۳ میل کا سفر طے کر کے تھیم تشائرے ڈنور (Denver) پہونچیں اور اخبار نویسوں کے سامنے اپنا یہ بیان دیں کہ یہ بات اگر مجھے پریشان نہیں کرتی، تو میں نہیں سمجھتی کہ کسی اور کو اس سے پریشان ہونا چاہیے :

If it doesn't bother me, I don't think it
ought to bother anyone else (p. 7).

مسٹر ہارٹ نے جب دیکھا کہ معاملہ کو چھپانے کے بارہ میں ان کی ساری تدبیروں کے باوجود راز کھل گیا ہے تو آخر کار انھوں نے اعتراف کر لیا۔ اب انھوں نے کہا کہ زنا کوئی قانونی جرم نہیں ہے۔ وہ صرف ایک گناہ ہے۔ اور وہ میرے اور میری بیوی اور میرے اور خدا کے درمیان ہے :

Adultery is not a crime. It's a sin. And that is
between me and Lee, and me and God (p. 7).

تاہم مسٹر ہارٹ کی یہ باتیں امریکی عوام کو مطمئن نہ کر سکیں۔ اوپینین پول میں اس سے پہلے امکانی صدر کی حیثیت سے ان کا نام سر فہرست رہتا تھا۔ اب پول کے ذریعہ عوام کی پیشگی رائے معلوم کی گئی تو اچانک ان کا نام بالکل نیچے آگیا۔ اس کے بعد مسٹر ہارٹ نے اپنے آپ کو ملک میں تنہا پایا :

And in the end he found himself alone (p. 10).

ٹائم (۱۸ مئی ۱۹۸۷) کے الفاظ میں ایکٹرس سے جنسی تعلق ان کے لیے ان کی سیاسی موت (Political death) کے ہم معنی بن گیا۔ ۳ مئی کو اس معاملہ کا انکشاف ہوا اور صرف پانچ دن

بعد ۸ مئی کو انھوں نے ان الفاظ کے ساتھ صدارتی مقابلہ سے علحدگی کا اعلان کر دیا :

I was withdrawing from the race, and then quietly disappear from the stage (p. 6).

ٹائم نے اس سلسلہ میں اپنی طویل رپورٹ کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے کہ امریکی اب اپنے لیڈروں کے بارہ میں وہی گہری معلومات جاننا چاہتے ہیں جو کسی وقت کلارک گیبل (ایکٹر) اور ایلزبیتھ ٹیلر (ناول نگار) کی رومانیت کے لیے مخصوص تھیں۔ ہتھیاروں کے کنٹرول کے مسائل سے نبرد آزما ہونے اور معاشی مسائل سے نمٹنے سے زیادہ امریکی عوام ایسے افراد چاہتے ہیں جن پر وہ بھروسہ کر سکیں. جن کا فیصلہ اور جن کی دیانت داری ان کے لیے اطمینان بخش ہو :

Americans now demand the same intimate knowledge about their leaders that once was reserved for the romantic entanglements of Clark Gable or Elizabeth Taylor. Rather than wrestling with the complexities of arms control and a troubled economy, the public tends to look for personalities they can trust, whose judgement and integrity make them feel comfortable (pp.7–8).

یہی بات سابق صدر امریکہ لنڈن جانسن کے پریس سکریٹری جارج ریڈی (George Reedy) نے اس طرح کہی کہ صدارت کے امیدوار کے لیے جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ اس کا کیرکٹر ہے۔ اور یہ سب سے زیادہ عورتوں کے ساتھ اس کے تعلق کے معاملہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس عہدہ پر ایک ایسا آدمی ہوتا ہے جو آپ سے کہتا ہے کہ آپ اپنے بنک اکاونٹ کے معاملہ میں اس پر بھروسہ کریں، اسی طرح آپ کے بچوں، آپ کی زندگی اور آپ کے ملک کے معاملہ میں بھی چار سال تک۔ اگر خود اس کی اپنی بیوی اس پر اعتماد نہ کر سکے تو یہ بات کس چیز کا پتہ دیتی ہے :

What counts with a candidate for President is his character, and nothing shows it like his relationship with women. Here you have a man who is asking you to trust him with your bank account, your children, your life and your country for four years. If his own wife can't trust him, what does that say? (p. 15.)

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص ایسا کرے کہ وہ نکاح کے دائرہ سے باہر جنسی تعلق قائم کرے، وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے اندر ذہنی ڈسپلن نہیں ہے۔ وہ اپنے جذباتی محرکات پر قابو رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ ایسا شخص اپنے کردار کے اعتبار سے ہرگز اعتبار کے قابل نہیں۔ اس کے اندر ایک ایسی نفسیاتی کمزوری ہے جس کی بنا پر شدید اندیشہ ہے کہ وہ اپنی کسی ذاتی خواہش کے لیے بڑے سے بڑے قومی مفاد کو قربان کردے۔ ایسا شخص عام زندگی میں بھی بھروسہ کے قابل نہیں، کجا کہ ریاست کے اعلیٰ منصب کے لیے اس پر بھروسہ کیا جائے۔

تجربات بتاتے ہیں کہ جنسی تعلقات کے معاملہ میں خدائی حد کو توڑنا سادہ معنوں میں صرف ایک مذہبی برائی نہیں ہے، وہ مہلک قسم کی سماجی برائی بھی ہے۔ وہ صرف ایک گناہ نہیں، وہ ایک جرم بھی ہے۔ بلکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے سب سے بڑا جرم۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

زرِ تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نیو کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم
اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۲ نومبر ۱۹۸۷

فہرست

ماہنامہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون : 697333, 611128

غلافِ کعبہ

کعبہ کے اوپر غلاف ڈالنے کا رواج قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا، اس کے متعلق تاریخ کا بیان یہ ہے :

کان من الطبیعی ان لا یشارك الرسول علیه الصلوٰة والسلام ومعه المسلمون فی کساء الکعبة قبل الفتح۔ ذالك ان المشرکین من قریش لم یتیحوا لهم هذا الامر الی أن تم فتح مکة فابقی علیه الصلوٰة والسلام علی کسوة الکعبة ولم یستبدلها حتی احترقت علی ید امرأة کانت ترید تبخیرها فکساها الرسول صلی الله علیه وسلم بالثیاب الیمانیة۔ ثم کساها الخلفاء الراشدون من بعده بالقباطی

الفیصل (ریاض) ذوالحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق اگست ۱۹۸۷، صفحہ ۹۱

یہ ایک قدرتی بات تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اس وقت کے مسلمان فتح مکہ سے پہلے کعبہ کی غلاف پوشی نہ کر سکے۔ کیونکہ قریش کے مشرکین نے انھیں اس کا موقع نہیں دیا۔ تاہم فتح مکہ کے بعد بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے سابقہ غلاف کو باقی رکھا اور اس کو تبدیل نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ایسا ہوا کہ کعبہ کے غلاف میں ایک عورت کے ہاتھ سے آگ لگ گئی اور وہ جل گیا۔ یہ عورت اس کو خوشبو پہنچانے کے لیے دھونی دے رہی تھی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یمنی کپڑوں کا ایک غلاف کعبہ کے اوپر اوڑھایا۔ آپ کے بعد خلفاء راشدین قبطی کپڑے کا غلاف کعبہ کے اوپر ڈالتے رہے۔

فتح مکہ کے وقت کعبہ کے اوپر جو غلاف تھا وہ دشمنوں اور کافروں کا بنایا ہوا تھا۔ یہ مقدس قبلہ پر غیر مقدس قبضہ کی یادگار تھا۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا کہ اس کو "ناپاک" قرار دے کر فوراً اس کو بدلنے کا حکم دیدیں۔ آپ نے سابقہ غلاف کو باقی رکھا اور اس کو صرف اس وقت بدلا جب کہ جل جانے کی وجہ سے اس کا بدلنا ایک ضرورت بن گیا۔

اصلاح کا مسنون اسلامی طریقہ یہ ہے کہ ڈھانچہ کو غیر ضروری طور پر توڑے بغیر فطری انداز میں اصلاحات کا نفاذ کیا جائے۔

ناکامی میں کامیابی

ڈاکٹر سلیم علی (۱۹۸۷-۱۸۹۶) کو علم طیور (Ornithology) میں غیر معمولی مقام ملا۔ ہندستان نے ان کو پدما بھوشن کا خطاب دیا۔ برطانیہ نے ان کو گولڈ میڈل سے نوازا۔ ہالینڈ نے ان کو گولڈن آرک عطا کیا۔ عالمی ادارہ وائلڈ لائف نے ان کو انعام کے طور پر ۵۰ ہزار ڈالر دیئے۔ ہندستان کی تین یونیورسٹیوں نے اعزازی طور پر ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ وہ راجیہ سبھا کے ممبر بنائے گیے وغیرہ۔ ڈاکٹر سلیم علی کو یہ غیر معمولی کامیابی ایک غیر معمولی ناکامی کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ وہ بمبئی کے ایک گنجان علاقہ کھیت واڑی میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھیں روزگار کی ضرورت ہوئی۔ مگر جب وہ روزگار کی تلاش میں نکلے تو ان کے الفاظ میں " ہر ادارے اور ہر دفتر میں ان کے لیے جگہ نہیں (No vacancy) کا بورڈ لگا ہوا تھا" اس ناکامی نے ان کے لیے نئی کامیابی کے راستے کھول دیئے۔

ایک روز انھوں نے ایک چھوٹی چڑیا پکڑی۔ اس کو دیکھا تو اس میں ایک غیر معمولی خصوصیت نظر آئی۔ اس کی گردن پیلے رنگ کی تھی۔ انھوں نے اس کی تحقیق شروع کر دی۔ انھوں نے علم طیور کے موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ان کی دل چسپی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے ایک دستی دوربین حاصل کی۔ اب ان کا کام یہ ہوگیا کہ اِدھر اُدھر جاکر چڑیوں کا مشاہدہ کریں اور ان کے حالات اپنی ڈائری میں لکھیں۔ آخر کار انھوں نے علم طیور میں اتنی مہارت پیدا کی کہ خود اس فن کو نئی جہتوں اور نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔ ان کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ایک کتاب میں انھوں نے برصغیر ہند کی ۱۲۰۰ چڑیوں کے حالات لکھے ہیں۔ ان کی دوسری کتاب طیور ہند (Indian Birds) ہے جو گیارہ بار چھپ چکی ہے۔ اور عالمی سطح پر پڑھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم علی کو زمینی ادارہ میں جگہ نہیں ملی تھی، انھوں نے آسمانی مشاہدہ میں اپنے لیے زیادہ بہتر کام تلاش کر لیا۔ ان کو ملکی ملازمت میں نہیں لیا گیا تھا، مگر اپنی اعلیٰ کارکردگی کے ذریعہ وہ عالمی اعزاز کے مستحق قرار پائے۔

ایک ہی سبب

۱۸ مئی ۱۹۸۴ کا واقعہ ہے۔ بھیونڈی کے مسلمانوں نے اسلامی عظمت کے اظہار کے لیے سبز جھنڈے لہرانے کا پروگرام بنایا۔ جھنڈے کے پرجوش مجاہدین اپنی اس مہم کے دوران ایسے مقام پر پہونچے جو روایتی طور پر شیوسینا کی جگہ سمجھی جاتی تھی۔ مسلمان اس پر چڑھ گیے انھوں نے وہاں اپنا جھنڈا لہرا دیا۔

اس پر مسلمانوں میں اور شیوسینا کے کارکنوں میں تکرار ہوئی۔ یہ تکرار بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۱۷ مئی کو بھیونڈی میں فساد پھوٹ پڑا۔ اس فساد میں بھیونڈی اور اطراف کے علاقوں میں پیمانہ پر لوگ قتل ہوئے اور لوٹ اور آتش زنی میں تقریباً ایک ارب روپیہ کا نقصان ہوا۔ نقصان کا بیشتر حصہ قدرتی طور پر مسلمانوں کو ملا۔

اس واقعہ کے تین سال بعد ۲۶ اگست ۱۹۸۷ کو ٹھیک اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہے۔ اس دوسرے واقعہ کا مرکز کراچی ہے۔ کراچی میں اس وقت مسلمانوں کی دو تنظیمیں ہیں۔ ایک کا نام ہے پنجابی پٹھان اتحاد (پی پی آئی) اور دوسری کا نام ہے مہاجر قومی مو (ایم کیو ایم) مذکورہ تاریخ کو پی پی آئی نے اپنے جھنڈے کا مظاہرہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ دوران اس کے پرجوش کارکنوں نے ایک ایسی عمارت کے اوپر اپنا جھنڈا گاڑ دیا جو ایم کیو کے خیال کے مطابق اس کے گروہ کی تھی۔

ایم کیو ایم نے جھنڈا نصب کرنے کی اس کارروائی پر اعتراض کیا۔ اس پر دونوں ف میں تکرار ہو گئی جو بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی اور دونوں طرف آٹومیٹک رائفلیں اور ریوالور چلنے لگے۔ کراچی سے گزر کر یہ فساد حیدرآباد (سندھ) تک پہو اس جنگ میں دونوں مقامات پر کئی درجن آدمی مارے گیے۔ کثیر تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔ بی دکان اور مکان اور سواریاں جزئی یا کلی طور پر جلادی گئیں (ہندستان ٹائمس ۲۷ اگست ، ٹائمس آف انڈیا ۲۹ اگست ۱۹۸۷)

یہ دونوں واقعات بالکل ایک قسم کے واقعات ہیں۔ اس لیے جب ہم ان کا سبب

چاہیں تو ہمیں ان کی توجیہہ کے لیے ایک ہی مشترک سبب تلاش کرنا ہوگا جو دونوں واقعات پر یکساں طور پر چسپاں ہوتا ہو۔ اگر ہم یہ کہیں کہ بھیونڈی کا فساد "ہندو شرپسندوں" نے کیا تو کراچی کے ٹھیک اسی قسم کے فساد کے لیے یہ الفاظ ناکافی ہوں گے۔ کیوں کہ کراچی میں "ہندو شرپسند" عنصر سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ ایسی توجیہہ جو ایک واقعہ پر چسپاں ہو اور دوسرے واقعہ پر چسپاں نہ ہو سکے، کسی متعصب اور جانبدار ذہن کو تو اپیل کر سکتی ہے۔ مگر وہ سنجیدہ اور حقیقت پسند انسانوں کو اپیل نہیں کر سکتی۔

جب ہم اس حیثیت سے غور کرتے ہیں تو ہم کو ایک ہی مشترک توجیہہ ملتی ہے جو دونوں واقعات پر یکساں طور پر چسپاں ہوتی ہو۔ اور وہ توجیہہ ہے —— انسان کی انا کو چھیڑنا۔

یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ بھیونڈی میں ایک فریق مسلمان تھا اور دوسرا فریق ہندو۔ جب کہ کراچی میں دونوں ہی فریق یکساں طور پر مسلمان تھے۔ اس ظاہری فرق سے قطع نظر، دونوں جگہ سبب ایک تھا۔ بھیونڈی میں مسلمان نے ہندو کی انا کو چھیڑا اور پھر اس کی سزا بھگتی۔ کراچی میں مسلمان نے مسلمان کی انا کو چھیڑا اور اس کی سزا بھگتی۔

فساد کی حقیقت کیا ہے اور فسادات کیوں ہوتے ہیں، اس کو ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ —— جب ایک شخص کی انا کو چھیڑا جائے تو وہ بڑا انا بن جاتا ہے، اور اس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے:

When one's ego is touched, it turns into super-ego, and the result is breakdown.

پٹرول کے ذخائر کے درمیان ماچس جلائی جائے تو اس کے نتیجہ میں شدید اندیشہ ہے کہ آگ بھڑک اٹھے اور وہ آس پاس کی تمام چیزوں کو جلا ڈالے۔ اسی طرح ہر آدمی اپنے سینہ میں ایک نہایت تیز قسم کا آتش گیر مادہ لیے ہوئے ہے جو معمولی ٹھیس سے بھڑک اٹھتا ہے اور کچھ دیر کے لیے آدمی کو بے قابو بنا دیتا ہے۔ یہ مادہ انا (ایگو) ہے۔

پٹرول کے ذخائر کے درمیان دھماکہ سے بچنے کا واحد راز یہ ہے کہ وہاں ماچس نہ جلائی

جائے۔ اسی [illegible]وں کے درمیان ان کے غیظ وغضب سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ ان
کی انا کو نہ چھیڑا جا[illegible]نا کو چھیڑنے کے بعد ہمیں لازماً فریق ثانی کی غضب ناکی کا شکار ہونا
پڑے گا، خواہ یہ فریق ثانی ہندو ہو یا مسلمان۔ خواہ وہ غیر قوم کا ہو یا خود اپنی قوم کا۔
کسی نے نہایت صحیح کہا ہے کہ ——— ہر آدمی کے اندر ایک شیطان سویا ہوا ہے،
اس شیطان کو سویا رہنے دو۔ کیوں کہ اگر تم اس کو جگاؤ گے تو وہ سب سے پہلے تم کو اپنی
خونخواری کا نشانہ بنائے گا۔

God Arises

by Maulana Wahiduddin Khan

This English edition of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, is an updated version, incorporating considerable additional material.

It has also been translated into a number of other languages, including Arabic, French, Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, Tamil, etc., and has come to be accepted as standard work on the Islamic position vis-a-vis modern thought.

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 / 81-85063-17-6 **Price Rs. 45**

THE ISLAMIC CENTRE
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110 013

احتجاج یا احتساب

ملک کی تقسیم (۱۹۴۷) سے لے کر اب تک کی پوری تاریخ میں ہندستانی مسلمانوں نے جس مسئلہ پر سب سے زیادہ دھوم مچائی ہے وہ شاہ بانو بیگم کا مشہور معاملہ ہے۔ محمد احمد خاں۔ شاہ بانو بیگم کیس (Criminal Apeal No. 103 of 1981) پر ہندستان کی سپریم کورٹ نے ۲۳ اپریل ۱۹۸۵ کو فیصلہ دیا۔ اس فیصلہ میں سپریم کورٹ نے مدھیہ پردیش ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کو باقی رکھا کہ محمد احمد خاں اپنی مطلقہ بیوی شاہ بانو بیگم کو 179.20 روپیہ ماہانہ بطور گزارہ (Maintenance) ادا کریں۔

یہ فیصلہ جو (Criminal P.C. (2 of 1974) S. 125-Maintenance) کے تحت دیا گیا تھا، اس میں فاضل جج نے قرآن کی آیت کا بھی حوالہ دیا اور یہ کہا کہ مطلقہ عورت کو گزارہ دینا عین قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔ انھوں نے اپنے فیصلہ میں قرآن سے سورہ البقرہ کی آیت ۲۴۱ نقل کی۔ سپریم کورٹ نے اپنے انگریزی فیصلہ میں اصلاً قرآن کے جس انگریزی ترجمہ پر انحصار کیا وہ عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ تھا۔ انھوں نے مذکورہ آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

For divorced women maintenance (should be provided) on a reasonable (scale). This is a duty on the righteous.

قرآن کی مذکورہ آیت میں "متاع" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ عبداللہ یوسف علی نے Maintenance کے لفظ سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ عربی زبان میں دو لفظ بالکل الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ ایک متاع، دوسرے نفقہ۔ متاع کا مساوی لفظ انگریزی زبان میں Provision ہے۔ اور نفقہ کا مساوی لفظ Maintenance ہے۔ اس اعتبار سے مذکورہ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ اس میں (Provision) کا لفظ استعمال کیا جائے جو وقتی عطیہ کے ہم معنی ہے۔ مگر عبداللہ یوسف علی نے غلط طور پر اس کے ترجمہ میں Maintenance کا لفظ استعمال کیا جو مستقل گزارہ کا مفہوم رکھتا ہے۔

سپریم کورٹ نے عبداللہ یوسف علی کے اس ترجمہ سے فائدہ اٹھایا اور مطلقہ کو ماہانہ گزارہ

دینے کی ہدایت جاری کر دی، جب کہ آیت کے اصل الفاظ کے مطابق مطلقہ کے لیے صرف بوقت رخصت کچھ نقد سامان دینے کی گنجائش نکلتی تھی۔

قرآن کے اعتبار سے مذکورہ فیصلہ بلاشبہ غلط تھا۔ مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں نے کیا کیا۔ انھوں نے اپنی ساری توجہ صرف سپریم کورٹ کے فیصلہ پر لگا دی نہ کہ مسلمان مترجم کے انگریزی ترجمہ پر۔ انھوں نے سپریم کورٹ کے خلاف تو اتنا طوفان اٹھایا کہ زمین و آسمان ایک کر دیا۔ مگر مسلمانوں کی کسی بھی جماعت یا کسی بھی قابل ذکر مسلم لیڈر کے اندر یہ تڑپ پیدا نہیں ہوئی کہ انگریزی کا ایک صحیح اور مستند ترجمۂ قرآن وجود میں لایا جائے تاکہ آئندہ کسی "دشمنِ اسلام" کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ ہمارے اپنے ترجمہ کا حوالہ دے کر ہمارے خلاف شر انگیزی کر سکے۔

واٹر ٹینک کا پانی بہہ کر چھت سے نیچے آرہا ہو تو زمین کی قوت کشش کے خلاف شور و غل کرنا بے فائدہ ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ واٹر ٹینک کا سوراخ بند کیا جائے۔ اسی طرح آپ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کوئی شخص آپ پر وار کرے تو دوسرے شخص کے خلاف چیخ پکار کرنے کے بجائے اپنی کمزوری کو دور کرنے میں لگ جائیے، اس کے بعد آپ خود بخود دوسروں کے وار سے محفوظ ہو جائیں گے۔

دوسری مثال

چاندمل چوپڑا نے ۱۹۸۵ میں بنگال ہائی کورٹ میں ایک رٹ کی اپیل داخل کی۔ اس میں ہائی کورٹ سے کہا گیا تھا کہ وہ دستور ہند کی دفعہ ۲۲۶ کے تحت حکومت مغربی بنگال کے نام ہدایت جاری کرے کہ وہ قرآن کی اشاعت اور تقسیم پر پابندی عائد کر دے۔ چاندمل چوپڑا نے اپنی اپیل میں قرآن کے انگریزی ترجموں سے مختلف آیتیں نقل کی تھیں اور کہا تھا کہ یہ آیتیں اپنے پڑھنے والے کے اندر لڑائی کی اسپرٹ ابھارتی ہیں اور اس طرح ملک کے اندر قیام امن میں رکاوٹ ہیں۔

چاندمل چوپڑہ کی یہ درخواست بلاشبہ لغو تھی، اور اس کی اسی لغویت کی بنا پر مسٹر جسٹس باسک نے ۱۷ مئی ۱۹۸۵ کو اس کے خلاف فیصلہ دیا اور یہ کہہ کر اسے خارج کر دیا:

... for the aforesaid reasons this application stands dismissed (Para 40).

چاندمل چوپڑا کے دعوے کی بنیاد دو بارہ قرآن کے وہ ترجمے تھے جن میں کثرت سے غلطیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر چاندمل چوپڑا نے اپنی اپیل میں قرآن کی سورہ الحج (آیت ۳۹) کا حوالہ دیا تھا۔ اس آیت کا ترجمہ محمد مارڈیوک پکتھال نے ان الفاظ میں کیا ہے:

Sanction is given unto those who fight ...

اس ترجمے سے بظاہر یہ نکلتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کو لائسنس دے رہا ہے کہ وہ دوسروں کے خلاف لڑائی چھیڑیں اور ان سے جنگ وقتال کریں۔ اور اسی ترجمہ کو چاندمل چوپڑا نے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ مگر یہ ترجمہ بجائے خود غلط ہے۔ قرآن کا اصل لفظ یقاتلون (ت پر زبر) ہے، مگر مترجم نے اس کے برعکس یقاتِلون (ت پر زیر) کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اس غلطی کی وجہ سے آیت کا مطلب بالکل الٹ گیا۔ اس آیت کا صحیح انگریزی ترجمہ یہ ہوگا:

Sanction (to take up arms) is given to those who are attacked ...

قرآن کے اصل لفظ (اور اس کے صحیح ترجمہ کے مطابق) اس آیت میں دفاع کے طور پر لڑنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر غلط ترجمہ کے نتیجہ میں یہ آیت جارحانہ جنگ کے ہم معنی بن گئی، اور چاندمل چوپڑا جیسے لوگوں کو موقع مل گیا کہ وہ اس غلط ترجمہ کو لے کر اسلام کو خونخوار مذہب ثابت کریں اور عدالت سے لے کر پریس تک اس کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم چلائیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد خود مسلمانوں نے کیا کیا۔ مسلم اخبارات نے چاندمل چوپڑا کے خلاف دھواں دھار مضامین شائع کیے اور مسلم لیڈروں نے اس کو ایک خطرناک سازش ظاہر کرنے کے لیے خطابت کا سارا زور صرف کر دیا۔ مگر مسلمانوں میں سے کوئی بھی تنظیم یا کوئی بھی قابل ذکر شخصیت ایسی نہیں نکلی جس کو یہ واقعہ بے تاب کر دے کہ انگریزی زبان میں قرآن کا کوئی صحیح اور قابل اعتماد ترجمہ موجود نہیں۔ اور پھر وہ اس منصوبہ پر عمل شروع کر دے کہ ایک صحیح اور قابل اعتماد انگریزی ترجمہ تیار کر کے شائع کیا جائے تاکہ چاندمل چوپڑا جیسے

جڑوں کی جڑ ہمیشہ کے لیے کٹ جائے۔

ملت کی کہانی

یہ دو مثالیں محض منفرد مثالیں نہیں۔ یہی موجودہ مسلمانوں کی پوری کہانی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی وہ اصل کمزوری کیا ہے جس نے ان کو موجودہ زمانہ میں بربادی سے دوچار کر رکھا ہے۔ وہ پچھلی نصف صدی سے صرف ایک ہی کام کر رہے ہیں ـــــــ دوسروں کو نشانہ بنا کر ان کے خلاف ہنگامہ آرائی کرنا۔ وہ اپنی داخلی اصلاح اور اپنے اندرونی استحکام کے میدان میں کوئی حقیقی کام انجام نہ دے سکے۔

قرآن کا یہ فیصلہ (آل عمران ۱۲۰) ہے، اور تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے کہ جب بھی کوئی خارجی طاقت کسی گروہ کو نقصان پہنچائے تو یہ درحقیقت خود نقصان پذیر گروہ کی داخلی کمی کی بنا پر ممکن ہوتا ہے۔ خربوزے کا کٹنا چھری کی سنگ دلی سے زیادہ خربوزے کی اپنی کمزوری (Vulnerability) کا نتیجہ ہے۔

چنانچہ تمام عقل مند لوگ ہمیشہ یہی کرتے ہیں کہ جب وہ کسی خارجی عنصر کی طرف سے کسی نقصان سے دوچار ہوتے ہیں تو فوراً وہ اپنے کمزور پہلو (Vulnerable point) کی تلاش میں لگ جاتے ہیں، تاکہ اس کی اصلاح کرکے خارجی زیادتیوں کے خلاف بند بنا سکیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ انتہائی نادانی کے ساتھ صرف دوسروں کے خلاف چیخ پکار کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی داخلی کمیوں کو درست کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پر اب تک ان کے احوال درست نہ ہو سکے۔

اس معاملہ میں پوری مسلم ملت نے حبل اللہ کو کھو دیا ہے۔ وہ اسلام کی تعلیم سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے، تو موجودہ مسلمان سب کے سب دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ جنھوں نے احتجاجی سیاست کو بطور قیادتی پیشہ کے اختیار کر رکھا ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو کلی یا جزئی طور پر اس قسم کی سیاست سے الگ ہیں۔ تاہم وہ پہلے طبقہ کے خلاف کھل کر نکیر نہیں کرتے، وہ ان پر مشخص اور متعین تنقید نہیں کرتے۔ اور اگر بالفرض کبھی کچھ کہتے ہیں تو ان کا یہ کہنا انھیں اس سے نہیں روکتا کہ وہ حدیث کے الفاظ میں، اس کے اکیل اور خلیط

اور شریک نہ بنیں۔ گویا کہ پوری ملت اس وقت ایک ہی کام میں مشغول ہے، اور وہ احتجاجی سیاست ہے، ایک طبقہ اس میں براہِ راست طور پر ملوث ہے اور دوسرا طبقہ بالواسطہ طور پر۔

یہ بے حد خطرناک علامت ہے۔ کیوں کہ قرآن و حدیث کے مطابق یہ وہ چیز ہے جو قوموں کو غضب الٰہی کا مستحق بنا دیتی ہے۔

یہ کھلی ہوئی اسلام کی خلاف ورزی ہے۔ کیوں کہ اس طرح کے معاملات میں اسلام کا طریقہ احتجاج نہیں ہے بلکہ احتساب ہے۔ اس طرح کے قومی امور میں ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اپنی داخلی کوتاہیوں کو تلاش کر کے ان کی اصلاح میں سرگرم ہوں، نہ یہ کہ کسی خارجی عنصر کو "ظالم" قرار دے کر اس کے خلاف شور و غل میں مشغول ہو جائیں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی غلط روش کو واضح کرنے کے لیے میں اسلامی تاریخ سے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

احد کے موقع پر مکہ کے لوگ چڑھائی کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ حنین میں قبیلہ ہوازن نے دھوکا دے کر مسلمانوں کے اوپر حملہ کر دیا تھا۔ ان دونوں مواقع پر مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس اعتبار سے بظاہر یہ ہونا چاہئے تھا کہ دونوں معاملات میں مسلمانوں کے نقصان کی ساری ذمہ داری فریق ثانی پر ڈال کر صرف اسی کو برا بھلا کہا جائے۔ مگر اس کے باوجود قرآن نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اس نے یک طرفہ طور پر مسلمانوں کو تنبیہہ کی کہ تمہاری فلاں فلاں کمزوریوں نے فریق ثانی کو یہ موقع دیا کہ وہ تمہارے خلاف اپنے دشمنانہ منصوبہ میں کامیاب ہو سکیں۔

غزوۂ احد ۳ھ میں ہوا، اور غزوۂ حنین ۸ھ میں۔ یہ دونوں واقعات خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آئے۔ چنانچہ ان دونوں کے بارے میں قرآن میں تبصرہ نازل ہوا۔ اس لحاظ سے یہ دونوں معیاری نمونے ہیں جن پر ہمیں اپنے مسائل کو جانچنا چاہیے۔

اس اعتبار سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ قرآن کا انداز سراسر اس کے برعکس ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلم قائدین نے اختیار کر رکھا ہے۔ موجودہ مسلم قائدین کی روش کے خلاف، قرآن نے فریق ثانی کے "ظلم اور سازش" کے بارہ میں کچھ نہیں کہا۔ اس نے دونوں لڑائیوں کے نقصان کی ذمہ داری خود مسلمانوں کی بعض کمزوریوں پر ڈالی۔ احد کے واقعہ کے بارے میں قرآن نے یہ کہا کہ تمہارے اختلاف و نزاع (آل عمران ۱۵۲) کی وجہ سے تمہیں یہ

نقصان اٹھانا پڑا۔ اسی طرح حنین کے بارہ میں قرآن نے اعلان کیا کہ اس موقع پر تمہیں جس شکست سے دوچار ہونا پڑا، اس کا سبب تمہارا فخر اور عجب (التوبہ ۲۵) تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر خدا کی پکڑ سے ڈرتے ہوں اور قرآن و سنت کو اپنی زندگی کا رہنما بنائیں تو ان کے لیے کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ وہ اپنے مصائب کا الزام دوسروں کو دے کر ان کے خلاف چیخ پکار کا موجودہ مشغلہ مکمل طور پر بند کر دیں۔ اس کے برعکس ان کے تمام مفکرین اور رہنما صرف اس ایک مہم میں لگ جائیں کہ وہ مسلمانوں کی ان داخلی کمزوریوں کو دور کریں جس کی وجہ سے دوسروں کو یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ انھیں اپنے مخالفانہ عزائم کا نشانہ بنائیں اور ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں۔

جس دن مسلمانوں کی داخلی کمزوریاں ختم ہوں گی، اسی دن اغیار کے تمام مخالفانہ منصوبے بے زمین ہو کر رہ جائیں گے اور آخر کار اپنی موت آپ مرجائیں گے۔

آزمودہ حل

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کو ہمارے لیڈر "مسلم کش فسادات" کہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بعض ہندوؤں کی بعض مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہیں ہے بلکہ یہ یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی نسل کشی ہے۔ مگر اس واقعہ کا سب سے زیادہ حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ اس عمومی مسلم کشی سے مسلم لیڈر صاحبان ہمیشہ مکمل طور پر محفوظ رہتے ہیں، خواہ وہ بے ریش لیڈر ہوں یا باریش لیڈر۔ ایک مسلم اخبار نے بالکل درست طور پر لکھا ہے :

"اس (فساد) میں قصور عام لوگوں سے زیادہ مسلمانوں کے آرام پسند لیڈروں کا ہے جو مسلمانوں سے قربانی وایثار کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن ان میں قربانی دینے کا کوئی حوصلہ نہیں ہے۔ چالیس برسوں کے دوران مسلمانوں کو جو قربانی دینی پڑی یا زبردستی ان سے جو قربانی وصول کی گئی اس کی مثال شاید ہی دنیا کی دوسری کوئی ملت پیش کر سکے۔ لیکن ان چالیس برسوں میں ایک بھی مسلمان لیڈر کو خراش تک نہیں آئی" نقیب (پٹنہ) ۲۰ جولائی ۱۹۸۷

مسلم لیڈروں کے اپنے بیان کے مطابق اس ملک میں تقریباً نصف صدی سے مسلم کشی اور مسلمانوں کے قتل عام کے واقعات ہو رہے ہیں۔ مگر بے ریش اور باریش مسلم لیڈروں میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں جو ہلاکت اور بربادی کے اس عمومی طوفان کا شکار ہوا ہو۔ اس قتل عام میں فرزندانِ ملت تو مسلسل ذبح ہو رہے ہیں، مگر فرزندانِ قیادت پوری طرح محفوظ ہیں۔

اس تجربہ کی روشنی میں میں مسلمانوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس پورے معاملہ پر از سر نو غور کریں۔ کیوں کہ اس تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر ہلاکت خیز فسادات کے باوجود یہاں ایک مجرب نسخہ ان کے لیے موجود ہے۔ وہ خود بھی وہی کریں جو ان کے لیڈر نصف صدی سے کر رہے ہیں۔ مسلمان لیڈر جس تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو مسلم کش فسادات کی زد سے بچائے ہوئے ہیں اسی تدبیر کے ذریعہ عام مسلمان بھی اس وبا سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اس معاملہ میں اپنے بچاؤ کا اس سے زیادہ کارگر نسخہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اب دیکھئے کہ مسلمان لیڈر صاحبان کس طرح اپنے آپ کو مسلم کش فسادات کی زد سے بچائے

ہوتے ہیں۔ ایک لفظ میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام لیڈر صاحبان اپنی ذات کے معاملہ میں عین اسی طریقے پر عمل کرتے ہیں جس کی تلقین الرسالہ میں مسلسل طور پر کی جا رہی ہے۔ البتہ جب وہ دوسروں کے سامنے آتے ہیں تو وہ اس کے برعکس تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ اسٹیج پر وہ الرسالہ کے مخالف ہیں، مگر اپنی ذاتی زندگی کے معاملہ میں وہ الرسالہ کی بات کو مبالغہ آمیز حد تک پکڑے ہوئے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے یہودی پیشواؤں کے بارے میں اپنے شاگردوں سے کہا تھا: فقیہہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ کیوں کہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کو اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ ان کو اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ (متی ۲۳: ۱-۳)

موجودہ حالات میں ہمارے لیڈر اور رہنما جو کچھ کر رہے ہیں وہ برعکس طور پر ہمارے لیے مطلوب ہو گیا ہے۔ ہندو مسلم مسئلہ کے ضمن میں یہ لیڈر عام مسلمانوں کو ٹکراؤ کا سبق دیتے ہیں، مگر خود اپنی ذات اور اپنی اولاد کے معاملے میں وہ ہم آہنگی کے طریقہ پر عمل کر رہے ہیں۔ اس لیے میں حضرت مسیح کے الفاظ کو بدل کر مسلمانوں سے کہوں گا کہ تمہارے لیڈر اس معاملہ میں جو باتیں کہتے ہیں ان کو نہ سنو، البتہ وہ خود جس طریقہ کو اپنائے ہوئے ہیں اسی کو تم بھی اپنا لو۔ اور پھر تم بھی اسی طرح محفوظ رہو گے جس طرح تمہارے تمام لیڈر محفوظ ہیں۔

چند مثالیں

ایک مسلمان لیڈر سے راقم الحروف کی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ الرسالہ کے ذریعہ مسلمانوں کو بزدلی کا سبق دے رہے ہیں۔ حالاں کہ پیغمبر اسلام کا حال یہ تھا کہ انھوں نے اسلام دشمنوں سے جنگ کی۔ انھوں نے ہمیشہ اسلام دشمنوں کے خلاف تلوار اٹھائی۔ یہ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ لیڈر کے اصل الفاظ یہ تھے:

He always took up arms against the enemies of Islam.

میں نے کہا کہ آج کل ساری دنیا میں جہاد کے میدان کھلے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ مسلمانوں اور "دشمنانِ اسلام" کے درمیان لڑائی جاری ہے۔ آپ ہتھیار خریدیے اور کسی جگہ کا انتخاب کر کے میدانِ

جہاد میں کود پڑیے۔ اب ان کا لہجہ بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا رہا ہوں تاکہ وہ ڈاکٹر اور انجینیئر بن کر قوم کی خدمت کریں۔ کیا یہ جہاد نہیں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مسلمان لیڈروں کے فسادات سے محفوظ رہنے کا ایک راز یہ ہے کہ وہ قوم کے بچوں کے سامنے پرجوش تقریریں کرکے انھیں لڑائی کے میدان میں بھیج رہے ہیں اور خود اپنے بچوں کو اس قسم کے جھگڑوں سے دور رکھ کر تعلیم کے میدان میں مصروف کیے ہوئے ہیں۔ اب عام مسلمانوں کو بھی یہی کرنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو پرامن "جہاد" کے میدان میں لگا دیں۔ اس کے بعد وہ بھی اسی طرح فسادات کی زد سے محفوظ رہیں گے جس طرح ان کے لیڈر اور لیڈر صاحبان کے بیٹے بیٹیاں محفوظ ہیں۔

ہمارے تمام لیڈروں کا حال یہ ہے کہ وہ عمل کے بزدل ہیں اور الفاظ کے بہادر۔ اس پالیسی سے ان کو یہ زبردست فائدہ ہو رہا ہے کہ "قتل عام" کے ماحول میں بھی وہ اور ان کے گھر والے قتل ہونے سے پوری طرح بچے ہوئے ہیں۔ پھر کیوں نہ عام مسلمان بھی اسی پالیسی کو اختیار کرلیں۔ ایسا کرکے وہ صرف اپنے لیڈروں کی پیروی کریں گے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

۲۔ اس سلسلے میں ایک بے حد سبق آموز مثال وہ ہے جو راقم الحروف نے اپنی کتاب (حل یہاں ہے) میں درج کی ہے۔ یہ مثال تفصیلی صورت میں کتاب کے صفحہ ۴۲-۴۵ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

مسلم لیڈر صاحبان کی ایک جماعت ۶۷ - ۱۹۶۶ کے درمیان بڑے جوش و خروش کے ساتھ اٹھی۔ اس تحریک کا مرکز شمالی ہند تھا۔ انھوں نے مسلم مسائل کے حل کا وہ نسخہ پیش کیا جس کو اقبال نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ ستیز

انھوں نے کہا کہ ہمیں لڑکر اپنا حق وصول کرنا ہے۔ اس "لڑائی" کا پہلا میدان ملکی انتخاب قرار پایا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں کانگریس (بالفاظ دیگر ہندو قیادت) کو انتخابی میدان میں شکست دینا ہے۔ ہم جب اس طرح اپنی قوت کا مظاہرہ کریں گے تو تمام لیڈر سہم جائیں گے اور اپنے آپ کو امکانی سیاسی نقصان سے بچانے کے لیے ہمارے تمام مسائل حل کر دیں گے۔

۱۹۶۷ کے الکشن میں ضرر رسانی کے اس نسخہ کا تجربہ کیا گیا مگر یہ نسخہ مسلمانوں کے لیے ایک

ذرا بھی مفید ثابت نہ ہو سکا۔ تاہم لیڈروں کی اس جماعت نے خود اپنے مسئلہ کے لیے جو نسخہ استعمال کیا وہ انتہائی کارگر ثابت ہوا۔ یہ نسخہ کسی شاعر کے کلام سے لینے کے بجائے قرآن سے لیا گیا تھا۔ یہ نسخہ وہی تھا جس کو قرآن میں تالیف قلب کہا گیا ہے۔

لیڈروں کی اس جماعت کو ایک ہمسایہ یونیورسٹی کے ہندو طلبہ سے خطرہ پیدا ہوا۔ یہاں انھوں نے ضرر رسانی کے بجائے نفع رسانی کی تدبیر استعمال کی۔ انھوں نے ان ہندو طلبہ سے ملاقاتیں کیں، اپنے یہاں ان کی دعوتیں کیں، ان کو ہیرو بنا کر انھیں انعامات دیئے۔ اس طرح ان کے دل کو جیت کر اپنے مسئلہ کو حل کر لیا۔ اس پورے واقعہ کی تفصیل "حل یہاں ہے" نامی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اب میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دوں گا کہ مسلمان لیڈر اگر ٹکراؤ کی باتیں کریں تو ان کی بات بالکل نہ سنو بلکہ وہی کرو جو وہ خود کرتے ہیں۔ یعنی اپنے غیر مسلم پڑوسیوں سے اچھے تعلقات بناؤ۔ ان سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آؤ، ان کے لیے نفع بخش بننے کی کوشش کرو۔ ان سے تمہیں ناخوش گواری کا تجربہ ہو تب بھی تم اپنی طرف سے ان کے سامنے خوش گوار ردعمل پیش کرو، اور اس کے بعد تمہارے مسائل اسی طرح حل ہو جائیں گے جس طرح لیڈر صاحبان کے مسائل حل ہو گیے۔

۳۔ ایک صاحب نے بتایا کہ شمالی ہند کے ایک مقام پر مسلمانوں کا ایک جلسہ تھا، میں بھی اس میں شریک تھا۔ ایک باریش مسلمان لیڈر نے تقریر کی۔ انھوں نے جوش و خروش کے ساتھ بابری مسجد کا ذکر کیا اور کہا کہ "بابری مسجد خون مانگ رہی ہے"۔ جب تقریر ختم ہوئی تو مذکورہ بزرگ لیڈر صاحب کے پاس گیے اور کہا کہ اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ نے اپنی تقریر میں یہ فرمایا ہے کہ بابری مسجد خون مانگ رہی ہے۔ اس سلسلہ میں صرف اتنا اور جاننا چاہتا ہوں کہ کس کا خون، میرے بچوں کا یا آپ کے بچوں کا۔ لیڈر صاحب نے کہا کہ میرا تو صرف ایک بچہ ہے اور وہ اس وقت عرب میں زیر تعلیم ہے۔ مذکورہ صاحب نے کہا تو گویا آپ اپنی اولاد کو تو تعلیم و ترقی کے میدان میں سرگرم کیے ہوئے ہیں اور دوسروں کی اولاد کو کٹنے مرنے کے میدان میں سرگرم کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر لیڈر صاحب بگڑ گیے۔

اصل یہ ہے کہ ہمارے تمام لیڈر صرف الفاظ کا جہاد کر رہے ہیں۔ وہ دوسروں کو جوش

دلاتے ہیں کہ وہ آگ کے سمندر میں کود پڑیں۔ مگر خود اپنے بچوں کو لے کر دور ساحل پر کھڑے رہتے ہیں۔ یہی سادہ سا راز ہے جس نے ان لیڈروں کو فسادات کی تباہی سے بچا رکھا ہے۔ اب مسلمانوں کو بھی یہی کرنا چاہیے کہ وہ لیڈر کے الفاظ کو الفاظ سے زیادہ اہمیت نہ دیں۔ وہ خود بھی وہی کریں جو لیڈر لوگ کرتے ہیں، وہ ہرگز وہ نہ کریں جو لیڈر لوگ کہتے ہیں، اور اس کے بعد وہ ہر تباہی سے مکمل طور پر محفوظ رہیں گے۔

۴۔ ایک مقامی مسلمان لیڈر ہیں۔ پہلے وہ اپنے محلہ میں بالکل بے محابا طریقہ سے رہتے تھے۔ کسی کی بات انھیں برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ بات بات میں دوسروں سے لڑنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

اس کے بعد ان کی شادی ہوئی۔ جلد جلد تین بچے پیدا ہوگئے۔ یہ بچے کچھ بڑے ہوئے تو گھر کے باہر محلہ میں چلنے پھرنے اور کھیلنے لگے۔ اب لیڈر صاحب کے اندر ایک نیا ذہن پیدا ہوا۔ انھوں نے سوچا کہ میں اکثر گھر سے باہر رہتا ہوں۔ گھر میں کوئی دوسرا مرد نہیں ہے۔ میرے بچے اکثر کھیلنے کے لیے یا کسی کام کے لیے باہر نکلتے ہیں۔ اگر میں پہلے کی طرح محلہ والوں سے لڑائی جاری رکھوں تو اس کا خمیازہ میرے بچوں کو بھگتنا پڑے گا۔ جس شخص کو بھی مجھ سے شکایت پیدا ہوگی وہ اس کا انتقام میرے چھوٹے بچوں سے لے گا۔ اس سوچ کا آنا تھا کہ لیڈر صاحب بالکل بدل گئے۔ جس محلہ میں پہلے وہ لڑ بھڑ کر رہنے کا نظریہ اپنائے ہوئے تھے وہاں اب وہ میٹھے بول بول کر اور مل جل کر رہنے کے نظریہ پر عمل کرنے لگے۔

ان کی اس تبدیلی کو دیکھ کر ایک شخص نے پوچھا: جناب اب تو آپ بالکل بدل گئے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آپ وہی شخص ہیں جو پہلے تھے۔ لیڈر صاحب نے مسکرا کر جواب دیا: بھائی، میرے بچوں نے مجھ کو بزدل بنا دیا۔

ہمارے تمام لیڈر قوم کے بچوں کو بہادری کا سبق دیتے ہیں۔ مگر خود اپنے بچوں کے لیے وہ بزدل بنے ہوئے ہیں۔ زندگی کا یہی وہ راز ہے جس نے تمام لیڈروں کو ذاتی نقصان سے بچا رکھا ہے۔ اب قوم کو چاہیے کہ وہ لیڈروں کی پر جوش تقریروں پر دھیان نہ دے۔ وہ خود بھی "بزدلی" کے اسی نسخہ کو اپنائے جس کو اپنا کر ہمارے تمام لیڈر ترقی اور کامیابی کے منازل طے کر رہے ہیں۔

کوئی نقصان پہونچانے والا ان کو نقصان نہیں پہونچا سکتا۔

۵۔ لیڈر صاحبان عام طور پر مسلمانوں کو یہ سبق دیتے ہیں کہ تم کو دب کر نہیں رہنا ہے، اگر تم دب گیے تو لوگ تم کو اور زیادہ دبائیں گے۔ یہاں تک کہ تمہارا خاتمہ ہی کر دیں گے۔ مگر یہی لیڈر حضرات اس وقت دبنے کے طریقے پر عمل کر کے اپنے مسئلہ کو حل کرتے ہیں جب کہ خود ان کا ذاتی معاملہ زد میں آگیا ہو۔

ایک لیڈر صاحب کا ایک ادارہ تھا۔ اس ادارہ کے احاطہ میں امرود کا ایک باغ تھا۔ قریب کے محلہ کی ایک گائے اس باغ میں گھس آئی۔ مسلم باغبان نے گائے کو بھگانے کے لیے اسے مارا۔ اتفاق سے اس کو گردن کے پاس سخت چوٹ آگئی۔ اس کے بعد جب وہ بھاگنے لگی تو باغ کے کنارے کے خاردار تار میں پھنس کر وہ اور زیادہ زخمی ہو گئی۔

یہ گائے جب اپنے ہندو مالک کے گھر پہونچی تو اس کے خون آلود جسم کو دیکھ کر ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ جب معلوم ہوا کہ مسلم ادارہ کے آدمی نے اس کو مارا ہے تو محلہ کے لوگ سخت مشتعل ہو گیے۔ ایک بڑا مجمع ادارہ کے احاطہ میں گھس آیا۔ وہ اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا اور یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ مارنے والے آدمی کو ان کے حوالہ کیا جائے۔ اس دوران میں وہ آدمی باغ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور ادارہ کے ایک کمرے میں چھپ گیا تھا۔ ادارہ والوں نے دیکھا کہ اس وقت یہ مجمع سخت غصہ میں ہے، اس لیے اس وقت آدمی کو ان کے حوالے کرنا مناسب نہ ہوگا۔ وہ مجمع کی اشتعال انگیزی سے مشتعل نہیں ہوئے۔ انھوں نے حکیمانہ گفتگو کر کے اس کو ایک دن کے لیے ٹال دیا۔ اور کہا کہ آپ ہمیں ایک دن کا موقع دیجئے۔ ہم اس آدمی کو تلاش کر کے کل تک ضرور اس کو آپ کے حوالے کر دیں گے۔

مجمع کو واپس کرنے کے بعد ادارہ کے لوگوں نے باغبان کو بلایا اور اس سے کہا کہ دیکھو ایک طرف تمہاری ذات ہے اور دوسری طرف ایک پورا مسلم ادارہ ہے اگر وہ تم کو نہیں پاتے ہیں تو وہ اپنا غصہ سب لوگوں پر اتاریں گے۔ تم ہمت کر کے اللہ کے بھروسہ پر ایسا کرو کہ گائے کے مالک کے یہاں جا کر حاضر ہو جاؤ اور اپنی غلطی کا اقرار کر لو۔ ان سے کہو کہ یہ میری ذاتی غلطی ہے، آپ مجھ کو جو سزا چاہیں دیں۔ اگر وہ لوگ کچھ جذبہ میں آکر تمہیں ڈانٹیں ماریں تو اس کو بھی برداشت

کرلیتا۔ چنانچہ اگلے دن وہ آدمی گائے کے مالک کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں حاضر ہو گیا ہوں۔ واقعۃً مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ آپ جو فیصلہ کریں وہ مجھ کو منظور ہے۔

انسان بہر حال انسان ہے۔ باغبان جب اس طرح حاضر ہو گیا اور اس نے سیدھے طور پر غلطی کا اعتراف کر لیا تو گائے والوں کے جذبات بھی ٹھنڈے پڑ گیے۔ انھوں نے کہا کہ خیر اب جاؤ، اگر کل تم مل گیے ہوتے تو ہم تم کو مارے بغیر نہیں چھوڑتے۔ اب گائے کو ہم نے اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔ اگر وہ مر گئی تو البتہ تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ (الجمعیۃ ویکلی، دہلی ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۷)

اس طرح ایک معاملہ جو ایک مسلم ادارہ بلکہ پورے شہر میں آگ لگا سکتا تھا، وہ نہایت آسانی سے وہیں کا وہیں ختم ہو گیا۔ ادارہ والوں نے جس تدبیر کا تجربہ اپنے ذاتی معاملہ میں کیا اسی کا سبق اگر وہ پوری قوم کو اس طرح کے معاملات میں دیں تو کتنے ہونے والے حادثات ہونے سے رہ جائیں۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے قائدین اپنے ذاتی معاملات کو حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ حل کرتے ہیں۔ اور ملت کو یہ سبق دیتے ہیں کہ تم خدا کے فوجدار ہو، کسی کی پروا کیے بغیر مجاہدانہ طور پر لڑ جاؤ۔ تاہم مسلمانوں کو میں یہ مشورہ دوں گا کہ اس معاملہ میں وہ لیڈروں کی تقریروں کو ہرگز نہ سنیں، وہ ان کے عمل کو دیکھیں۔ یہ لیڈر صاحبان جس طرح خاموش تدبیر سے اپنے ذاتی معاملہ کو حل کرتے ہیں، اسی طرح وہ بھی اپنے معاملات کو حل کریں، اور اس کے بعد انشاءاللہ وہ ہر فساد سے محفوظ ہو جائیں گے۔

۶۔ عرب کے سفر میں میری ملاقات ایک ہندستانی مسلمان سے ہوئی۔ پہلے وہ ہندستان میں مسلمانوں کے درمیان لیڈری کرتے تھے۔ اس کے بعد انھیں عرب میں ایک اچھا کام مل گیا اور وہ وہاں منتقل ہو گیے۔ آج کل وہ عرب میں خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ہندستان کیسا وحشی ملک ہے۔ وہاں آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں کسی مسلمان کی جان و مال محفوظ نہیں۔ آپ دیکھئے ہم لوگ یہاں کتنے سکون کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ یہاں کا نظام آپ کو جو کچھ دے رہا ہے اس کا آپ

نے [illegible] مگر آپ خود یہاں کے نظام کو جو کچھ دے رہے ہیں، اس کا ذکر کرنا آپ بھول گئے۔
میں نے کہا [illegible] جس ڈھنگ سے عرب میں رہتے ہیں، اگر ہندستان کے مسلمان اسی ڈھنگ
سے ہندستان میں رہیں تو وہ ہندستان میں بھی اسی طرح باعزت طور پر رہ سکتے ہیں جس طرح
آپ عرب میں رہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیسے۔ میں نے کہا کہ عرب میں آپ کے پرسکون
طور پر رہنے کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ یہاں کے نظام کے ساتھ کامل توافق (Adjustment)
ہے۔ اگر ہندستان کے مسلمان اپنے ملک کے نظام سے اسی طرح توافق اور ہم آہنگی کے ساتھ رہیں
تو ایک دن میں سارا جھگڑا ختم ہو جائے۔

میں نے کہا کہ ساری عرب دنیا میں وطنی کے مقابلہ میں خارجی کو نمبر ۲ کا شہری سمجھا جاتا
ہے۔ مگر آپ اس کو برداشت کرتے ہیں۔ یہاں ایک ہندستانی کے مقابلہ میں ایک امریکی
کو کئی گنا زیادہ تنخواہ ملتی ہے مگر آپ اس امتیاز کو گوارا کیے ہوئے ہیں۔ یہاں آپ کو یہ اجازت
نہیں کہ مسجد میں یا مسجد کے باہر لاؤڈ اسپیکر لگا کر تقریر کریں۔ یہاں آپ نہ کوئی آزاد اخبار
نکال سکتے اور نہ کوئی آزاد رسالہ چھاپ سکتے ہیں مگر اس کے خلاف آپ جیل بھرنے کی مہم نہیں
چلاتے۔ یہاں واضح طور پر بہت سے غیر شرعی امور پر عمل ہو رہا ہے۔ مگر ان کے بارہ میں آپ
بالکل خاموش ہیں۔ آپ حضرات اس قسم کی چیزوں کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کرتے اور نہ ان
مسائل پر کوئی جلوس نکالتے۔

میں نے کہا کہ عرب میں آپ کو جو پرسکون زندگی حاصل ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں
کے نظام سے ہم آہنگی اختیار کر کے آپ نے اس کی ضروری قیمت ادا کر دی ہے۔ اگر ہندستان
کے مسلمان یہ قیمت ادا کرنے پر راضی ہو جائیں تو وہاں بھی وہ عزت اور کامیابی کے ساتھ زندگی
گزار سکتے ہیں۔

مسلمانوں میں سے جو لوگ عرب ملکوں میں جاتے ہیں، حتی کہ ان کے اکابر جو کانفرنسوں میں
شرکت کرنے کے لیے عرب کے سفر کرتے رہتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں عام ہندستانی مسلمانوں کے
لیے زبردست سبق ہے۔ یہ مسلمان اور یہ اکابر عرب میں جا کر جس طرح وہاں کے نظام سے موافقت
کر کے رہتے ہیں، اسی طرح ہندستانی مسلمان بھی ہندستان کو اپنا ملک سمجھیں اور یہاں کے حالات

سے موافقت کرکے زندگی گزاریں۔ اس کے بعد انشاء اللہ ان کے لیے یہاں کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

۷۔ ایک لیڈر صاحب ہیں۔ لیڈر ہونے کے ساتھ وہ ایک اسلامی ادارہ بھی چلاتے ہیں۔ اور اس کے ذمہ دار اعلیٰ ہیں۔ یہ لیڈر صاحب اپنی پرجوش تقریروں میں اکثر اقبال کا یہ شعر پڑھتے ہیں:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

وہ جب تقریر کرتے ہیں تو ہمیشہ "اینٹی گورنمنٹ" لہجہ میں بات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں وزیروں اور گورنروں کی پروا نہیں کرتا۔ میں صرف خدا کی پروا کرتا ہوں اور اسی سے ڈرتا ہوں۔ حکمرانوں سے استغنا برتنا اور انھیں نظرانداز کرنا ان کا خاص کمال سمجھا جاتا ہے۔ ان کی اس قسم کی تقریروں کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے حلقہ کے لوگوں میں عام طور پر یہ ذہن بن گیا ہے کہ جو شخص حکمرانوں سے قریب ہو یا ان کے حق میں بھلائی کا کلمہ کہے تو وہ یقینی طور پر ابن الوقت اور موقع پرست ہے۔

مذکورہ لیڈر صاحب کا یہ انداز وہ ہے جس کو وہ اپنی تقریروں میں برتتے ہیں۔ مگر خود اپنے عملی معاملات میں ان کا طریقہ سراسر اس سے مختلف ہے۔ مثلاً ان کے ادارہ اور شاہراہ عام کے درمیان کوئی سڑک نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں ایک ایسی سڑک بن جائے جو ادارہ کو شاہراہ عام سے جوڑ دے تاکہ سفر آسان ہوسکے۔

بظاہر یہ ایک مشکل کام تھا، مگر ان کے زرخیز ذہن نے اس کا نہایت خوبصورت حل دریافت کرلیا۔ انھوں نے اپنے ادارہ کے احاطہ میں ایک "بین اقوامی" کانفرنس کی جس میں عرب کے کئی شیوخ بھی شریک ہوئے۔ اب لیڈر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ایک باضابطہ دعوت نامہ تیار کیا جس میں ریاست کے ہندو چیف منسٹر کو "خصوصی مہمان" کے طور پر کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ چیف منسٹر صاحب نے بخوشی یہ دعوت قبول کرلی۔ وہ جب اپنی سرکاری کار سے کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تو انھیں غیر معمولی اعزاز دیا گیا۔ مگر انھیں یہ دیکھ کر شرم آئی کہ بیرونی ملکوں کے مہمان ان کے شہر میں آئیں اور ان کو اجتماع گاہ تک پہنچانے کے لیے معقول راستہ موجود نہ ہو۔ لیڈر صاحب کے ساتھیوں نے چیف منسٹر کے اس احساس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جلد ہی وہاں ادارہ اور شاہراہ عام

کے دوران [illegible] ایک مہاسبھائی تقریر ہو گئی تھی۔

[illegible] مسلمانوں سے کہوں گا کہ آپ کے لیڈر اگر حکمرانوں کے خلاف تقریر کریں تو آپ ہرگز ایسی تقریروں کو سنجیدہ طور پر نہ لیں۔ آپ سرکاری افسروں اور حکام سے اچھے تعلقات رکھیں اور اس کے بعد آپ کے سب کام اسی طرح بخوبی طور پر انجام پا جائیں گے جس طرح لیڈروں کے اپنے کام بخوبی طور پر انجام پا رہے ہیں۔

۸۔ شریمتی سبھدرا جوشی (پیدائش ۱۹۱۹) ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ انھوں نے کرسچین کالج لاہور سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا اور پھر ملکی سیاست میں شامل ہو گئیں۔ وہ مہاتما گاندھی کی ساتھیوں میں سے ہیں۔

سبھدرا جوشی نے ایک انٹرویو کے دوران بتایا کہ ۱۹۴۷ کے فسادات میں ہم دہلی کے مسلم محلوں میں کام کر رہے تھے۔ دلی کانگریس پر ہمارا قبضہ تھا۔ گاندھی جی آئے۔ انھوں نے ہم سے پوچھا کہ کتنے مسلمان مارے گیے۔ ہم نے بتایا: دس ہزار سے زیادہ مارے گیے ہیں۔ وہ بہت برہم ہوئے اور کہا کہ تم نے بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ ہم نے کہا، ہم تو برابر کوشش کر رہے ہیں، مگر حالات بہت زیادہ خراب ہیں۔ انھوں نے غصہ میں پوچھا، ان دس ہزار میں تمہارے کانگریسی ورکر کتنے مارے گیے۔ ہم نے جواب دیا ایک بھی نہیں۔ اس پر وہ بولے "پھر میں کیسے مان لوں کہ تم نے بچانے کی کوشش کی ہو گی" (ماہنامہ شبستاں، دہلی، جون ۱۹۷۲)

گاندھی جی کے اس تبصرہ کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ لیڈر لوگوں نے فساد زدہ عوام کو بچانے کا کام ہی نہیں کیا، وہ بس دور دور سے اس کا کریڈٹ لیتے رہے۔ اگر واقعۃً وہ فساد زدہ عوام کو بچانے کی کوشش کرتے تو جس طرح دوسرے لوگ مارے گیے وہ بھی انھیں کے ساتھ مارے جاتے۔

اس پہلو سے قطع نظر، اس واقعہ میں ایک اور سبق ہے۔ وہ یہ کہ لیڈر لوگوں کے پاس کوئی ایسا نسخہ ہوتا ہے کہ عین اس وقت بھی لیڈروں میں سے کوئی لیڈر مارا نہ جائے جب کہ دوسرے لوگ دس ہزار سے زیادہ کی تعداد میں مار ڈالے گیے ہوں۔ اب میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ لیڈروں کی زندگی کے اس پہلو کا مطالعہ کریں۔ اگر انھوں نے اس راز کو جان لیا تو انھیں یہ شکایت

کرنے کی ضرورت نہ رہے گی کہ ان کا جان و مال اس ملک میں غیر محفوظ ہے۔

اگر آپ لیڈر صاحبان کی زندگی کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ لیڈروں کے محفوظ رہنے کا نسخہ وہی حکمت اور احتیاط کا طریقہ ہے جو الرسالہ میں پچھلے دس سال سے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ لیڈر صاحبان بظاہر الرسالہ کی بات کو نظر انداز کرتے ہیں مگر اپنی ذاتی زندگی میں وہ پوری طرح اس طریقہ کو اپنائے ہوئے ہیں۔ پھر آپ بھی کیوں نہ اسی خاموش طریقہ کو اپنا لیں۔ ایسا کرکے آخر کار آپ وہی کریں گے جو آپ کے لیڈر بہت پہلے سے کر رہے ہیں۔

۹۔ ایک تعلیم یافتہ مسلمان ایک ریاست میں سرکاری ملازم ہیں۔ ایک بار وہ اپنے محکمہ کے کام سے دہلی آئے۔ درمیان میں انھیں اپنے "چیف" سے بات کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ انھوں نے دہلی سے ٹرنک کال کیا۔ جب وہ ٹیلی فون پر اپنے چیف سے بات کر رہے تھے تو میں نے سنا کہ ان کی زبان سے صرف " ہاں صاحب ، جی صاحب " " ہاں صاحب ، جی صاحب " کے الفاظ نکل رہے ہیں۔ اس وقت اگرچہ وہ اپنے چیف سے سیکڑوں میل دور تھے۔ مگر حال یہ تھا کہ بات کرتے ہوئے کرسی سے اٹھے چلے جا رہے تھے، جیسے کہ چیف صاحب خود ان کے سامنے موجود ہوں۔

"ہندو چیف" سے جب ان کی بات ختم ہوگئی تو ان سے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر گفتگو شروع ہوئی۔ اس درمیان میں الرسالہ کا نام آیا۔ ان کا لہجہ فوراً بدل گیا۔ انھوں نے کہا آپ تو پوری قوم کو بزدل بنا دینا چاہتے ہیں۔ میں آپ کے الرسالہ کا سخت مخالف ہوں۔" انھوں نے پر جوش طور پر کہا کہ اسلام ہمیشہ اقدام کی تعلیم دیتا ہے۔ اور آپ مسلمانوں کو انفعالی روش کی طرف لے جانا چاہتے ہیں:

Islam stands for an active approach in all matters and forbids all that leads to a passive surrender.

میں نے آہستگی سے کہا کہ مجھ میں اور آپ میں جو فرق ہے وہ نقطۂ نظر کا فرق نہیں ہے۔ بلکہ اصل فرق یہ ہے کہ آپ ایک ڈبل اسٹینڈرڈ آدمی ہیں اور میں ڈبل اسٹینڈرڈ آدمی نہیں۔ میرا ایک ہی اصول ہے، ایک معاملہ میں بھی اور دوسرے معاملہ میں بھی۔

انھوں نے بگڑ کر کہا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا کہ آپ اپنے ذاتی معاملہ میں مفاہمت کے اصول پر قائم ہیں۔ اور دوسروں کو ٹکراؤ کے راستہ پر لے جانا چاہتے ہیں۔ آپ کا سابقہ جن ہندوؤں (اعلیٰ افسران) سے پڑتا ہے ان کے ساتھ آپ مبالغہ آمیز حد تک اسی نرم روش کو اپنائے ہوئے ہیں جس کی تلقین الرسالہ میں کی جاتی ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے معاملہ میں یہ چاہتے ہیں کہ ان کا سابقہ جن ہندوؤں سے پڑے ان کے مقابلہ میں وہ آخری حد تک کڑے بن جائیں۔

مذکورہ مسلم دانشور اور ان کے جیسے دوسرے تمام مسلمانوں کے معاملات پوری طرح درست ہیں۔ ان کے بچے اعلیٰ ڈگریاں لے کر بڑی بڑی ترقیاں حاصل کر رہے ہیں۔ اس کا راز صرف یہ ہے کہ وہ زبان سے اگرچہ لڑائی بھڑائی کی باتیں کرتے ہیں، مگر عملاً اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو لڑائی بھڑائی سے سیکڑوں میل دور رکھتے ہیں۔ اب میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ بھی اسی طریقہ کو اپنالیں۔ تصادم اور اقدام، جیسی باتوں کو وہ صرف کہنے کی بات سمجھیں وہ ہرگز انھیں اپنا عملی پروگرام نہ بنائیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کا اور ان کے بچوں کا مستقبل بھی اسی طرح محفوظ رہے گا جس طرح ہمارے رہنماؤں اور دانشوروں کا مستقبل پوری طرح محفوظ ہے۔

خلاصہ

اوپر جو کچھ کہا گیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے "قتل عام" کے باوجود خود مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا موجود ہے جس کو اب بھی اس ملک میں حفاظتِ عام حاصل ہے۔ یہ طبقہ مسلم لیڈروں کا ہے۔ یہ دراصل مسلم لیڈر ہی ہیں جو ہندستان میں مذکورہ "قتل عام" کا انکشاف کرتے رہتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ خود مسلم لیڈر اس قتل عام سے ہمیشہ اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ہم مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اس معاملہ میں وہ بھی وہی کریں جو ان کے لیڈر کرتے ہیں۔ لیڈروں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں۔ فرقہ وارانہ نقصان سے بچنے کے لیے مسلمان بھی اپنے لیڈروں کی اسی آزمودہ تدبیر کو اختیار کریں۔ مسلمان اپنے لیڈروں کے قول کو نہ دیکھیں بلکہ وہ صرف ان کے عمل کو دیکھیں۔ اس معاملہ میں لیڈر لوگ دوسروں سے جو کچھ کہتے ہیں اس کو وہ نظر انداز کر دیں، اور صرف یہ پتہ لگائیں کہ وہ خود کیا کر رہے ہیں۔

ایک سفر

کئی مہینہ پہلے کی بات ہے، مجھ کو جامنیر (ضلع جلگاؤں) سے ایک خط ملا جس میں بتایا گیا تھا کہ شری ایشور لال جی جین (سابق ایم ایل اے) اپنے دادا آنجہانی راج مل لکھی چند للوانی (وفات ۱۹۷۳) کی یاد میں "لکچر سیریز" کی تقریب کر رہے ہیں۔ اس کا سلسلہ ایک ہفتہ تک جاری رہے گا۔ اس سات روزہ پروگرام میں وہ ایک اسلامی عالم کا بھی لکچر رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے راقم الحروف کا انتخاب کیا ہے۔ خط وکتابت جاری رہی یہاں تک کہ یہ طے ہوگیا کہ مجھ کو ۸ اپریل کو جامنیر پہنچ کر مذکورہ لکچر دینا ہے۔ اس پروگرام کے تحت یہ سفر ہوا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت ایک خاص تاریخ یا وقت پر کسی مقام کا سفر کرنا ایک عام بات ہے۔ ساری دنیا کا کام اسی طرح ہو رہا ہے۔ مگر جب اس پر غور کیا جائے کہ ایسا کیوں کر ممکن ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے جس نے پیشگی طور پر مقررہ پروگرام کے تحت سفروں کو انسان کے لیے ممکن بنا دیا ہے۔ یہ ہے سورج اور چاند اور زمین کی گردش کا نظام۔ اگر یہ نظام نہ ہو تو تعیین وقت کے ساتھ کوئی کام کرنا ناممکن ہو جائے۔ یہی وہ عظیم نعمت ہے جس کی طرف قرآن میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: اللہ ہی جس نے سورج کو روشن بنایا اور چاند کو نور عطا کیا اور اس کی منزلیں مقرر کر دیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور حساب معلوم کرو (یونس ۵)

۸ اپریل کی صبح کو فلائٹ نمبر ۴۹۱ کے ذریعہ دہلی سے روانگی ہوئی۔ یہ بوئنگ ۷۳۷ تھا۔ "بوئنگ" امریکہ کی مشہور جہاز ساز کمپنی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جہاز سازی کی صنعت میں امریکہ کو اجارہ داری حاصل ہے۔ دنیا کے بیشتر سفر امریکی کمپنیوں کے جہاز ہی پر ہوتے ہیں۔ آپ امریکہ کی مخالف کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے پرواز کریں تب بھی اغلب ہے کہ آپ امریکہ ہی کے بنے ہوئے جہاز پر سفر کر رہے ہوں گے۔

عباسی خلیفہ ہارون رشید نے بادل کے ایک ٹکڑے کو آسمان میں تیرتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا

کہ [illegible] یا کر بس، بہر حال خراج میرے ہی پاس آئے گا (مطلب ہی حیث شئت فسیاتینی خراجہ)
آج اگر [illegible] چاہے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ تم جو بھی سفر کرو خواہ میرے موافق یا میرے خلاف،
اس کا ٹیکس آخر کار میرے ہی پاس آئے گا۔

تقریباً یہی صورت حال ہمارے ملک میں اکثریتی فرقہ کی ہو رہی ہے۔ ہندستان کے تمام تجارتی شعبوں پر اکثریتی فرقہ کا قبضہ ہو چکا ہے۔ پچھلے سو سالہ عمل کے نتیجہ میں یہاں اکثریتی فرقہ کی حیثیت "دکاندار" کی ہو گئی ہے اور اقلیتی فرقہ کی حیثیت "خریدار" کی۔ یہ سب سے بڑا حادثہ ہے جو اقلیتی فرقہ کی جدید تاریخ میں اس کے ساتھ پیش آیا ہے۔

۳۰ مارچ کو راجدھانی میں اقلیتی فرقہ کی ایک "عظیم الشان ریلی" تھی۔ یہ ریلی اکثریتی فرقہ کی زیادتیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر کی گئی تھی۔ ریلی میں شرکت کرنے والے کچھ لوگ مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی ریلی میں کتنے آدمی شریک ہوئے۔ انھوں نے پُر فخر طور پر کہا کہ کم از کم پانچ لاکھ۔ میں نے پوچھا کہ سفر کا، کا خرچ فی کس کتنا ہو گا۔ ان کا اندازہ تھا کہ فی کس اوسط خرچ ایک سو روپیہ ہو گا۔ میں نے کہا کہ پانچ لاکھ آدمی اگر فی کس ایک سو روپیہ خرچ کریں تو کل کتنی رقم ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ پانچ کرور۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے صرف ایک دن میں پانچ کرور روپے خرچ کر دیئے۔ اب اگر اس صورت حال کو سامنے رکھا جائے کہ اس ملک میں دولت کی گردش یک طرفہ ہو گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اقلیتی فرقہ نے صرف ایک دن میں پانچ کرور روپے اپنی جیب سے نکال کر اکثریتی فرقہ کی جیب میں ڈال دیئے۔ اقلیتی فرقہ کو تو کچھ نہیں ملا۔ مگر اس فرقہ کو اس کا پورا حصہ مل گیا جس کے خلاف آپ نے احتجاج کیا تھا۔

ہندستان بظاہر بیل گاڑی کے سفر کے دور سے نکل کر ہوائی جہاز کے سفر کے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ مگر ترقی یافتہ ملکوں سے تقابل کیجیے تو ہندستان کی ہوائی سروس نہایت ناقص نظر آئے گی۔ حتیٰ کہ یہاں کے ہوائی جہازوں میں بعض اوقات ایسے عجیب و غریب لطیفے پیش آتے ہیں جو ترقی یافتہ ملکوں میں ناقابل تصور سمجھے جاتے ہیں۔

یکم اپریل ۱۹۸۷ کے اخبارات میں ایک خبر حسب ذیل سنسنی خیز سرخی کے ساتھ شائع

ہوئی :

Vayudoot Plane door opens in mid-air

یعنی وایا دوت جہاز کا دروازہ فضا میں کھل گیا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ کو وایو دوت کا ایک جہاز (PF-102) ۱۵ مسافروں کو لیے ہوئے لدھیانہ سے دہلی جا رہا تھا۔ اچانک ایک شور کے ساتھ تیز ہوا جہاز کے اندر داخل ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اس کا دروازہ کھل گیا ہے۔ مسافروں میں زبردست گھبراہٹ پھیل گئی۔ تاہم ہوائی جہاز محفوظ طور پر اگلے ہوائی اڈہ پر اتار لیا گیا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ ۲۴ مارچ ۱۹۸۷ کو پیش آیا۔ وایو دوت کا ایک جہاز کلکتہ کے ہوائی اڈہ سے اڑا مگر فضا میں پہونچنے کے بعد اس کا دروازہ کھل گیا۔ تاہم اس بار بھی کوئی جانی نقصان پیش نہیں آیا۔ اس کا پائلٹ حفاظت کے ساتھ جہاز کو ہوائی اڈہ پر اتارنے میں کامیاب رہا۔

اس مسئلہ کو پارلیمنٹ میں اٹھاتے ہوئے ایک کانگریسی ممبر ڈاکٹر گوری شنکر راج ہنس (ٹائمس آف انڈیا ۷ اپریل ۱۹۸۷) نے کہا :

Is it Vayudoot or Yamadoot

وایو دوت پائلٹس ایسوسی ایشن کے ایک ذمہ دار نے بتایا کہ حالت پرواز میں دروازہ کھلنے کی وجہ یہ تھی کہ جہاز کے دروازے کا دستہ (Door handle) ناقص تھا۔ اور فالتو پرزوں کی کمی کی وجہ سے اس کو درست نہیں کیا جا سکا تھا۔ دوسری طرف اس سلسلے میں انگریزی اخبار انڈین اکسپریس ۵ اپریل ۱۹۸۷ (صفحہ ۳) نے ایک رپورٹ شائع کی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے :

In fact, the management of Vayudoot believes that its hangar at Palam Airport is jinxed and on April 1 a 'havan' was performed to ward off evil spirits. All top executives, including the general manager attended the function.

دراصل وایو دوت کی انتظامیہ کا یہ خیال ہے کہ پالم ایرپورٹ میں اس کے ہینگر کو نحوست

ہے۔ چنانچہ یکم اپریل کو وہاں ایک ہون کیا گیا تاکہ بدروحوں کو نکالا جاسکے۔ تمام اصل افسران مع جنرل منیجر اس تقریب میں موجود تھے۔

ہمارے ملک کے سرکاری مشنری میں جو بدنظمی پائی جاتی ہے اس کی کم از کم ایک وجہ توہم پرستی ہے جس کی ایک مثال مذکورہ بالا واقعہ میں نظر آتی ہے۔ "جہاز" کی ناقص کارکردگی کو اگر آپ مشین کا معاملہ سمجھیں تو آپ اپنی ساری توجہ اس کی مشین کو درست کرنے میں لگادیں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ کا یہ عقیدہ ہو کہ "جہاز" کی ناقص کارکردگی بدروحوں کے اثر سے پیدا ہوئی ہے تو آپ بدروحوں کو نکالنے کے لیے غیر متعلق قسم کے توہم پرستانہ اعمال میں مبتلا ہو جائیں گے۔

جہاز کے اندر مطالعہ کے لیے ۸ اپریل کا انگریزی اخبار اسٹیٹسمین رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کو اٹھا کر دیکھنا شروع کیا۔ اتنے میں میرے پاس بیٹھے ہوئے ہندو بھائی نے ایک خبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اس کو پڑھیے"۔ انھوں نے صرف اتنا ہی کہا۔ مگر خبر کو پڑھنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ وہ کس بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

یہ صفحہ اول کی ایک خبر تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ۷ اپریل ۱۹۸۷ کو ہندو لوگ بہت بڑی تعداد میں رام لیلا گراؤنڈ میں جمع ہوئے اور اس بات کا عہد کیا کہ وہ اجودھیا کی رام جنم بھومی کو "آزاد" کرنے کے لیے ہر قیمت ادا کریں گے۔ خواہ اس کی خاطر انھیں "خون کی ہولی" کھیلنا پڑے۔ وغیرہ وغیرہ

اس ملک کے مسلمان پچھلے دو سو سال سے جو تحریک چلا رہے ہیں وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے قومی تحریک ہے، اور اس لیے وہ سراسر باطل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر معمولی قربانیوں کے باوجود انھیں اپنی تحریکوں میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ مسلم۔ سکھ تحریک، مسلم۔ انگریز تحریک، مسلم۔ ہندو تحریک، یہی مسلمانوں کی پچھلی دو سو سالہ تاریخ کا خلاصہ ہے۔ از روئے قرآن مسلمانوں کو اس ملک میں داعی۔ مدعو تحریک چلانا چاہیے تھا مگر انھوں نے اس کے برعکس تحریکیں چلائیں۔ مسلم۔ سکھ۔ مسلم۔ انگریز۔ مسلم۔ ہندو تحریکوں نے مسلمانوں کے اندر ان اقوام کے خلاف نفرت اور بیزاری پیدا کی۔ حالاں کہ یہ قومیں ہمارے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی تھیں۔

اور مدعو کے لیے داعی کے دل میں صرف محبت اور خیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہیے۔ دوسری قوموں کو اگر ہم محبت کا تحفہ دیتے تو اس کے جواب میں ہمیں بھی ہمارے موافق تحفہ ملتا۔ مگر جب ہم نے انھیں نفرت اور بیزاری کا تحفہ دیا تو اس کے جواب میں ان کی طرف سے بھی ہم کو وہی چیز ملی جو ہم نے انھیں دی تھی۔

اخبار کی ایک سرخی یہ تھی کہ (اشتراکی) پولینڈ نے اپنی سرکاری کمپنیوں کو نجی ملکیت میں دینے کا فیصلہ کیا ہے:

Poland to privatize State companies

اسٹاک ہام کی ڈیٹ لائن کے ساتھ اس خبر میں پولینڈ کے ذمہ داروں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ پولینڈ بہت جلد اپنی کئی سرکاری کمپنیوں میں نجی افراد کو حصہ دار بننے کی پیش کش کرے گا۔ یہ ان اہم اصلاحی تبدیلیوں میں سے ہے جو پولینڈ میں وہاں کی اشتراکی معیشت کو نئی زندگی دینے کے لیے کی جارہی ہیں:

Poland will soon offer shares to private citizens in several State companies under major reforms to rejuvenate its socialist economy.

موجودہ صدی کے آغاز میں اشتراکی حضرات نے نجی معیشت کے طریقہ کو ترقی میں رکاوٹ قرار دے کر رد کر دیا تھا۔ اب اسی صدی کے آخر میں انھیں عملاً یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ان کو نجی معیشت کے طریقہ کو دوبارہ اپنانا پڑے گا ورنہ ان کی قومی اقتصادیات برباد ہو کر رہ جائے گی۔

۸ اپریل کو ۱۱ بجے ہم اورنگ آباد پہونچے۔ یہاں جناب منہاج خاں صاحب کی رہائشگاہ پر دو گھنٹے قیام رہا۔ اس کے بعد جامنیر کے لیے روانگی ہوئی۔ اورنگ آباد ریاست مہاراشٹر کا ایک شہر ہے۔ اس کو ملک امبر نے ۱۶۱۰ء میں آباد کیا تھا۔ بعد کو اورنگ زیب نے اس کا نام اورنگ آباد کر دیا۔ ۱۹۵۸ میں یہاں مرہٹواڑہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اورنگ زیب کا مقبرہ بھی اورنگ آباد کے پاس ہے۔ ایلورا کے مشہور غار بھی اسی کے پاس واقع ہیں۔

اورنگ آباد کے مختصر قیام میں شہر کے متعدد افراد ملاقات کے لیے آگئے اور مختلف

[illegible]ت پر تبادلہ خیال رہا۔ بمبئی کا ایک اردو ہفت روزہ اخبار جو اپنے جذباتی بلکہ مشتعل انداز [illegible]ور ہے، وہ اس علاقہ میں کافی پڑھا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے اس اخبار کا ذکر کرتے ہوئے کہا: یہاں کے لوگوں کا مزاج تو یہی اخبار بنا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اخبار مزاج نہیں بنا رہا ہے، بلکہ وہ بنے ہوئے مزاج کو استعمال کر رہا ہے۔ ان اخباروں میں مزاج بنانے کی طاقت نہیں۔ وہ تو صرف مسلمانوں کے بگڑے ہوئے مزاج کو استعمال کر سکتے ہیں اور وہی کر رہے ہیں۔

اورنگ آباد کی آبادی تین لاکھ ہے۔ اس میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً ۳۵ فی صد ہے۔ وہ یہاں ہر اعتبار سے اچھی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر میرے اندازہ کے مطابق ابھی تک وہ اپنی اس حیثیت کا مثبت استعمال نہ کر سکے۔ ان کی طاقت زیادہ تر آپس کے اختلافات اور بے فائدہ مظاہروں میں ضائع ہو رہی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل خرابی فخر کی نفسیات ہے۔ قرآن کی آیت لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کو انھوں نے بدل کر اس طرح کر دیا ہے: لقد کان لکم فی رسول اللہ مفخرۃ حسنۃ۔ جن مقامات پر مسلمان مادی اعتبار سے غیر اہم ہوں وہاں وہ دبے ہوئے رہتے ہیں۔ اور جہاں انھیں کچھ محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے وہاں ان کا مخصوص ذہن فوراً ایک جزیرۂ فخر تعمیر کر لیتا ہے۔ دونوں ہی قسم کے مقامات پر مسلمان کوئی موثر کردار ادا کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ اول الذکر مقامات پر غیر ضروری احساس کمتری کی بنا پر اور ثانی الذکر مقامات پر غیر ضروری احساس برتری کی بنا پر۔

اورنگ آباد سے جامنیر کا سفر بذریعہ کار طے ہوا۔ اورنگ آباد اور جامنیر کے درمیان سلود ہے۔ یہاں ظہر کی نماز پڑھی گئی۔ یہاں کوئی پروگرام پہلے سے نہیں رکھا گیا تھا۔ مگر لوگوں کو میری آمد کی خبر ملی تو لوگ بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ ان کے اصرار پر یہاں نماز ظہر کے بعد مختصر تقریر کی۔ معلوم ہوا کہ سلود میں کافی لوگ ہیں جو برابر الرسالہ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

آگے بڑھے تو ایک اور مقام آیا جس کا نام پہور ہے۔ یہاں کے لوگ بھی خبر سن کر جمع ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ ہم لوگ کچھ دیر وہاں ٹھہریں اور تقریر کا پروگرام رکھا جائے۔ مگر وقت کی کمی کی بنا پر ہم لوگ یہاں ٹھہر نہ سکے اور آگے روانہ ہو گئے۔ پہور میں بھی الرسالہ پڑھا جا رہا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ الرسالہ اب محض ایک رسالہ نہیں رہا، اب وہ ایک تحریک بن چکا ہے۔

اس سفر میں مختلف مقامات پر چند پروگرام رہے۔ تاہم یہ سفر اصلاً شری ایشور لال جین (معروف بابو جی) کی دعوت پر ہوا۔ انھوں نے اپنے دادا کے نام پر ایک ہفتہ کے لیے لکچروں کا انتظام کیا تھا۔ اس پروگرام کے آخری دن میری تقریر تھی۔ میری تقریر کا موضوع یہ تھا کہ نیشنل انگریشن اور اس کے بارے میں اسلام کی رہنمائی۔

شری ایشور لال جین اس علاقہ کے نہایت ممتاز آدمی ہیں۔ مختصر قیام کے دوران ان سے ملک کے مسائل اور فرقہ وارانہ معاملات پر گفتگو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک صاف ذہن اور انصاف پسند آدمی ہیں۔ ہر موضوع پر انھوں نے صاف گوئی کے ساتھ باتیں کیں۔ میرا خیال ہے کہ اکثریتی فرقہ کے بیشتر افراد اسی قسم کا مزاج رکھتے ہیں، مگر اقلیتی فرقہ ابھی تک اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکا کہ وہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھائے۔

تقریر کا پروگرام ایک کالج کے میدان میں تھا۔ وسیع میدان تقریباً پورا بھرا ہوا تھا۔ ہندو صاحبان بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ بلکہ بعض لوگوں نے بتایا کہ پچھلے پروگراموں کے مقابلہ میں حاضرین کی تعداد اس دن زیادہ تھی۔ خود شری ایشور لال جین میری ڈیڑھ گھنٹہ کی

پروگرام

۸ اپریل	اورنگ آباد، ۱۱ بجے	ملاقات اور اظہار خیال	برمکان جناب منہاج خاں صاحب
	جامنیر، بعد عصر	خطاب (مسجد اور نماز کی اہمیت)	شاہی مسجد میں
	جامنیر، بعد مغرب	خطاب عام (نیشنل انٹگریشن)	شری ایشور لال جین کے جلسہ میں
	جامنیر، بعد عشار	خطاب (قومی یک جہتی)	بمقام نیو انگلش اسکول
۹ اپریل	جلگاؤں، بعد نماز فجر	درس قرآن	جامع مسجد جلگاؤں
	جلگاؤں، ۹ بجے صبح	خطاب (سیکولر ہندستان میں مسلمانوں کا کردار)	ضلع پریشد ہال
	جلگاؤں	خطاب (تعمیر ملت)	اینگلو اردو جونیر کالج
	جلگاؤں	خطاب (توحید اور آخرت)	جامع مسجد
	اورنگ آباد، ۱۰ بجے شام	ملاقات اور اظہار خیال	مولانا آزاد کالج

تقریر [illegible] ات توجہ کے ساتھ سنتے رہے اور آخر میں غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔

[illegible] اموں کی اطلاع مقامی اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر اطراف [illegible] کے کچھ لوگ بھی آگئے اور اجتماعات میں شریک رہے۔

شری ایشور لال جین کی منعقدہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے میں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ نیشنل انٹگریشن ہمارے ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر کوئی بڑی ترقی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ مگر میں دو چیزوں میں فرق کرتا ہوں۔ ایک ہے خود نیشنل انٹگریشن کا مقصد۔ دوسرا ہے انٹگریشن کو حاصل کرنے کا طریقہ۔ میں نیشنل انٹگریشن کے مقصد سے صد فی صد اتفاق کرتے ہوئے اس طریق کار سے اتفاق نہیں رکھتا جو آجکل نیشنل انٹگریشن کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔

حال میں میں نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی کتاب پڑھی۔ اس کا نام ہے:

INDIA: The Roots of Crisis (1986)

اس کتاب میں انھوں نے نیشنل انٹگریشن کے مقصد کو حاصل کرنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ ملک میں کلچرل انٹگریشن پیدا کیا جائے۔ یعنی تمام لوگ ایک ہی کلچر کو اختیار کریں۔ یہ کسی ایک شخص کی بات نہیں ہے۔ ملک میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ نیشنل انٹگریشن کا ذریعہ کلچرل انٹگریشن ہے۔ مثلاً ملک کے مختلف فرقوں میں سول میرج کا طریقہ رائج کر دیا جائے، ہر فرقہ کے لوگ دوسرے فرقہ کے لوگوں سے شادی کریں وغیرہ۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کا نیشنل انٹگریشن سے کوئی تعلق نہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں میں عام طور پر آپس کی شادی کا رواج تھا۔ پھر ان کے درمیان لڑائی کیوں ہوئی۔ پاکستانی اور بنگلہ دیشی دونوں ایک مذہب کے لوگ ہیں پھر وہ ایک دوسرے سے کیوں لڑگیے۔

حقیقت یہ ہے کہ نیشنل انٹگریشن کا تعلق قومی مزاج سے ہے نہ کہ اس قسم کے رواجوں سے۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ لوگوں کے اندر انسانیت کے احترام کا مزاج پیدا کیا جائے۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے جان و مال اور عزت کو قابل احترام سمجھے۔ یہ مزاج آجائے تو اپنے آپ نیشنل انٹگریشن پیدا ہو جائے گا۔ اور اگر یہ مزاج نہ آئے تو کسی اور تدبیر سے نیشنل انٹگریشن کا مقصد

حاصل ہونے والا نہیں۔

یہ حل جو بتایا جاتا ہے وہ فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ فطرت کا نظام تنوع کے اصول پر قائم ہے۔ مثلاً پودوں اور درختوں کو دیکھئے۔ ہر ایک کا الگ انداز اور ہر ایک کی الگ شان ہے۔ اگر کوئی شخص تمام پودوں اور درختوں کو کاٹ کر ایک سائز کا بنانے لگے تو یہ سراسر نادانی کی بات ہوگی۔ دنیا کے باغ میں بڑے درخت بھی ہیں اور چھوٹے درخت بھی۔ بڑا درخت اگر سایہ اور لکڑی دیتا ہے تو چھوٹے درختوں کی قطاریں ہریالی میں اضافہ کرتی ہیں۔ پھول کے درخت اگر خوشبو دیتے ہیں تو اسی کے ساتھ گھاس بھی ایک اہم کام کرتی ہے۔ اگر گھاس نہ ہو تو زمین پر ہری مخمل کا فرش کون بچھائے۔

یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسانوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ یعنی ایک انسان کو کوئی خصوصیت دی ہے اور دوسرے انسان کو کوئی دوسری خصوصیت عطا کی ہے۔ ایک کا ذوق ایک ڈھنگ کا ہے تو دوسرے کا ذوق دوسرے ڈھنگ کا۔ یہ تنوع زندگی کی جان ہے۔ کیوں کہ اسی کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے کہ زندگی کی مختلف ضرورتیں پوری ہوں اور ہمہ گیر اور ہمہ جہتی ترقی ممکن ہوسکے۔ انسانوں کے اس تنوع کو ختم کرنا ایسا ہی ہے جیسے تمام انسانوں کے قد کو برابر کرنے کے لیے ان کے سروں کو تراشا جانے لگے۔

اس قسم کا حل موجودہ دنیا میں ناممکن ہے۔ یہ خود انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ ہر آدمی بذات خود ایک کائنات ہے۔ ہر آدمی کی فزیکل بناوٹ الگ ہوتی ہے۔ ہر آدمی کے انگوٹھے کا نشان الگ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اب یہ ثابت ہوا ہے کہ ہر انسان کے جسم کا ہر پارٹیکل دوسرے انسان کے جسم کے پارٹیکل سے جدا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ تمام لوگوں کو ایک ہی رنگ میں کیسے رنگ سکتے ہیں۔ یہ تو خود نظامِ فطرت کے خلاف ہے۔ جب خالق نے انسان کے اندر کثرت رکھی ہے تو آپ کثرت کو مان کر اپنا مسئلہ حل کر سکتے ہیں نہ کہ اس کو رد کر کے۔

اس بنا پر میں کہتا ہوں کہ نیشنل انٹگریشن کا راز کلچرل انٹگریشن میں نہیں ہے بلکہ کلچرل ایڈجسٹمنٹ میں ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کا احترام کریں۔ ایک دوسرے کے معاملے میں رواداری برتیں، اختلاف کے باوجود متحد ہونا سیکھیں۔ اس تمہید کے بعد میں نے تفصیل کے ساتھ

[illegible]سلامی تعلیمات کی روشنی میں بتایا کہ ہندستان کے حالات میں حقیقی نیشنل انٹگریشن کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔

[illegible]سفر میں بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ چند ملاقاتوں کا حال یہاں لکھا جاتا ہے۔

الرسالہ کے ایک قاری نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کے ہر صفحہ پر کوئی نئی بات ہوتی ہے۔ الرسالہ کی اس خصوصیت نے اس کو نہایت اثر انگیز بنا دیا ہے۔ جو شخص اس کو پڑھتا ہے وہ اس سے اثر لیے بغیر نہیں رہتا۔ ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ نے میری زندگی بدل دی۔ پہلے میں قرآن کو پڑھتا تھا مگر اس کے معانی پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ مگر اب میں قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ عبادت میں ایک نئی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ کائنات کو دیکھتا ہوں تو اس میں مجھے خالق کا جلوہ نظر آتا ہے۔ حالاں کہ پہلے ایسا نہ تھا۔ کئی لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ انھوں نے الرسالہ کے زیر اثر اپنے اختلافات ختم کر لیے اور حق داروں کو ان کے حقوق واپس کر دیئے۔

کچھ لوگوں نے "عملی پروگرام" کی بابت سوال کیا۔ میں نے کہا کہ ہم دوسرے لوگوں کی طرح معروف قسم کا عملی پروگرام شروع نہیں کر سکتے۔ ہر عملی پروگرام کے لیے ضروری ہے کہ جن لوگوں کے درمیان اس کو اٹھایا گیا ہے۔ ان کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کر لیا گیا ہو۔ دوسرے لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ "اسلام خطرہ میں" اور "مسلمان خطرہ میں" کے عنوان کے تحت اقدامات کرتے ہیں۔ اس طرح کے اقدامات کے لیے کوئی ذہنی زمین بنانے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو بنی بنائی موجود ہے۔ موجودہ مسلمان مختلف اسباب کے تحت جھنجلاہٹ اور احساس مظلومی کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ اب کوئی شخص جب خطرہ کی گھنٹی بجاتا ہے تو یہ بات عین انکے مزاج کے مطابق ہوتی ہے۔ اس قسم کے نعروں سے ان کی منفی نفسیات کو غذا ملتی ہے۔ وہ جوق در جوق اس کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دل کھول کر اس کے لیے چندے دیتے ہیں۔ لیڈروں کی پرجوش تقریروں کو سننے کے لیے فوراً ان کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔

مگر ہم کو جو کام کرنا ہے وہ خالص تعمیری کام ہے۔ لوگ خارجی خطروں میں جی رہے ہیں،

جب کہ یہیں ان کے اندر داخلی خطرے کا احساس پیدا کرنا ہے۔ لوگ انھیں احتساب غیر پر بلاتے ہیں۔ ہم انھیں احتساب خویش پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ اب چونکہ ہمارے موافق ذہنی زمین مسلمانوں کے اندر موجود نہیں ہے، اس لیے ہمارا کام ذہنی زمین تیار کرنے سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ دوسروں کو ذہنی زمین تیار کرنے کے جھنجھٹ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی بھی دن ایک نعرہ لے کر کھڑے ہو سکتے ہیں اور صبح وشام میں ان کے گرد ایک بھیڑ جمع ہو جائے گی۔

ایک صاحب نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ مظلوم کی پکار سیدھی خدا تک پہونچتی ہے اور عرش الٰہی کو ہلا دیتی ہے۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں مظلوم ہیں۔ وہ پچاس برس سے ہر روز خدا سے دعا کرتے ہیں مگر اب تک ظالموں کا کچھ نہیں بگڑا۔ اب تک ان کی مظلومیت ختم نہیں ہوئی۔

میں نے کہا کہ حدیث میں جس "مظلوم" کا ذکر ہے، وہ ایسا شخص ہے جو یک طرفہ طور پر مظلوم بنا دیا گیا ہو، دوطرفہ عمل کے نتیجہ میں مظلوم ہونے والوں کا ذکر اس حدیث میں نہیں۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان یک طرفہ قسم کے مظلوم نہیں ہیں۔ ان کا معاملہ دوطرفہ ہے۔ یعنی مسلمانوں نے بھی دوسروں کے ساتھ ظلم کیا اور دوسروں نے بھی ان کے ساتھ ظلم کیا۔ ایسے لوگ خواہ اپنے کیے ہوئے ظلم سے زیادہ ظلم دوسروں کی طرف سے پائیں۔ بہر حال وہ دوطرفہ مظلوم ہیں۔ ایسے لوگ اس حدیث کا مصداق نہیں بن سکتے۔

مسلمان اگر ایسا کریں کہ وہ نہ تو اپنی طرف سے کسی ظلم کا آغاز کریں اور نہ دوسروں کے ظلم کے بعد ان کے خلاف کوئی جوابی ظلم کریں تو ان کی مظلومیت یک طرفہ ہوگی۔ ایسی حالت میں اگر وہ خدا کو پکاریں گے تو بلاشبہہ عرش الٰہی ان کی پکار سے ہل جائے گا۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کے بارے میں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ بھارتی سرکار کے ایجنٹ ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کا ثبوت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کوئی کانکریٹ ثبوت نہیں البتہ شبہہ ہے۔ میں نے کہا کہ محض شبہہ کی بنیاد پر کسی کے خلاف الزام لگانا حرام ہے۔ گویا کہ میرے خلاف ان کا الزام تو ابھی غیر ثابت شدہ ہے۔ مگر خود وہ لوگ دلیل کے بغیر اس قسم کا الزام لگا کر خود اپنے آپ کو فعل حرام کا مجرم ثابت کر رہے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جو لوگ اس قسم کا الزام لگاتے ہیں وہ یقینی طور پر اندھے ہیں۔ الرسالہ

ہ تعمیری باتیں ہوتی ہیں۔ آپ ساری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی نہیں بتا سکتے کہ ایک شخص تخریب ... کا ایجنٹ ہو، اس کے باوجود وہ اپنی قوم کو تعمیری بنیاد پر اٹھانے کی کوشش کرے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں برابر الرسالہ پڑھتا ہوں۔ آپ کی تمام کتابیں پڑھ چکا ہوں۔ مجھے آپ کی باتوں سے صدفی صد اتفاق ہے۔ مگر بعض لوگ آپ کے بارے میں طرح طرح کی قابلِ اعتراض باتیں بیان کرتے ہیں جن سے ذہن خلجان میں پڑجاتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہاں آپ نے میری کئی تقریریں سنی ہیں۔ کیا آپ نے ان میں کوئی خلاف بات پائی۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ ہر مہینہ میرے دو رسالے (اردو، انگریزی) نکلتے ہیں، کیا ان میں آپ کو کوئی خلاف بات ملی۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ میری تقریباً پچاس کتابیں چھپ چکی ہیں، کیا ان میں آپ نے کوئی خلاف بات پائی۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ بس تو پھر آپ اس قسم کے لوگوں کی باتوں کو نظر انداز کر دیجئے۔ جو شخص سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر آپ سے لغو باتیں کہتا ہے اس سے کہیے کہ تم جھوٹے ہو۔ اگر تم کو اعتراض کرنا ہے تو مطبوعہ باتوں کی بنیاد پر اعتراض کرو۔ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر کیا ہوا تمہارا اعتراض سراسر ناقابلِ لحاظ ہے۔ وہ خود تمہاری شرپسندی کو ثابت کرتا ہے نہ کہ کسی دوسرے شخص کے غلط کار ہونے کو۔

ایک ایڈیٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک خاص موضوع پر اپنے رسالہ کا نمبر نکالنے والے تھے اور چاہتے تھے کہ میں اس موضوع پر ایک مضمون لکھ کر انھیں دوں۔ میں نے کہا کہ یہ میرے لیے مشکل ہے، کیوں کہ فرمائشی مضمون لکھنا مجھ کو نہیں آتا۔ انھوں نے کہا کہ آپ تو اتنے زیادہ مضامین لکھتے ہیں کہ الرسالہ میں صرف آپ کے مضامین ہوتے ہیں، اور اسی طرح وہ دس سال سے نکل رہا ہے۔ پھر ایک مضمون لکھنا آپ کے لیے کیا مشکل ہے۔

میں نے کہا کہ میرے لکھنے کا طریقہ اس سے مختلف ہے جو دوسروں کا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ حسب ضرورت ایک موضوع مقرر کیا اور اس پر لکھنا شروع کر دیا۔ میرا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ میرا مضمون میرے مطالعہ کی ضمنی پیداوار (By-product) ہوتا ہے۔

میں جب کوئی چیز پڑھتا ہوں۔ خواہ قرآن و حدیث پڑھوں یا اور کوئی چیز پڑھوں تو مطالعہ کے دوران ذہن کسی خاص پہلو کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ بس اس کو میں کاغذ پر لکھ لیا کرتا ہوں۔ یہی میرا مضمون ہے۔ میرے تمام مضامین "آمد" ہوتے ہیں نہ کہ "آورد"۔

اس طرح ہر روز کثیر تعداد میں مضامین ذہن میں وارد ہوتے ہیں اور ان کو میں لکھتا رہتا ہوں۔ یہ مضامین اکثر الرسالہ کی ضرورت سے زیادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسے مضامین جو الرسالہ میں نہیں چھپے، اس وقت بھی میرے پاس اتنے زیادہ ہیں کہ اگر میں مرجاؤں تو ایک آدمی ان مضامین کی بنیاد پر اگلے دس برس تک انشاء اللہ اسی طرح رسالہ کو جاری رکھ سکتا ہے۔

جلگاؤں ریاست مہاراشٹر کا ایک ضلع ہے۔ ۱۹ ویں صدی سے پہلے اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس کے بعد خاندیش کے علاقہ میں روئی کی کاشت شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ خاندیش روئی کی فصل پیدا کرنے کا ممتاز علاقہ بن گیا۔ اس واقعہ نے جلگاؤں کو اہمیت دیدی۔ یہاں کپڑے کی صنعت وجود میں آئی۔ اولاً ہینڈ لوم اور اس کے بعد پاور لوم نے جلگاؤں کو صنعتی مقام بنا دیا۔

ہر ترقی کے لیے ایک زمین درکار ہوتی ہے۔ جب تک موافق زمین فراہم نہ کی جائے، کسی بھی قسم کی کوئی ترقی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

جلگاؤں میں ہر سال سارو جنک گنیش اتسو کا جلوس نہایت دھوم سے نکلتا ہے۔ اسی زمانہ میں ایک دو دن کے فرق سے مسلمانوں کا محرم کا جلوس بھی نکلتا ہے۔ ہندوؤں کو محرم کے جلوس کے راستہ (روٹ) پر اعتراض ہوتا ہے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے جلوس کے راستہ (روٹ) پر۔ اس کے نتیجہ میں دونوں فرقوں کے درمیان تناؤ بڑھتا ہے اور فساد کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۹۸۵ میں یہاں کے کلکٹر نے دونوں فرقوں کے لوگوں کی میٹنگ بلائی اور ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ دونوں فرقے اپنے اپنے جلوس کا راستہ (روٹ) بدل دیں۔ مسلمان اپنے جلوس کا راستہ بدلنے پر راضی ہو گئے مگر ہندو صاحبان اپنے جلوس کا راستہ بدلنے پر راضی نہیں

[illegible] وقت جب جلوس نکلا اور وہ چلتا ہوا اسلام پورہ کے علاقہ کی مسجد کے پاس پہنچا تو وہاں کے [illegible] تناؤ پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے طیش میں آکر چاہا کہ باہر نکلیں اور جلوس کو روکیں۔ کلکٹر نے [illegible] کہا کہ آپ لوگ اپنے گھروں میں ٹھہریئے، ہم کو اس مسئلہ سے نمٹنے دیجئے۔ مسلمانوں نے کلکٹر کی بات مان لی اور جلوس کے سامنے نہیں آئے۔ جلوس مسجد کے سامنے رکا ہوا تھا اور اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا۔ مثلاً جس کو ہونا پاکستان، اس کو بھیجو قبرستان۔ یا ہندی، ہندو، ہندستان ملا بھاگو پاکستان۔ کلکٹر نے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اعلان کیا کہ آپ لوگ پانچ منٹ کے اندر آگے بڑھ جائیے، ورنہ آپ کے اوپر لاٹھی چارج کر دیا جائے گا۔ ایک طرف مجمع اپنی اشتعال انگیز کارروائیوں میں مشغول رہا۔ دوسری طرف کلکٹر نے گھڑی کی سوئی کو دیکھنا شروع کیا۔ جیسے ہی گھڑی کی سوئی نے بتایا کہ پانچ منٹ پورے ہو گیے، کلکٹر نے فوراً پولیس کو لاٹھی چارج کا آرڈر دے دیا۔ اس کے بعد پولیس نے جلوس کو مارنا شروع کیا۔ یہ "پولیس ایکشن" اتنا سخت تھا کہ سارا جلوس بھاگ کھڑا ہوا اور سڑک بالکل خالی ہو گئی۔

ایسے مواقع ملک کے مختلف حصوں میں پیش آتے ہیں۔ ان میں مسلمان یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ صبر اور حکمت کا ثبوت نہیں دے پاتے، وہ خود لڑنے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ اگر ایسے مواقع پر وہ صبر اور حکمت کا ثبوت دیں تو ہر جگہ وہی کہانی دہرائی جائے جس کا ایک نمونہ جلگاؤں کے مذکورہ واقعہ میں نظر آتا ہے۔

۹ اپریل کی شام کو جلگاؤں سے اورنگ آباد کے لیے واپسی ہوئی۔ جلگاؤں سے اورنگ آباد کا فاصلہ بذریعہ روڈ ۱۶۰ کلو میٹر ہے۔ جلگاؤں سے اورنگ آباد آتے ہوئے عصر کی نماز راستہ میں ادا کی گئی۔ میرے ساتھیوں کی رائے ہوئی کہ کھلی جگہ پر نماز ادا کی جائے۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے ٹیوب ویل لگا ہوا تھا۔ یہاں گاڑی روک کر ہم سب نے وضو کیا اور کھیت میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔

دور تک کھلا میدان تھا جس میں جگہ جگہ درخت اُبھرے ہوئے تھے۔ ان کے آگے پہاڑوں کی بلندیاں نظر آتی تھیں۔ اوپر آسمان اپنی ساری وسعتوں کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ یہ ماحول اپنی اتھاہ عظمتوں کے ساتھ انسانی عجز کی یاد دلا رہا تھا۔ ایسے آفاقی ماحول میں جب

اللہ کے چند بندے " اللہ اکبر" کہتے ہوئے سجدے میں گر پڑیں تو یہ ایسا منظر ہوتا ہے جیسے کائنات کی خاموشی کو زبان مل جائے، جیسے بے شعور مخلوق اور باشعور مخلوق دونوں اپنے خالق کا اقرار کرنے کے لیے ہم آہنگ ہو گیے ہوں۔

جلگاؤں سے اورنگ آباد جاتے ہوئے راستہ میں اجنتا کے غار آتے ہیں۔ یہاں سنگھر کروہ قدیم صنعت دیکھی جس کو قرآن میں الذین جابوا الصخر بالواد کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی پہاڑ کی چٹانوں کو تراش کر گھر یا مورت وغیرہ بنانا۔ قدیم زمانہ کی صنعتوں میں سے ایک صنعت یہ بھی تھی۔ اجنتا کے غاروں کے بارے میں خود لکھنے کے بجائے میں مولانا اکبرالدین قاسمی کے الفاظ نقل کرتا ہوں جنھوں نے اجنتا کے مشاہدہ کے بعد مجھے ایک خط میں لکھا تھا :

" جلگاؤں سے واپسی میں اجنٹہ ایک مقام ہے جہاں کے غار بہت مشہور ہیں وہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ بدھ مذہب کا کسی زمانے کا بہت بڑا اسنٹر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کل ۲۶ غار ہیں جن میں گوتم بدھ کے کئی ہزار مجسمے مختلف انداز سے تراشے اور اتارے گیے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اجنتا کے اس مقام پر جو آبادی ہے وہ مسلم اکثریتی آبادی ہے جہاں سیاسی اور معاشی طور پر مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔ سرپنچ اور دیگر سیاسی عہدے مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی وقت دعوتی کام ہوا تھا جس کی وجہ سے یہاں کی فضا بدھ مذہب کے ماحول میں بھی مسلم فضا بن گئی۔ یہاں ایک تاریخی مسجد ہے۔ جو آصف جاہ اول نے بنائی تھی۔ بڑی شاندار اور لمبی چوڑی مسجد ہے۔ خوبصورت کمانیں کشادہ صحن مسجد کو باوقار بنائے ہوئے ہیں۔ یہاں عشاء کی نماز پڑھنے کا موقع ملا۔ نماز کے بعد جب منبر (خطبہ جمعہ کی جگہ) پر نظر پڑی تو وہاں " تذکیر القرآن " رکھی ہوئی تھی۔ امام مسجد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ تفسیر یہاں ہر روز بعد نماز فجر سنائی جاتی ہے۔ یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ لوگوں میں تذکیری غذا حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو رہا ہے۔ اللھم زد فزد "

اورنگ آباد میں میرا قیام صوبیدار گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ یہاں ایک لطیفہ پیش آیا

میں [illegible] باتھ روم میں داخل ہوا تو وہاں کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ قریب جا کر دیکھا تو ایک بڑا مینڈک تھا۔ میں نے گیسٹ ہاؤس کے آدمی سے کہا کہ یہاں باتھ روم میں ایک مینڈک ہے۔ اس نے جواب دیا: ہاں، یہاں چوں کہ چاروں طرف باغ ہیں، اس لیے کبھی کبھی باہر سے مینڈک آجایا کرتے ہیں۔

ایک سال پہلے دہلی میں اشوک ہوٹل کے کمرے میں یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ وہاں کیڑے رینگتے ہوئے نظر آئے جس کی وجہ سے ایک امریکی وفد ہوٹل چھوڑ کر چلا گیا۔ اورنگ آباد کا گیسٹ ہاؤس اور دہلی کا اشوک ہوٹل دونوں حکومت کی ملکیت ہیں۔ آخر سرکاری اداروں ہی میں کیوں اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ "پبلک سیکٹر" کو ہندستان میں "پرائیویٹ سکٹر" کے لیے بطور نمونہ قائم کیا گیا تھا۔ مگر اب پرائیویٹ سکٹر ہی پبلک سکٹر کے لیے نمونہ بن رہے ہیں۔

۱۰ اپریل کی صبح کو واپس آتے ہوئے اورنگ آباد ایرپورٹ میں داخل ہوا تو سیکورٹی چک پر ایک شخص پولس کی وردی میں کھڑا ہوا تھا۔ حسب معمول اس نے "چیکنگ" کی۔ اس کے بعد میرے اور اس کے درمیان مندرجہ ذیل مکالمہ ہوا:

آپ کہاں رہتے ہیں

دہلی میں

آپ کا نام کیا ہے

وحید الدین

السلام علیکم (مصافحہ کرتے ہوئے) "میرا نام عثمان علی خان ہے۔ میرے لیے دعا فرمائیے"

مذکورہ آدمی کی شخصیت پولیس کی وردی میں چھپی ہوئی تھی۔ مگر جیسے ہی اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے السلام علیکم کہا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پولیس کی وردی کے اندر سے ایک نیا انسان نکل آیا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے اندر ایک اور انسان چھپا ہوا ہے۔ پہلے انسان کو آپ ہر وقت دیکھ سکتے ہیں۔ مگر دوسرا انسان صرف اس وقت سامنے آتا ہے جب کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آکر اس کا پردہ پھاڑ دے۔

یں سونے اور جاگنے کی کیفیت کے درمیان اپنی سیٹ پر تھا کہ اناؤنسر کی آواز کان میں آئی :
اب سے کچھ دیر بعد جہاز دوسان دلی کے ہوائی اڈہ پر اترے گا

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کہنے والا کہہ رہا ہو کہ " اب سے کچھ دیر بعد تمہارا جنازہ قبر میں اترے گا " یہ سوچ کر بدن پر کپکپی طاری ہو گئی ۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ دل سے دعا نکلی کہ خدایا ، آپ نے خیریت کے ساتھ دہلی پہنچا دیا ہے ، اسی طرح خیریت کے ساتھ آخرت کی بہترین منزل تک پہنچا دیجئے ۔ ہر سفر بالآخر موت پر ختم ہونے والا ہے ۔ مگر لوگ ہر سفر اس طرح کرتے ہیں گویا کہ وہ زندگی کی منزل پر پہنچ رہے ہیں ۔

سفر سے واپسی کے بعد جناب ایس اے ناصر صاحب کا خط (۱۳ اپریل ۱۹۸۷) موصول ہوا ہے ۔ ان کا وطن جامنیر ہے ۔ مگر وہ جلگاؤں کے ایک کالج میں استاد ہیں ۔ چنانچہ وہ زیادہ تر جلگاؤں میں رہتے ہیں ۔ وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں : یہاں جلگاؤں میں آپ نے لوگوں کے دلوں میں تشنگی بڑھا دی ، جو اتنا کم وقت یہاں مل سکا ۔ آئندہ انشاء اللہ نئے عزم کے ساتھ کام ہوگا ۔ جامنیر میں تو آپ لوگوں کو اپنا دیوانہ بنا کر گئے ۔ آپ کی جامنیر کی تقریر کیسٹ سے کاغذ پر نقل کر لی گئی ہے اور اخبار کو برائے اشاعت بھیج دی گئی ہے ۔ اگر نظر ثانی کر کے اس کو کتابچہ کی شکل میں چھپوالیں تو بہت بہتر ہوگا ۔ یہ تقریر کچھ سمجھ دار لوگوں نے کیسٹ سے سنی تو کہنے لگے کہ ایسا پروگرام تو جلگاؤں میں ہونا چاہیے تھا ۔ اور اب وہ دوبارہ خواہش ظاہر کر رہے ہیں کہ یہاں پوری تیاری کے ساتھ پروگرام ہو "

پروفیسر این . جی قاضی (اورنگ آباد) اپنے خط مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۸۷ میں لکھتے ہیں :
" جامنیر میں بعد نماز عصر آپ نے نماز کی حقیقت پر جو روح پرور بیان دیا ، واقعی بے حد موثر تھا ۔ اس سے نہ صرف آنکھیں نم تھیں بلکہ دل و دماغ بھی رشد و ہدایت کی ضیا سے منور ہو رہے تھے ۔ اور میں تو اپنے آپ میں ایک انقلابی تبدیلی محسوس کر رہا تھا ۔ اسی طرح نیشنل انٹگریشن اور اسلام پر جامنیر میں آپ نے جو خطاب عام فرمایا اور جس انداز سے حقیقت کو پیش کیا ، اس سے تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً غیر مسلم بے حد متاثر ہوئے "

پریس کانفرنس سے خطاب

آپ سے پہلے میں یہ بات صاف کردینا چاہتا ہوں کہ ہماری یہ پریس ملاقات کسی پولیٹکل اشو پر نہیں ہے۔ اور نہ ان باتوں میں سے کسی بات پر ہے جس کو عام زبان میں کرنٹ ٹاپک یا برننگ ٹاپک کہا جاتا ہے۔ ہم اس وقت صرف مارل اشوز پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں پہلے ہی یہ بات بھی کہہ دوں کہ اس ملاقات میں آپ کی طرف سے جو سوالات آئیں وہ بھی اصل ٹاپک پر آئیں۔ اس خاص ٹاپک سے باہر سوال وجواب کے لیے ہم آپ سے معافی چاہتے ہیں۔

آپ نے شاید آج (۱۴ فروری ۱۹۸۷) کے انڈین اکسپریس میں انڈیا کے بزرگ جرنلسٹ ایس ملگاؤکر (S. Mulgaokar) کا آرٹیکل دیکھا ہوگا جس کی ہڈنگ یہ ہے:

Can systemic changes provide the entire answer?

اس آرٹیکل کا فرسٹ پارٹ پچھلے سنڈے (۷ فروری) کو آیا تھا۔ اس کا دوسرا پارٹ آج کے انڈین اکسپریس میں چھپا ہے۔ اس میں مسٹر ملگاؤکر نے کہا ہے کہ ہماری انڈپنڈنس پر چار ڈیکیڈ گزر چکے ہیں۔ ہم نے کئی اعتبار سے پراگرس بھی کی ہے۔ مگر ہمارے پرابلم ابھی بہت زیادہ ہیں، اور مجموعی طور پر ہمارے مسائل ہماری ترقی سے بڑھے ہوئے ہیں:

Our Problems are many and serious, and on balance, appear to outweight the progress.

مسٹر ملگاؤکر نے ان لوگوں کی بات کو نہیں مانا ہے جو حالات کو ٹھیک کرنے کے لیے سسٹم میں چینج کی بات کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سسٹم تو آخر کار آدمی ہی چلاتے ہیں۔ جب آدمی اچھے نہ ہوں تو سسٹم کیسے اچھا ہوگا:

In the final analysis, a system is only as good as those who operate it.

مسٹر ملگاؤکر کی اس بات سے مجھے اتفاق ہے۔ اس کو بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ مہاتما گاندھی نے ہمارے ملک کو پولیٹکل بیس دیا۔ اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں پاور آیا اور انھوں نے اس ملک کو انڈسٹریل بیس دیا۔ مگر تیسرا کام ابھی ہونا باقی ہے اور وہ ہے اس

ملک کو مارل بیس دینا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تیسری چیز (مورلیٹی)، زندگی میں ڈیسائڈنگ فیکٹر کی حیثیت رکھتی ہے۔ خود پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی آخر عمر میں یہ مانا تھا کہ مارل بیس جب تک حاصل نہ ہو، صحیح معنوں میں ملک کو ترقی کی طرف نہیں لے جایا جاسکتا :

What constitutes a good society? I believe in certain standards. Call them moral standards. They are important in any individual and in any social group. And if they fade away, I think that all the material advancement you may have will lead to nothing worthwhile.

یہ بات اتنی کھلی ہوئی ہے کہ کسی کو ایک یا دوسرے لفظوں میں سبھی لوگ کہتے رہے ہیں۔ وہ قریب قریب ایک مانی ہوئی بات ہے۔ اس لیے میں اس کو زیادہ لمبا نہ کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ مارل بیس کا لفظ میں کسی نیرو سنس میں نہیں بول رہا ہوں۔ بلکہ بہت وسیع معنی میں بول رہا ہوں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہمارے دیس کا ہر سمجھ دار آدمی اس کی اہمیت کو مانتا ہے۔ ہر سمجھ دار آدمی یہ مانتا ہے کہ ملک اس کے بغیر بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ پھر بھی اس کے لیے ابھی تک کوئی بڑی کوشش نہیں کی جا سکی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کام میں جلد کوئی رزلٹ سامنے نہیں آتا۔ آپ کوئی پولیٹکل اشو کھڑا کریں تو بہت جلد لوگوں کی بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ مگر مارل اشو پر جلد کوئی بھیڑ جمع نہیں ہو سکتی۔ اکثر لوگ چونکہ امیجیٹ گین چاہتے ہیں، اس لیے اکثر لوگ اس راہ میں کوشش کے لیے بھی اپنے کو تیار نہیں کر پاتے۔ ہم نے بہر حال اسی کام کو کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم نے طے کیا ہے کہ خواہ رزلٹ حاصل کرنے میں دیر لگے، ہم اسی راہ پر چلتے رہیں گے۔

ملک کو مارل بیس دینے کے لیے ہمیں سب سے پہلا کام یہ کرنا ہے کہ لوگوں کے اندر مارل اویرنس پیدا کریں۔ یہ اس معاملہ میں بہت بیسک بات ہے۔ اس راہ میں ہمیں اپنا سفر اویرنس (Awareness) سے شروع کرنا ہے نہ کہ جلوس اور ایجی ٹیشن جیسی چیزوں سے۔ اس کیمپین میں ہمارا ٹارگٹ انسان ہے نہ کہ کوئی حکومت۔

جیسا کہ میں نے کہا، میں مارل اویرنس کا لفظ کسی محدود معنی میں یا نیرو سنس میں نہیں بول رہا ہوں۔ بلکہ وسیع معنی میں بول رہا ہوں۔ اس سے میری مراد خاص طور پر اس چیز سے ہے جس کو دوسرے لفظوں میں کانسٹرکٹیو تھنکنگ کہا جاسکتا ہے۔ یعنی مسائل کو لڑے بھڑے بغیر حل کرنا

[illegible] سے ٹکراؤ کو اوائڈ کرتے ہوئے اپنی زندگی کا سفر طے کرنا، ممکن چیز (Possible) سے اپنا کام شروع کرنا نہ کہ اس چیز سے جو ناممکن (Impossible) ہے۔ اس کے سوا جو طریقے ہیں وہ سب کھونے کے طریقے ہیں، وہ پانے کے طریقے نہیں ہیں۔

جاگ یا اویرنس پیدا کرنے کا کام اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب کہ وہ تعمیری انداز میں ہو۔ یعنی اس کا رخ اپنی طرف ہو نہ کہ دوسروں کی طرف۔ دوسروں سے مانگ کرنے کے بجائے اپنے آپ کو دیکھا جائے۔ اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ابھارا جائے۔ لوگوں کے اندر جذباتی اندازِ فکر (Emotional approach) ختم کیا جائے اور ان کے اندر عقلی اندازِ فکر (Rational approach) پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ ذہن بنایا جائے کہ لوگ معاملہ کو دوسرے کے اوپر نہ ڈالیں بلکہ اس کی ذمہ داری خود قبول کریں۔ جہاں معاملہ ایک سے زیادہ آدمیوں کا ہو وہاں ذمہ داری خود قبول کرنے سے مسئلہ حل ہوتا ہے، دوسروں کے اوپر ڈالنے سے کبھی مسئلہ ختم نہیں ہو سکتا۔

اویرنس پیدا کرنے کا یہ کام مجاریٹی کمیونٹی اور مائناریٹی کمیونٹی دونوں کے درمیان کرنا ہے۔ دونوں کے اندر یہ سوچ ابھارنا ہے کہ وہ دوسروں کو بلیم دینے کا طریقہ چھوڑیں اور اپنے آپ میں جھانک کر دیکھنے کا مزاج پیدا کریں۔ وہ ماضی کی باتوں کو بھلائیں اور مستقبل کے لحاظ سے اپنی منصوبہ بندی کریں۔ تاہم اس وقت میں اس کوشش کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو میں اور میرے ساتھی مائناریٹی کمیونٹی کے اندر کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کو ہم پچھلے دس سال سے اسی ڈھنگ پر ایجوکیٹ کر رہے ہیں، اور لٹریچر اور ملاقات اور کیسٹ اور تقریروں کے ذریعہ ان کے اندر تعمیری شعور (Mind building) کی مہم چلا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ بہت لمبی بات ہے۔ ہمارے اردو اور انگلش میگزین کو دیکھ کر اس کی تفصیل معلوم کی جا سکتی ہے۔ یہاں میں بات کو واضح کرنے کے لیے صرف دو باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ (باقی)

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہ

الرسالہ (انگریزی) کے دو شمارے ایک پروفیسر صاحب کی نظر سے گزرے۔ اس کے بعد انھوں نے ہمارے نام ایک خط لکھا ہے۔ یہ خط یہاں انھیں کے لفظوں میں نقل کیا جاتا ہے :

I am thankful to you for sending me the October 87 number of *Al-Risala*. I had duly received an earlier number as well. It is informative and full of thought-provoking materials. It seemingly provides intellectual food for thought. India and China had been rich in intellectual traditions all through history. Muslim intellectuals in the past with their rusty knowledge and methodology failed to make much headway. I wish all success to the contemporary ones including those associated with your esteemed journal, the *Al-Risala*. I wish to subscribe to it. But my pocket does not allow at the moment. I shall see, if I do in future.

Prof. Sanghasena Singh, Head, Department of Buddhist Studies, Faculty of Social Sciences, Delhi University, Delhi 110 007

اس طرح کے خطوط ہم کو برابر ملتے رہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریزی الرسالہ (جاری شدہ فروری ۱۹۸۴) پورے عالم اسلام کا واحد پرچہ ہے جو خالص دعوتی اور تعمیری انداز میں نکل رہا ہے۔ وہ مسلمانوں کے قومی جھگڑوں سے مکمل طور پر الگ ہو کر دین خدا کی بے آمیز دعوت کو عالمی سطح پر سمجھی جانے والی زبان میں پیش کر رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں تمام مسلمان یا تو ملی تحفظ کے کاموں میں مشغول تھے یا قومی جھگڑوں کے میدان میں سرگرمی دکھا رہے تھے۔ پورے عالم اسلام میں کوئی ایک جریدہ ایسا نہ تھا جو خدا کے دین کی ایجابی دعوت کو بین اقوامی زبان میں پیش کرے۔ ایسی حالت میں الرسالہ (انگریزی) کا نکلنا گویا پوری امت کی طرف سے فرض کفایہ کی ادائیگی کا انتظام ہے۔ اب امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو تمام دنیا میں غیر مسلم قوموں کے تعلیم یافتہ افراد تک پہونچائے۔

ضرورت ہے کہ ہر مسلمان کم از کم ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم بھائی کے نام الرسالہ انگریزی کو اپنی طرف سے جاری کرائے۔ یہ دعوتِ حق کی مہم میں اپنے آپ کو شامل کرنا ہے، اور دعوتِ حق کی مہم میں شامل ہونے سے زیادہ بڑی کوئی سعادت انسان کے لیے نہیں۔

۱- ... نیشنل کمیشن کی طرف سے ۲۲ اگست ۱۹۸۷ کو نئی دہلی میں ایک سیمینار تھا۔ اس کا عنوان تھا :

Human Rights and Value Education.

منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز اس سیمینار میں شریک ہوئے اور مذکورہ موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے ایک تقریر کی۔ عام طور پر لوگوں نے اس کو پسند کیا۔

۲- دہلی (بھوجل پہاڑی) میں ۳ اگست ۱۹۸۷ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں علاقہ کے تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا : ملی تعمیر کے لیے علم کی اہمیت۔ تقریر میں یہ بتایا گیا کہ علم یا تعلیم کا اصل مقصد سروس حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد قوم کے افراد کو باشعور بنانا ہے۔ مختلف تاریخی مثالوں کے ذریعہ بتایا گیا کہ علمی شعور کس طرح قوموں کی ترقی اور کامیابی میں مددگار ہوتا ہے۔

۳- ایک صاحب جو دوحہ (قطر) میں بحیثیت استاد کام کر رہے ہیں اپنے خط (۱۳ جولائی ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں : یہاں لائبریری میں "مذہب اور جدید چیلنج" نظر آئی۔ اَلْاِسْلامُ یَتَحَدّیٰ تمام مکتبات میں موجود ہے۔ پچھلے جمعرات کو حسن اتفاق سے ریڈیو پر آپ کی تقریر "حج کی اجتماعی اہمیت" سامعہ نواز ہوئی۔ پوری تقریر میں نے ٹیپ کر لی۔ اور یہاں اپنے طلبہ کو کلاس میں سنائی۔ عرب طلبہ نے کہا : یہ نام ہمارے یہاں معروف ہے۔ اب میں الاسلام یتحدیٰ خرید کر ان میں تقسیم کرنے والا ہوں (ڈاکٹر شفیق ندوی)

۴- انڈین ریلوے اسٹاف ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک میگزین نکلتا ہے جس کا نام ہے سنگتین۔ اس میں بیک وقت انگریزی اور ہندی مضامین ہوتے ہیں۔ اس میگزین میں الرسالہ کے مضامین نمایاں طور پر انگریزی اور ہندی زبانوں میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر جنوری ۱۹۸۷ میں صفحہ ۳ پر اور اپریل ۱۹۸۷ میں صفحہ ۴ پر۔ یہ میگزین گورکھپور سے شائع ہوتا ہے۔

۵- ایک صاحب جونسا انگریز ہیں۔ انھوں نے عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ سپیر عربی

اور اردو اور فارسی اور پشتو زبانیں سیکھیں۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے "اسلامی تعلیمات" کے ایک باب (آدمی کا امتحان) کے بارے میں اپنا تاثر حسب ذیل الفاظ میں روانہ کیا ہے:

I think I have a reasonable grasp of the gist of the whole passage now. Man has been given power on earth, so there are some who will work corruption, but also some who will use their power to good ends; for this has the world been created. So man is being tested, by being given power, and his most crucial test comes when he has to acknowledge the right of some other person. What good sense this explanation makes; everything fits in. Strange, no one else thought of it up till now. They make the whole episode a focus of human pride, instead of human responsibility, proud of being made Khalifah, proud of being bowed down to by the angels, proud of being given knowledge of the "names". Jan Mohammad Butt, London.

۶۔ ایک صاحب اپنے خط ۱۸ جولائی ۱۹۸۷ میں غازی پور سے لکھتے ہیں: الرسالہ پابندی سے برابر موصول ہو رہا ہے۔ میں الرسالہ پڑھنے کے بعد متعدد لوگوں کو دے دیا کرتا ہوں جو کہ اس کا مطالعہ بڑے ذوق شوق کے ساتھ کرتے ہیں اور بحمداللہ اس کے مطالعہ کے بعد میں نے لوگوں میں بڑی تبدیلیاں محسوس کیں۔ سوچنے سمجھنے اور بحث کرنے کا ان کا انداز یکسر بدل گیا۔ یہ ایک خاموش انقلاب ہے جو ایک خوب صورت انداز میں لوگوں کی زندگی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خوش گوار تبدیلی بے حد مفید اور عظیم ثابت ہوگی (ڈاکٹر ایس ایچ صدیقی)

۷۔ ایک صاحب اپنے خط (۲۹ جولائی ۱۹۸۷) میں لکھتے ہیں: الرسالہ کے ذریعہ ہم ایک عظیم فتنہ سے بچے۔ میرا دل، جس میں پہلے تعصب کی بھٹیاں جلتی رہتی تھیں، الحمدللہ اس میں اب اللہ کی توفیق سے دوسروں کے لیے خیر خواہی ہے۔ اللہ میری کوتاہیوں سے درگذر فرمائے (شاد حسین، سرینگر)

۸۔ اسلامی مرکز کے فکر کی مزید اشاعت کے لیے یہ مہم شروع کی گئی ہے کہ ملک کے بڑے بڑے انگریزی اخبارات میں "خطوط" شائع کرائے جا رہے ہیں۔ اس قسم کے متعدد خطوط قومی روزناموں میں چھپ چکے ہیں اور خدا کے فضل سے ان کا اچھا اثر مترتب ہو رہا ہے۔

مسٹر بے ایف ریبیرو (ڈائرکٹر جنرل آف پولس، پنجاب) نے صدر اسلامی مرکز کا ایک آرٹیکل (مطبوعہ ٹیلی گراف) پڑھا جس کا عنوان تھا:

Only goodness can cure the evil of communalism

مسٹر ریبیرو نے اس کو (Very interesting article) قرار دیتے ہوئے اپنے خط مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۸۷ میں لکھا ہے:

It is a difficult solution, but constant efforts should be made by the leaders to solve problems in the suggested manners

۱۰۔ اسلامی مرکز کے فکر کو خدا کے فضل سے یہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ بڑی تعداد میں لوگ اس کو دہرانے لگے ہیں۔ تھوڑے لوگ حوالہ کے ساتھ اور بیشتر لوگ حوالہ کے بغیر۔ دوسری قسم میں ایک تعداد ان لوگوں کی ہے جو الفاظ اور ترتیب کے معمولی فرق کے ساتھ اس کو اپنی تحریروں کے درمیان شامل کر لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو سیدھے سیدھے ہماری تحریر کو اپنے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ یہ اسلامی مرکز کے فکر کی غیر معمولی مقبولیت کا ثبوت ہے۔

۱۱۔ صدر اسلامی مرکز نے ۱۳ اگست ۱۹۸۷ کو نئی دہلی کے ایک اجتماع سے خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع تھا: سچائی کیا ہے اور ہم کس طرح اسے پا سکتے ہیں۔ اس اجتماع میں سب تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اکثریت غیر مسلم صاحبان کی تھی۔

۱۲۔ ایک صاحب نے الرسالہ کے منتخب مضامین کو گجراتی زبان میں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کتاب چھپ گئی ہے اور حسب ذیل پتے سے مل سکتی ہے:

Ghulam Rasool Kamili, Kalupur, Panch Patti, Mullaharun's Pole, Ahmedabad 360 001

۱۳۔ اسلامی زندگی کو سمجھنے کے لیے مولانا محمد یوسف صاحب کی کتاب حیاۃ الصحابہ نہایت مفید اور جامع کتاب ہے۔ اس کا عربی اڈیشن اعراب کے ساتھ دہلی کے ایک ادارہ نے شائع کیا ہے۔ مولانا محمد عبد اللہ طارق صاحب کی تحقیق و تعلیق کے اضافہ نے اس کی افادیت مزید بڑھا دی ہے۔ تفصیلات کے لیے ذیل کے پتہ پر لکھیں:

ادارۂ اشاعت دینیات، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳ ۱۱۰۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۳ دسمبر ۱۹۸۷

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

تبدیلی کا نظام

قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، اور جب انھیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں (وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ، الشوریٰ ۳۷)

اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ اہل ایمان ردعمل کی نفسیات کا شکار نہیں ہوتے کہ وہ برائی کا جواب برائی سے دیں اور جب کوئی شخص غصہ دلانے والا کام کرے تو غصہ ہو کر اس کے ساتھ بھی وہی کرنے لگیں جو اُس نے اِن کے ساتھ کیا ہے۔ بشری تقاضے کے تحت انھیں دوسرے کی غلط بات پر غصہ تو ضرور آتا ہے، مگر جب وہ اس کو لوٹاتے ہیں تو غصہ نہیں لوٹاتے، بلکہ غصہ کے جواب میں اسے معافی اور درگزر کا سلوک لوٹاتے ہیں۔

یہ عین وہی قانون ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی پوری دنیا کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ یہاں ہر چیز اس ڈھنگ پر بنائی گئی ہے کہ اس کو جو کچھ باہر سے ملے اس کو وہ اسی طرح اگل نہ دے بلکہ اپنے اندرونی نظام کے تحت اس کو تبدیل کرے۔ وہ کمتر چیز کو بہتر چیز بنا کر خارج کرے۔ درخت کو زمین سے "مٹی" ملتی ہے۔ مگر اس کو وہ پتی اور پھول اور پھل میں تبدیل کر کے باہر لاتا ہے۔ اس کو بیرونی فضا سے کاربن ڈائی آکسائڈ دیا جاتا ہے، مگر وہ اس کو اپنے اندر جذب کر کے باہر کی دنیا کو آکسیجن کا تحفہ عطا کرتا ہے۔ "گائے" اسی تبدیلی کا ایک زندہ کارخانہ ہے۔ وہ گھاس کھاتی ہے اور دودھ نکالتی ہے۔ وہ غیر دودھ کو دودھ میں تبدیل کرتی ہے:

The cow is a living factory which converts non-milk into milk.

خدا پرست انسان کو بھی اسی اصولِ فطرت پر رہنا ہے جس پر دنیا کی بقیہ چیزیں قائم ہیں۔ اس کو یہ کرنا ہے کہ دوسرے لوگ جب اس کے ساتھ برا سلوک کریں اور اس کی وجہ سے اس کے اندر غصہ اور نفرت اور انتقام بھڑک اٹھے تو وہ ان منفی جذبات کو مثبت جذبات میں تبدیل کرے۔ وہ برے سلوک کا جواب اچھے سلوک سے دے۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۷

ازالۂ سبب

ایک حکیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک تجربہ کار حکیم ہیں اور اپنے فن پر کامل عبور رکھتے ہیں۔ انھوں نے ایلوپیتھی اور طب یونانی کا تقابل کرتے ہوئے کہا کہ دونوں کے طریقِ علاج میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ایلوپیتھی کا انحصار ازالۂ تکلیف پر ہے اور طب یونانی کا انحصار ازالۂ سبب پر۔ مثلاً ایک مریض آتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے سر میں درد ہے۔ اب ایلوپیتھی کا معالج اس کو ایسپرین کی گولی دیدے گا جس کے استعمال سے درد بظاہر دب جائے گا۔ مگر یہ دبنا وقتی ہوگا۔ اس کی گولیاں وقتی طور پر کچھ ازالۂ تکلیف کر سکتی ہیں، مگر وہ درد کو مستقل طور پر ختم نہیں کرتیں۔

اس کے برعکس طب یونانی کے معالج کے سامنے یہی مریض آئے تو وہ دردِ سر کا سبب تلاش کرے گا۔ اگر وہ پائے گا کہ درد کا سبب پیٹ کی خرابی ہے تو وہ پیٹ کا علاج کرے گا نہ کہ براہ راست دردِ سر کا۔ مذکورہ حکیم صاحب نے ایلوپیتھی کے طریقہ پر سخت تنقید کی اور طب یونانی کے طریقہ کو صحیح اور فطری طریقہ قرار دیا۔ "کیوں کہ ازالۂ تکلیف کا طریقہ صرف وقتی ریلیف دیتا ہے، وہ مستقل شفا عطا نہیں کرتا"

اس کے بعد الرسالہ کا ذکر آیا تو حکیم صاحب نے اس کے "تعمیری پیغام" سے اتفاق نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان آج سنگین قسم کے مسائل میں مبتلا ہیں۔ وہ فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ مگر آپ کے پاس مسلمانوں کے مسئلہ کا کوئی فوری حل نہیں۔ آپ صبر اور اعراض کی اور یک طرفہ طور پر شکایات کو ختم کر لینے کی باتیں کرتے ہیں۔ موجودہ حالت میں تو یہ بات محض ایک فلسفہ ہے وہ مسئلہ کا حل نہیں۔

میں نے حکیم صاحب سے کہا کہ آپ شخصی بیماری کے لیے ازالۂ سبب کے طریقہ کو مفید بتاتے ہیں، اور اجتماعی بیماری کے لیے ازالۂ تکلیف کے طریقہ کی وکالت کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہم شخصی اور اجتماعی دونوں قسم کے مسائل میں ازالۂ سبب کے طریقہ کو نتیجہ خیز سمجھتے ہیں۔ بس اس کے سوا ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ آپ دہرا اندازِ فکر کو ختم کر دیں اور پھر ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی فرق نہ ہوگا۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۷

ہر ایک کی کہانی

ایک بس میوات کے علاقہ سے گزر رہی تھی۔ وہ اسٹینڈ پر رکی تو کچھ مسافر بس کے اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک بوڑھی "میونی" بھی تھی۔ اپنے سر پر گٹھری لیے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ کہاں جا کر بیٹھے۔ ایک مسافر نے ازراہ مذاق کہا: دیکھو، وہ سیٹ خالی ہے۔ وہاں جا کر بیٹھ جاؤ۔ یہ ڈرائیور کی سیٹ تھی۔ مگر میونی کو ڈرائیور کی سیٹ اور مسافر کی سیٹ کا فرق معلوم نہ تھا۔ وہ اطمینان کے ساتھ آگے بڑھی اور "خالی سیٹ" پر جا کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر کے بعد ڈرائیور اندر داخل ہوا۔ وہ اپنی سیٹ پر میونی کو دیکھ کر بولا: عورت، تو یہاں کیسے بیٹھ گئی۔ یہاں سے تو میں بیٹھ کر بس چلاؤں گا۔ میونی نے اپنی گٹھری سنبھالتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا: میں تو چوکھی بیٹھی ہوں، تو کہیں اور سے چلالے۔

بس کے اعتبار سے دیکھئے، تو یہ صرف ایک جاہل عورت کی کہانی معلوم ہوگی۔ مگر وسیع تر اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمانہ میں یہی ہر شخص کی کہانی ہے۔ موجودہ زمانہ حرص اور حب دنیا کا زمانہ ہے۔ آج ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی "سیٹ" پر قناعت نہیں کرتا۔ ہر آدمی دوسرے کی "سیٹ" پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ آدمی صرف وہاں رکتا ہے جہاں حالات نے اس کو رکنے کے لیے مجبور کر دیا ہو، اگر حالات اجازت دیں تو بہلی فرصت میں وہ دوسرے کی سیٹ پر قبضہ کرنے کا عمل شروع کر دے گا۔

خدا کی دنیا میں ہر چیز اپنی حد کے اندر عمل کرتی ہے۔ آسمانی اجسام اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں۔ جنگل کے جانور اپنے فطری دائرہ میں رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔ خدا کی دنیا میں صرف ایک ایسی مخلوق ہے جو حد بندی کو قبول نہیں کرتی۔ یہ انسان ہے۔ انسان بار بار اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے۔ انسان اس چیز پر قابض ہونے کا منصوبہ بناتا ہے جو باعتبار حقیقت اس کی نہیں۔

بوڑھی میونی کا کیس بیوقوفی کا کیس تھا اور دوسرے لوگوں کا کیس سرکشی کا کیس۔ بیوقوفی قابل معافی ہوتی ہے، مگر سرکشی خدا کے قانون کے مطابق قابل معافی نہیں۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۷

غلط فہمی

محمد دوم یا محمد فاتح (۱۴۸۱-۱۴۳۲) ترکی کا مشہور مسلم حکمراں ہے۔ اس نے ۱۴۵۳ میں قسطنطنیہ کو فتح کیا اور اس کو نئے نام (استانبول) کے ساتھ اپنی راجدھانی بنایا۔ محمد فاتح کے سیاسی کارناموں سے متاثر ہو کر بعض لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس کو اس حدیث کا مصداق ٹھہرائیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ قسطنطنیہ کا ذکر فرمایا ہے اور اس میں شرکت کرنے والوں کو خصوصی بشارت دی ہے۔

ایک صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ترکی کے شہر قسطنطنیہ کے بارہ میں رحمۃ للعالمین پیش گوئی فرماتے ہیں کہ وہ سالار خوش قسمت ہوگا جو دیار قیصر کو بلاد اسلامیہ میں شامل کرے گا۔۔۔۔ صدیوں کے بعد یہ پیشین گوئی جس ترک کے ہاتھوں پوری ہوئی وہ محمد فاتح کے نام سے تاریخ کی زینت ہے۔ (صراط مستقیم، نومبر ۱۹۸۵)

حدیث کے اصل الفاظ کو دیکھے بغیر اگر اس مضمون کو پڑھا جائے تو بظاہر مذکورہ بات صحیح معلوم ہوگی۔ مگر حدیث کے اصل الفاظ کی روشنی میں دیکھئے تو یہ بات بالکل غلط ہو جاتی ہے۔ یہ حدیث بخاری میں ہے۔ اس کے متعلقہ حصہ کے الفاظ یہ ہیں: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اول الجیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم (صحیح البخاری، کتاب الجہاد والسیر) یعنی میری امت کے پہلے لشکر کے لوگ جو کہ قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) کا غزوہ کریں گے وہ سب بخشے ہوئے لوگ ہیں۔

اس حدیث میں قسطنطنیہ کی فتح کا ذکر نہیں ہے۔ صرف اس پر پہلا غزوہ کرنے کا ذکر ہے۔ مضمون نگار کے ذہن نے شعوری یا غیر شعوری طور پر پہلے غزوہ کو فتح کے ہم معنی بنایا اور پھر اس کو محمد فاتح پر چسپاں کر دیا۔ حالاں کہ حدیث کے الفاظ کی بنا پر شارحین حدیث عام طور پر اس کا مصداق یزید کی مہم کو قرار دیتے ہیں۔ ابن کثیر نے یزید بن معاویہ کو اس کا مصداق ٹھہراتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں: اور یزید پہلا شخص ہے جس نے قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کیا (وقد کان یزید اول من غزا مدینۃ قیصر، البدایہ والنھایہ)

ایک لفظ کے بدلنے سے کس طرح بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔

برا گمان

یا ایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم (الحجرات ۱۲)
اے ایمان والو، بہت سے گمان سے بچو۔ بیشک بعض گمان گناہ ہیں۔

گمان (ظن) بڑی تقسیم میں دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک حسن ظن جو جائز ہے اور دوسرا سوء ظن جو حرام ہے (ان الظن علی اقسام، منہا ما یجب اتباعہ وھو حسن الظن، ومنہا ما یحرم اتباعہ کسوء الظن، التفسیر المظہری) مفسر طبری نے اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن کو اس سے منع فرمایا کہ وہ دوسرے مومن کے حق میں برا گمان کرے (نھی اللہ عزوجل المومن ان یظن بالمومن شرا)

ایک ہے عین واقعہ یا عین مشاہدہ کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ اور ایک ہے قیاس اور استنباط کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ اس معاملہ میں شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی کے بارے میں بری رائے قائم کرنے کا معاملہ ہو تو ایسی رائے صرف عین واقعہ یا عین مشاہدہ کی بنیاد پر قائم کی جاسکتی ہے۔ البتہ اگر اچھی رائے قائم کرنے کا معاملہ ہو تو دونوں طریقوں کی بنیاد پر رائے قائم کرنا جائز ہوگا۔ حدیث میں یہاں تک ارشاد ہوا ہے کہ اذا ظَنَنْتَ فلا تحقَّق۔ یعنی اگر کسی شخص کے بارہ میں تمہیں کوئی برا گمان ہوجائے تو اس کی تحقیق میں نہ پڑو، بلکہ اس کو اپنے ذہن سے نکال دو۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے ولید بن عقبہ کا ذکر کیا اور کہا کہ اس شخص کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا: ہم کو تجسس سے روک دیا گیا ہے۔ البتہ اگر کوئی چیز بالکل ظاہر ہوجائے گی تو ہم اس پر مواخذہ کریں گے (قیل لہ ھذا فلان تقطر لحیتہ خمرا۔ فقال عبد اللہ رضی اللہ عنہ قد نُھینا عن التجسس ولکن ان یظہر لنا شئ ناخذ بہ) حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا: تمہارے مومن بھائی کی زبان سے کوئی بات نکلے تو تم ہرگز اس کو برے معنی میں نہ لو جب کہ تم اس کو اچھے معنی میں بھی لے سکتے ہو (لا تظُنَّنَّ بکلمۃ خرجت من اخیک المومن الا خیرا وانت یجد لھا فی الخیر محملا، تفسیر ابن کثیر)

نیا انسان

إذا ابتليت عبدي المؤمن فصبر فلم يشكني الى عوّاده أطلقته من إساري ثم أبدلته لحمًا خيرًا من لحمه ودمًا خيرًا من دمه ثم يستأنف العمل

(رواہ الحاکم عن ابی ہریرۃ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب میں اپنے کسی مومن بندے کو کسی مصیبت میں مبتلا کروں اور وہ اس پر صبر کرے اور آنے جانے والوں سے اس کی شکایت نہ کرے تو میں اس کو اپنی قید سے آزاد کر دیتا ہوں۔ پھر میں اس کے گوشت کو دوسرے بہتر گوشت سے بدل دیتا ہوں اور اس کے خون کو دوسرے بہتر خون سے بدل دیتا ہوں۔ پھر وہ نئے نئے کام کرنے لگتا ہے۔

ایک آدمی وہ ہے جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو کوئی شخص خود اپنے آپ کو بناتا ہے۔ پہلا آدمی روایتی آدمی ہے۔ وہ خاندان اور ماحول کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ مگر دوسرا آدمی ایک ارتقا یافتہ آدمی ہے۔ وہ ایک ایسا آدمی ہے جس کے اندر عظیم انقلاب برپا ہو چکا ہے۔

یہ نیا آدمی کس طرح بنتا ہے۔ یہ نیا آدمی حالات کے درمیان بنتا ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی پر طرح طرح کے ناموافق حالات پیش آتے ہیں۔ ان ناموافق حالات میں آدمی جو رد عمل پیش کرتا ہے اسی سے یہ متعین ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کیسا آدمی بنے گا۔ ایک رد عمل یہ ہے کہ ناموافق حالات آدمی کے اندر شکایت کی نفسیات پیدا کریں۔ وہ ان کے خلاف لوگوں سے شکایت اور احتجاج کرنے لگے۔ ایسے آدمی کی شخصیت کبھی ارتقا نہیں کر سکتی۔ وہ جہاں ہے وہیں پڑی رہے گی۔

دوسرا آدمی وہ ہے جو مصیبتوں پر صبر کرتا ہے۔ ناموافق حالات اس کے سکون کو برہم نہیں کرتے۔ دوسروں کے ظلم سے اس کے اندر نفرت کا جذبہ نہیں بھڑکتا۔ حالات کی شدت اس کے اندر جھنجلاہٹ پیدا نہیں کرتی۔ ایسے آدمی کا حال یہ ہوگا کہ ناموافق حالات میں پڑنے کے بعد اس کے اندر نئی شخصیت ابھر آئے گی۔ اس کا صبر اس کو ایک ارتقا یافتہ انسان بنا دے گا۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۷

اعلیٰ کامیابی

۸۶-۸۷ ۱۹ کے سول سروس کے امتحانات میں ابتدائی جانچ (Preliminary test) میں پورے ملک سے تقریباً ۹۴ ہزار امیدوار شریک ہوئے۔ ان میں سے صرف دس ہزار امیدواروں کو تحریری امتحان (Main examination) میں حصہ لینے کا اہل قرار دیا گیا۔ اس مرحلہ کے بعد سترہ سو امیدواروں کو انٹرویو کے لیے چنا گیا۔ انٹرویو کے بعد جن امیدواروں کو آخری طور پر اعلیٰ ملکی ملازمتوں کا اہل قرار دیا گیا، ان کی تعداد ۸۵۵ تھی۔

ان امتحانات کے آخری نتیجہ کا اعلان ۸ جون ۱۹۸۷ کے اخبارات میں شائع ہوا۔ اس کے ساتھ کامیاب ہونے والوں کی فہرست بھی شامل تھی۔ اس وقت لوگوں نے دیکھا کہ اتنی لمبی فہرست اور اتنی طویل جانچ کے بعد سارے ملک سے جو لوگ سول سروسز کے اہل قرار دیئے گیے ہیں ان میں سب سے پہلا نام "عامر سبحانی" کا ہے۔ اس اعلیٰ ملکی امتحان میں عامر سبحانی نے ٹاپ کا درجہ حاصل کیا تھا۔ یہ تنہا واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لیے اعلیٰ ترین کامیابی کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ کوئی تعصب یا کوئی جانبداری ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔

ہندستان کی کل آبادی میں مسلمان تقریباً ۱۲ فی صد ہیں۔ اس نسبت سے ۸۵۵ کی فہرست میں کم از کم ایک سو مسلمانوں کا نام ہونا چاہیے تھا۔ مگر عملاً صرف گیارہ مسلمان کامیاب ہونے والوں کی فہرست میں شامل ہو سکے ہیں۔ عام طور مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ تعصب ہے۔ مگر سول سروس کے امتحانات کے طریقہ پر غور کیجئے تو یہ بات بالکل بے بنیاد معلوم ہوگی۔

سول سروس کے تحریری امتحانات میں جواب کی کاپیوں پر امیدواروں کے نام لکھے ہوئے نہیں ہوتے۔ بلکہ صرف کوڈ نمبر درج ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں ممتحن کے لیے یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں کہ امیدوار کا تعلق کس فرقہ سے ہے۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ انٹرویو کا ہے۔ انٹرویو بورڈ پانچ سے سات ممبران پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر ممبر اپنے مضمون کا اکسپرٹ ہوتا ہے۔ اگر یہ ممبران متعصب اور تنگ نظر ہوں تو کوئی مسلمان نہ آئی اے ایس میں چنا جائے اور نہ ٹاپ کر سکے۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۷

تاہم اگر بالفرض ان میں کسی درجہ میں تعصب کا وجود فرض کیا جائے تب بھی ان کا تعصب اس معاملہ میں فیصلہ کن نہیں بن سکتا۔

اس کی وجہ ان امتحانات کا نظام ہے۔ تحریری امتحانات پورے ۱۸۰۰ نمبر کے ہوتے ہیں۔ جب کہ انٹرویو میں صرف ۲۵۰ نمبر ہوتے ہیں۔ اب اگر بالفرض تعصب کی بنیاد پر انٹرویو میں کسی امیدوار کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو محض انٹرویو میں اچھا نمبر حاصل نہ کرنے کی وجہ سے اس کو نااہل قرار نہیں دیا جاسکتا بشرطیکہ تحریری امتحان کے پرچوں میں اس نے اچھے نمبر حاصل کیے ہوں۔ کیوں کہ جب کامیاب امیدواروں کی آخری فہرست بنائی جاتی ہے تو تحریری امتحانات اور انٹرویو دونوں میں حاصل کردہ نمبروں کو یکجا کر کے شمار کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ صرف انٹرویو میں حاصل کردہ نمبر کی بنیاد پر فیصلہ کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک سبق آموز بات یہ ہے کہ عامر سبحانی صاحب نے تحریری امتحانات میں مجموعی طور پر ۶۴ فی صد نمبر حاصل کیے ہیں، جب کہ انٹرویو میں ان کو ۷۴ فی صد نمبر ملے ہیں۔ یعنی انٹرویو میں ۱۰ فی صد زیادہ۔

مسٹر سبحانی سے پوچھا گیا کہ انھوں نے سول سروس کے امتحان کے لیے کس طرح تیاری کی تھی۔ اس کے بارے میں بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ چھ مہینہ تک وہ روزانہ ۱۲ سے ۱۴ گھنٹہ تک مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ اس سے پہلے بھی انھیں آدھی رات تک پڑھنے کی عادت تھی۔ وہ نصابی کتابوں کے علاوہ انڈین اینڈ فارن ریویو، یوجنا اور انڈیا ٹوڈے کا برابر مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ دہلی سے نکلنے والے کئی انگریزی اخبارات کو روزانہ پوری طرح پڑھتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر عامر سبحانی کی غیر معمولی کامیابی کا راز غیر معمولی محنت ہے۔ وہ اپنی محنت کی وجہ سے میٹرک سے لے کر ایم اے تک ہمیشہ امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ وہ اپنے تجربہ کی روشنی میں آئی اے ایس کے امتحان میں شریک ہونے والے نوجوانوں کو کیا مشورہ دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا: سخت محنت اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی پوری جدوجہد۔

(۲۸ جون ۸۷ کے انگریزی اخبارات ، نئی دنیا ۳۰ جون ۱۹۸۷، بلٹز ۱۵ اگست ۱۹۸۷)

ہندستان میں مسلمانوں کے لیے عمل کے دو میدان ہیں۔ ایک مطالبہ اور احتجاج کا میدان اور دوسرا محنت اور جدوجہد کا میدان۔ ہمارے لیڈر پہلے میدان میں سرگرمی کی علامت ہیں۔ اور عامر سبحانی جیسے افراد دوسرے میدان میں سرگرمی کی علامت۔ ہمارے تمام لیڈر پچھلی نصف صدی سے ٹکراؤ کے راستے پر چل رہے ہیں۔ وہ فریق ثانی کو ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف لامتناہی احتجاج کی مہم جاری کیے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہماری قوم میں عامر سبحانی جیسے افراد بھی ہیں جنھوں نے فریق ثانی کی طرف سے نظریں ہٹا کر اپنی محنت پر بھروسہ کیا، وہ اپنے ذاتی امکانات کو بروئے کار لانے میں منہمک ہو گیے۔

اب عملی نتیجہ کے اعتبار سے دیکھیے تو لیڈر صاحبان کا طریقہ مسلم امت کے لیے سراسر بے نتیجہ ثابت ہو رہا ہے۔ اس راستہ سے ملت کو ایک نی صد بھی کوئی مثبت فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اس کے برعکس جو لوگ عامر سبحانی والے راستہ پر چلے وہ ہمیشہ کامیاب رہے۔ ان کی کوششوں سے ہمیشہ مثبت نتیجہ برآمد ہوا۔

یہ دو قسم کی مثالیں واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ مسلمانوں کو اس ملک میں کیا کرنا چاہیے۔ انھیں لیڈروں کے بتائے ہوئے طریقہ کو مکمل طور پر چھوڑ دینا چاہیے اور "عامر سبحانی" والے طریقہ کو مکمل طور پر اختیار کر لینا چاہیے۔ یہی واحد راستہ ہے جس پر چل کر مسلمان کامیابی کی منزل تک پہونچ سکتے ہیں۔

فرق کا سبب

راجہ مہندر پرتاپ (۱۹۷۹ - ۱۸۸۶) نے ۱۹۰۷ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ دنیا کا سفر کیا تھا۔ اس سفر میں انھوں نے چار مہینے گزارے اور یورپ، امریکہ، کناڈا، جاپان وغیرہ جاکر نئی دنیا کو اپنی آنکھ سے دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس طرح مجھے عالمی نگاہ حاصل ہوئی۔ میرے سفر نے مجھے مطمئن کر دیا کہ یورپ اور امریکہ کی ترقی کی وجہ جدید مشینوں اور صنعتوں کے سبب سے ہے۔ میں نے اپنا یہ ذہن بنایا کہ مجھے ہندستان میں ٹکنکل تعلیم کا آغاز کرنا ہے:

Thus I received World Vision. My tour convinced me that the progress of Europe and America was due to modern machines and industries. I made up my mind to start technical education.

چنانچہ سفر سے واپسی کے بعد راجہ مہندر پرتاپ نے ٹکنکل اسکول اور ٹکنکل کالج قائم کیا جس کا نام ابتداءً پریم مہاودیالیہ تھا۔ انھوں نے اپنی ریاست کے پانچ گاؤں اور ورندابن میں اپنا ایک بہت بڑا مکان اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ ان پانچ گاؤں کی آمدنی تقریباً ۳۰ ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ موجودہ صدی کے آغاز میں یہ آمدنی بہت بڑی رقم کے برابر تھی۔ ۱۹۱۱ میں راجہ مہندر پرتاپ نے دوبارہ مغربی دنیا کا سفر کیا اور انگلینڈ، جرمنی، سوئزرلینڈ اور پیرس کے ٹکنکل کالجوں کو دیکھا تاکہ اس کے مطابق اپنے یہاں کی ٹکنکل تعلیم کے اداروں کو مزید ترقی دے سکیں۔ (ڈے آفٹر، اگست ۱۹۸۷)

اکثریتی فرقہ میں راجہ مہندر پرتاپ جیسے بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں مغربی دنیا کا سفر کیا۔ اور ہندستان واپس آکر اس قسم کا تعمیری کام کیا جس کی ایک مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔ جب کہ مسلمانوں میں ایسی کوئی بھی مثال موجود نہیں۔

ماضی کا یہی فرق ہے جو دونوں فرقوں کے حال کے فرق کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ پچھڑے پن کا کیس ہے نہ کہ تعصب کا کیس۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۷

کچھ اور تصویریں

۲۸ اگست ۱۹۸۷ کو فلپائن میں ناکام فوجی بغاوت ہوئی۔ اس کی اطلاع فوراً بذریعہ
ٹیلی فون سی اول میں واقع ٹائم کے دفتر کو دی گئی۔ میگزین کی تین آدمیوں کی ٹیم ہوائی جہاز سے روانہ
ہوکر فلپائن کی راجدھانی منیلا پہونچی۔ اس نے واقعہ کی ضروری تصویریں حاصل کیں اس کے بعد سی اول
واپس آکر وہ لوگ اپنے تصویر بھیجنے والے مرکز (Photograph-transmission center)
میں سرگرم ہوگئے۔ انھوں نے تصویروں کو کمپیوٹر نقطوں (Computer digits) میں تبدیل کرکے
کمپیوٹر میں داخل کیا۔ پھر انھیں مصنوعی سیاروں کی مدد سے نیویارک کے صدر دفتر پہنچایا گیا۔ وہاں
ان نقطوں کو دوبارہ رنگین تصویروں میں تبدیل کیا گیا۔ اس کے بعد یہ تصویریں مضامین کے ساتھ شامل
کرکے پریس کے حوالہ کی گئیں۔ چند دن کے اندر فلپائن کے ناکام فوجی انقلاب کی باتصویر کہانی چھپ کر
تمام دنیا کے قارئین کے سامنے موجود تھی۔ اس کو بتاتے ہوئے ٹائم (۷ ستمبر ۱۹۸۷) نے اپنی رپورٹ
ان الفاظ پر ختم کی ہے کہ دنیا کی بہترین تصویر بھی بالکل بے کار ہے اگر وہ ابھی تک کسی شخص کے کیمرہ
میں بند ہو:

The best photo in the world is no good
if it is still in somebody's camera (p. 3).

فطرت کے امکانات کی دریافت نے آج اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ واقعات کی
تصویریں نہایت تیز رفتاری کے ساتھ حاصل کرکے شائع کی جاسکیں۔ تاہم آخری بہترین تصویر جو کوئی
انسانی کیمرہ کھینچ سکتا ہے وہ بہرحال ایک ظاہری تصویر ہوگی۔ مگر اس دنیا میں کچھ اور تصویریں ہیں جو
اس سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ یہ تصویریں وہ ہیں جو اندرونی حقیقتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک انسان
کا سچائی کے لیے تڑپنا، ایک انسان کے سینہ میں خدا کی یاد کا بھونچال آنا، ایک انسان کا اپنی انا کو ہلاک
کرکے حق کا اعتراف کرنا، یہ اس دنیا کی سب سے زیادہ اعلیٰ تصویریں ہیں۔ مگر وہ ابھی تک "کیمرہ" کے اندر
بند ہیں۔ وہ لوگوں کے سامنے نہیں آئیں۔ جس دنیا میں کمتر تصویروں کے اظہار کے لیے اتنا کامل انتظام ہوا
کیا وہاں برتر تصویروں کے اظہار کے لیے کوئی انتظام نہ ہوگا۔

ایک اور حملہ

۱۹۶۲ میں چین نے ہندستان کی مشرقی سرحد پر حملہ کیا تو ہندستانی فوج پہلے ہی مرحلہ میں شکست کھا گئی۔ ۱۹ نومبر ۱۹۶۲ کو اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں بیان دیا تو وہ لب ولہجہ کے اعتبار سے ایک مرثیہ سے کم نہ تھا۔ اگلی صبح کو لابی میں ایک پرانے کانگریسی لیڈر یہ کہتے ہوئے سنے گیے کہ "یہ بات کبھی میرے تصور میں نہیں آئی تھی کہ مہاتما گاندھی کے سیاسی وارث کے پاؤں مٹی کے ہوں گے"

۱۹ نومبر کو جواہر لال نہرو کی ایک تقریر ریڈیو سے نشر کی گئی۔ یہ تقریر یاس انگیز تھی، وہ حوصلہ بڑھانے والی نہ تھی۔ نہرو نے آسام والوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو کچھ آپ کے دروازہ پر ہو رہا ہے .... آسامیوں کے لیے یہ بات بڑی حیرت انگیز ثابت ہوئی۔ ان کا ریمارک یہ تھا کہ نہرو نے یہ کیوں کہا کہ "جو کچھ آپ کے دروازہ پر ہو رہا ہے" انھوں نے یہ کیوں نہیں کہا کہ "جو کچھ ہمارے دروازہ پر ہو رہا ہے"

شری ایچ وی کامتھ نے اس قسم کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:

"کوئی شخص یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ آدمی جو عالم گیر شہرت کے آسمان پر اڑانیں لگا رہا ہے، وہ جنگ کے زمانہ میں اتنی نیچی سطح پر آجائے گا۔ اور اس کی پالیسیوں کا ڈھانچہ اس طرح زمیں بوس ہو جائے گا۔ جواہر لال نہرو نے بعد کو خود تسلیم کیا کہ میں سپنوں کی دنیا میں رہ رہا تھا اور حقائق سے بالکل بے نیاز ہو گیا تھا"

(الجمعیۃ ویکلی ۱۳ جولائی ۱۹۷۳)

۱۹۶۲ کے چینی حملہ سے زیادہ بڑا ایک حملہ ہے جس کا خطرہ ہر آدمی کو درپیش ہے۔ یہ موت کا حملہ ہے۔ موت انسان کے اوپر اسی قسم کا شدید تر حملہ ہے۔ انسان اپنی دنیاوی کامیابیوں میں کھو کر حقیقت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ مرنے کے بعد جب اچانک اس کو اصل حقیقت کا سامنا پیش آئے گا تو اس وقت اس کی بدحواسی کا کیا عالم ہوگا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو کہاں چھپائے گا۔

فطرت کی پکار

ماسکو سے ایک انگریزی ماہنامہ نکلتا ہے، اس کا نام اسپٹنک (Sputnik) ہے۔ اس کے شمارہ اگست ۱۹۸۷ میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے :

Truth, Progress and the Human Soul

اس کے مضمون نگار روس کے مشہور سائنس داں یاکوف زلڈووچ (Yakov Zeldovich) ہیں۔ وہ ۱۹۱۴ میں پیدا ہوئے اور اب روس کی اکیڈمی آف سائنسز کے ممبر ہیں۔

مسٹر زلڈووچ نے اپنے بارے میں اقرار کیا ہے کہ وہ ایک ملحد ہیں۔ وہ خدا اور مذہب کو نہیں مانتے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ کہتے ہیں کہ انسانی معاشروں میں مذہب کی موجودگی ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے۔ نیز یہ کہ روحانی تقاضے انسان کے شعور میں گہرائی کے ساتھ پیوست ہیں :

Spiritual needs are deeply embedded
in human consciousness.

انسانی فطرت کی یہ نوعیت اتنی واضح اور اتنی قطعی ہے کہ تمام سنجیدہ لوگوں نے اس کا اقرار کیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک تمام انسان اس احساس کو لے کر پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ملحد معاشروں میں پیدا ہونے والے بچے بھی اپنے آپ کو اس احساس سے خالی نہ کر سکے۔ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ایک ایسی مانی ہوئی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس حقیقت کو مان لینے کے بعد صرف یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس تقاضے کا جواب کیا ہے۔ مذکورہ سائنس داں کا کہنا ہے کہ اس کا جواب نیچرل سائنس ہے۔ مگر یہ جواب اپنی تردید آپ ہے۔ اس لیے کہ نیچرل سائنس ایک مادی چیز ہے اور انسانی فطرت کا تقاضا ایک روحانی چیز۔ پھر ایک مادی چیز ایک روحانی سوال کا جواب کس طرح بن سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا جواب صرف خداوند تعالیٰ ہے۔ مخلوق اپنے خالق کی تلاش میں ہے، اور خالق کو پانے کے بعد ہی مخلوق کو سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۷

غلطی کے باوجود

۲ اگست ۱۹۸۷ کو جوہانسبرگ (افریقہ) میں سوال وجواب کا ایک مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ کا نام تھا:

Operation Hunger Goldrush quiz show

اس مقابلہ میں صحیح جواب دینے والے کو ایک ملین رینڈ (Rand) ملنے والا تھا جو کہ تقریباً ۶۰ لاکھ ہندستانی روپیہ کے برابر ہے۔ یہ انعام جان اسمڈل (John Smeddle) کو ملا، اگرچہ اس نے صحیح جواب نہیں دیا تھا۔

اس مقابلہ میں ۲۰ آدمی حصہ لے رہے تھے۔ سوال وجواب کا پورا منظر ٹیلی ویزن پر دکھایا جا رہا تھا۔ جب تمام لوگ اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے تو جج نے آخری سوال پیش کیا: "ہنری ہشتم (Henry VIII) کی چھ بیویوں میں سے تین بیویوں کے نام بتائیے" مسٹر اسمڈل نے حسب ذیل تین نام بتائے:

Ann Boleyn
Catherine of Aragon
Jane Grey

جج جانی فرینکل (Jonny Frankel) نے مسٹر اسمڈل کے جواب کو صحیح قرار دے کر اس کے حق میں مذکورہ انعام کا فیصلہ کر دیا۔ مگر یہ جج کی غلطی تھی۔ اس کا بتایا ہوا تیسرا نام جین گرے (Jane Grey) دراصل ہنری ہشتم کی چھوٹی بہن کی پوتی کا نام تھا جس کا کبھی مذکورہ انگلستانی بادشاہ سے نکاح نہیں ہوا۔ ہنری ہشتم کی بیوی کا صحیح نام جین سیمور (Jane Seymour) تھا۔ مگر دونوں ناموں کے پہلے جزر کی یکسانیت کی وجہ سے غالباً جج کو تشابہ ہو گیا۔ اور اس نے جواب کو صحیح قرار دے کر انعام اس کے حوالے کر دیا (ٹیلی گراف، کلکتہ، ۳ اگست ۱۹۸۷، صفحہ ۳)

موجودہ دنیا میں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص غلط جواب دے کر بھی اول انعام پالے۔ مگر آخرت میں ایسا ہونا ممکن نہ ہوگا۔ آخرت کی دنیا میں صرف اس شخص کو اول انعام ملے گا جس نے واقعۃً صحیح جواب دیا ہو۔ غلط جواب دینے والے کے لیے آخرت کی دنیا میں کچھ نہیں۔

ایک جائزہ

لارڈ بنٹنک (Lord Bentick) نے ۱۸۲۹ میں ستی (خود سوزی) کو خلاف قانون قرار دیا تھا۔ مگر ۴ ستمبر ۱۹۸۷ کو دیورالا (سیکر، راجستھان) میں ۱۸ سالہ بیوہ روپ کنور کی ستی نے بتایا کہ یہ رسم ابھی ہندستان سے ختم نہیں ہوئی۔ اس واقعہ نے ملک کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا ہے اور سنجیدہ لوگوں نے اس کی سخت مذمت کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس غیر انسانی رسم کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

تاہم ایک بات بہت عجیب ہے۔ کچھ لوگوں نے ستی کی رسم کی مذمت کرتے ہوئے غیر ضروری طور پر اس کے ساتھ اسلام کو بھی بریکٹ کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مسٹر آئی کے گجرال (سابق وزیر اطلاعات ونشریات) کا ایک آرٹیکل ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ آرٹیکل اخبار ٹیلی گراف (۲۰ اکتوبر ۱۹۸۷) میں چھپا ہے اور اس کا عنوان یہ ہے:

Widow-burning a national disgrace

مسٹر گجرال نے ستی پر اظہار خیال کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ بیوہ کو جلانے کا بے ہودہ عمل جس کو پر لطف طور پر ستی کہا جاتا ہے، راجستھان کے ایک دور دراز گاؤں میں پیش آیا۔ اس واقعہ نے ظاہر کیا ہے کہ قرون وسطی کی وحشیانہ رسم ہمارے ملک میں آج بھی زندہ ہے۔ مسٹر گجرال نے ستی کے احیاء کی شدید مذمت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کو ہمیں جرأت مندانہ طور پر ختم کر دینا چاہیے، قبل اس کے کہ فنڈمنٹلزم کوئی متشددانہ رخ اختیار کر لے۔

یہاں تک مسٹر گجرال بالکل صحیح راستہ پر نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا قلم غلط پٹری پر چلا جاتا ہے جب کہ وہ غیر ضروری طور پر "ہندو فنڈمنٹلزم" کے ساتھ "مسلم فنڈمنٹلزم" کو بریکٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے فنڈمنٹلزم کی اصطلاح پسند نہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک متعصبانہ اصطلاح ہے نہ کہ حقیقۃً علمی اصطلاح۔ تاہم اس لفظی بحث کو نظر انداز کرتے ہوئے میں اصل مسئلہ کے بارے میں کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

مسٹر گجرال کے آرٹیکل کے جس پیراگراف پر اس وقت مجھے اظہار خیال کرنا ہے، اس

کے الفاظ یہ ہیں :

The Muslim fundamentalists had succeeded in browbeating the leadership to get a law enacted that gave them the traditional rights "to maltreat female divorcees of their community".

مسلم بنیاد پرست اس میں کامیاب ہوگیے کہ وہ ہمارے لیڈروں کو دھمکا کر ایک قانون بنوا لیں جس کے تحت انھیں یہ روایتی حق مل جائے کہ وہ اپنے فرقہ کی مطلقہ عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کر سکیں۔

مسٹر گجرال نے یہاں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں بھی "ستی" جیسی غیر معقول تعلیمات موجود ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ خود انتہائی غیر معقول بات ہے کہ اسلام کے بارے میں اس قسم کا بے ثبوت ریمارک دیا جائے۔

مسٹر گجرال نے جس قانون کا حوالہ دیا ہے، اس سے ان کی مراد مطلقہ مسلم خواتین سے متعلق قانون The Muslim Women (Protection of Rights on Divorce) Bill 1986 ہے۔ مگر اس قانون کی کسی بھی دفعہ میں وہ بات نہیں جس کو فاضل مضمون نگار نے وادین کے ساتھ درج کرنا پسند کیا ہے۔ یعنی مسلم مطلقہ خواتین کے ساتھ بدسلوکی۔

مذکورہ قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک مسلم عورت کو طلاق ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد سے دوسرا نکاح ہونے تک اس کے ماہانہ خرچ کی ذمہ داری، عام حالات میں اس کے سابق شوہر پر نہ ہوگی۔ بلکہ مطلقہ عورت کی وراثتی جائداد سے یا اس کے رشتہ داروں کے ذریعہ اس کے گزارہ کا انتظام کیا جائے گا۔ اور اگر بالفرض کسی واقعہ میں ایسا انتظام نہ ہو سکے تو متعلقہ ریاست کا وقف بورڈ اس کو ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ اور مجسٹریٹ بذریعہ قانون اس کا نفاذ عمل میں لائے گا۔

اس انتظام کو بدسلوکی (Maltreatment) کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو ایک زیادہ بہتر اور زیادہ معقول بندوبست ہے، نہ کہ کسی قسم کی بدسلوکی۔ کیونکہ سابق شوہر بے روزگار یا کم آمدنی والا ہو سکتا ہے، یا وہ طلاق کے بعد وفات پا سکتا ہے۔ جب کہ دوسری صورت میں یہ ضمانت ہے کہ عورت کے اخراجات کی بقدر ضرورت فراہمی آخر مدت تک جاری رہے گی۔

روپ کنور کی ستی کے بعد اس موضوع پر مختلف لوگوں نے تحقیقات کی ہیں۔ بمبئی یونین آف جرنلسٹس (BUJ) نے اس سلسلے میں ایک اسٹڈی ٹیم مقرر کی۔ یہ ٹیم تین تعلیم یافتہ ہندو خواتین پر مشتمل تھی۔ وہ اکتوبر ۱۹۸۷ میں دیورالا گئی اور تمام حالات کی تحقیق کرکے اپنی رپورٹ مرتب کی۔ اس کے بعد یو این آئی نے اس رپورٹ کو نشر کیا۔ ہندستان ٹائمس (۲۱ اکتوبر ۱۹۸۷) نے اس رپورٹ کو اپنے صفحۂ اول پر شائع کیا ہے۔ اس کے مطابق رپورٹ کا ایک حصہ یہ ہے :

> The study team found that the root cause of the sati tradition, which had claimed 38 lives since independence lay in the status of women in the Rajput society. General secretary of Mahila Congress Sudha Raina told the team that for a Rajput widow, life is as good as over. Widows are expected to sleep on the floor, abstain from eating meat, avoid using certain colours, stay away from all functions and tolerate advances from all male members of the family.
>
> *The Hindustan Times*, October 21, 1987

اسٹڈی ٹیم نے پایا کہ ستی کی روایت جو آزادی کے بعد سے ۳۸ جانیں لے چکی ہے، اس کا اصل سبب راجپوت سماج میں عورتوں کی حیثیت ہے۔ مہیلا کانگریس کی جنرل سکریٹری سودھا رائنا نے ٹیم کو بتایا کہ ایک راجپوت بیوہ کے لیے زندگی گویا ختم ہو جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بیوہ سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ زمین پر سوئے، وہ گوشت نہ کھائے۔ کچھ رنگوں کا استعمال نہ کرے۔ ہر قسم کی تقریبات سے دور رہے۔ خاندان کے ہر مرد کے اقدامات کو برداشت کرے۔

یہ ایک ہلکا سا نقشہ اس صورت حال کا ہے جو ہندو سماج میں بیوہ عورت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہندو روایات کے مطابق، بیوہ عورت کی دوسری شادی نہیں ہو سکتی۔ مزید یہ کہ وہ شادی کے بغیر رہ کر بھی ہندو سماج میں باعزت زندگی کی امید نہیں رکھتی۔ ایسی حالت میں ہندو سماج میں بیوہ ہونے کے بعد ستی ہونے کا رواج شاید اس لیے بھی پڑا کہ عورت نے اس کو نسبتاً آسان سمجھا کہ وہ تا حیات "جلنے" کی مصیبت اٹھانے کے بجائے ایک ہی دن میں جل کر ختم ہو جائے۔ مگر اسلامی روایات کے مطابق اس قسم کا کوئی بھی مسئلہ مسلم بیوہ یا مسلم مطلقہ کے لیے نہیں۔ ایسی حالت میں مسلم مطلقہ کے معاملہ کا تقابل ہندو بیوہ کی ستی سے کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

مسلمان بیوہ یا مطلقہ کے لیے دوسرے نکاح کا راستہ پوری طرح کھلا ہوا ہے۔ وہ اسلامی

قانون وراثت کے تحت خاندان کی جائداد میں حصہ دار ہے۔ وہ بیوگی یا طلاق کے بعد بھی پوری طرح باعزت زندگی گزار سکتی ہے۔ اسلامی اصول بیوہ اور غیر بیوہ یا مطلقہ اور غیر مطلقہ کے درمیان درجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں کرتا۔

ایسی حالت میں مسلم مطلقہ کے لیے سابقہ شوہر سے گزارہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ گزارہ لینے کا جو مقصد ہے وہ سابقہ شوہر سے گزارہ لیے بغیر اسے پوری طرح حاصل ہے۔ شاہ بانو بیگم کے مشہور کیس (A.I.R. 1985-S.C. 945) میں یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اس کے لیے گزارہ کا دعویٰ برائے ضرورت نہ تھا، بلکہ برائے انتقام تھا۔ ورنہ شاہ بانو کی ضرورت اس کے میکہ میں اس کے بغیر ہی بخوبی طور پر پوری ہو رہی تھی۔ (مسلم عورت کے بارے میں اسلام کے قانون کی تفصیل کے لیے دیکھئے : خاتونِ اسلام)

مسٹر گجرال نے اپنے مضمون میں نہایت نامناسب طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں بھی "ستی" جیسی ناشائستہ تعلیمات موجود ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے نزدیک "مسلم فنڈ منٹلزم" کا یہ عمل ہے کہ اس نے مسلم مطلقہ عورت کو اس کے سابقہ شوہر سے گزارہ نہ دلانے کا قانون بنوایا۔ مگر ان کا یہ حوالہ ان کی سنجیدگی کو مشتبہ کرتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے مذکورہ قانون کو اس کی اصل صورت میں بیان نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ بظاہر یہی ہے کہ قانون کو اس کی اصل صورت میں بیان کرنا ان کے مفید مطلب نہیں تھا۔ وہ ہندو فنڈ منٹلزم اور مسلم فنڈ منٹلزم دونوں کو برابر کی چیز ثابت کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ واضح ہے کہ "بیوہ کو آگ میں جلانا" اور "مطلقہ کو اس کے سابقہ شوہر سے گزارہ نہ دلانا" دونوں برابر کے واقعات نہیں ہیں۔ اس لیے مضمون نگار کو گزارہ (Maintenance) کی جگہ بدسلوکی (Maltreatment) کا لفظ لکھنا پڑا۔ تاکہ ہندو فنڈ منٹلزم اور مسلم فنڈ منٹلزم دونوں برابر کی چیز دکھائی دینے لگیں۔

اس طرح مضمون نگار نے خود ہی اسلام کی صداقت کا بالواسطہ اعتراف کرلیا۔ کسی نظریہ کی صداقت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کو اس وقت تک نشانۂ تنقید بنانا ممکن نہ ہو جب تک اس کو بگاڑ کر خود ساختہ شکل میں پیش نہ کیا جائے۔

دو طریقے

قرآن میں قیامت کے احوال کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے :

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا. وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا. رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا

(الاحزاب ۶۸-۶۶)

جس دن ان کے چہرے آگ میں اُلٹے پلٹے جائیں گے۔ وہ کہیں گے، اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ اور وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی بات مانی تو انھوں نے ہم کو راہ سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے رب، ان کو دگنا عذاب دے اور ان پر بھاری لعنت کر۔

قرآن کی ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ اور اسی کے مطابق آخرت کے انجام کے اعتبار سے ان کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک وہ گروہ جو خدا کی کتاب اور رسول کی سنت میں غور کرے اور اس میں جو رہنمائی ملے اس کو کسی تبدیلی کے بغیر اختیار کر لے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے لوگ وہ ہیں جن کے معاملات کا رُخ ان کے دنیوی لیڈروں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی رایوں سے متعین ہوتا ہے۔ اوّل الذکر لوگ ہی اللہ کی رحمت کے مستحق ہیں۔ دوسرے لوگ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔ وہ خدا کی رحمت کے مستحق نہیں قرار پا سکتے۔ خواہ وہ اپنے بڑوں کی پیروی کو خود ساختہ طور پر قرآن و حدیث کے الفاظ میں کیوں نہ بیان کرتے ہوں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس بد قسمتی سے دوسری نوعیت کے گروہ کا کیس ہے۔ آج مسلمانوں کی بھیڑ جن راستوں کی طرف چلی جا رہی ہے وہ خدا و رسول کا راستہ نہیں بلکہ ان کے نعرہ باز لیڈروں کا راستہ ہے۔ آپ ان لوگوں کو قرآن کی آیتیں سنا کر بتائیے کہ تمہارا راستہ قرآن کا راستہ نہیں۔ یہ خدا کے رسول کی سنّت کے مطابق نہیں تو وہ ہرگز آپ کی باتوں پر دھیان نہیں دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہمیں تو وہی کرنا ہے جو ہمارے بڑوں نے ہم کو بتایا ہے، ہم تمہاری دلیلوں سے اپنا راستہ بدلنے والے نہیں۔

سرّ شقائنا فینا

قرآن وحدیث میں نہایت واضح طور پر یہ بات بتائی گئی ہے کہ مسلمانوں پر جب بھی کوئی مصیبت آئے گی تو ان کی اپنی داخلی کمزوریوں کی بنا پر آئے گی۔ باہر کی کوئی طاقت انھیں کبھی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں علماء اسلام نے یہ کیا کہ جب بھی مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئی تو انھوں نے خود مسلمانوں کو یہ نصیحت کی کہ تم اپنی اندرونی خرابیوں کی اصلاح کرو، کیوں کہ اپنی اندرونی خرابیوں کی اصلاح کرکے ہی تم بیرونی خطرات سے بچ سکتے ہو۔

۱۷۳۹ میں ایرانی حکمراں نادرشاہ نے ہندستان پر حملہ کیا اور دہلی کے مسلمانوں کو لوٹا اور ان کا قتل عام کیا۔ یہ بے حد سخت لمحہ تھا۔ لوگوں نے وقت کے بزرگ حضرت مرزا مظہر جانجاناں سے اس کی شکایت کی۔ انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ نادرشاہ پر ذمہ داری ڈال کر اس کو لعنت ملامت کرنے لگیں۔ اس کے بجائے انھوں نے یہ فرمایا کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ ہماری اپنی ہی بداعمالیوں کی وجہ سے ہو رہا ہے، اس لیے سب سے زیادہ اپنے اعمال کی اصلاح کی طرف توجہ کرو۔ یہ در اصل خود ہمارے برے اعمال ہیں جنھوں نے نادر کی صورت اختیار کرلی ہے:

شامت اعمال ما صورتِ نادر گرفت

ماہنامہ الفرقان (جولائی ۱۹۸۷) میں مولانا محمد منظور نعمانی کی ایک تقریر شائع ہوئی ہے۔ بارہ صفحات کی یہ تقریر خاص اسی موضوع پر ہے۔ اس میں مولانا موصوف فرماتے ہیں:

"قرآن وحدیث کی روشنی میں یقین ہے کہ آج ہم مسلمانوں پر جو مصیبتیں جہاں بھی آرہی ہیں اور جو مظالم ہو رہے ہیں وہ سب ہماری بداعمالیوں اور نافرمانیوں کے نتائج ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: وماظلمناهم ولكن كانوا انفسهم يظلمون۔ ایک حدیث قدسی کے الفاظ ہیں: انما هي اعمالكم احصيها لكم۔ بدقسمتی سے اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جن مشکلات میں مسلمان مبتلا ہیں ان سے نجات پانے کے لیے ان کے ناخداشناس اور دین سے بے بہرہ قائد و رہنما ان قوموں کے طور طریقوں سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں جو ایمان سے محروم ہیں۔ قرآن سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرنے

کرنے کا ان کو خیال بھی نہیں آتا، خدا کے لیے اس طریقہ کو بدلیے ورنہ حالات بد سے بدتر ہوتے رہیں گے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ ہم پر ظلم نہیں ہو رہا ہے۔ ظلم ہو رہا ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ ظلم اس ظلم کے نتیجہ میں ہو رہا ہے جو ہم اپنے اوپر کر رہے ہیں۔ اگر ہم کسی اعتبار سے ظالم نہ ہوتے، صرف مظلوم ہی ہوتے تو اللہ کی مدد آچکی ہوتی اور ہم پر ظلم کرنے والوں پر اللہ کی پکڑ آگئی ہوتی۔ ایک اور ظلم ہم اپنے اوپر یہ کر رہے ہیں کہ ہم جہاں رہتے ہیں وہاں کے لوگوں کو اپنا حریف اور دشمن سمجھ کر رہتے ہیں، بجائے اس کے کہ ہم ان کو اللہ کا بندہ سمجھتے اور محبت و حکمت اور اخلاق کے ساتھ ان کو اللہ کی رحمت سے اور ہدایت سے اور جنت سے قریب کرنے کی کوشش کرتے" (صفحہ ۱۹-۲۱)

ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے ایک عربی پرچہ نکلتا ہے جس کا نام الرائد ہے۔ اس پرچہ کے شمارہ ۱-۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے: سر شقائنا فینا (ہماری بدبختی کا راز ہمارے اندر ہے) اس مضمون میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کی جڑ ان کی اپنی اخلاقی گراوٹ ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے:

ان المسلمین فقدوا سیر تهم للثانیة ---- فلو تصدیٰ ای شخص للعثور علی الرذائل الخلقیة کلها مجتمعة فی امة لوجد افراد هٰذه الامة خیر مثال لها علیٰ اختلاف الاجناس والالوان (صفحہ ۳)

اس عربی عبارت کا اردو ترجمہ خود ندوہ ہی کے دوسرے جریدہ تعمیر حیات (۲۵ اکتوبر ۱۹۸۷، صفحہ ۷) میں ان الفاظ میں چھپا ہے:

"اگر کوئی شخص تمام اخلاقی برائیوں کو یکجا طور پر دیکھنا چاہے تو اس کو سب سے واضح اور نمایاں مثال مسلمانوں ہی کی زندگی میں ملے گی۔ رنگ، نسل، زبان اور علاقہ کے لحاظ سے ان میں خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، لیکن برائیوں کے قبول کرنے میں غیر معمولی اتفاق نظر آتا ہے"

اسی بات کو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ان لفظوں میں بیان فرمایا: "مسلمانوں کی دنیوی مصائب و آفات اور عزت و دولت اور حکومت وغیرہ سے محرومی بھی ان کے برے اعمال کے نتائج اور تعلیمات قرآن و حدیث سے غفلت اور اعراض کے ثمرات ہیں" (تعمیر حیات ۲۵ اکتوبر ۸۷)

جدید امکانات

سائنسی دریافتیں اکثر اتفاقی حادثہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ سائنس کی تاریخ بتاتی ہے کہ بعض اوقات اچانک ایک دھماکہ پیش آتاہے۔ یہ دھماکہ بظاہر ایک ناخوش گوار حادثہ ہوتا ہے۔ مگر اس ناخوش گوار حادثہ میں ایک خوش گوار پہلو نکل آتاہے۔ کیوں کہ وہ قدرت کے ایک امکان کو بتاتا ہے۔ اس دھماکہ کے ذریعہ سائنس داں فطرت میں چھپی ہوئی ایک طاقت کو دریافت کرتاہے اور اس کو استعمال کرکے انسانی تمدن کو آگے لے جاتا ہے۔

کہاجاتاہے کہ انفجاری مادہ (Explosive) کی ابتدائی دریافت اسی طرح ایک حادثہ کے ذریعہ ہوئی۔ اس اتفاقی حادثہ میں اگرچہ کچھ جانی نقصان ہوا۔ مگر اسی حادثہ کے ذریعہ انسان نے اس عظیم طاقت کو دریافت کیا جس نے سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا۔

قرآن پر پابندی لگانے کی ناکام کوشش

ایسا ہی ایک واقعہ مئی ۱۹۸۵ میں ہندستان میں ہوا۔ سائنسی اعتبار سے نہیں بلکہ مذہبی اعتبار سے۔ یہ واقعہ کلکتہ ہائی کورٹ کا وہ مقدمہ تھا جس کے ذریعے قرآن کی اشاعت کو اس ملک میں قانونی طور پر بند کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ بظاہر یہ ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا۔ مگر اس ناپسندیدہ واقعہ سے ایک عظیم الشان بھلائی نکل آئی۔ اس نے واقعاتی طور پر بتایاکہ موجودہ زمانہ میں کس طرح اسلامی دعوت کے نئے امکانات کھل گیے ہیں۔ یہ واقعہ گویا اس تاریخی حقیقت کا عملی اعلان تھا کہ دنیا اب مذہبی پابندی کے دور سے گزر کر مذہبی آزادی کے دور میں داخل ہوگئی ہے۔

یہ ایک بے حد اہم واقعہ ہے۔ اس کی غیر معمولی اہمیت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ جدید ہندستان کے اس واقعہ کو قدیم عرب کے اسی قسم کے واقعہ سے ملا کر دیکھا جائے اور دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

قدیم مکہ اور جدید ہندستان

آپ جانتے ہیں کہ قدیم مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کے سامنے قرآن پیش کیا تو وہ اس کے سخت مخالف ہو گئے۔ انہوں نے چاہا کہ آپ قرآن کی تبلیغ چھوڑ دیں۔ سیرت ابن ہشام میں اس زمانہ کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اسلام قبول کیا۔ ان کو شوق ہوا کہ وہ قرآن کا پیغام لوگوں تک پہونچائیں۔ وہ کعبہ گئے اور وہاں مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر سورہ رحمٰن بلند آواز سے پڑھنے لگے۔ یہ سن کر مکہ کے مشرکین دوڑے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ پڑھنے والا قرآن کی آیتیں پڑھ رہا ہے تو وہ سخت غصہ ہو گئے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے چہرے پر مارنا شروع کر دیا (فجعلوا یضربون فی وجہہٖ جزء اول صفحہ ۲۳۶) حضرت عبداللہ بن مسعود اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور اس پر مار کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔

اس طرح کے واقعات قدیم مکہ میں روزانہ پیش آتے تھے۔ قرآن کی تعلیمات ان کے مزاج کے سراسر خلاف تھیں۔ اس لیے وہ اس کے سخت دشمن بن گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ مکہ چھوڑ دیں اور مکہ سے باہر چلے جائیں۔

قدیم مکہ میں پیغمبر اسلام کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کو اگر آج کل کی زبان میں کہا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ "مکہ کے مشرک سرداروں نے قرآن کی اشاعت پر پابندی لگا دی" قدیم مکہ میں اگر کوئی اخبار ہوتا تو وہ اس واقعہ کی سرخی انہیں الفاظ میں قائم کرتا۔ پابندی لگانے کی یہ اسکیم پوری طرح عمل میں آئی۔ وہ اس حد تک موثر ثابت ہوئی کہ پیغمبر اسلام کو قرآن سمیت مکہ چھوڑ دینا پڑا۔ اس کے بعد آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ چلے گئے۔ مکہ کو قرآن سے خالی کر دیا گیا۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ اس واقعہ کے چودہ سو سال بعد ۱۹۸۵ میں ہندستان میں اسی نوعیت کا مگر اس سے بالکل مختلف واقعہ پیش آتا ہے۔ حیدر آباد کے ایک شخص چاند مل چوپڑا

نے کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن کے خلاف ایک رٹ پٹیشن داخل کیا۔ اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ قرآن تشدد کی تعلیم دیتا ہے، اس لیے اس کی اشاعت اور تقسیم کو قانونی طور پر ممنوع قرار دے دیا جائے۔

کلکتہ ہائی کورٹ کی خاتون جج پدما خستگیر نے ۱۸ اپریل ۱۹۸۵ کو یہ پٹیشن سماعت کے لیے منظور کرلیا۔ مگر اس کے فوراً بعد اس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ مغربی بنگال کی ریاستی حکومت اور ملک کی مرکزی حکومت، دونوں نے قرآن پر پابندی لگانے کی کوشش کے خلاف سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ مرکزی وزیر قانون مسٹر اشوک سین فوراً سفر کرکے دہلی سے کلکتہ پہونچے۔ اٹارنی جنرل مسٹر پارسس رام اور مغربی بنگال کے ایڈوکیٹ جنرل مسٹر ایس کے اچاریہ نے اس کے خلاف عدالت میں زبردست وکالت کی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جسٹس پدما خستگیر نے خاموشی سے اس کیس کو اپنے زیر سماعت مقدمات کی فہرست سے خارج کردیا۔ اس کے بعد کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی ہدایت کے تحت مسٹر جسٹس بی سی باسک (B.C. Basak) نے اس مقدمہ کی سماعت کی۔ انہوں نے ۱۳ مئی کو پہلی ہی پیشی میں اپنا ابتدائی فیصلہ دے دیا۔ اس کے بعد ۱۷ مئی کو آخری فیصلہ دیتے ہوئے پٹیشن کو قطعی خارج کردیا۔ فاضل جج نے اپنے فیصلے میں لکھا:

Courts cannot sit in judgment on holy books like the Koran

عدالتوں کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ قرآن جیسی مقدس کتابوں کے بارے میں فیصلہ کرنے بیٹھیں۔

(ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، ۱۸ مئی ۱۹۸۵)

فاضل جج نے اپنے ۱۸ صفحات کے فیصلے میں مزید لکھا:

Banning of the Koran would amount to abolition of the Muslim religion itself, as it could not exist without the Koran. Such action is unthinkable. Further, it would take away the secularity of India and violate Article 25 of the constitution which guarantees all people freedom of conscience and right to profess, practise and to propagate religion.

The Times of India (New Delhi) May 18, 1985

قرآن پر پابندی لگانا خود مسلمانوں کے مذہب کو ختم کرنے کے ہم معنیٰ ہوگا۔ کیوں کہ قرآن کے بغیر

اس کا وجود ممکن نہیں۔ اس طرح کی کارروائی ناقابل قیاس ہے۔ مزید یہ کہ یہ ہندستان کے سیکولرزم کو ختم کرے گا اور دستور کی دفعہ ۲۵ کے خلاف ہوگا۔ جو کہ تمام باشندوں کو ضمیر کی آزادی کی ضمانت دیتی ہے اور عقیدہ اور عمل اور مذہبی تبلیغ کا آزادانہ حق تسلیم کرتی ہے۔

زمانہ کا فرق

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قدیم مکہ اور جدید ہندستان میں یہ فرق کیوں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ قدیم مکہ کے لوگوں نے قرآن پر پابندی لگانا چاہا اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوگیے۔ اس کے برعکس جدید ہندستان میں کچھ افراد کی طرف سے قرآن پر پابندی لگانے کی کوشش کی گئی۔ مگر خود حکومت اور عدالت نے پابندی لگانے کے اس منصوبہ کی شدید مخالفت کی اور آخر کار اس کو مکمل طور پر رد کر دیا گیا۔

اس فرق کی وجہ زمانہ کا فرق ہے۔ قدیم زمانہ مذہبی تشدد کا زمانہ تھا۔ موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں دوسرے مذہب کو برداشت نہیں کیا گیا۔ اور موجودہ زمانہ میں ہر مذہب کے لیے آزادی کا حق تسلیم کیا جا رہا ہے۔

قدیم رواج کے مطابق یہ بالکل جائز فعل تھا کہ ایک شخص اگر قومی مذہب کے سوا کوئی اور مذہب اختیار کرے تو اس پر روک لگائی جائے۔ اس پر سختیاں کی جائیں۔ حتیٰ کہ اس کو مار ڈالا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ میں جو فکری اور علمی انقلاب ہوا ہے، اس نے انفرادی آزادی کو آخری حد تک مقدس قرار دے دیا ہے۔ اب ہر شخص کے لیے یہ حق بلا شرط تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ آزاد ہے کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے، جس مذہب پر چاہے عمل کرے اور جس مذہب کو چاہے پُر امن طور پر اس کی تبلیغ کرے۔ یہ موجودہ زمانہ میں ہر آدمی کا ایک مسلمہ حق ہے۔

مذہبی تشدد کے دور میں قرآن پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ مگر مذہبی آزادی کے دور میں اس پر پابندی لگانے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ واقعہ دونوں زمانوں کے فرق کی ایک واضح مثال ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج دنیا کے حالات اس سے بالکل مختلف ہیں جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے قدیم مکہ میں پائے جاتے تھے۔

دور جدید کی اس تبدیلی کو سمجھنے کے لیے یہاں ہم ایک اور واقعہ کا حوالہ دیں گے۔ اس

کا تعلق اسپین سے ہے۔ یہ واقعہ بھی اسی سال پیش آیا۔ یعنی ۱۹۸۵ کے آغاز میں۔ یہ واقعہ عربی مجلہ
ربی ، میں تفصیل کے ساتھ باتصویر انداز میں شائع کیا گیا ہے۔

اسپین کی مثال

" العربي ، عربی زبان کا ایک مشہور ادبی اور ثقافی ماہنامہ ہے۔ وہ کویت کی وزارۃ الاعلام
ینے سے شایع ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت رمضان ۱۴۰۵ھ (جون ۱۹۸۵ء) میں ایک مضمون چھپا
بس کا عنوان ہے :

عبد الرحمٰن الداخل یعود الی الاندلس

رحمٰن الداخل اسپین میں واپس آتا ہے) یہ ڈاکٹر عفیف بھنسی کا مضمون ہے۔ وہ ایک
ں تقریب میں شرکت کے لیے اسپین گئے تھے۔ واپس آکر انہوں نے یہ مفصل مضمون شایع
ہے۔

عبدالرحمٰن الداخل اُموی خاندان کا ایک شاہزادہ تھا۔ وہ ۱۱۳ھ (۷۳۲ء) میں پیدا ہوا۔
عمر بیس سال کی تھی کہ عباسیوں نے دمشق کی اُموی خلافت پر غلبہ حاصل کر لیا۔ یہ واقعہ ۷۵۰ء
ا۔ اس کے بعد وہ بنو امیہ کے افراد کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنے لگے۔ نوجوان عبدالرحمٰن نے
کر دریائے فرات کے کنارے ایک باغ میں پناہ لی۔ عباسیوں کے سپاہی وہاں بھی پہونچ گیے۔
ن فرات میں کود گیا اور تیر کر دریا کے دوسری طرف نکل گیا۔

اس کے بعد وہ بھیس بدل کر سفر کرتا رہا۔ وہ دمشق سے فلسطین پہونچا۔ وہاں سے مصر گیا
نس پہونچا جو افریقہ کا ایک ساحلی ملک ہے۔ وہاں سے وہ ایک کشتی پر سوار ہوا اور سمندری سفر کرتے
اسپین کے اس ساحلی مقام پر اترا جس کو المونیکر (Almunecar) کہا جاتا ہے۔ دمشق سے
ل پہنچنے میں اس کو پانچ سال لگ گیے۔ وہ ۱۳۸ھ (۷۵۶ء) میں اسپین کی زمین میں
ل ہوا۔

یہی عبدالرحمٰن الداخل اموی وہ شخص ہے جس نے اسپین میں عرب سلطنت قائم کی اور یورپ
ذیب کے عہد کا آغاز کیا۔ اسپین کا فاتح طارق ابن زیاد ہے مگر اسپین میں باقاعدہ مسلم
ت قائم کرنے والا عبدالرحمٰن الداخل ہی تھا۔

اسپین میں مسلمانوں نے ۸ سو سال تک حکومت کی۔ پھر ان کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھاکر عیسائیوں نے ان کو مغلوب کر لیا۔ اس کے بعد عیسائیوں نے ایک ایک مسلمان کو یا تو قتل کر دیا یا اسپین سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اسپین سے ہر مسلم نشان کو بالکل مٹا دیا گیا۔

۱۹۸۵ میں عبدالرحمٰن الداخل کی وفات کو بارہ سو سال پورے ہوئے ہیں۔ اس مناسبت سے اس سال المونیکر (اسپین) میں اس عرب حکمراں کی ۱۲۰۰ سو سالہ برسی منائی گئی۔ یہ مقام سمندر کے کنارے غرناطہ سے قریب ہے۔ غرناطہ اسپین کی آخری مسلم سلطنت کی راجدھانی تھا۔ اس تاریخی تقریب میں اسپین کے ممتاز افراد اور عرب کے علماء اور سفراء شریک ہوئے۔ اس کی صدارت اسپین کی ملکہ صوفیا نے کی۔ عبدالرحمٰن الداخل نے اسپین میں ۳۲ سال تک حکومت کی۔ اور پھر اسی ملک میں اس کا انتقال ہوا۔

اس تقریب کے موقع پر جو مختلف کارروائیاں ہوئیں ان میں سے ایک کارروائی یہ تھی کہ عبدالرحمٰن الداخل کا ایک بہت بڑا اسٹیچو تیار کیا گیا اور اس کو المونیکر میں سمندر کے کنارے ایک پر فضا مقام پر لگایا گیا۔ اس اسٹیچو کا فوٹو ماہنامہ العربي (جون ۱۹۸۵) میں شائع ہوا ہے۔ اسٹیچو میں عبدالرحمٰن الداخل اپنے داہنے ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے کھڑا ہے اور پُر اعتماد چہرے کے ساتھ اسپین کی سرزمین کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اسٹیچو کے نیچے العربی نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

تمثال عبد الرحمٰن الداخل في المنكب من الخلف

یعنی المونیکر میں عبدالرحمٰن الداخل کے اسٹیچو کی تصویر پیچھے کی طرف سے۔

اسپین میں مسلمانوں کی حکومت آخری طور پر ۱۴۹۲ء (۸۹۷ھ) میں ختم ہوئی۔ اس کے بعد وہاں کی عیسائی حکومت نے مسلمانوں پر سخت ترین مظالم شروع کیے۔ مسلمان یا تو اسپین سے بھاگ گئے یا انہیں قتل کر دیا گیا۔ ۸۰۰ سو سالہ حکومت کے بعد اسپین سے ایک ایک مسلمان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے اسپین سب سے بڑا مسلم دشمن ملک بنا ہوا تھا۔

اب اسی ملک میں ۱۹۸۵ میں یہ واقعہ ہوتا ہے کہ وہاں قدیم مسلم فاتح کی یاد منائی جاتی ہے۔ اور اس کی مستقل یادگاریں قائم کی جاتی ہیں۔ ایسا ہونا ایک بے حد غیر معمولی بات ہے۔ یہاں گویا ایک ختم شدہ تاریخ پھر سے اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ تاریخ کے مٹے ہوئے صفحات دوبارہ انہیں

لوگوں کے ہاتھوں سے لکھے جا رہے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے ان کو بھلا دیا تھا

عقلی اور تاریخی نقطۂ نظر

ایسا کیوں کر ممکن ہوا ۔ اس کی وجہ جدید انقلاب ہے ۔ جدید ذہنی انقلاب نے قدیم طرز کے تعصب کا خاتمہ کر دیا ہے ۔ جدید ذہن کے تحت وہ ماضی دوبارہ دلچسپی کا موضوع بن گیا ہے جو اس سے پہلے صرف نفرت اور فراموشی کا موضوع بنا ہوا تھا ۔ متعصبانہ طرز فکر نے جس چیز کو رد کر دیا تھا تاریخی طرز فکر نے اس کو قبول کر لیا ۔ العربی کے مضمون نگار نے لکھا ہے :

ونظرا لاهمية عبد الرحمٰن وعهد الخلافة فی تاریخ حضارة الاندلس رای المسئولون فی الاندلس الیوم انه من الاهمية توضيح اعمال و شخصية هذ الحاكم الاموی الشجاع والعظيم (صفحہ ۱۶۶)

اسپین کے تمدن کی تاریخ میں عبدالرحمٰن اور عہد خلافت کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے وہاں کے موجودہ ذمہ داروں نے محسوس کیا کہ یہ ایک اہم ضرورت ہے کہ بنو امیہ کے اس بہادر اور عظیم حکمراں کی شخصیت اور اس کے کارناموں کو نمایاں کیا جائے ۔

موجودہ زمانہ میں عقلیت کا غلبہ ہے ۔ آج کا انسان ہر معاملہ میں عقلی نقطۂ نظر (Rational approach) کو پسند کرتا ہے ۔ اس نقطۂ نظر نے جدید انسان کے تمام معاملات پر گہرا اثر ڈالا ہے ۔ اسی میں سے وہ تبدیلی بھی ہے جس کی ایک مثال ہندستان اور اسپین کے ان واقعات میں نظر آتی ہے جن کو ابھی ہم نے بیان کیا ۔

جدید انسان پر جب عقلی نقطۂ نظر کا غلبہ ہوا تو اس کو یہ بات بالکل بے معنی معلوم ہوئی کہ اسپین کی مسلم حکومت کے آٹھ سو سال جو ایک تاریخی حقیقت ہیں ان کو نظر انداز کیا جائے ۔ مزید یہ کہ یہ آٹھ سو سالہ دور محض حکمرانی کا دور نہ تھا بلکہ وہ ایک شاندار تہذیب کا دور تھا ۔ حتیٰ کہ اس دور میں پیدا ہونے والی تہذیب ہی بالآخر یورپ کی جدید تہذیب کی بنیاد بنی ۔ اسپین کی جدید نسل پر جب عقلی طرز فکر کا غلبہ ہوا تو انہوں نے محسوس کیا کہ مسلم تاریخ کو نظر انداز کر کے وہ خود اپنی تاریخ کے ایک اہم باب کو نظر انداز کر رہے ہیں ۔ غیر عقلی نقطۂ نظر نے جس واقعہ کو نفرت کے خانہ میں ڈال رکھا تھا ۔ عقلی نقطۂ نظر نے اس واقعہ کو دلچسپی کے خانہ میں ڈال دیا

پہلے جو چیز صرف غیر کی نظر آتی تھی وہ اب خود اپنی چیز نظر آنے لگی۔

یہی معاملہ ہندستان کا بھی ہے۔ ہندستان میں بعض انتہا پسند لوگ ایسے موجود ہیں جو اپنے متعصبانہ ذہن کی وجہ سے قرآن پر پابندی لگا دینا چاہتے ہیں۔ مگر یہاں کا جو تعلیم یافتہ طبقہ ہے، جو ملک کو ترقی کی طرف لے جانا چاہتا ہے، وہ جانتا ہے کہ قرآن پر پابندی لگانا ساری دنیا میں اپنے کو فکری اچھوت بنا لینے کے ہم معنیٰ ہوگا۔ کیوں کہ آج کا تعقل پسند انسان آزادی خیال کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہے۔ عقیدہ اور مذہب کی آزادی آج کی دنیا کا ایک تسلیم شدہ اصول ہے۔ عالمی فکر کا یہی دباؤ ہے جس کی وجہ سے ہندستان کی عدالت اور حکومت نے قرآن پر پابندی لگانے کی تحریک کو خود ہی کچل دیا۔

آج کی ضرورت

اس قسم کے واقعات جو آج کی دنیا میں پیش آرہے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ آج ہمارے لیے اسلامی دعوت کے نئے امکانات کھل گئے ہیں۔ آج اس کا امکان پیدا ہوگیا ہے کہ کسی روک ٹوک کے بغیر کھلی فضا میں خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک پہونچایا جا سکے۔ دور قدیم کے داعیوں نے جو کام مذہبی پابندی کے ماحول میں انجام دیا تھا وہ کام آج مذہبی آزادی کے ماحول میں انجام دیا جا سکتا ہے۔ جس دعوتی کام کو انہوں نے متعصبانہ رکاوٹوں کے درمیان انجام دیا تھا، اس کو آج رواداری اور غیر جانب داری کی فضا میں انجام دیا جا سکتا ہے۔ جس کام کو انہوں نے ہٹ دھرمی کے حالات میں انجام دیا تھا اس کو آج معقولیت پسندی کے حالات میں انجام دیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے فکری انقلاب نے اسلامی دعوت کے لیے بالکل نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ اب دعوت کے لیے ایسے موافق امکانات پیدا ہوگئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی دنیا میں موجود نہ تھے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ہم ان امکانات کو جانیں اور انہیں ہوش مندی کے ساتھ اسلامی دعوت کے لیے استعمال کریں۔

موجودہ زمانے میں کسی فکر کی تبلیغ و اشاعت کے لیے جو نئے مواقع کھلے ہیں ان پر سب سے زیادہ حق خدا کے دین کا ہے اور ان کو سب سے زیادہ خدا کے دین کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔

مسلمانوں کی ذمہ داری

مسلمان ختم نبوت کے بعد مقام نبوت پر ہیں۔ ان کی یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے پیغام رحمت کو دنیا کی تمام قوموں تک پہنچائیں۔ ایک طرف یہ حقیقت ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے حالات اور دنیا کے حالات کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے دوسرے تمام دروازے عملاً مسلمانوں کے لیے بند کرکے صرف ایک دروازہ ان کے لیے کھلا رکھا ہے۔ اور وہ دعوت الی اللہ کا راستہ ہے۔

مسلمان پچھلے سو سال سے ساری دنیا میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ مگر ان کی جدوجہد صرف لاحاصل انجام پر ختم ہو رہی ہے۔ بعض ملکوں میں وہ قومی جدوجہد کر رہے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھیں داخلوں اور ملازمتوں اور ممبریوں میں رزرویشن دیا جائے۔ مگر اس جدوجہد سے اب تک بے فائدہ احتجاج کے سوا اور کچھ ان کے حصہ میں نہیں آیا ہے۔ بعض ملکوں میں وہ سیاسی جدوجہد کر رہے ہیں۔ یعنی اسلام کو سیاسی نظام کی حیثیت سے قائم کرنا۔ مگر یہاں بھی پُرشور کوششوں کے باوجود بے فائدہ اکھیڑ پچھاڑ کے سوا اور کچھ انہیں حاصل نہ ہو سکا۔ بعض ملکوں میں وہ صنعت اور ٹکنالوجی کی راہ سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر یہاں بھی ایک حقیقت ان کی راہ میں حائل ہے۔ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ابھی تک انڈسٹریل ایج میں بھی داخل نہیں ہوئے اور دنیا آگے بڑھ کر سُپر انڈسٹریل ایج میں داخل ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میدان میں ان کے لیے اس کے سوا کچھ اور مقدر نہیں کہ وہ ہمیشہ دوسری قوموں کے پیچھے چلتے رہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی کا راز اقدام میں ہے نہ کہ تقلید اور احتجاج جیسی کارروائیوں میں۔ اور اللہ تعالیٰ نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو اس حال میں کر دیا ہے کہ وہ دعوت کے سوا کسی اور راہ میں حقیقی اقدام کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ گویا مسلمان آج کا فرنہ توانی ناچار مسلمان شو کی منزل میں ہیں۔ وہ یا تو دعوت کی راہ میں آگے بڑھنے کے لیے اٹھیں گے یا بے حقیقت ہو کر رہ جائیں گے۔ مزید یہ کہ موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک پورا دور پیدا کیا ہے جس نے دعوت کے بے پناہ امکانات کھول دیئے ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان کو سمجھ کر انھیں استعمال کیا جائے۔

حصہ دوم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے، یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے (فان مع العسر یسرا، ان مع العسر یسرا، الانشراح)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی مشکل صرف مشکل نہیں ہوتی۔ ہر مشکل میں ایک آسانی موجود ہوتی ہے۔ ہر ڈس ایڈوانٹج میں ایک ایڈوانٹج کا پہلو چھپا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح کانٹے کے ساتھ پھول ہوتا ہے، اسی طرح ہر ناکامی اپنے ساتھ کامیابی کا ایک نیا امکان لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی زیادہ سخت ہو جائیں اس دنیا میں آدمی کے لیے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ وہ از سر نو عمل کر کے دوبارہ اپنے حالات کو بہتر بنا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا عقل کا امتحان ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کے لیے سب سے زیادہ اہم شرط بالغ نظری ہے۔ یہاں وہ شخص یا گروہ کامیاب ہوتا ہے جو ظاہری مشکل کے اندر چھپی ہوئی آسانی کو دیکھ لے۔ جو ناموافق حالات (Disadvantage) میں موافق پہلو (Advantage) کو دریافت کر لے۔

اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ مومن کی ہوشیاری سے بچو، کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے (اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله) خدا کی نگاہ دور رس نگاہ ہے۔ وہ واقعہ کے تمام پہلوؤں کو دیکھ لیتی ہے اور جو واقعہ کے تمام پہلوؤں کو دیکھ لے اس کی طاقت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

اصل یہ ہے کہ ایک انسانی نگاہ ہوتی ہے اور ایک ربانی نگاہ۔ انسانی نگاہ محدود ہوتی ہے اور ربانی نگاہ لامحدود۔ عام انسان خدا کے فیض سے محروم ہوتا ہے اس لیے وہ کسی چیز کو صرف انسانی نگاہ سے دیکھ پاتا ہے۔ ایسا آدمی کسی واقعہ کے صرف سطحی پہلو کو دیکھتا ہے۔ اگر وہ بظاہر اپنے کو مشکل حالات میں پائے تو شکایت کا دفتر لے کر بیٹھ جائے گا۔ وہ مایوسی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ مگر مومن خدا کے فیض کو پائے ہوئے ہوتا

ہے اس لیے اس کو ربانی نگاہ حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ حقیقتوں کو بہت دور تک دیکھتا ہے۔ وہ سی چیز کے سطحی پہلو میں نہیں اٹکتا بلکہ وہ اس کو اس کی گہرائی تک جان لیتا ہے۔

قرآن کی آیت (ان مع العسر یسرا) کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مومن عسر میں سر کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ مشکل میں آسانی کا راز پالیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکایت اور احتجاج ومن کا طریقہ نہیں۔ مومن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تاریکی میں روشنی کا راز دریافت کرے اور اعتماد کے ساتھ اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے نگاہ ربانی کو کھو دیا ہے وہ چیزوں کو صرف نگاہ انسانی سے دیکھنا جانتے ہیں، وہ چیزوں کو نگاہ ربانی سے دیکھنا نہیں جانتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معاملات میں صرف عسر کے پہلو کو دیکھتے ہیں، وہ اپنے معاملات میں یسر کے پہلو کو نہیں دیکھ پاتے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا شکایت اور احتجاج میں مبتلا ہونا صرف یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اُس چیز سے محروم ہیں جس کو حدیث میں فراستِ مومن کہا گیا ہے۔

قرآن کے خلاف کلکتہ ہائی کورٹ میں جو مقدمہ دائر کیا گیا تھا اس کے بارے میں ہمارے تمام لکھنے والوں نے لکھا اور ہمارے تمام بولنے والوں نے اس پر کلام کیا۔ مگر ہر ایک کو صرف اس کا تاریک پہلو نظر آیا۔ ہر ایک اس کو ظلم اور تعصب کا واقعہ قرار دے کر اس کے خلاف چیخ پکار کرتا رہا۔ مجھے کوئی قابل ذکر مسلمان نہیں معلوم جس نے اس واقعہ میں اس کے روشن پہلو کو دیکھا ہو۔ جس نے یہ دریافت کیا ہو کہ ہائی کورٹ نے اس مقدمہ کو خارج کر کے اس حقیقت کا قانونی اعلان کیا ہے کہ اس ملک میں ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لوگوں کو اس واقعہ میں صرف مذہبی تعصب نظر آیا۔ وہ اس میں مذہبی آزادی کے پہلو کو نہ دیکھ سکے۔

یہی معاملہ اسپین کا ہے۔ اسپین میں مسلمان دوبارہ آباد ہو رہے ہیں۔ وہاں سلطان عبدالرحمٰن الداخل کو دوبارہ مقام دیا گیا ہے۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں سے کیا۔ آپ تعجب کریں گے کہ ان کا جواب یہ تھا کہ یہ عیسائیوں کی کوئی نئی سازش معلوم ہوتی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک واقعہ میں کھلا ہوا روشن پہلو ہے مگر وہ لوگوں کو نظر نہیں آتا۔

البتہ اس میں موہوم سازش کا امکان انھیں بخوبی دکھائی دے رہا ہے۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ایک قسم کے ذہنی فاقہ (Intellectual starvation) سے دوچار ہیں۔ وہ نہایت شدید قسم کے فکری افلاس میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے یہ صلاحیت کھودی ہے کہ وہ واقعات کا گہرا تجزیہ کر سکیں۔ وہ چیزوں کو اس کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے جانچ کر ان کے بارے میں صحیح فیصلہ کر سکیں۔ وہ حالات کے ظاہری طوفان کے ساتھ اس کے تہہ میں پائی جانے والی پُرسکون لہروں کو بھی دیکھ لیں اور گہری معرفت کے ساتھ اپنے سفر کی سمت متعین کریں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے جو کچھ لکھ رہے ہیں اور بول رہے ہیں وہ مشترک طور پر صرف ایک ہے۔ دوسروں کے خلاف چیخ پکار۔ مسلمانوں کے کسی بھی بیان کو دیکھئے، کسی بھی ملک میں جا کر ان سے ملاقات کیجئے۔ ان کی کسی بھی کانفرنس میں شرکت کیجئے۔ ہر جگہ ایک ہی ذہن کام کرتا ہوا نظر آئے گا۔ آج دنیا بھر کے مسلمانوں کے ذہن پر یہ چھایا ہوا ہے کہ کچھ اسلام دشمن قومیں ہیں جو ان کو ستا رہی ہیں۔ غیر قوموں کا ظلم، ان کا تعصب اور ان کی سازش یہی وہ چیزیں ہیں جن کو آج کے مسلمان جانتے ہیں۔ ان کے سوا کسی اور چیز کی انھیں خبر نہیں۔

۵۰ سال پہلے امیر شکیب ارسلان نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا لماذا تأخر المسلمون وتقدم غيرهم (مسلمان کیوں پیچھے ہوگئے اور دوسرے لوگ کیوں آگے ہوگئے) مگر اس لمبی مدت میں مسلمانوں کے قائدین اس سوال کا کوئی جواب اس کے سوا دریافت نہ کر سکے کہ وہ دوسروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار قرار دے کر ان کے خلاف شکایت اور احتجاج کرتے رہیں۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں صرف عسر کو دیکھنے کے ماہر بنے ہوئے ہیں وہ یسر کو دیکھنے کے ماہر نہ بن سکے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی بربادی کا اصل سبب ظالموں کا ظلم نہیں بلکہ خود مسلمانوں کا اپنا ذہنی افلاس ہے۔ مسلمان اپنے غلط ذہن کی وجہ سے اس قیمتی فکری غذا سے محروم ہو رہے ہیں جو ان کے چاروں طرف خدا نے ان کے لیے مہیا کر رکھی ہے۔ وہ اعلیٰ ترین مواقع کے

کنارے کھڑے ہوکر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے لیے آگے بڑھنے کا کوئی موقع نہیں ۔ وہ حالات کو دیکھ رہے ہیں مگر وہ امکانات کو نہیں دیکھتے ۔ ان کی نگاہ "کیا ہے" پر اٹکی ہوئی ہے ۔ "کیا ہو سکتا ہے" تک ان کی نگاہ ابھی نہیں پہونچی ۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصہ میں بتایا گیا ہے کہ ایک بڑے میدان میں فرعون نے مصر کے جادوگروں کو جمع کیا ۔ ان جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لکڑیاں میدان میں ڈالیں ۔ جادو کے زور سے یہ رسیاں اور لکڑیاں سانپ کی طرح میدان میں دوڑنے لگیں ۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ کے دل میں ڈر پیدا ہوا ۔ بشری تقاضے کے تحت انہیں یہ محسوس ہوا کہ سانپوں کی اس فوج کا مقابلہ وہ کس طرح کریں گے ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ ڈرومت ، تمہیں غالب رہو گے ۔ تمہارے ہاتھ میں جو عصا ہے اس کو ڈال دو ۔ یہ عصا ان کے تمام سانپوں کو نگل جائے گا ۔ کامیابی تمہارے لیے ہے نہ کہ ان کے لیے ۔ اس ہدایت کے تحت حضرت موسیٰ نے اپنا عصا زمین پر پھینکا ۔ اچانک یہ عصا تمام سانپوں سے بڑا سانپ بن گیا ۔ جب وہ میدان میں چلا تو جادوگروں کے تمام سانپ اس طرح ختم ہوگئے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا ۔
(طٰہٰ ۶۹ - ۶۶)

مسلمانوں کا حال موجودہ زمانہ میں بلاتشبیہ ایسا ہی ہو رہا ہے ۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص عصائے موسیٰ اپنے بغل میں لیے ہوئے ہو اور پھر بھی سانپوں سے ڈرتا ہو ۔ جیسے کسی کو اللہ نے معجزاتی طاقت دے رکھی ہو مگر وہ جادوگروں کے جادو اور نظر بندوں کی نظر بندی کو دیکھ کر کانپ رہا ہو ۔ جیسے خدا کا قانون پوری طرح کسی کا ساتھ دینے کے لیے موجود ہو مگر وہ انسانوں کے جھوٹے فریب کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ۔

وسیع تبدیلیاں

صلیبی جنگوں (Crusades) کے بعد یورپ کے عیسائی علماء اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ کو بگاڑ کر پیش کرتے تھے ۔ مگر سائنس کے زور سے انیسویں صدی میں ایک نیا دور شروع ہوا ۔ سائنس میں جن چیزوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان میں قطعیت (Exactness) کی بے حد اہمیت ہوتی ہے ۔ اس طرح سائنس کے اثر سے جدید قوموں میں قطعی طرزِ فکر

(Exact thinking) کو ترقی ہوئی اور حقیقت پسندی کا انداز پیدا ہوا۔

اس حقیقت پسندانہ طرز فکر کا اثر تمام شعبوں پر پڑا۔ اور اسی طرح اسلام کے مطالعہ پر بھی۔ چنانچہ اب یہ ذہن پیدا ہوا کہ اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ کو ویسا ہی لیا جائے جیسا کہ وہ ہیں۔ اس کے بعد استشراق (Orientalism) کا ایک نیا دور شروع ہوا جس میں اسلام کو زیادہ حقیقی انداز میں پیش کیا جانے لگا۔

روس اور چین میں کیمونسٹ انقلاب کے بعد ابتدائی دور میں مذہب کے خلاف سخت ردعمل پیدا ہوا تھا مگر اب وہاں بھی عالمی دباؤ کے تحت اعتدال پیدا ہو رہا ہے اور مذہب کو دوبارہ آزادی دی جا رہی ہے۔ قدیم زمانہ میں ایک مذہب کے لوگ دوسرے مذہب کے خلاف صرف مناظرہ بازی کرنا جانتے تھے۔ آج عالمی سطح پر بے شمار مشترک اجتماعات ہو رہے ہیں جن میں ہر مذہب کے لوگ اپنی تعلیمات کو پیش کرتے ہیں اور دوسرے مذہب کے لوگ اس کو سنجیدگی کے ساتھ سنتے ہیں۔ خود مجھے ایسے کئی اجتماعات میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں عربی زبان اور اسلامیات کے شعبے بہت بڑے پیمانہ پر کھولے گیے ہیں جن میں خالص علمی اور تاریخی انداز میں اسلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مغربی دنیا کے غیر مسلم طلبہ بڑی تعداد میں عربی زبان پڑھ رہے ہیں۔ وہ مغربی زبانوں میں قرآن و حدیث کے ترجمے کر رہے ہیں۔ وہ قدیم عربی کتابوں کو ایڈٹ کرکے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ وہ اسلام کے بارے میں تاریخی اور تحقیقی کتابیں لکھ رہے ہیں۔ وغیرہ

موجودہ زمانہ میں جس طرح سواری، خبر رسانی اور صنعت و زراعت میں زبردست تبدیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح افکار و خیالات کے اعتبار سے بھی آج کی دنیا میں زبردست تبدیلی ہوئی ہے۔

یہ تبدیلی عین اسلامی دعوت کے حق میں ہے۔ اس تبدیلی نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ جو کام پہلے سخت رکاوٹوں کے درمیان انجام دینا پڑتا تھا اس کو سہولتوں اور آسانیوں کے درمیان انجام دیا جائے۔ جو کام پہلے بے اعترافی کے ماحول میں کیا جاتا تھا وہ اب اعتراف کے ماحول میں کیا جائے۔ جو کام پہلے ہٹ دھرمی کی فضا میں کرنا پڑتا تھا

اس کو اب معقولیت کی فضا میں کیا جاسکے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے زبردست نئے امکانات کھل گیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے موجودہ زمانہ میں ایسے حالات پیدا کردیئے ہیں کہ کسی رکاوٹ کے بغیر اسلامی دعوت کا کام شروع کیا جاسکے۔ اور ہر قسم کے جدید وسائل کو استعمال کرتے ہوئے اس کو آخری حد تک پہونچایا جائے۔

آج ساری دنیا کے مسلمانوں کو غیر اقوام سے ظلم اور تعصب کی شکایت ہے۔ اس شکایتی ذہن کا یہ نتیجہ ہے کہ انھیں جدید دنیا کے وہ دوسرے پہلو نظر نہیں آتے جو عین انھیں حالات میں اسی دنیا کے اندر موجود ہیں اور جو ہمارے لیے زبردست امید کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انھیں مظاہر میں سے ایک بہت نمایاں مظہر یہ ہے کہ آج بھی ہر روز ہزاروں کی تعداد میں دوسری قوموں کے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ افریقہ کے صرف ایک ملک روانڈا میں پانچ سال کے اندر ۲۵ ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ فرانس میں کیتھولک عیسائیوں کے بعد اسلام دوسرا سب سے بڑا مذہب بن چکا ہے۔ برطانیہ، امریکہ، جاپان میں ہر جگہ روزانہ کثرت سے لوگوں کے اسلام قبول کرنے کی خبریں آرہی ہیں۔ دنیا کے تمام بڑے شہروں میں عالی شان اسلامی مرکز بن رہے ہیں۔ روم جو کسی وقت اسلام دشمنی کا سب سے بڑا مرکز تھا، وہاں عین شہر کے اندر بہت بڑی مسجد اور اسلامک سنٹر تعمیر کیے گیے ہیں۔ اسپین کے نومسلموں نے غرناطہ سے ایک اخبار جاری کیا ہے جس کا نام ہے: Pais Islamico

اسپین کے نومسلم ڈاکٹر عمر فاروق عبد اللہ نے ۱۹۸۴ میں حج کا فریضہ ادا کیا۔ اس موقع پر انھوں نے ایک انٹرویو (یقین انٹرنیشنل کراچی، ۲۲ مئی ۱۹۸۵) میں بتایا کہ جنرل فرانکو (۱۸۹۲ — ۱۹۷۵) کے بعد اسپین کے حالات بہت بدل گیے ہیں۔ اب غرناطہ میں بہت بڑا اسلامک سنٹر بنایا گیا ہے۔ وہاں ہر شہر میں مسلمان نظر آنے لگے ہیں۔ اس درمیان میں پانچ سو اسپینیوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسپین کے موجودہ ذمہ دار کھلے ذہن کے لوگ ہیں اور رواداری نقطۂ نظر رکھتے ہیں:

the present Spanish authorities are open-minded and tolerant in their attitude.

غرض ساری دنیا میں آج اسلام کی مسلسل اشاعت ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام آج بھی نظریاتی اعتبار سے اقدام کی پوزیشن میں ہے۔ آج جب کہ مسلمان ہر جگہ مغلوب ہو رہے ہیں، عین اسی وقت اسلام ہر جگہ دلوں پر فتح حاصل کر رہا ہے۔ مسلمان اگر اسلام کی جدید تاریخ کے اس دوسرے پہلو کو دیکھ سکیں تو وہ پائیں گے کہ جن حالات کے خلاف وہ فریاد و ماتم میں مشغول ہیں وہ حالات انہیں کرنے کا عظیم الشان پروگرام دے رہے ہیں۔

ایک بیرونی سفر کے دوران مجھے ایک جاپانی نومسلم سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے کہا کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت کے زبردست امکانات ہیں مگر اس امکان سے ابھی تک پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جاپانیوں کے سامنے تو بس سادہ طور پر ان کی اپنی زبان میں اسلام پیش کر دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ان کی اکثریت اسلام قبول کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ جاپانی لوگ تو بالقوہ مسلمان ہی ہیں:

Japanese people are potentially Muslims.

ایک انٹرنیشنل سیمینار میں میری ملاقات ایک مسلمان پروفیسر سے ہوئی جو کناڈا کی ایک یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ انھوں نے مغربی دنیا کے جدید امکانات کو بتاتے ہوئے کہا کہ کناڈا میں اسلامی دعوت کے زبردست مواقع ہیں۔ حتیٰ کہ وہاں اسلامی دعوت کا کام خود حکومت کے مالی تعاون سے اعلیٰ پیمانہ پر کیا جا سکتا ہے۔ کناڈا کی حکومت ہر پرامن اسکیم میں اپنے شہریوں کی مدد کرتی ہے۔ مزید یہ کہ وہ اس تعاون کی قیمت اس شکل میں وصول نہیں کرتی کہ وہ ہماری کارکردگی میں غیر ضروری مداخلت کرے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس امکان سے دوسرے مذاہب کے لوگ بہت بڑے پیمانہ پر فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر مسلمان ابھی تک اس سے محروم ہیں کیوں کہ مسلمانوں نے سیاسی چیخ پکار کو کام سمجھ رکھا ہے۔

صلح حدیبیہ کا پیغام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آکر مکہ چھوڑ دیا اور مدینہ

کی طرف ہجرت فرمائی۔ تاہم مکہ والوں کا غصہ ختم نہیں ہوا۔ انھوں نے اسلام کو مٹانے کے لیے اسلام کے خلاف باقاعدہ جنگ چھیڑ دی۔ اب مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان جنگ پر جنگ ہونے لگی۔ ہر طرف جنگی فضا پیدا ہو گئی۔ اس جنگی فضا کی وجہ سے اسلام کا دعوتی کام تقریباً ٹھپ ہو گیا۔

ہجرت کے چھٹے سال ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عربوں کے پاس اسلام کے لیے نفرت اور تعصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلسل جنگی حالات کے نتیجے میں اسلامی تاریخ معطل ہو کر رہ گئی۔ بظاہر اسلام کے لیے ملک میں کوئی روشن امکان نظر نہیں آتا تھا۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے خصوصی فیضان سے یہ جان لیا کہ اس ظاہر کے اندر ایک اور باطن چھپا ہوا ہے۔ اوپر کی سطح پر اگرچہ نفرت اور تشدد نظر آرہا ہے مگر نیچے کی سطح پر اسلام کے لیے انتہائی روشن امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ آپ کی ربانی بصیرت نے آپ کو یہ بتایا کہ اگر کسی طرح جنگی حالات ختم کر دیے جائیں تو اندر کی تہہ میں چھپے ہوئے امکانات ابھر آئیں گے اور اسی جغرافیہ میں اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی جہاں وہ بظاہر ختم ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے۔

حالات کے اسی مطالعہ سے وہ چیز برآمد ہوئی جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ صلح حدیبیہ حقیقۃً مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگی حالات کو ختم کرنے کے لیے یہ کیا کہ مشرکین کے ہر مطالبہ کو یک طرفہ طور پر منظور کر لیا۔ فریق ثانی جب ضد پر تُلا ہوا ہو تو فریق اوّل کے لیے نارمل حالت پیدا کرنے کی ایک ہی صورت ہوتی ہے۔ یہ کہ وہ فریق ثانی کی ضد کو یک طرفہ طور پر مان لے۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کی تاریخ دوبارہ اسی مقام پر پہونچ گئی ہے۔ جہاں وہ صلح حدیبیہ کے وقت ہجرت کے چھٹے سال پہونچی تھی۔ موجودہ زمانہ میں تقریباً پوری مسلم دنیا دوسری قوموں کے نفرت اور تشدد کا شکار ہو رہی ہے۔ مسلمان بھی اس کے خلاف ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری مسلم دنیا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان

بے فائدہ لڑائیاں جاری ہیں۔ یہ لڑائی کہیں لفظی احتجاج کی صورت میں ہے اور کہیں ہتھیاروں کے استعمال کی صورت میں۔ بظاہر آج کی دنیا میں اسلام بے جگہ ہے۔ آج کی دنیا کے پاس اسلام کے لیے نفرت اور بیزاری کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو حقیقی صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ آج بھی عین وہی صورت حال ہے جو دور اوّل میں صلح حدیبیہ کے وقت تھی۔ اس کی ایک واضح علامت کثرت سے لوگوں کا اسلام قبول کرنا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مخالف اسلام حالات کے اندر موافق اسلام حالات چھپے ہوئے ہیں۔ اصل مسئلہ صرف ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کا ہے۔ اگر ہم اس حکمت عملی کا ثبوت دے سکیں جو رسول اور اصحاب رسول نے صلح حدیبیہ کے وقت استعمال فرمائی تھی تو یقینی ہے کہ دوبارہ بہت بڑے پیمانہ پر وہی نتائج اسلام کے حق میں نکلیں گے جو دور اوّل میں صلح حدیبیہ کے بعد نکلے تھے۔

اس صورت حال کا فائدہ اٹھانے کے لیے ایک قربانی کی ضرورت ہے۔ کسی صورت حال (Situation) کو استعمال (Avail) کرنے کے لیے ہمیشہ قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج مسلمانوں کو یہی قربانی دینی ہے۔ یہ قربانی وہی ہے جو صلح حدیبیہ کے وقت رسول اور اصحاب رسول نے دی تھی۔ یعنی تمام جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کرکے معتدل فضا پیدا کرنا۔

مسلمان آج تمام دنیا میں ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی مدعو قوموں سے قومی اور مادی جنگ چھیڑے ہوئے ہیں۔ یہی جنگ دعوت کی راہ میں اصل رکاوٹ ہے۔ اس کی وجہ سے داعی اور مدعو کا رشتہ حریف اور رقیب کے رشتہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ دوسری اقوام سے اپنے تمام قومی اور سیاسی جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں تاکہ داعی اور مدعو کا رشتہ بحال ہو۔ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان وہ معتدل فضا پیدا ہو جس میں آدمی دوسرے کی بات سنتا ہے اور اس پر کھلے ذہن کے ساتھ غور کرتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ایک طرف وہ امکانات ہیں جو جدید تبدیلیوں کے نتیجے میں اسلام

کے حق میں پیدا ہوئے ہیں اور دوسری طرف کشمکش اور ٹکراؤ کی وہ فضا ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ساری دنیا میں جاری ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل کرنا ہے جو سنت چھٹی ہجری میں صلح حدیبیہ کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی۔ یعنی غیر مسلم اقوام سے کشمکش اور ٹکراؤ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دینا۔ غیر مسلم اقوام کی طرف سے ڈالی جانے والی تکلیفوں کو یک طرفہ طور پر پی جانا۔ اگر مسلمان اس قربانی کا حوصلہ کر سکیں تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کی موجودہ فضا اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد جو چیز بچے گی وہ وہی دوسری چیز ہے جس کو ہم نے اسلامی دعوت کے جدید امکانات کہا ہے۔ نفرت کی فضا ختم ہوتے ہی نیچے کی تہہ میں چھپے ہوئے امکانات سامنے آجائیں گے۔

جس دن ایسا ہوگا اسی دن اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی، ایک ایسی تاریخ جس کے لیے خدا نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ اختتام تک پہونچنے سے پہلے کہیں نہ ٹھہرے۔

نیا دور

صلح حدیبیہ دس سال کا ناجنگ معاہدہ تھا۔ صلح حدیبیہ کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار الگ رکھ دی اور اسلام کی فکری طاقت کو استعمال کیا۔ یہ انسانی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ مقابلہ کو جنگ کے میدان سے نکال کر فکر کے میدان میں لایا گیا۔ اس وقت تک انسان صرف یہ جانتا تھا کہ دو مختلف گروہوں کے درمیان فیصلہ جنگ کے میدان میں ہوتا ہے۔ مگر خدا کے رسول نے اپنے عمل سے دکھایا کہ یہ فیصلہ فکر و نظریہ کے میدان میں بھی ہوتا ہے۔ اور فکر و نظریہ کے میدان میں ہونے والا فیصلہ جنگ کے میدان میں ہونے والے فیصلہ سے زیادہ کامیاب ہے۔

صلح حدیبیہ محض ایک وقتی تدبیر نہ تھی جو قدیم زمانہ کے قبیلۂ قریش سے نمٹنے کے لیے اختیار کی گئی۔ اس کی حیثیت اس سے زیادہ ہے۔ یہ انسانی تاریخ میں ایک نیا دروازہ کھولنا تھا۔ اس کے ذریعہ آپ نے ایک طرف اسلام کی ناقابل تسخیر فکری قوت کا مظاہرہ فرمایا۔ اور دوسری طرف تاریخ میں پہلی بار ایک نئے دور کا آغاز کیا جس کی تکمیل موجودہ زمانہ میں پہونچ کر ہوئی ہے۔

قدیم زمانوں میں یہ ایک جائز بات سمجھی جاتی تھی کہ ایک حکمراں اپنی مسلح فوجوں کو لے کر دوسرے ملک میں داخل ہوجائے اور قتل وخوں ریزی کے ذریعہ اس پر قبضہ کرلے۔ یہ تمام تر ایک جدید ظاہرہ ہے کہ اس قسم کی جارحیت کو بین اقوامی جرم سمجھا جاتا ہے۔ اور بین اقوامی مسائل کو گفت وشنید کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بین اقوامی زندگی میں ہتھیار کے بجائے نظریہ کا استعمال تمام تر پیغمبر اسلام کی دین ہے۔ موجودہ زمانہ کا یہ عالمی مزاج درحقیقت اس انقلابی لہر کی تکمیل ہے جو صلح حدیبیہ کی صورت میں چودہ سو سال پہلے شروع کی گئی تھی۔ پیغمبر اسلام نے سب سے پہلے قوموں کے درمیان یہ سوچ پیدا کی۔ پھر آپ نے اس اصول پر عمل کرکے اس کو ایک زندہ واقعہ کی حیثیت دے دی۔ اس کے بعد یہ طرز فکر تاریخی لہر میں شامل ہوگیا۔ وہ برابر بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ موجودہ فکری انقلاب کی صورت میں اپنی انتہا کو پہونچ گیا۔

تاریخ کا یہ انقلاب عین ہمارے حق میں ہے "حدیبیہ" کے وقت جو موقع وقتی صلح کے ذریعہ حاصل کیا گیا تھا، اب اس نے ایک پورے دور کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس انقلاب نے ہمارے لیے ہمیشہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر یہ امکان کھول دیا ہے کہ ہم ایک موافق فضا میں اسلام کی اشاعت کا کام کریں اور اسلام کی فکری طاقت کو استعمال کرکے دوبارہ اس کو دنیا کا غالب دین بنا دیں۔

دہلی یکم ستمبر ۱۹۸۵

سچائی کو پانے والا

معانی کی دنیا خدا کے جلووں کی دنیا ہے۔ کون ہے جو خدا کے جلووں کو انسانی زبان میں بیان کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم جب کسی معنی کو بیان کرتے ہیں تو ہم اس کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو کچھ گھٹا دیتے ہیں۔ اس کے اوپر ایک لفظی پردہ ڈال دیتے ہیں۔

کسی بامعنی حقیقت کو کوئی شخص محض اس کے الفاظ سے سمجھ نہیں سکتا۔ ایک اندھا شخص کسی کے بتانے سے یہ نہیں جان سکتا کہ پھول کیا ہے۔ اسی طرح ایک شخص جس نے معنوی حقائق کو دیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ جگائی ہو وہ معنوی حقائق سے باخبر نہیں ہو سکتا۔ خواہ ڈکشنری کے تمام الفاظ اس کے سامنے دہرا دیئے جائیں، خواہ قاموس المعانی کی تمام جلدوں کو اسے پڑھا دیا جائے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس کتاب سے ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اپنے اندر تقویٰ کی صفت رکھتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچائی اس کو ملتی ہے جس کے دل میں سچائی کی کھٹک موجود ہو۔ جو شخص سچائی کی تلاش میں ہو، سچائی جس کی ضرورت بن گئی ہو، جو سچائی کو پانے کے لئے اتنا بے قرار ہو کہ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہو اور اسی کی یاد لے کر جاگتا ہو، جو آدمی اس طرح سچائی کا طالب ہو، قرآن اسی کے لئے ہدایت بنتا ہے۔

ایسا شخص گویا ہدایت کا نصف راستہ طے کر چکا ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے عہد الست کی خدائی آوازوں کو سن رہا ہے۔ وہ اپنے اندر اس صلاحیت کو بیدار کر چکا ہے جو معانی زبان کو سمجھتی ہے۔ ایسا شخص مادی دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے عالم حقائق سے اتنا قریب آجاتا ہے کہ وہ فرشتوں کی سرگوشیوں کو سننے لگتا ہے۔

نبوت کا علم ملنے سے پہلے یہ تمام تجربات آدمی کے اندر مبہم اور مجہول انداز میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب قرآن کی آواز اس کے اندر داخل ہوتی ہے تو وہ اس کی کتاب فطرت کی تفسیر بن جاتی ہے وہ اپنے اندر چھپے ہوئے غیر ملفوظ اشارات کو ملفوظ زبان میں پا لیتا ہے۔ اب قرآن اور قرآن کو پڑھنے والا دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ بن جاتے ہیں۔ قرآن وہ بن جاتا ہے اور وہ قرآن۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۴۵

۱۔ امریکی اخبار نیویارک سٹی ٹریبیون (New York City Tribune) کے نمائندہ مسٹر کٹل (Robert S. Kittel) ۱۲ اگست ۱۹۸۷ کو مرکز میں آئے اور اپنے اخبار کے لیے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو نیویارک سٹی ٹریبیون (۱۷ اگست ۱۹۸۷) میں چھپا ہے۔ ہندستان کی ۴۰ سالہ برسی کے موقع پر مذکورہ اخبار نے ہندستان سے متعلق ایک خصوصی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں ہندو نقطۂ نظر، عیسائی نقطۂ نظر، مسلم نقطۂ نظر، سکھ نقطۂ نظر اور بدھسٹ نقطۂ نظر کے تحت ہر فرقہ کے ایک نمایاں شخص کا انٹرویو شامل ہے۔ مسلم نقطۂ نظر کے بارے میں اخبار نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو شائع کیا ہے۔ مسٹر کٹل نے صدر اسلامی مرکز کے نام اپنے خط مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۸۷ میں لکھا ہے کہ آپ کی شرکت کے بغیر یقیناً ہماری یہ اشاعت نامکمل رہتی:

It certainly would have been incomplete
without your contribution.

۲۔ مشہور انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۵ ستمبر ۱۹۸۷) نے صدر اسلامی مرکز کا ایک مفصل مضمون نمایاں طور شائع کیا ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے خبروں کے بلیٹن کے ساتھ بھی نشر کیا گیا۔

۳۔ آل انڈیا ریڈیو (اکسٹرنل سروس) نے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ۷ ستمبر ۱۹۸۷ کو ریکارڈ کیا۔ اس انٹرویو کا موضوع ہندستانی مسلمان تھا۔ یہ انٹرویو آدھ گھنٹہ جاری رہا۔ وہ اولاً ۱۸ ستمبر اور دوسری بار ۲۴ ستمبر ۱۹۸۷ کو نشر کیا گیا۔

۴۔ نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام صاحب (مقیم اٹلی) الرسالہ کے باقاعدہ قاری ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں الرسالہ کے بلند معیار کا اعتراف کیا ہے۔ اپنے خط مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۷ کے ساتھ انھوں نے امریکہ کے دو پتے اور انگلینڈ کے دو پتے روانہ کیے ہیں اور اپنی طرف سے زر تعاون ادا کرکے ان کو الرسالہ انگریزی جاری کروایا ہے۔ یہ چاروں حضرات اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

۵۔ الرسالہ انگریزی کن حلقوں میں پھیل رہا ہے اور وہ کس قسم کے تاثرات پیدا کر رہا ہے، اس کو جاننے کے لیے یہاں ایک خط (۱۴ اکتوبر ۱۹۸۷) نقل کیا جاتا ہے:

Just today we received the September and October 87 copies of Al-Risala. I keep eagerly áwaiting for the ensuing editions every time — so wonderful they are. Every page breathes of the universality, catholicity, breadth and wisdom of the Editor and the authors. Please accept our hearty congratulations for this noble attempt at a time when man hates man in the name of religion and builds narrow walls of communalism around himself. Please continue to send the copies regularly. We wish to preserve them for the reading public (14.10.1987)

Swami Abhiramananda, Sir Ramakrishna Ashrama
Bull Temple Road, Bangalore 560 019

۶۔ فرینک فرٹ جرمنی میں کتابوں کی ایک عالمی نمائش ۷۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۷ کو ہوئی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں ہندستانی پویلین پر بطور نمائش رکھی گئیں۔

۷۔ شری ستیہ سائیں سیوا آرگنائزیشن (ریلوے کالونی کشن گنج، دہلی) کی طرف سے ۳ اکتوبر ۱۹۸۷ کو ایک اجتماع تھا۔ ہندو عورتیں اور مرد اس میں شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز کو اس موقع پر شرکت کی دعوت دی گئی۔ وہ اس میں شریک ہوئے اور "اسلامی تعلیمات" کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ لوگوں نے تقریر کو پسند کیا اور مزید سننے کی خواہش ظاہر کی۔

۸۔ بہوجن سماج پارٹی کی طرف سے ۲۷ ستمبر ۱۹۸۷ کو کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس سمینار کا موضوع ہندستان کی مذہبی اقلیتوں کے مسائل پر غور کرنا تھا۔ منتظمین سمینار کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس سمینار میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان اس ملک میں ایک قسم کا پروٹسٹنٹ گروپ بن کر رہ گیے ہیں۔ یہ ان کے مسئلہ کا حل نہیں۔ ان کے مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ وہ اس ملک میں کری ایٹو گروپ بنیں۔ یہی ان کے مسئلہ کا واحد حل ہے۔

۹۔ گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ۲ اکتوبر ۱۹۸۷ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ

مسلمان شریک ہوئے ۔ صدر اسلامی مرکز نے قرآن و حدیث کی روشنی میں بتایا کہ اسلام کیا ہے اور موجودہ حالت میں احیاء ملت کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے ۔

۱۰۔ مجلہ البلاغ (کویت) کے نمائندہ محمد یاسر القضمانی نے ۸ اکتوبر ۱۹۸۷ کو صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی اور البلاغ کے لیے ان کا انٹرویو لیا ۔ یہ انٹرویو ڈیڑھ درجن سوالات اور جوابات پر مشتمل تھا ۔ سوالات ذاتی نوعیت کی باتوں سے لے کر علمی اور ملی مسائل تک پھیلے ہوئے تھے ۔ دوران گفتگو انھوں نے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ اسلامی مرکز کی مطبوعات کو جلد سے جلد عربی زبان میں منتقل ہونا چاہیے ۔

۱۱۔ اسلامی مرکز کے مشن کے تعارف کے لیے انگریزی اخبارات میں متعدد خطوط اور آرٹیکل شائع کرائے گئے ۔ ٹائمس آف انڈیا (۵ استمبر ۱۹۸۷) نے اسلامی مرکز کا ایک مفصل آرٹیکل شائع کیا ۔ اس کو بہت پسند کیا گیا ۔ اس کی اشاعت کے بعد مرکز میں کافی خطوط اور ٹیلی فون آئے ۔ لوگوں نے کہا کہ یہ بہت مفید سلسلہ ہے ۔ اس کو جاری رکھا جائے ۔ خود اخبار میں کافی خطوط موافق اور مخالف چھپتے رہے ۔ یہاں صرف ایک خط (مطبوعہ ٹائمس آف انڈیا ۶ اکتوبر ۱۹۸۷) کا ایک پیراگراف نقل کیا جاتا ہے :

Maulana Wahiduddin Khan (September 15) has given golden advice to Muslim Indians — to stop complaining and start creating. As long as there are men like Maulana Wahiduddin Khan in the Muslim community, there is hope for it.

K.R. Malkani, New Delhi. (*The Times of India*, October 6, 1987)

۱۲ ایک صاحب جو یورپ کے ایک ملک سے تعلق رکھتے ہیں ، انھوں نے ٹائمس آف انڈیا کا مذکورہ مضمون پڑھا ۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے خط (۳۰ ستمبر ۱۹۸۷) حسب ذیل الفاظ میں اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے :

I was very interested to see the article printed in *The Times of India* (15-9-87). It is extremely encouraging that the message of *Al-Risala* is receiving nationwide dissemination and one can only hope that people hearken to it.

۱۳۔ الرسالہ کے بارہ میں بدگمانی میں صرف وہ لوگ رہتے ہیں جنھوں نے الرسالہ کو نہ پڑھا ہو ۔

الرسالہ پڑھتے ہی ان کی غلط فہمی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں:
میں آپ کے ماہنامہ الرسالہ سے متنفر تھا۔ لیکن وہ میرا تعاقب کرتا رہا۔ بادلِ ناخواستہ ایک مرتبہ مطالعہ کے لیے اٹھایا تو عجیب ٹیسٹ ملا۔ پھر تو احباب سے لے کر برابر دیکھنے لگا۔ ہر مرتبہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ گرہیں کھلنے لگیں۔ اس کے مضامین دلوں میں پیدا ہونے والے گمراہ کن خیالات کا جواب نیز قلب و فکر کی تطہیر کے ساتھ اکتشافِ حق کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ یقیناً میری طرح ایسے بہت افراد ہوں گے جو منجمد ماحول اور مخصوص تربیت کی وجہ سے تقلیدی بدظنی کا شکار ہوں گے۔ اب برائے کرم مندرجہ ذیل پتہ پر اس کو جاری فرمادیں اور جواب میں مطلع کریں کہ الرسالہ کی فائلیں کیا دستیاب ہو سکتی ہیں
(توحید احمد قاسمی، جونپور)
الرسالہ کے مشن کو پھیلانے کے لیے ابھی بہت کم براہ راست کوشش کی جا سکی ہے۔ مگر یہ اللہ کا فضل خاص ہے کہ وہ اپنے آپ پھیل رہا ہے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۸۷ کو ابوظبی سے ٹیلی فون آیا۔ ایک بزرگ (محمد اقبال صاحب) نے بتایا کہ وہ اسلامی مرکز کے مشن سے ناواقف تھے۔ اتفاقاً انھیں "خاتونِ اسلام" ملی۔ اس کو پڑھ کر وہ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے ــــــ اسی طرح ہر روز تحریری یا زبانی طور پر خبریں ملتی رہتی ہیں۔
ایک صاحب دوحہ (قطر) سے لکھتے ہیں: الرسالہ کے دو شمارے دسمبر ۱۹۸۲ اور نومبر ۱۹۸۶ ایک دوست سے پڑھنے کو ملے۔ تمام مضامین آج کل کے ماحول کے عین مطابق ہیں۔ ایک بار الرسالہ پڑھنا شروع کرو تو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایک ایک مضمون عصری اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ کتنا بھی زیادہ پڑھ جاؤ نگاہ پر کسی طرح کا بار محسوس نہیں ہوتا۔ سوئے ہوئے کو جگانا تو ایک عام سی بات ہے۔ لیکن جو جاگتے ہوئے بھی سوئے ہوئے ہوں ان کا جگانا ایک عام سی بات نہیں بلکہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اسی کے مصداق ہیں۔ آپ سے التماس ہے کہ آپ جب سے الرسالہ جاری کیے ہوئے ہیں یعنی پہلے شمارہ سے لے کر آج تک سب ایک ایک عدد اور "عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر" کا مکمل سیٹ بذریعہ ہوائی ڈاک مجھے روانہ کر دیں (محمد سعید)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ ۴۸ روپیہ

خصوصی تعاون سالانہ ۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک ۲۰ ڈالر امریکی

بحری ڈاک ۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا